مجموعۂ

رسائلِ امام شاہ ولی اللہؒ

(حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل کے جمیع مباحث ومسائل پر مشتمل)

جلد چہارم

ترتیب وتقدیم:

مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

حصہ چہارم

(حجۃ اللہ البالغہ حصۂ اوّل

کے

جمیع مباحث ومسائل پر مشتمل)

ترتیب وتقدیم

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

نام کتاب : مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد چہارم

مرتبہ : مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

قیمت : ۳۰۰

سن اشاعت : جنوری ۲۰۱۴

تعداد : ۵۰۰

کمپوزنگ : ریاض احمد

مطبع : نیو پرنٹ سنٹر، دریا گنج، نئی دہلی

ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکا نگر، نزد (این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول) کاکا نگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title	:	Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-IV
Editing	:	Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition	:	January 2014
Price	:	300
ISBN	:	978-93-84153-00-7
Composing	:	Riyaz Ahmed

Published by

Shah Waliullah Institute
Masjid Kaka Nagar, Near (N. D. M. C.
Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661
website : www.shahwaliullah.com
Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرست مضامین

حرفِ چند

الحمد للہ مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی چوتھی جلد حجۃ اللہ البالغہ کے حصہ اوّل کے اہم مباحث اور متنوع مسائل پر محیط و مشتمل ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ، حکیم الامت، حجۃ اللہ فی الارض حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے، جو احکام شرعیہ کے رموز واسرار اور مقاصد دین کی تشریح و تنقیح کے حوالے سے روئے زمین پر بلاشبہ رب کریم کی ایک ابدی وسرمدی نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے الہامی اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت پہلے حضرت شاہ صاحب کو احساس ہو چکا تھا کہ آئندہ جو دور آنے والا ہے وہ عقلیت پسندی اور مادیت پرستی کا دور ہوگا اور احکام دین متین کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات پیش کیے جائیں گے، ایسے پرفتن دور میں اسلام کو دین فطرت کی حیثیت سے پیش کرنے اور اس کے احکام کی حکمت ومعنویت بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ لوگ غلط فہمی وشبہ میں مبتلا نہ ہوں۔ حضرت شاہ صاحب نے اسلامی تعلیمات پر عائد الزامات کو دفع کرنے کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اور اسلامی احکام کے اسرار ورموز کی نشاندہی کی ہے۔

مجھے براہ راست ایک ذمہ دار عالم دین نے بتایا کہ مولانا عبیداللہ سندھی جلا وطنی کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اپنے قیام کے دوران اپنے رفقا اور حلقۂ درس کے شرکا سے بڑے جوش وخروش اور جذبہ کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ یوروپ سے الحاد وزندقہ کا ایک سیلاب اور طوفان بلاخیز آنے والا ہے جو اسلام پر یلغار کرے گا اور اس کا دفع ومقابلہ کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف

فلسفہ ولی اللہی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے افکار ونظریات کی عصری معنویت پر معروضی گفتگو کی ضرورت ہے جو ایک مستقل بحث کا موضوع ہے۔

حضرت شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ کی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

وبينا أنا جالس ذات يوم بعد صلوٰة العصر متوجّها الى الله اذ ظهرت روح النبي صلى الله عليه وسلم وغشيتني من فوقي بشئ خيل الى أنه ثوب ألقي على ونفث في روعي في تلك الحالة، أنه اشارة الى نوع بيان للدين ووجدت عند ذلك في صدري نوراً لم يزل ينفسح كل حين. (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۳۹)

میں ایک دن عصر کی نماز کے بعد مراقبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک مجھ کو نظر آئی اور ایک کپڑا سا مجھ پر ڈال دیا گیا۔ اور اسی وقت میرے دل میں اس کے یہ معنی معلوم ہوئے کہ یہ دین کو ایک خاص طرز سے بیان کرنے کی طرف اشارہ ہے اور اسی وقت سے میرے دل میں ایک ایسا نور معلوم ہوا جو کہ ہر وقت ترقی پذیر تھا۔

حضرت شاہ صاحب نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران یہ ایک خواب بھی دیکھا تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے حجۃ اللہ البالغہ ہی میں لکھتے ہیں:

ثم رأيت الامامين الحسن والحسين في منام. رضي الله عنهما وأنا يومئذ بمكة، كأنهما أعطياني قلما وقالا هذا قلم جدنا رسول الله صلى الله عليه وسلم. (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۴۰)

پھر اس کے بعد خواب میں میں نے حضرت امام حسن وحسینؓ کو مکہ میں اس طرح دیکھا کہ انھوں نے مجھ کو ایک قلم عطا فرمایا اور کہا کہ یہ ہمارے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔

اس طرح حضرت شاہ صاحب کو اس عظیم الشان کتاب کی تصنیف کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے اور آپ کی توجہ خاص سے یہ شہرۂ آفاق کتاب معرض وجود میں آئی۔ مگر یہ کتاب کب لکھی گئی

اس کی تصنیف کی ابتدا اور اس کی تکمیل کی تاریخ خود حضرت شاہ صاحب نے نہیں تحریر فرمائی ہے اس لئے کہ اس کی ابتدا اور اس کی تکمیل کی حتمی تاریخ کا تعین خاصا مشکل ہے البتہ بعض لوگوں نے حجۃ اللہ البالغ کا سنہ تصنیف ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء رقم کیا ہے۔ لیکن یہ قول بداہۃً غلط ہے، کیونکہ حضرت شاہ صاحب کی تاریخ وفات ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۳ء ہے تو اگر اس قول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا واضح مطلب ہوگا کہ یہ کتاب آپ کی وفات کے بعد میں معرض وجود میں آئی ہے، جو ایک مضحکہ خیز دعویٰ ہے۔

جناب اطہر عباس رضوی صاحب کی تحقیق ہے کہ ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء اور ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء کے درمیان کسی وقت اس تصنیف کی تکمیل ہوئی ہے اور مولانا محمد احسن نانوتوی (جو حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے مصحح و ناشر ہیں) کا خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ تصنیف اپنے آخری زمانہ میں مکمل تھی۔ اور وہ اس پر نظر ثانی نہ کر سکے

بعض دانشوروں کی رائے ہے کہ جناب اطہر عباس رضوی کی رائے زیادہ صائب اور مناسب ہے اور یہی خیال کچھ میرا بھی ہے کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحب کے آخری دور کی ہے اور اگرچہ اس کے بعد ہمعات تصنیف کی گئی ہے اور اس میں حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔

سردست حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف مخطوطات، مطبوعات اور تراجم اور عربی و اردو شروح کا اختصار سے تذکرہ کیا جا رہا ہے، تاکہ حجۃ اللہ البالغہ کے مخطوطات، مطبوعات اور ان کے تراجم و شروح کا علم ہو سکے اور ان کے مترجمین و شارحین کے بارے میں بھی واقفیت ہو سکے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے مخطوطات:-

(۱) نسخہ کراچی: یہ حجۃ اللہ البالغہ کا قدیم ترین و صحیح ترین قلمی نسخہ ہے، جسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث کے ایک شاگرد و معتقد مولانا کریم نے ۱۱۵۹/ ۱۷۴۶ میں تحریر کیا ہے، جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کی تاریخ پیدائش بھی ہے، اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے کاتب نے حضرت شاہ صاحب کے روبرو درس میں پڑھا بھی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے درس میں اس کی قرأت و خواندگی شعبان ۱۱۶۲ میں پوری ہوئی تھی۔ اس نسخہ کے سرورق پر یہ نوٹ درج ہے:

''پیش حضرت شیخ مصنف بطریق تعلم شروع نمودہ شد، اللہ سبحانہ توفیق اتمام دہد وتحقیق بایں علوم میسر ساذ''

اور اسی نسخہ کے آخری صفحہ پر رقم ہے:

''تم الکتاب حجۃ اللہ البالغہ بید الفقیر الحقیر کریم ہر کہ خواند دعا طمع دارم، زآنکہ من بندہ گنہ گارم درسنہ ۱۱۵۹ھجری المقدس''

اسی صفحہ پر دوسری جگہ تحریر ہے:

''تا شعبان ۱۱۶۲ تا آخر پیش حضرت مرشد خواندہ شدہ۔ اللہ تعالیٰ تحقیق میسر کند''۔

یہ نسخہ ۲۷۳ اوراق پر محیط ہے، جس کے ۷۵ اوراق خط نسخ میں ہیں اور باقی حصے خط نستعلیق میں ہیں۔ اور دونوں خط عمدہ ولاجواب ہیں، یہ نسخہ کراچی، پاکستان کے معروف ایڈووکیٹ خالد اسحٰق صاحب کی ملکیت وتصرف میں رہا ہے۔ اب کیا صورت ہے، اس کا علم نہیں ہے۔

حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب لکھتے ہیں:

''نسخہ کراچی کے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے ابتدائی مسودہ کی نقل ہے چوں کہ اس میں جگہ جگہ عبارتیں قلم زد کی گئی ہیں۔ جن کی خاصی تعداد ہے۔ ایک آدھ سطر سے چار چھ سطروں تک اور بہت سے مقامات پر آدھا صفحہ، پون صفحہ، بلکہ پورا یا ڈیڑھ یا پونے دو صفحے مسلسل قلم زد کئے گئے ہیں، کہیں کہیں عبارتیں بالکل مٹائی گئی ہیں، بیشتر مقامات پر قلم زد عبارت پڑھی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ناقل (کریم) نے اپنا نسخہ حضرت مصنف کے ابتدائی مسودہ سے نقل کیا تھا مگر درس کے وقت جب یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے حضور پڑھا گیا تو حضرت شاہ صاحب نے اس میں کثرت سے ترمیم کرائی، جو عبارتیں غیر ضروری یا زائد تھیں وہ حذف کرادیں اور چند عبارتوں سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت مصنف کی رائے میں تبدیلی ہوگئی تھی، اس لئے پرانے نظریہ پر قلم پھیر دیا۔ اسی شان سے پورے نسخہ کی تعلیم وقرأت مکمل ہوئی آخر آخر میں حضرت شاہ صاحب نے جس متن کو باقی رکھا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ کے اور

نسخوں کے نقل کرنے والوں نے اس کو بنیاد بنایا ہے۔
یہ تو بڑی تصحیحات کی کیفیت تھی، اس کے علاوہ کلمات یا فقروں کی تصحیح بھی کثرت سے ہے جو کہیں کہیں متن میں اور کثرت سے حاشیوں پر کی گئی ہے، تصحیحات کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی کوئی صفحہ ان سے خالی ہے''۔

حجۃ اللہ البالغہ ایک تجزیاتی مطالعہ صفحہ ۱۴

مخطوطہ کراچی میری نگاہ سے نہیں گزرا ہے اسی وجہ سے حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب کی تحقیق پر انحصار و اعتماد کیا ہے، جو ایک معتبر و مستند محقق اور فکر ولی اللہی کے ماہر ہیں۔

(۲) مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ:۔

یہ حجۃ اللہ البالغہ کا اہم ترین خطی نسخہ ہے، جو نسخہ ۱۲ ربیع الاول ۱۲۴۰/۴ نومبر ۱۸۲۴ کا مکتوبہ ہے، جس کے مجموعی اوراق ۲۵۷ ہیں، یہ نسخہ منشی محمد حسن کے لئے لکھا گیا ہے، جس کے گمنام کاتب و ناقل یہ تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمت: تمام شد ایں کتاب بموجب فرمائش جناب منشی محمد حسن دام اقبالہ، بتاریخ دوازدہم ماہ ربیع الثانی سنہ ۲۲ بوسی و مطابق ھجری ۱۲۴۰ فقط''

منشی محمد حسن کے بارے میں بھی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ یہ کون بزرگ ہیں۔ لیکن ''دام اقبالہ'' کے لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی رئیس یا کوئی صاحب علم بزرگ ہوں گے۔

مذکورہ بالا نسخہ نہایت ہی پاکیزہ و خوشنما اور نستعلیق میں تحریر کیا گیا ہے اور حواشی بھی خوشخط لکھے گئے ہیں۔

(۳) نسخہ پیر جھنڈا، حیدرآباد، یہ قلمی نسخہ ۱۱۸۳ھ میں لکھا گیا ہے، جس کے ناقل و کاتب شیخ محمود بن محمد سندھی پلیچہ تھے۔ یہ نسخہ عرصہ دراز تک شیخ مولانا محب اللہ (پیر جھنڈا) کے معروف کتب خانہ میں رہا ہے۔ اب اس تاریخی کتب خانہ کا ایک بڑا حصہ نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی میں منتقل ہو گیا ہے، غالباً یہ نسخہ پیر جھنڈا نیشنل میوزیم میں موجود ہے۔

(۴) نسخہ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدثؒ: یہ نسخہ قیمہ خود محدث کبیر حضرت شاہ محمد اسحٰق محدثؒ کے دست مبارک نے لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ گرچہ نسخہ پیر جھنڈا کے بعد کا مکتوبہ ہے، لیکن حضرت شاہ محمد

اسحٰق محدثؒ سے نسبت کی وجہ سے نسخہ کراچی، یعنی نسخۂ مصنف کے بعد سب سے مستند نسخہ ہے، یہ نسخہ کتب خانہ حرم مکہ میں محفوظ ہے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے قیام مکہ کے دوران اس نسخہ سے استفادہ کیا ہے۔

(۵) نسخۂ کاکوری: یہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری لکھنؤ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۶۸/ ۵۲-۱۸۵۱ کا مکتوبہ ہے ایک مستند نسخہ ہے۔

(۶) نسخۂ برلن: یہ نسخہ خطی جرمنی کی نیشنل لائبریری برلن میں ہے، جسے نسخۂ اسپرنگر بھی کہتے ہیں، اسپرنگر ایک انگریز تھا جسے مخطوطات اور قیمتی کتابوں کو جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، ہندوستان سے بہت سارے مخطوطات لے گیا تھا اور بہت سی کتابوں کو نقل بھی کروایا تھا۔ نسخۂ برلن صاف ستھرے خط اور خوشنما تحریر میں ہے، لیکن نہ کاتب کا نام درج ہے اور سنہ کتابت رقم ہے، یہ مخطوطہ دو جلدوں میں ہے یہ نسخہ ۵۳۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سفر برلن کے دوران میرے علم میں نہ تھا کہ یہ مخطوطہ برلن میں موجود ہے، ورنہ میں اس کا معائنہ ضرور کرتا۔

(۷) نسخۂ دلّی: یہ حجۃ اللہ البالغہ کا نسخہ خطی ہے، درگاہ حضرت شاہ ابوالخیر چتلی قبر دلّی میں موجود ہے، جس کے وارث و مالک مولوی محمد انس فاروقی صاحب ہیں، اس کے کل ۱۷۵ اوراق ہیں، لیکن کاتب کا نام درج نہیں ہے۔

(۸) نسخہ مدرسہ صولتیہ، یہ نسخہ مکہ مکرمہ کے مشہور مدرسہ صولتیہ میں محفوظ ہے۔ گرچہ یہ مخطوطہ بہت بعد کا مکتوبہ ہے لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ نسخہ برسوں مولانا عبید اللہ سندھی کے مطالعے میں رہا ہے اور اس پر مولانا سندھی کے دستخط بھی موجود ہے، یعنی عبید اللہ بن الاسلام۔

حجۃ اللہ البالغہ کے مطبوعہ نسخے:۔

طبع اوّل: ''مطبع صدیقی'' بریلی:

حجۃ اللہ البالغہ کی سب سے پہلی طباعت ۱۲۸۶ میں ''مطبع صدیقی'' بریلی سے مولانا محمد احسن نانوتوی کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ جس کے محرک مولانا منشی جمال الدین نانوتوی تھے جو ریاست بھوپال میں مدار المہام کے عظیم منصب پر فائز تھے۔ انھوں نے مطبع صدیقی کے معیار طباعت ونفاست کو دیکھ کر حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کی طباعت واشاعت کی تحریک کی تھی۔

مولانا محمد احسن نانوتوی نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس کی ذمہ داری قبول کی اور حجۃ اللہ البالغہ کو موجود مخطوطات سے موازنہ وتقابل کے بعد مفید حواشی، ضروری اعراب اور کتابت و حسن طباعت کے ساتھ شائع کیا۔ مشہور عالم دین مولانا محمد منیر نانوتویؒ بھی اس کے اہتمام طباعت میں ان کے شریک کار تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی تصحیح وتنقیح میں درج ذیل کتب خانوں کے مخطوطات مولانا محمد احسن نانوتویؒ کے پیش نگاہ تھے:-

(۱) مولانا احمد حسن مرادآبادی (متوفی ۱۲۸۸/۱۸۷۱)

(۲) مولانا مفتی سعد اللہ رام پوری (متوفی ۱۲۹۴/ ۱۸۷۷)

(۳) مولانا مفتی ریاض الدین کاکوری (متوفی ۱۲۹۵/ ۱۸۷۸)

(۴) مولانا ارشاد حسین رام پوری مجددی (متوفی ۱۳۱۱/۱۸۹۳)

یہ تمام مخطوطے ناقص اور غیر مکمل تھے اس وجہ سے مولانا محمد احسن نانوتوی نے موجود چاروں خطی نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک مستند اور جامع متن تیار کیا اور اس جامع متن میں ان چاروں مخطوطوں کے امتیازات وخصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھا۔

حجۃ اللہ البالغہ کی پہلی اشاعت بڑے سائز کے ۳۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے آخری دو صفحات پر مولانا محمد احسن نانوتویؒ کا لکھا ہوا خاتمۃ الطبع بھی ہے، جس میں مخطوطات کی فراہمی کی تفصیل ہے، اور بعض لوگوں کے تعاون وتحریک کا بھی ذکر ہے اور آخر میں چھ عربی اشعار پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ بھی ہے۔

طبع دوم: ''مطبع بولاق'' مصر:

ہندوستان میں حجۃ اللہ البالغہ کی اشاعت کے بعد اس کے افادہ عام کے لئے مولانا منشی جمال الدین کتانوی نے مصر میں اس کی طباعت واشاعت کا منصوبہ بنایا اور مولانا محمد حسین فقیر دہلوی کو بطور سفیر مصر بھیجا اور مطبع بولاق میں اس کی طباعت واشاعت کا انتظام کرایا۔ مصری طباعت اور متن کی نئی تدوین اور قلمی نسخوں سے موازنے ومراجعت کا اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ ہندوستانی مطبع صدیقی کے مطبوعہ نسخے کو عربی رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کوئی حدیث آئی ہے، وہاں حاشیہ میں ''ح'' بنا دی گئی ہے تاکہ احادیث کی شناخت ہو سکے۔ اس

کے مصحح شیخ ابراہیم عبدالغفار دسوقی (متوفی ۱۳۰۰/۱۸۸۳) تھے، جو مصر و ترکی کے نامور اور دور اندیش مصحح تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا یہ مصری نسخہ بھی ہندوستانی نسخہ کے طرح دو جلدوں میں ہے۔ یہ مصری نسخہ ۱۲۹۴/ ۱۸۷۷ کا مطبوعہ ہے۔

طبع سوم: ''مطبع خیریہ'' مصر:

حجۃ اللہ البالغہ کی دوسری طباعت ۲۳-۱۳۲۲ میں مصر میں مطبع خیریہ کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ یہ مطبع بولاق کے مطبوعہ نسخہ کی بعینہٖ دوسری اشاعت ہے۔ حسب سابق دو جلدوں میں چھپی ہے، جلد اوّل ۱۳۲۲ کے اواخر میں اور جلد دوم ۱۳۲۳ میں طبع ہوئی ہے۔

طبع چہارم: ''مطبع منیریہ'' مصر:

حجۃ اللہ البالغہ کی تیسری اشاعت ۱۳۵۲ میں مصر میں ''مطبع منیریہ'' کے زیر اہتمام ہوئی تھی اور اس کی تصحیح و تنقیح میں مولانا عبیداللہ سندھی نے معاونت کی ہے اور اس میں حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث کا دستیاب مخطوطہ حرم مکی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اور یہی نسخہ منیریہ ہندوستان میں بھی مقبولیت عام کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ تقریباً یہی نسخہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی نے شائع کیا ہے علاوہ ازیں دارالسلفیہ لاہور سے بھی تھوڑی بہت تصحیح کے بعد شائع ہوا ہے اور دارالسلفیہ کے مطبوعہ نسخے میں احادیث کی تخریج اور متون احادیث کا اضافہ کیا گیا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم:

حجۃ اللہ البالغہ کے متعدد اردو تراجم مختلف ادوار میں ہوتے رہے ہیں، جن میں سے کچھ بہت ہی معیاری اور کچھ برائے نام ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ سردست حجۃ اللہ البالغہ کے یہ تمام اردو تراجم میرے پاس موجود نہیں ہیں ورنہ میں حجۃ اللہ البالغہ کے ان اردو تراجم کا تقابلی و تجزیاتی جائزہ پیش کرتا جس سے اندازہ ہو جاتا کہ کون سا ترجمہ زیادہ سلیس و شستہ اور بامحاورہ، اور کون ترجمہ تحت اللفظ، مغلق، پیچیدہ اور چیستاں اور غیر واضح ہے۔

اب حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

(۱) نعمۃ اللہ البالغہ: یہ اردو ترجمہ مولانا محمد فضل الرحمٰن رئیس اعظم عظیم آباد پٹنہ کی تحریک

وترغیب پر مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی (متوفی ۱۲۶۷/۱۳۳۵ھ) نے کیا ہے، مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی ایک اچھے مترجم وشارح اور مفسر قرآن ہیں، آپ نے ترجمہ وتفسیر قرآن ''تفسیر حقانی'' کے نام سے کیا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا یہ ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور ۱۳۰۲/ ۱۸۸۵ میں مکمل ہوا ہے۔ اور یہ ترجمہ آپ نے کب شروع کیا ہے۔اس کی کوئی اطلاع نہیں ملتی ہے، اردو ترجمہ نعمۃ اللہ البالغہ پہلی مرتبہ کس سن میں چھپا تھا اس کی بھی اطلاع نہیں ہوسکی ہے البتہ دوسری مرتبہ اصح المطابع کراچی سے طبع ہوا ہے اور ترجمہ کی زبان میں جزئی ترمیم مولانا عبداللطیف ،مولانا معراج احمد فارق صاحب نے کی ہے۔ اصح المطابق کا نسخہ بھی متن کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے مگر اس پر تاریخ درج نہیں ہے، حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم میں نعمۃ اللہ البالغہ سب سے زیادہ معیاری اور سلیس وشستہ ترجمہ ہے، اور یہی ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی چوتھی . پانچویں جلد میں شامل ہے۔

(۲) آیات اللہ الکاملہ: یہ اردو ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ مولانا خلیل احمد سنبھلی اسرائیلی (متوفی ۱۳۴۰ھ) مقیم علی گڑھ کا کیا ہوا ہے، یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۳۱۵/ ۱۸۹۷ میں مطبع اسلامی لاھور سے طبع ہوا ہے۔ اور دوسری مرتبہ ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء میں حمایت الاسلام پریس لاہور سے شائع ہوا ہے. یہ دونوں تراجم عربی متن سے معری ہیں، اور یہ چھ سوبیس صفحات پر مشتمل ہیں۔

(۳) شموس اللہ البالغہ: مولانا عبدالحق صاحب ہزاروی نے یہ ترجمہ کیا ہے اور ۱۳۵۱ھ میں شیخ الٰہی بخش نے حمایت الاسلام پریس لاہور سے طبع کرایا تھا اور دو جلدوں میں شائع ہوا ہے اور متعدد بار یہ ترجمہ مع عربی متن کے چھپتا رہا ہے، اس ترجمہ کے بارے میں اکثر لوگوں کی رائے اچھی نہیں ہے۔

(۴) نعمۃ اللہ البالغہ: یہ اردو ترجمہ مولانا عماد الدین شیرکوٹی (متوفی ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء) نے ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۰ء کے دوران کیا تھا اور کتب خانہ انصار یہ جالندھر کے زیر انتظام دو جلدوں میں طبع ہوا ہے۔

(۵) ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ: جس کے مترجم مولانا پروفیسر عبدالرحیم پشاوری (متوفی ۱۳۶۹/ ۱۹۵۰ء) ہیں، یہ اردو ترجمہ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء میں مکمل ہوا اور ۱۳۶۷/ ۱۹۴۹ء میں دو جلدوں میں

شائع ہوا تھا اور یہ ترجمہ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء میں قومی کتب خانہ لاہور سے بھی شائع کیا گیا ہے۔

(۶) برہان الٰہی: یہ اردو ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ: مولانا ابوالعلاء اسماعیل گودھروی نے مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک پر ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء میں مکمل کیا تھا اور شیخ غلام نبی اینڈ سنز لاہور نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد جون ۱۹۹۹ میں مطبع حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور کی جانب سے شائع کی گئی تھی اور اس کی دوسری جلد بھی اسی مطبع سے ۱۹۹۹ ہی میں شائع کی گئی ہے۔

مولانا ابوالعلاء محمد اسماعیل گودھروی لکھتے ہیں:

"۱۹۱۹ء میں قیام رانچی کے زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے سب سے پہلے مجھے اس کتاب کے ترجمہ کی طرف توجہ دلائی تھی، مگر افسوس کہ عرصہ تک اس کا موقع نہ ملا، اور میری ہمت نے بھی ساتھ نہ دیا، ۱۹۳۷ء میں جب میں حج بیت اللہ کے لئے گیا تو مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے حرم مکہ میں دوران ملاقات اس کتاب کے ترجمہ کی طرف توجہ دلائی بلکہ کافی اصرار بھی کیا"۔ مقدمہ مترجم صفحہ ۱۷

مولانا ابوالعلاء محمد اسماعیل گودھروی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کے دوسرے اردو تراجم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کتاب کے اردو ترجمے پہلے ہی ہو چکے ہیں، لیکن ترجمے کیا ہیں۔ ایک چیستاں ہیں۔ جن میں مغلق مقامات کو اور بھی زیادہ مغلق کر دیا گیا ہے۔ اکثر الفاظ مفردہ کا ترجمہ الفاظ مفردہ سے کیا گیا ہے۔ جس سے مطلب کی وضاحت تو درکنار الجھاؤ اور بڑھ گیا ہے، ایسے مقامات اور الفاظ کو جملوں اور سطروں سے واضح کرنے کی ضرورت ہوئی ہے۔ تحت اللفظ یا تحت اللفظ جیسا ترجمہ اس کتاب کی شان کے خلاف ہے بلکہ کتاب کے مطلب کو بگاڑنا ہے"۔ مقدمہ مترجم صفحہ ۱۷

ترجمہ برہان الٰہی ایک عمدہ ترجمہ ہے، دوسرے اردو تراجم (باستثنا نعمۃ اللہ البالغہ) کے مقابلے میں زیادہ آسان اور واضح ہے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ کوئی بھی ترجمہ یا کوئی بھی کام حرف آخر نہیں ہوا کرتا ہے، اس کے بعد بھی کچھ اردو تراجم سامنے آئے ہیں۔ وہ خود بھی مغلق اور غیر واضح ہیں۔

ترجمہ از مولانا منظور الوحیدی: یہ ترجمہ کس نام سے کیا گیا ہے، اس کا علم نہ ہو سکا ہے البتہ یہ ترجمہ ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ جس کے فاضل مترجم مولانا منظور الوحیدی صاحب ہیں، یہ ترجمہ پہلی دفعہ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے اور یہ ترجمہ میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔

شروح حجۃ اللہ البالغہ

اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ از عبید اللہ سندھیؒ: مولانا عبید اللہ سندھیؒ امام شاہ ولی اللہ محدث کے علوم وافکار کے امین وشارح ہیں، انھوں نے ہی حضرت شاہ صاحب اور ان کے فکر وفلسفہ کو برصغیر میں متعارف کرایا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم کے علاوہ اس کی دو شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ایک شرح عربی میں اور دوسری شرح اردو میں ہے۔ یہ دونوں شرحیں دراصل مولانا عبید اللہ سندھی کی درسی تقریریں ہیں، مولانا سندھیؒ مکہ کے قیام کے دوران حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا کرتے تھے، آپ کے درسی افادات کو آپ کے شاگرد مولانا عبداللہ بن نہال نے عربی میں منتقل کر دیا تھا اور جلا وطنی کے بعد جب آپ ہندوستان آ گئے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیام کیا تھا اور حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس شروع کی تو آپ کے ایک شاگرد محمد صدیق سہارنپوری نے آپ کی درسی تقریروں کو جمع کر کے شائع کیا اور افادۂ عام کے لئے وقف کیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی اردو شرح میرے پیش نظر ہے، اس کے شروع میں حکیم الہند امام شاہ ولی اللہ کے حالات زندگی، ان کی تعلیمات، ان کے آباواجداد اور اساتذہ کا تعارف ہے اور اس کے بعد ابداع، خلق اور تدبیر کی تشریح ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں، غرضیکہ ایک اچھی شرح ہے، جو حجۃ اللہ البالغہ کے اہم مسائل کو سمجھنے میں بے حد مددگار ثابت ہوتی ہے۔

رحمۃ اللہ الواسعہ: مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ اور شرح رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے کیا ہے اور متعدد جلدوں میں کیا ہے، جلد اول ۲۰۰۱ میں مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع ہوئی ہے اور اس کی دوسری جلد ۲۰۰۲ء میں مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع ہوئی تھی۔

اس مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد چہارم میں مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی کا ترجمہ نعمۃ اللہ البالغہ کو شامل کیا گیا ہے جو حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم میں ایک شاندار و جاندار اور سلیس وشستہ ترجمہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نایاب تحفہ ثابت ہوگا۔

اس مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی اشاعت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال و متحرک اور ہر دلعزیز ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ وہ اردو زبان کے مخلص ادیب اور باشعور دانشور ہیں۔ میں ان کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔ انھوں نے اس کی اشاعت میں گہری دلچسپی لی۔ اللہ تعالیٰ انہیں مزید ترقیات وفتوحات سے نوازے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر برادر عزیز عرفی عبید صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جو ایک علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، جن کے دادا جناب ارشادالحق صاحب مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں تھے اور آپ کے والد جناب عبیدالحق صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاذ تھے۔ اللہ ان حضرات کی مغفرت فرمائے۔ جناب عبید عرفی صاحب جہاں پیشے سے ایک اچھے و تجربہ کار انجینئر اور فن تعمیر کے ماہر ہیں وہاں دینی و ملی حمیت وغیرت میں بالکل منفرد مزاج و ذوق کے مرد میدان بھی ہیں، جنھوں نے اس مجموعہ کی اشاعت میں تعاون کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو باحوصلہ و باہمت رکھے۔ آخر میں برادرم جناب محمد الیاس ملک صاحب کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اس مجموعہ کی اشاعت و ترویج میں بھرپور دلچسپی لی ہے، جو ایک سماجی آدمی ہیں، ملی مسائل سے بھی انہیں گہری دلچسپی ہے۔

والسلام

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیئرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

سوانح حیات

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

از مولانا معراج محمد بارقؒ

نام ونسب:-

احمد نام، ابوالفیاض کنیت اور ولی اللہ عرف ہے۔ بشارتی نام قطب الدین اور تاریخی نام عظیم الدین مشہور ہے۔ آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم ابوالفیض ہیں جو اپنے وقت کے ایک جید عالم اور مشہور بزرگ تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کی نظر ثانی واصلاح میں آپ بھی شریک تھے۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی جانب سے حضرت عمرؓ تک اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے اس لحاظ سے آپ خالص عربی النسل اور نسباً فاروقی ہیں۔

ولادت:-

آپ بروز چہارشنبہ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء بوقت طلوع آفتاب دہلی میں تولد ہوئے۔ آپ کی ولادت سے قبل آپ کے والد کو ایک بلند اقبال اور ہونہار لڑکا پیدا ہونے کی بے شمار بشارتیں ہوئیں، شیخ عبدالرحیم کی اہلیہ شباب کے تمام مراحل طے کر کے زمانہ یاس کو پہنچ چکی تھیں اس لئے ان کو گمان ہوا کہ شاید یہ اشارہ بیٹے کی طرف نہیں، لیکن کچھ عرصہ بعد انھوں نے شیخ محمد کی صاحبزادی سے عقد کیا اور اس خاتون کے بطن سے آپ پیدا ہوئے اور وہ بشارت یوں پوری ہوئی۔ بعض دیگر بزرگوں کو بھی آپ کے متعلق بہت سی بشارتیں ہوئیں غالباً انہی بشارت کی بنا پر

آپ کا نام ولی اللہ مشہور ہوا۔

بچپن:۔

بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں، لیکن آپ کی طبیعت میں شروع ہی سے سادگی، شرافت اور متانت موجود تھی، نہایت ذہین واقع ہوئے تھے۔ بچپن میں آپ کی تمام حرکات اتنی محبوب ودلفریب تھیں کہ ہر شخص ان کا شیفتہ تھا، عام بچوں کی طرح آپ بیکار کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ چند ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کہیں باغ میں کھیل کود کو چلے گئے، جب وہاں سے واپس آئے تو والد بزرگوار نے سر پر دست شفقت پھیر کر فرمایا ''جانِ پدر آج تم نے کیا چیز ایسی حاصل کی جو تمہارے ساتھ باقی رہے گی؟ ہم نے تو یہ پڑھا، یہ لکھا اور یہ یہ عبادت کی''۔ والد بزرگوار کی زبان سے یہ الفاظ سننے تھے کہ آپ فرط ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گئے اور ان کے یہ جملے گویا دل میں بس گئے۔ اس کے بعد آپ پھر کبھی سیر سپاٹے اور بیکار کھیلوں میں مشغول نہ ہوئے۔ اس سے آپ کی سعادت مندی اور وفا شعاری کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم وتربیت:۔

آپ پانچ برس کے ہوئے تو مکتب میں میں قرآن مجید پڑھنے بٹھائے گئے۔ ساتویں سال قرآن ختم کر لیا اسی سال آپ کے والد بزرگوار نے نماز روزہ شروع کرایا اور فارسی کی درسی کتب پڑھانی شروع کیں، آپ کی ''رسم سنت'' بھی اسی سال عمل میں آئی۔ ایک ہی سال میں فارسی کی تعلیم مکمل کر لی اور صرف ونحو کی طرف متوجہ ہوئے اور دس برس کی عمر میں علم نحو کی معرکۃ الآرا کتاب ''شرح ملا جامی'' تک پہنچ گئے۔ اور نہ صرف فارسی کی نوشت وخواند میں مہارت پیدا کر لی بلکہ عربی کی صرف ونحو میر پر بھی عبور حاصل کر لیا اور عربی کتب کے مطالعہ کی استعداد پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد معقول کی کتابیں شروع کیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان سے فراغت پائی۔ پندرہ سال کی عمر میں تمام متداولہ درسی علوم کی تکمیل کر لی۔ اور نہ صرف مروّجہ نصاب تعلیم مکمل کیا بلکہ طب، حکمت، ہندسہ، حساب وغیرہ کی بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ اور اس طرح چھوٹی سی عمر میں ارباب فضل وکمال کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔

شاہ صاحب کی تعلیم اکثر اپنے والد بزرگوار کے پاس ہوئی اور جو کچھ اپنے والد سے اکتساب

کیا اس کے متعلق خود بیان فرماتے ہیں۔ ''علم حدیث میں مشکٰوۃ شریف تمام وکمال پڑھی لیکن چند روز کی علالت کی وجہ سے کتاب البیع سے کتاب الادب تک کا حصہ نہ پڑھ سکا۔ صحیح بخاری شروع سے کتاب الطہارۃ تک پڑھی اور شمائل ترمذی اوّل سے آخر تک تفسیر میں تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کے کچھ حصے باقاعدہ پڑھے اور باقی حصوں کا خود مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعہ کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں مجھے حاضری کی توفیق ملی اور اس طرح کئی بار میں نے حضرت سے متن قرآن پڑھا اور یہی میرے حق میں ''فتح عظیم'' کا باعث ہوا (والحمد للّٰہ علی ذٰلک) علم فقہ میں شرح وقایہ پوری، ہدایہ کی دو جلدیں، صرف تھوڑا سا حصہ چھوڑ دیا گیا۔ اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح کا درس لیا۔ منطق میں شرح شمسیہ کامل اور بعض مختصرات پڑھیں۔ علم کلام میں شرح عقائد کامل، شرح خیالی اور شرح مواقف کے کچھ حصے پڑھے۔ تصوف وسلوک میں عوارف المعارف کا بڑا حصہ اور رسائل نقشبندیہ پڑھے۔ علم الحقائق میں شرح رباعیات، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور مقدمہ نقد النصوص پڑھا۔ خواص اسماو آیات میں والد صاحب کا ترتیب دیا ہوا ایک مجموعہ پڑھا۔ طب میں موجز اور فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ نحو میں کافیہ اور اس کی شرح از ملا جامی۔ علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی اس قدر جتنے پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے اور ہیئت وحساب میں بھی بعض رسالے پڑھے۔ اور الحمد للہ کہ اسی تحصیل علم کے زمانے میں ہر فن سے ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی اور ان کے خاص مسائل اور اہم مباحث میرے ذہن کی گرفت میں آ گئے۔

عقد نکاح:۔

شاہ صاحب کی عمر جب چودہ سال کی ہوئی تو شادی کی صورت پیدا ہوگئی۔ آپ کے والد صاحب نے اس معاملہ میں انتہائی عجلت سے کام لیا، لیکن سسرال والوں نے سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا تو آپ نے کہلا بھیجا کہ یہ عجلت بے وجہ نہیں، اس کی حکمت ومصلحت بعد میں ظاہر ہوگی۔ چنانچہ شیخ صاحب کے اصرار پر سسرال کے لوگ راضی ہو گئے اور اسی سال آپ کی شادی ہوگئی۔

وہ راز بعد میں اس طرح ظاہر ہوا کہ شادی ہو جانے کے چند ہی روز بعد شاہ صاحب کی

خوش دامن کا انتقال ہوگیا۔ پھر تھوڑے ہی دن بعد خوش دامن کے والد کا وصال ہوگیا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شاہ صاحب کے ماموں شیخ ابوالرضا محمد کے صاحبزادے شیخ فخر عالم رحلت فرما گئے۔ اس کے بعد آپ کی سوتیلی ماں وفات پاگئیں۔ ان صدمات اور مختلف امراض وضعف کی وجہ سے آپ کے والد بھی سخت بیمار پڑ گئے۔

بیعت ودستار بندی:۔

شادی کے ایک سال بعد یعنی پندرہ سال کی عمر میں آپ نے والد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انھوں نے آپ کو علوم باطنی کی طرف توجہ دلائی۔ اور آپ ان کی زیر نگرانی اشغال صوفیہ میں مشغول ہوئے خصوصاً نقشبندیہ میں کہ تمام طریق صوفیہ میں یہ طریقہ بدعات متاخرین سے پاک وصاف ہے۔ اسی سال آپ نے بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا مروجہ نصاب تعلیم مکمل کرلیا۔ والد ماجد نے اس تقریب میں بڑے پیمانہ پر خواص وعوام کی ایک شاندار دعوت کی اور دستار بندی کی رسم ادا ہوئی۔

والد ماجد کا انتقال اور بیعت وارشاد کی اجازت:۔

دو تین سال کے عرصہ میں آپ نے علوم باطن میں بھی کمال پیدا کرلیا، پھر آپ کی عمر کے سترھویں سال آپ کے والد ماجد سخت بیمار ہوئے اور اسی حالت مرض میں آپ کو بیعت وارشاد کی اجازت دے دی اور ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں درس وارشاد کی مسند اپنے اس بلند اقبال بیٹے کے لئے خالی کردی۔

درس وتدریس اور علمی استغراق:۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد آپ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں مستقل طور پر مسند ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کے علم وفضل اور کمالات ظاہری وباطنی کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ ہر طرف سے تشنگان علوم ومعارف جوق در جوق آتے اور زانوئے ادب بچھاتے۔ تقریباً بارہ سال تک آپ کتب دینیہ اور معقولات کا درس دینے میں مشغول رہے۔

اس دوران میں آپ کو ہر علم وفن میں غور کرنے کا موقعہ ملا، اسی زمانہ میں آپ نے مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور ان احادیث کو بھی بامعان نظر

دیکھا جن سے یہ حضرات ائمہ اپنے اقوال و مذاہب کی سند لاتے ہیں اور اسی وقت سے ''فقہائے محدثین'' کا طریقہ بھی آپ کے دلنشین ہوا۔

آپ کا یہ زمانہ نہایت استغراق اور محویت کا گزرا، آپ نے نہایت تحقیق و کاوش سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور رات دن انتہائی، انہماک و استغراق کے ساتھ کتب بینی میں مشغول رہے۔ شاہ صاحب ان دنوں کھانا بھی کم کھاتے اور آرام بھی کم کرتے اور درس و تدریس کے بعد جو وقت ملتا صحبت کتب میں صرف کرتے۔

حج بیت اللہ:۔

یہ شوق علم و تحقیق اس قدر بڑھا کہ آپ کو حرمین جانے کا خیال پیدا ہوا۔ جس قدر علم حدیث کی ضرورت آپ محسوس کرتے تھے وہ دہلی میں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی تحصیل و تکمیل کے لئے آپ کو حجاز کا سفر اختیار کرنا ضروری تھا، تاکہ وہاں کامل اساتذہ کی صحبت اور اعلیٰ علمی کتابوں کے مطالعہ سے اپنی بصیرت اور روحانیت میں اضافہ کریں۔

چنانچہ اسی ارادہ کے تحت آپ ۱۱۴۳ھ-۱۷۳۱ء کے اواخر میں حج کے لئے روانہ ہوئے، اس زمانہ میں ذرائع نقل و حمل کی کمی اور راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے ایسا سفر کرنا اگرچہ بڑا مشکل اور جان جوکھوں کا کام تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے زیارت حرمین کا شوق و ولولہ اور علم و تحقیق کی لگن سے مجبور ہو کر ان مصائب و تکالیف کو سر پر لیا اور نہایت عزم کے ساتھ حجاز روانہ ہوئے۔

وہاں آپ سب سے پہلے مکہ معظّمہ پہنچے اور اسی سال حج سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ کم و بیش ایک سال تک عالم اسلامی کے مختلف علما و مشائخ سے دلچسپ صحبتیں رہیں اور علوم ظاہر و باطن کا اکتساب کیا۔

فیوض حرمین:۔

قیام حرمین کے زمانہ میں شاہ صاحب متعدد علما و مشائخ سے کسب فیض کرتے رہے۔ پہلی مرتبہ شاہ صاحب نے ہندوستان میں شیخ محمد افضل خان المعروف بہ حاجی سیالکوٹی سے حدیث پڑھی تھی، پھر مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے سند حاصل کی۔ شیخ ابو طاہر شاہ

صاحب کے بڑے معتقد تھے، اکثر فرمایا کرتے کہ ''ولی اللہ الفاظ کی سند مجھ سے لیتے ہیں اور میں معنی کی سند ان سے لیتا ہوں''۔

شیخ ابوطاہر کے علاوہ شاہ صاحب نے شیخ وفد اللہ بن شیخ سلیمان مغربی کی درسگاہ میں بھی شرکت کی اور موطا یحییٰ بن یحییٰ (یعنی موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ) اوّل سے آخر تک سنائی اور اس کے بعد شیخ محمد بن محمد سلیمان مغربی کی تمام مرویات کی اجازت لی، شاہ صاحب تاج الدین قلعی حنفی مفتیٔ مکہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور صحیح بخاری کی سماعت کے علاوہ کتب صحاح ستہ کے بعض مشکل مقامات کی بھی سماعت کی، اس کے علاوہ موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ اور موطا امام مالک بروایت امام محمد، کتاب الآثار امام محمد اور مسند دارمی کی بھی سماعت کی۔ شیخ تاج الدین نے خصوصیت کے ساتھ شاہ صاحب کو تحریری اجازت نامہ عنایت کیا۔

شاہ صاحب دیگر بڑے بڑے مشائخ سے بھی مستفید ہوئے، شیخ سناوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کر کے کسب فیض کیا، شیخ احمد قشاشی سے بھی کچھ فیوض حاصل کئے۔ ان کے علاوہ سید عبدالرحمٰن ادریسی، شمس الدین، محمد بن علا بابلی، شیخ عیسیٰ جعفری، شیخ حسن عجیمی، شیخ احمد علی اور شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے بھی اکتساب فیض کیا، شیخ ابوطاہر مدنی فقط علم ظاہر کے حامل نہ تھے بلکہ علوم باطن میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، شیخ موصوف نے تمام طرق صوفیہ کا جامع خرقہ بھی اسی بابرکت سفر میں شاہ صاحب کو عنایت کیا۔

حج سے واپسی:۔

الغرض وہاں ایک سال کے قیام میں ان علمی صحبتوں اور عمیق مطالعۂ کتب اور امداد غیبی سے آپ نے حدیث وفقہ میں مجتہدانہ کمال پیدا کرلیا پھر اواخر ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۲ء میں آپ نے دوبارہ حج کیا اور ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء کے اوائل میں وطن کا رخ کیا، پورے چھ مہینے آپ کو آتے آتے راستہ میں لگ گئے اور بتاریخ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء ٹھیک جمعہ کے دن صحیح سلامت وطن مالوف دہلی پہنچے، شہر کے تمام باشندوں اور نامی گرامی علما وفقہا نے آپ کا خیر مقدم کیا۔

آپ کے زمانہ میں ہندوستان کی عام حالت:۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی حالت ہر لحاظ سے ابتر تھی شاہ صاحب کی ولادت اورنگ زیب

کی وفات سے چار سال قبل ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد جو ہند میں طوائف الملوکی پھیلی ہے اس سے کوئی بشر ناواقف نہیں، شاہ صاحب کو تمام عمر میں دس سلاطین دہلی کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، یعنی اورنگ زیب عالمگیر، بہادر شاہ اول، معزالدین جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ (رنگیلا)، احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی۔

ان سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو جن مہیب اور خونی واقعات اور لرزہ خیز حوادث وانقلابات سے گزرنا پڑا، وہ سب پر عیاں ہیں۔ سادات بارہ کا تسلط (جو بادشاہ گر یعنی ''کنگ میکر'' کے نام سے مشہور ہیں)، فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں بصد بیکسی قید میں مرنا پھر تورانی امرائے دربار کے ہاتھوں ان سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج سکھوں کا خونی فتنہ، نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی کی معرکۂ پانی پت میں فتح، روہیلوں کا ہندوستان کی سیاست میں شریک ہونا، ایرانی و تورانی امرا کی باہمی کشمکش، مغربی اقوام کا ملکی سیاست میں بتدریج داخل ہوتے جانا، انگریزوں کا بنگال و بہار وغیرہ پر اقتدار اور عمل دخل تقریباً یہ تمام واقعات شاہ صاحب کی زندگی ہی میں پیش آئے۔

الغرض پورا ملک عجیب بے کلی و بے چینی میں مبتلا تھا، مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، قتل و غارتگری کا طوفان برپا تھا، بدامنی و بدنظمی ہر طرف آشکارا تھی، امرا و سلاطین کبھی رنگ رلیوں میں مبتلا ہوتے اور کبھی فتنوں سے دوچار، زمانہ کی رفتار کچھ سیدھی نہ تھی، ادھر شاہان وقت اپنے اسلاف کی دولت رقص و سرود کی محفلوں اور حسن و جمال کے بازاروں میں لٹا رہے تھے اور اُدھر رعایا بدحال و پریشان، غربت و افلاس کے ہاتھوں برباد، اور ستمگروں کے مظالم سے پامال ہو رہی تھی، گویا پوری قوم کو اگر ایک طرف عشرت ڈبو رہی تھی تو دوسری طرف عسرت کھا رہی تھی۔

عوام کی اخلاقی حالت بھی نہایت درجہ گری ہوئی تھی۔ بدعقیدگی و بدعملی کے تمام جراثیم ان میں پیدا ہو چکے تھے، فسق و معصیت ان کی معاشرت کا جزو بن گئی تھی، تمام بدکاریاں اور منکرات ان کی تہذیب میں داخل تھی، اور کھلم کھلا سر مجلس ان پر فخر کیا کرتے تھے۔ بے ایمانی، دغا بازی، جھوٹ، مکر و فریب، زنا و بدکاری، دیوثیت شراب خواری، جوا بازی، دریوزہ گری، ظلم و ناانصافی،

ٹونے ٹوٹکے، فضول خرچی، ریا ونمود، ترک امور دین وغیرہ اس قسم کے بیسیوں عیوب ہیں۔ جو شاہ صاحب نے اپنے نصائح میں ان لوگوں کے متعلق بیان فرمائے ہیں۔

دینی لحاظ سے بھی ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کتاب وسنت سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ اہل ہنود کے تمام مراسم قبیحہ اور ایام جاہلیت کے تمام افعال شنیعہ انھوں نے اپنا لئے تھے۔ بے سروپا عقائد ان میں رواج پا چکے تھے، تفرق وتحزب کا جال وسیع تھا اور قسم با قسم کے اوہام وشکوک کا دروازہ کھلا، محض دنیا پرست، عامی مشرب، تحقیق سے اجنبی، تقلید وجمود میں منہمک علما وصوفیہ کا دور دورہ تھا جنہیں نہ دینی امور سے ذوق تھا، نہ دین کا درد، نہ حق کا خیال نہ احقاق حق سے واسطہ، انھوں نے اپنے علم کو ذریعۂ عزت بنا رکھا تھا۔ بجائے اس کے کہ عوام ان کے طالب ہوتے وہ عوام کے طالب بن چکے تھے۔ جاہ وحشمت کے لئے بادشاہوں کے آستانوں پر سرخم کرنے اور ان کے حاضر باش دربار بننے میں فخر محسوس کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت خدا سے دور ہوتی گئی۔ غیر اسلامی بدعات ومحدثات کو دین سمجھ کر اپنایا گیا، صحیح دینی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہ رہا، فرائض وعبادات سے زیادہ خود ساختہ بدعات کی پابندی کی جانے لگی، شریعت کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کے بے شمار فرائض اس کے عملاً منسوخ ومعطل قرار دے دیئے گئے تھے اور بہت سے مستحبات وسنن حرام ومتروک، قرآن کو ایک چیستان سمجھ کر بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ اس کو عوام کی سمجھ سے بالاتر قرار دے کر صرف چند خاص مواقع پر ثواب بخشنے یا حلف اٹھانے وغیرہ کے کام میں لیا جاتا تھا۔ اس میں غور کرنا باعث گمراہی متصور ہوتا تھا۔ اسلام کے تمام شعائر وآداب اٹھ چکے تھے ان کی جگہ دیگر رسوم وآداب نے لے لی تھی۔ اس کے علاوہ ہندی ویدانت، ایرانی تصوف، یونانی فلسفہ، حلول، بروز اور وحدۃ الوجود کے عقیدے لوگوں کے دل ودماغ میں رچ بس گئے تھے، عوام وجدان پرستی، پیری مریدی اور خانقاہ پرستی میں پھنسے ہوئے تھے، پیرزادے مذہبی پیشوا بن کر لوگوں کو لوٹ رہے تھے، گدی نشین صوفیہ اور مسند آرا مشائخ سب اسی قسم کی دھڑے بندیوں میں مصروف، اپنے اپنے راگ اپنی اپنی منڈلیوں میں الاپ رہے تھے اور جھوٹے فقرا اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے رہزن بنے بیٹھے تھے۔ متقشف واعظین، خانقاہ نشین اور گمراہ صوفیہ لوگوں کو موضوعات واباطیل کی طرف دعوت دے کر ان کے مال اور ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے تھے۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کی علمی و تعلیمی حالت بھی حد درجہ انحطاط پذیر تھی، ان کے مدارس میں ''درس نظامیہ'' کا وہی بے ثمر اور فرسودہ نظام تعلیم جاری تھا۔ جو مدت مدید سے ان کے رگ و پے میں جمود و تعطل کے جراثیم داخل کر رہا تھا۔ وہ ساری عمر صرف و نحو اور معانی میں ضائع کر دیتے اور انہی میں سر کھپاتے رہتے اصل علوم (کتاب و سنت) کی طرف انہیں کبھی توجہ نہ ہوتی۔ درسگاہوں میں صدرا قاضی مبارک، شمس بازغہ اور شرح مطالع کے شروح و حواشی اس کثرت سے رائج تھے کہ گویا اس کے علاوہ ان کا کوئی نصاب تعلیم تھا ہی نہیں۔ دینیات میں فقہ کے سوا کچھ نہ تھا، فقہائے سالفین کی تفریعات میں ڈوب کر اصل علم کو چھوڑ دیا تھا، حدیث میں صرف بطور تبرک مشکوٰۃ اور مشارق الانوار پڑھا دینا کافی سمجھتے تھے۔ قرآن مجید خارج از نصاب تھا۔ انھوں نے اس کی درس و تدریس میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، دراصل انہیں یونانی علوم کی تحصیل سے ہی فرصت نہ تھی جو اس کی طرف توجہ دیتے۔ یہ وہ علوم تھے جن کا اپنے منبع و سرچشمہ یونان میں بھی رواج اٹھ گیا تھا۔ ان فضول اور بے فیض علوم سے ان کی ذہنیتیں مسخ ہوگئی تھیں۔ وہ محض عقائد وغیرہ کے استدلالی مناظرات اور کلامی بحثوں میں الجھ گئے تھے۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی کیا کیفیت تھی اور کس ماحول میں شاہ صاحب نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

حج سے واپسی پر آپ کے مشاغل:۔

فیوض حرمین سے مالامال ہوکر جب آپ ۱۱۴۵ھ-۱۷۳۳ء میں دہلی تشریف لائے تو حالات گردوپیش کا جائزہ لیا اور اپنے عزائم و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ پرانی دلّی میں ایک مقام پر (جو مہندیوں کے نام سے مشہور ہے اور جہاں اب ان کے بزرگوں کی قبریں ہیں) اپنے والد کے ایک چھوٹے سے پرانے مکان میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور وہ مدرسہ رحیمیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جب آپ کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا تو چند ہی دنوں میں اطراف و اکناف سے طلبہ کھنچ کھنچ کر آنے لگے اور وہ جگہ تنگ ہوگئی۔ بادشاہ وقت سلطان محمد شاہ (رنگیلا) نے یہ کیفیت دیکھ کر شاہ صاحب کو بلایا اور شہر میں ایک عالیشان حویلی دیدی۔ آپ نے یہاں دارالحدیث کا افتتاح فرمایا اور پرانی جگہ غیر آباد ہوگئی۔ یہ نیا مدرسہ بڑا

عالیشان اور خوبصورت تھا۔ اور اب یہ ایک بڑا دارالعلوم سمجھا جانے لگا۔ آپ نے بڑی دلجمعی سے یہاں درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ دور دور سے طلبا آ کر یہاں درس قرآن وحدیث میں شریک ہوئے اور کسب فیض کیا۔ یہ مدرسہ عرصہ تک قائم رہا اور آپ کے بعد آپ کے چاروں صاحبزادوں نے یہی مشغلہ درس وتدریس یہاں جاری رکھا اور ان کے بعد دیگر اہل علم حضرات نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔ یہ سلسلہ کئی پشت تک اس خاندان میں چلتا رہا۔ بالآخر غدر ۱۲۸۴ھ۔ ۱۸۵۷ء میں یہ مدرسہ تباہ ہوا، لوگ وہاں کے کڑی تختے اتار کر لے گئے اور صرف مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ کا ہی نام رہ گیا۔

حرمین شریفین سے واپسی کے بعد اس تعلیم وتدریس کے زمانہ میں آپ نے اپنے اوقات عزیز کو تین اہم مشاغل میں صرف کرنے کے لئے مخصوص کرلیا تھا (۱) صبح کی عبادات واذکار وظائف وغیرہ سے فارغ ہوکر دوپہر تک حدیث کا درس دیتے۔ (۲) علم حدیث کے اسرار ورموز اور علوم نبوت کے حقائق ومعارف کے علاوہ دین کے دقائق وحقائق اور معرفت وتصوف کے اسرار وغوامض پر بھی تقریر فرما کر سامعین کو مستفیض فرماتے (۳) تیسرا نہایت اہم مشغلہ آپ کا یہ تھا کہ جو وقت ان دونوں مشاغل سے بچتا، اس کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونے دیتے بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ اس کے بعد آپ نے ہر فن کے لئے ایک شخص تیار کرلیا تھا جس فن کا جو طالب ہوتا اس کو اسی فن کے استاد کے سپرد فرما دیتے۔ یہ معلم حضرات آپ ہی کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے۔ اب مدرسہ ان ہی کے سپرد تھا، خود آپ حدیث کے معارف بیان کرتے اور لکھنے کا کام کرتے، آپ کی مصروفیت اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں ''آپ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجلاتے اور نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے''۔

آپ کا طریقۂ تعلیم:۔

اس زمانہ کی تعلیمی حالت پر تبصرہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ طریقہ کس قدر نکما اور بے سود تھا۔ شاہ صاحب نے اس طریقہ کو بالکل ترک کردیا اور وہی طریقہ تعلیم جاری فرمایا جس کی بنیاد آپ کے والد ماجد ڈال گئے تھے۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ پہلے آپ صرف ونحو کے مختصر تین چار چار رسائل حسب استعداد طالب علم کو حفظ کرادیتے، اس کے بعد حکمت یا تاریخ

کی کوئی عربی کتاب پڑھا دی جاتی اس طرح اس کے علم لغت میں اضافہ ہو جاتا، عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جانے کے بعد موطا امام مالک کا درس دیا جاتا، قرآن مجید کا ترجمہ بغیر تفسیر کے پڑھایا جاتا، البتہ جہاں کہیں شان نزول یا قاعدۂ نحویہ کی کوئی مشکل اسے پیش آتی تو اس کو اچھی طرح حل کر کے آگے درس دیا جاتا۔ اس کے بعد تفسیر جلالین بقدر نصاب پڑھائی جاتی۔ اس سے فراغت کے بعد ایک وقت کتب حدیث مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم وغیرہ اور کتب فقہ عقائد و سلوک وغیرہ اور دوسرے وقت کتب حکمت پڑھائی جاتیں، مثلاً شرح ملا، قطبی وغیرہ۔ یہ طریقہ بڑا مفید اور کامیاب رہا، اس سے طلبا کا ذہنی جمود اور قوائے غور و فکر کا تعطل دور ہو گیا۔ اب وہ اندھے مقلد ہونے کے بجائے محقق اور صحیح معنوں میں ''فقیہ محدث'' بن گئے اور ان میں یہ ملکہ پیدا ہو گیا کہ آیات و احادیث میں غور و تدبر کر کے اس کے مطالب سمجھ سکیں۔

ترجمۂ قرآن مجید اور فتنہ علمائے سو:-

شاہ صاحب کے زمانے میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قرآن مجید کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا، اس کو عمدہ ریشمی جزدانوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا تاکہ بوقت ضرورت فال لینے یا حلف اٹھانے کے کام آئے۔ عملی زندگی میں اس سے کوئی استفادہ نہ کیا جاتا تھا، مراجعت حرمین کے بعد آپ نے یہ صورت حال دیکھ کر ان کی اصلاح کی خاطر قرآن مجید کا وہاں کی مروجہ زبان فارسی میں ترجمہ کرنا شروع کیا، سلسلۂ درس و ارشاد کے ساتھ اس ترجمہ آغاز ۱۱۵۰ھ - ۱۷۳۷ء میں ہوا اور ۱۱۵۱ھ - ۱۷۳۸ء میں اس کی تکمیل ہوئی، پھر ۱۱۵۶ھ - ۱۷۴۳ء میں اس کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔

شاہ ولی اللہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ساڑھے گیارہ سو برس کے بعد سرزمین ہندوستان میں قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور اسی کے بعد ترجمۂ قرآن کی بنیاد پڑی، آپ ہی کے تتبع میں آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ رفیع الدین نے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ اردو میں کیا اور دوسرے فرزند حضرت شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ اردو ترجمہ کیا۔ الغرض اس ترجمہ کا باب سب سے پہلے آپ ہی نے کھولا اور اگر غور کیا جائے تو یہ امت مسلمہ پر آپ کا بہت بڑا احسان ہے، ورنہ کچھ عجب نہیں کہ ہم ترجمۃ القرآن سے اب تک محروم رہتے، لیکن اس زمانے کے علمائے سو بجائے

آپ کے ممنون احسان ہونے اور ہمت افزائی کرنے کے آپ کے مخالف بن گئے اور عوام میں آپ کے خلاف شورش برپا کر دی کہ "اس طرح یہ شخص لوگوں میں گمراہی پھیلانا چاہتا ہے۔ قرآن کا ترجمہ پڑھ کر لوگ بھٹک جائیں گے اس نے دین اسلام میں ایک زبردست بدعت کی بنا ڈالی ہے۔ سلف صالحین نے کبھی ایسا نہیں کیا، ایسا مجرم اور بدعت سیئہ کا مرتکب واجب القتل ہے وغیرہ وغیرہ"۔ مخالفین نے آپ کے اس فعل حسن کو محض اپنے عناد اور دشمنی کی بنا پر عجب رنگ چڑھایا، بہت سے لوگوں کو آپ کے خلاف ورغلایا اور تمام شہر میں اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ عصر کے وقت جب شاہ صاحب مسجد فتح پوری سے نکل رہے تھے تو ان معاندین نے چند غنڈوں کو ہمراہ لے کر آپ کو گھیر لیا لیکن آپ کسی طرح بچ کر نکل گئے۔ اس کے بعد یہ مخالفت آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑتی گئی اور آج یہ کیفیت ہے کہ ہم اسی کارنمایاں پر آپ کی ہدیۂ تحسین پیش کر رہے ہیں، اور ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ نے صرف یہی خدمت انجام دی ہوتی تو یہ آپ کا نام زندہ رکھنے کے لئے بہت کافی تھی۔

آپ کے اصلاحی کارنامے:۔

ابھی ہم آپ کے دو شاندار کارناموں کا ذکر کر چکے ہیں، ایک تو اس زمانہ کے طریقۂ تعلیم کو بدلنا اور نئے اسلوب پر درس دینا، اور دوسرے قرآن وحدیث کے تراجم مروجہ زبان میں کرنا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ دونوں کام قوم کی اصلاح کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ہی کے ذریعہ ایک قوم کے انداز فکر اور زاویۂ نگاہ کو بدلا جا سکتا ہے، خصوصاً ترجمہ قرآن کی بنیاد ڈالا جانا ہم لوگوں کے حق میں آپ کی سب سے بڑی خدمت اسلام ہے۔ اس کے علاوہ جو خدمات جلیلہ آپ نے انجام دیں ان کا مختصر حال حسب ذیل ہے:

آپ نے متعصب فرقہ پرستوں اور مختلف مکتب خیال کے لوگوں کو ایک نقطۂ عدل پر لا کر ان میں ہم آہنگی اور اتفاق پیدا کرنے کی کوشش فرمائی، اس زمانہ میں افتراق وتشتت اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا، ہر فرقہ دوسرے کو کافر وزندیق گردانتا تھا، کٹر حنفیوں اور متشدد اہل حدیث کے درمیان مدتوں سے جھگڑا چلا آتا تھا ادھر سنی وغالی شیعہ باہم دست بگریباں تھے۔ دوسرے فرقے بھی باہمی چپقلش اور جنگ وجدل سے باز نہ رہتے تھے۔ تفرق وتحزب کی ایک ملک گیر وبا پھیلی ہوئی تھی۔

ان حالات میں آپ نے تحریر وتقریر دونوں طریقوں سے اس کے خلاف کوشش کی، ہر ایک کی افراط وتفریط اور لغزش نمایاں فرمائی۔ اور ان موضوعات پر مختلف کتابیں اور رسالے تصنیف کئے جن سے ہر شخص راہ صواب کا پتہ چلا سکتا ہے۔ امت کی سالمیت اور اس کے اتحاد کو برقرار رکھنے میں یہ آپ کا جلیل القدر کارنامہ ہے۔

اس زمانہ کا دوسرا فتنہ معقولین کی خرابی ہے۔ ان لوگوں کے دماغ یونانی فلسفہ اور عجمی افکار باطلہ سے اس درجہ ماؤف ہو گئے تھے کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے علم کی طرف توجہ دینا تو درکنار اس کو ذرا بھی وقعت نہ دیتے تھے۔ ان کی ساری عمر منطق، علوم عقلیہ اور الٰہیات کی لایعنی بحثوں میں گزر جاتی، تمام وقت وہ لفظی موشگافیوں، بے معنی خرافات اور فرسودہ فلسفہ یونان کی تحصیل میں گزار دیتے جو عملی دنیا میں کسی کام کا نہ تھا۔ آپ نے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک طرف تو انہیں ان لفظی گورکھ دھندوں اور بے فیض علوم میں تضیع اوقات سے روکا اور دوسری طرف ایک ایسا نیا فلسفہ پیش کیا جو بجا طور پر فلسفۂ اسلام کہلایا جا سکتا ہے اور جس کا انسان کی عملی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ قرآن مجید واحادیث نبوی کے نصوص وکلیات کے مطابق ایک صحیح فلسفۂ اسلام مدون کرنے کی کامیاب کوشش اب تک صرف آپ ہی نے فرمائی ہے اور یہ آپ کا نہایت قابل قدر کارنامہ ہے۔

ایک اور وبا جو آپ کے وقت میں ملک پر تسلط تھی وہ عجمی تصوف اور اس کی بے سروپا خرافات ہیں۔ اس زمانہ میں متقشف صوفیہ اور گمراہ مشائخ نے اپنے من گھڑت اصول، اجنبی افکار اور مختلف خرافات واباطیل کو ''تصوف'' کا نام دے کر ملک میں رائج کر رکھا تھا۔ آپ نے بزور قلم ان کے طلسم وافسوں کی دھجیاں بکھیر دیں اور ان کے مزعومات باطلہ کی تردید کر کے کتاب وسنت کی روشنی میں ''احسان'' کی واضح اور روشن راہ لوگوں کے سامنے پیش کی اور وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا۔

ایک اور خطرہ جو اس زمانہ میں لاحق تھا وہ فرنگی اقتدار اور مغربی خیالات کی اشاعت کے باعث اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ اگرچہ بعینہ اسی قسم کا دور ارتیاب اس سے قبل بھی آ چکا تھا اور اس زمانہ کے علمائے کرام نے پوری قوت سے مقابلہ کر کے اس کا سد باب کر دیا تھا لیکن اب یہ فتنہ اس سے خطرناک شکل میں آنے والا تھا۔ شاہ صاحب نے اس خطرہ کو

بھانپ کر اس کے تدارک و مدافعت کے لئے مکمل دلائل و براہین کا ایک بے بہا ذخیرہ فراہم کر دیا تا کہ آئندہ نسلیں ان سے مرعوب ہو کر صحیح راہ نہ چھوڑ دیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ کے زمانہ میں حدیث و قرآن کا ذوق بالکل فنا ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ فقہائے متاخرین کے فتاوے اور تفریعات نے لے لی تھی، ہر طرف انہی کا شور و غلغلہ تھا۔ کتاب و سنت کی طرف کسی کی نظر نہ تھی۔ کتاب و سنت سے تمسک کے بارے میں مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تحریصات و ترغیبات کا اثر بالکل زائل ہو چکا تھا۔ اور وہی فضا پیدا ہو گئی تھی جس سے ان دو بزرگوں کو مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ شاہ صاحب نے یہ صورت حال دیکھ کر ان کتب کی ''پوجا'' ختم کرائی اور علم کے اصل منبع قرآن و حدیث کی طرف توجہ دلائی اور روح اجتہاد کو زندہ کیا۔ آپ ہی کی انتھک کوشش اور مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج کل ہم اس ملک میں علوم قرآن و حدیث کا چرچا دیکھتے ہیں۔ اسی بارے میں مصر کے مشہور علامہ رشید رضا مقدمہ مفتاح کنوز السنہ میں فرماتے ہیں ''اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علما کی توجہ اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اور فنا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

اس زمانہ کے نواب و سلاطین اور عوام کی دینی و اخلاقی حالت کا بیان پیچھے گزر چکا ہے، آپ نے ان کو اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے معاشرہ کے ہر طبقہ اور ہر گروہ سے مخاطب ہو کر اس کی خامیوں سے مطلع کیا اور اس کے انجام سے ڈرا کر صحیح راستے پر لانے کی نہایت واضح الفاظ میں تلقین کی۔ ان کے تمام عیوب گنا کر ان کا علاج تجویز کیا اور اس ڈھنگ سے تنبیہ فرمائی کہ اگر کوئی زندہ دل اور حوصلہ مند قوم ہوتی تو یک لخت اپنی غلط راہ و روش سے باز آ جاتی۔ آپ کی گراں قدر تصنیف ''تفہیمات'' میں اس قسم کے مسلسل الارم موجود ہیں جو اس زمانہ کی صورت حال کا ایک زندہ مرقع بھی ہیں۔ اور آپ کے مخلصانہ جذبات و عزائم کا ثبوت بھی۔

آپ کی جدوجہد کے نتائج:۔

آپ کے کارنامے تمام تر تحریری و قولی ہیں۔ اس وقت کے حالات کے پیش نظر آپ میدان عمل میں نہ اترے اور نہ جہاد کیا، لیکن محض قلم کے ذریعہ آپ نے وہ خدمت انجام دی جو رہتی دنیا تک یادر ہے گی۔ تعلیمات اسلام میں جو خرافات اور بے سروپا باتیں شامل کر دی گئی تھیں آپ نے

ان کو الگ کیا اور دین کو ایک منظم ومرتب نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا، معاندین کے اعتراضات کا کماحقہ رد کیا اور مشتبہ مقامات کی صراحت فرمائی، عقل ونقل دونوں اعتبار سے دین اسلام کو مطابق فطرت ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کتاب وسنت کے احکام عوام تک پہنچانے کا انتظام بذریعہ ترجمہ فرمایا۔ دین کے ہر شعبہ کو باطل کی آمیزش سے پاک کیا اور اس کی اصل صورت لوگوں کے سامنے پیش کی۔

دراصل شاہ صاحب کا جہاد شمشیر سے گریز کسی بزدلی یا کاہلی کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس زمانہ کے حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ معاشرہ اپنے انحطاط کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ جہاد کے لئے معتمد وتربیت یافتہ کارکنوں اور ہمراہیوں کا ہونا از بس ضروری ہے اور ایسے حالات کا ہونا لازم ہے۔ جس میں جہاد بجائے اصلاح ودرستی کے ایک وجہ فساد نہ بن جائے، اگرچہ ہمیں یہ علم نہیں کہ کن وجوہات کی بنا پر آپ نے جہاد سے گریز فرمایا اور کیا حالات تھے جو آپ کو اس اقدام سے مانع رہے لیکن آپ کی سیرت کے مطالعہ اور تحریر وتقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی کوئی ایسی ہی صورت حال ہوگی جو آپ شمشیر زنی اور قتل وقتال سے باز رہے۔ چنانچہ آپ خود ''تفہیمات الٰہیہ'' میں فرماتے ہیں۔

''اگر بالفرض یہ شخص (یعنی خود شاہ صاحب) ایسے زمانے میں پیدا ہوتا کہ اسباب کا اقتضا یہی ہوتا کہ لوگوں کو جنگ وقتال سے درست کیا جائے اور اس کے دل میں ڈالا جاتا کہ تلوار ہی سے دنیا کے نظام کو درست کرے تو یہ شخص پھر یہی کرتا اور الحمد للہ بڑی خوبی سے اس کام کو انجام دیتا اور دنیا دیکھ لیتی کہ رستم واسفندیار بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں بلکہ وہ اس کے طفیل اور شاگرد بننے کے لائق ہیں''۔

یہی وجہ تھی کہ آپ نے حالات کو جہاد کے ناموافق پا کر اس معاشرہ کے ذہین ومفکر لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو اپنی تعلیمات وارشادات سے بہرہ اندوز کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ کسی آئندہ زمانہ میں ان کے مشن کے مطابق ایک انقلاب برپا کر سکیں۔ ان ذی عقل اور صاحب فہم تلامذہ نے آپ سے پورا استفادہ کیا اور کچھ عرصہ بعد آپ ہی کی نسل سے شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید اٹھے اور شرک وبدعت مٹانے کی خاطر علم جہاد بلند کیا۔

آپ کے کارنامے وقتی نہیں بلکہ ایک مستقل افادی حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کی تصانیف سے خاص و عام اب تک استفادہ کرتے آرہے ہیں، ملک کی دینی و علمی حالت کا سدھار بہت حد تک آپ ہی کا مرہون منت ہے۔ اگر آپ نے اس وقت علم کی شمع روشن نہ کی ہوتی تو نہ معلوم اس وقت جہالت وظلمت کی کیا کیفیت ہوتی۔ آپ ہی کی نکالی ہوئی نہریں اور روشن کئے ہوئے چراغ ہیں جن سے ہم اب تک مستفید ہو رہے ہیں۔

مقام و منصب :-

آپ کی منزلت علمی کے بارے میں کچھ لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے آپ اسلام کے ان جلیل القدر علما میں سے ہیں جن کی شہرت وعظمت زمان ومکان کے حدود سے آگے بڑھ چکی ہے۔ آپ کا شمار عبقریین ونوابغ میں ہوتا ہے۔ آپ جیسی عالی پایہ شخصیتیں اور یگانۂ روزگار ہستیاں بہت کم وجود میں آتی ہیں۔ آپ بقول خود زوال وانحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں اور اس کو آپ تخریج بر تخریج وتفریع بر تفریع کا دور فرماتے ہیں۔ اس زمانہ کی کچھ کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے اس دور ظلمت وجہالت میں ایسی وسیع النظر، دقیقہ رس اور ژرف نگاہ ہستی کا جنم لینا بجائے خود ایک قابل حیرت امر ہے۔ آپ نے اپنے ماحول سے کوئی اثر نہیں لیا۔ آپ کی ذہنی سطح اور آپ کے علوم و معارف اپنے ہم عصر علما کی سطح سے بہت بلند ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں "اتحاف النبلا" میں صحیح فرماتے ہیں۔ "اگر وجوداو در صدر اول در زمانہ ماضی می بود، امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ می شد" یعنی "اگر آپ کا وجود گزشتہ زمانہ میں صدر اول میں ہوتا تو تمام مجتہدین کے پیشوا اور مقتدا مانے جاتے بلکہ ان کے سرتاج بنائے جاتے اور امام الائمہ کا گرانقدر خطاب پاتے۔

آپ کے علمی وذہنی کمالات واقعی اسی تعریف وتوصیف کے لائق ہیں۔ اور آج بھی امت مسلمہ آپ کو "حکیم الامت" اور "مجدد ملت" کے القاب سے یاد کرتی ہے، آپ کے خارق عادات علمی کارناموں اور غیر معمولی ذہانت ودینی خدمات جلیلہ کو دیکھ کر آپ کے ہم عصر علماء وفضلا نے بھی بڑی قدر ومنزلت سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ مرزا محمد مظہر جان جاناں فرماتے ہیں۔ "حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمہ اللہ طریقۂ جدیدہ بیان نمودہ اند۔ در تحقیق اسرار معارف وغوامض علوم طرز خاص دارند، بایں ہمہ علوم وکمالات، از علماء ربانی اند۔ مثل ایشان در محققان صوفیہ کہ جامع اند در علم ظاہر

وباطن وعلم نو بیان کردہ اند، چند کس گزشتہ باشند"۔ آپ کے ایک اور معاصر مولانا فخر الدین فخر جہاں دہلوی اپنے رسالہ "فخر الحسن" میں آپ کو اس طرح یاد کرتے ہیں۔ شیخ صاحب المقامات العالیہ والکرامات الجلیلہ الشیخ ولی اللہ المحدث سلمہ اللہ تعالیٰ وابقاہ"۔

مولانا شاہ محمد عاشق پھلتی جو آپ کے خاص عقیدتمندوں میں سے تھے مقدمہ "خیر کثیر" میں آپ کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"ودریں زمان بایں مقام اسنی ذات، مجمع آیات، مطلع فیض وانوار، منبع علوم واسرار، مخزن کنوز کمالات وراثت محمدیہ، معدن نقود رموز وصایت احمدیہ، مجدد قواعد شریعت، مقنن قوانین طریقت، مبین غوامض معرفت، محقق دقائق حقیقت، اعظم المحدثین، ولی العصر، لسان اللہ، قطب الدین احمد، ابوالفیاض شیخ ولی اللہ است مداللہ ظلال ارضاہ علی العالمین الی یوم الدین، کما ھو ثابت عند اہل المعرفۃ والیقین۔

اس کے علاوہ صاحب "سیر الاخیار" نے بھی آپ کا تذکرہ لکھا ہے اور اس میں آپ کے یکتائے روزگار اور مجتہد عصر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

علاوہ ازیں امیر شاہ خان کی زبانی مولانا محمد قاسم نانوتوی (بانی دارالعلوم دیوبند) کا ایک واقعہ منقول ہے جس سے شاہ صاحب کی ہند کے علاوہ دیگر اقطار عرب وعجم میں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ "مولانا نانوتوی کا جہاز دوران سفر حج میں یمن کی کسی بندرگاہ پر رک گیا۔ مولانا کو کسی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس شہر میں کوئی معمر بزرگ بھی رہتے ہیں۔ جب ملاقات کی تو ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ سند اجازت عطا ہو۔ اس پر محدث صاحب نے پوچھا تو کس کے شاگرد ہو؟ انھوں نے اپنا سلسلۂ تلمذ شاہ عبدالعزیز صاحب (شاگرد فرزند شاہ ولی اللہ) تک بیان کیا تو وہ بزرگ بولے "ہاں میں ان کو جانتا ہوں۔ میرے نزدیک شاہ ولی اللہ گویا شجر طوبیٰ ہیں، جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں۔ وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں وہاں جنت نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں وہاں جنت نہیں"۔

یہ تو آپ کے حلقہ بگوشوں اور عقیدتمندوں کا اظہار خیال تھا۔ ان کے علاوہ مولانا فضل حق

خیرآبادی نے بھی آپ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بجائے عقیدت و نیاز کے اپنے آپ کو علم کے اس سلسلہ اور خانوادہ کا حریف مقابل سمجھا کرتے تھے، چنانچہ ان کے شاگرد رشید مولانا محسن بہاری اپنی کتاب ''الیانع الجنی'' میں خود اپنی سنی ہوئی شہادت بیان کرتے ہیں جبکہ وہ الور میں مولانا سے درس لیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

''مولانا فضل حق کے ہاتھ ''ازالۃ الخفا'' کا ایک نسخہ کہیں سے لگا۔ مولانا اس کے مطالعہ کے بڑے خواہشمند تھے، جب بھی درس و تدریس یا دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی تو بکثرت اسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ جب مولانا اس کتاب کا بیشتر حصہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو آپ نے سب کے سامنے جن میں میں بھی شریک تھا یہ فرمایا کہ جس شخص نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ تو ایک بحر بیکراں ہے، جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا''۔

خودفہمی:۔

اپنی عظمت و منصب کا آپ کو خود بھی احساس تھا اور اسی احساس نے آپ کے جذبۂ خود اعتمادی اور بے نیازی کو بڑھا دیا تھا۔ اسی احساس کے تحت آپ نے جو فرمایا نہایت ذمہ داری اور یقین سے فرمایا۔ اپنی عظمت کا اظہار بطور ''تحدیث نعمت'' آپ نے متعدد جگہ فرمایا ہے جن میں سے چند اقتباسات بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) ''اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس دور آخر کا ''ناطق'' اور ''حکیم'' اور ''قائد وزعیم'' بنا دیا (اور یہ میں فخراً نہیں کہتا)'' (تفہیمات)

(۲) ''میرے ذہن میں ڈالا گیا ہے کہ میں لوگوں تک یہ حقیقت پہنچا دوں کہ ''یہ زمانہ تیرا زمانہ ہے اور یہ وقت تیرا وقت ہے۔ افسوس اس پر جو تیرے جھنڈے کے نیچے نہ ہو''۔ (تفہیمات)

(۳) ''مجھ کو رب نے یہ سمجھایا کہ ہم نے تم کو اس طریقہ کا امام بنا دیا اور حقیقت قرب تک پہنچنے کے تمام راستوں کو بند کر کے صرف ایک راستہ کھلا رکھا ہے اور وہ تمہاری محبت اور اطاعت کا راستہ ہے، جو شخص تمہارا دشمن ہے۔ اس کے لئے آسمان آسمان نہیں اور زمین زمین نہیں۔ پس تمام اہل مشرق و مغرب تمہاری رعیت ہیں۔ اور تم ان کے بادشاہ۔ اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ جانتے ہیں یا نہیں۔ اگر جانتے ہیں تو کامیاب ہوں گے ورنہ نقصان اٹھائیں گے''۔ (تفہیمات)

(۴) ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ''قائم الزماں'' یعنی اللہ تعالیٰ جب خیر کے کسی نظام کا ارادہ فرماتا ہے تو اپنے اس ارادہ کی تکمیل کے لئے وہ مجھے اوزار یا آلۂ کار کی طرح بنالیتا ہے''(فیوض الحرمین)

(۵) ''خداوند تعالیٰ نے ایک وقت میں میرے قلب میں ''میزان'' پیدا کردی جس کی وجہ سے میں ہر اس اختلاف کا سبب پہچان لیتا ہوں جو امت محمدیہ میں واقع ہوا، اور اس کو بھی پہچان لیتا ہوں جو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک حق ہے اور خدا نے مجھ کو یہ بھی قدرت دی ہے کہ امر حق کو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے اس طرح ثابت کردوں کہ اس میں کسی قسم کا شبہ اور اشکال باقی نہ رہے''۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

ایک جگہ اپنے جلائل اعمال کا بالتفصیل تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔

(۶) ''حق تعالیٰ کا عظیم ترین انعام اس ضعیف بندہ پر یہ ہے کہ اس کو ''خلعت فاتحیہ'' بخشا گیا ہے اور اس آخری دور کا افتتاح اس سے کرایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو ''مرضی'' (پسندیہ نظریات) میں ان کو جمع کردوں اور اس کے لئے فقہ حدیث کی از سرنو بنیاد رکھ کر اس فن کی پوری عمارت تیار کی گئی اور آنحضرت صلعم کے تمام احکام وترغیبات اور ان تعلیمات کے اسرار ومصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے اس کا کام عشر عشیر بھی نہیں کیا گیا تھا۔ نیز سلوک کا وہ طریقہ جو حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ اور جو اس دور میں کامیاب ہوسکتا ہے مجھے اس کا الہام فرمایا گیا اور میں نے اس طریق کو اپنے دو رسالوں ''ہمعات'' اور ''الطاف القدس'' میں قلمبند کردیا ہے۔ ایک کام مجھ سے یہ لیا گیا کہ متقدمین اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل وبراہین سے ثابت کیا اور معقولیوں کے شکوک وشبہات کے خس وخاشاک سے ان کو قطعی پاک کردیا اور ان کی تقریر بحمد اللہ ایسی کی جس کے بعد کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں کمالات اربعہ ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعدادات کا علم مجھے عطا فرمایا گیا اور یہ دونوں ایسے علم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے ان کے کوچہ میں قدم بھی نہیں رکھا۔ اور حکمت عملی مجھے بھرپور دی گئی (یعنی تدبیر معاشیات کے اصول اور سیاست مدن کے ضوابط وغیرہ) اور کتاب وسنت وآثار صحابہ سے اس کی تطبیق وتفصیل کی توفیق بھی

نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا جس کے ذریعہ میں یہ تمیز کر سکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت رسول اللہ صلعم کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے اور وہ کون کون سی باتیں ہیں بعد میں جو اس میں ٹھونسی گئی ہیں یا جو کسی بدعت پسند فرقہ کی تحریف کا نتیجہ ہیں۔ اگر میرے بدن کا رواں زبان بن جائے اور ہر وقت حمد الٰہی میں مصروف رہے تو بھی حق تعالیٰ کی حمد کا جو حق مجھ پر ہے وہ ادا نہیں ہو سکتا۔ والحمد للہ رب العالمین'' (الجزء اللطیف)

(۷) جب میرا دورۂ حکمت یعنی علم اسرار دین پورا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خلعت مجددیت پہنائی۔ پس میں نے مسائل اختلافی میں جمع (وتطبیق) کو معلوم کرلیا۔ (تفہیمات)

یہ اور اس قسم کے بیسیوں اقوال آپ کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ خصوصاً ''تفہیمات'' میں یہ اشارات بکثرت ہیں، لیکن یہ تصریحات بطور تعلّی اور خودستائی کے نہیں اور نہ فخر وغرور کی بنا پر ہیں بلکہ جیسا کہ بعض مقامات پر خود اشارہ کر دیا ہے بطور ''تحدیث نعمت'' اور تحمید الٰہی کے ہیں اور ان کے بیان کا خاص مقصد ہے۔ یہ دعوے ظاہر نظر میں اگرچہ بہت بلند بانگ اور حیران کن نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کے غیر معمولی کارناموں اور شاندار علمی خدمات کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو گھٹنے ٹیک دینے پڑتے ہیں اور ان کو تسلیم کئے بغیر چارہ نظر نہیں آتا۔

وفات:۔

آپ کی آخری عمر میں دہلی پر ایک متعصب شیعہ نجف علی خاں کا تسلط ہو گیا تھا۔ یہ مغل دربار کا آخری امیر تھا، اس نے بہت سے علما کو دردناک سزائیں دیں۔ امیر شاہ خاں ''امیر الروایات'' میں بیان فرماتے ہیں کہ ''اس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتر اکر ہاتھ بیکار کر دیے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون تحریر نہ کر سکیں'' (۱) جب آپ کی عمر اکسٹھ سال سے کچھ زائد ہوئی تو مرض الموت نے آلیا اور چند روز کی خفیف سی علالت کے بعد آسمان علم کا یہ آفتاب جہاں تاب ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۳ء کو بوقت ظہر افق دہلی میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا اور اپنے پیچھے بے شمار کواکب و نجوم کو دمکتا چھوڑ گیا جو اس کی مستعار روشنی سے اب تک منور ہیں۔ مصرعۂ تاریخ وفات ہے ''او بود امام اعظم دیں''۔

(۱) یہ روایت ضعیف ہے۔ (قاسمی)

اولاد:-

شاہ صاحب نے اپنے پیچھے چار بیٹے یادگار چھوڑے۔شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی۔ پھر شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے تو کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔لیکن شاہ رفیع الدین کے چار بیٹے ہوئے محمد موسیٰ، محمد عیسیٰ، محمد مخصوص اللہ اور حسن جان اور شاہ عبدالغنی کو اللہ تعالیٰ نے شاہ محمد اسمٰعیل جیسا ہونہار اور لائق فخر فرزند عطا فرمایا۔ان میں سے ہر ایک آسمان علم وفضل کا روشن ستارہ اور درخشاں مہتاب تھا۔نواب صدیق حسن خاں قنوجی اس خاندان کی تعریف ''اتحاف النبلا'' میں کیا خوب فرماتے ہیں۔

''ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت وفرید دہر و وحید عصر در علم وعمل وعقل وفہم وقوت تقریر وفصاحت تحریر وتقویٰ ودیانت وامانت ومراتب ولایت بود، وہم چنیں اولاد اولاد ایں سلسلہ از طلائے ناب است''۔

تلامذہ:-

شاہ صاحب کی بیشتر عمر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزری، آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، ملک کے اطراف واکناف سے صدہا طالب علم آتے اور آپ سے مستفید ہوتے، حرمین شریفین سے بھی بامذاق عالم آپ سے علم سیکھنے آتے، اس طرح آپ کے تلامذہ کی بسیط فہرست ملنا مشکل ہے لیکن چند ممتاز شاگردوں میں آپ کے چاروں صاحبزادوں کے علاوہ شاہ محمد عاشق پھلتی، شاہ نور اللہ بڈھانوی، جمال الدین شاہ محمد امین کشمیری اور شاہ ابوسعید کے نام آتے ہیں جو آپ کے خاص رفقا بھی رہے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ عصر حاضر کے تمام علمائے ہند آپ ہی کے معنوی شاگرد ہیں تو کسی طرح بیجا نہ ہوگا۔

مسلک:-

شاہ صاحب کا مسلک علما کے درمیان عرصہ سے متنازعہ فیہ موضوع رہا ہے۔بعض آپ کو حنفی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں بعض اہل حدیث، بعض حضرات مقلد بتاتے ہیں تو بعض غیر مقلد بیان کرتے ہیں۔الغرض ہر گروہ آپ کو اپنے زمرہ اور فرقہ میں شمار کرنے کی سعی کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود آپ کو اس تفرق وتحزب سے سخت نفرت تھی اور آپ تمام عمر اسی لعنت کو مٹانے

کی کوشش فرماتے رہے لیکن تعجب ہے کہ لوگوں نے آپ ہی کی شخصیت کو اس بحث کا موضوع قرار دے دیا۔

دراصل آپ کا طریقہ یہ تھا کہ کسی مسئلہ کو مقلدانہ نظر سے نہ دیکھتے بلکہ کتاب وسنت پر پیش کرتے اور پھر فقہ حنفیہ کے علاوہ دیگر مذاہب میں بھی اس کی تحقیق کرتے، جب ہر طرح اسے ٹھیک پاتے تو قبول فرما لیتے ورنہ متروک قرار دیتے گویا آپ ہر معاملہ پر ایک محقق کی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے۔ کسی خاص مذہب کی جانب داری اور دیگر مذاہب سے عناد آپ کا طریقہ نہ تھا۔ جس مذہب کی کسی مسئلہ میں تائید فرماتے تو دلائل کی بنا پر اور مخالفت بھی بر بنائے دلیل۔ اس تائید و مخالفت میں کوئی عصبیت اور جانبداری کارفرما نہ ہوتی۔ بہت سے مسائل ہیں جن میں آپ نے مسلک حنفی کی پیروی اختیار کی ہے اور بعض امور ایسے ہیں جن میں دیگر مذاہب کو ترجیح دی ہے اور انہی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ بعض مقامات پر آپ نے دونوں مذاہب میں جمع کیا ہے لیکن جہاں یہ بات ناممکن نظر آئی وہاں جس کو اقرب الی السنہ اور صحیح تر پایا اسے ہی اختیار کیا اپنے مسلک کی توضیح کرتے ہوئے آپ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

''میں مذاہب اربعہ مشہورہ میں بقدر امکان جمع کرتا ہوں اور صوم وصلوٰۃ وضوء غسل وحج کے مسائل اس وضع پر واقع ہیں جسے تمام اہل مذاہب جانتے ہیں۔ جب جمع وتطبیق غیر ممکن ہو جاتی ہے تو میں اس مذہب پر عمل کرتا ہوں جو دلیل کی رو سے زیادہ قوی اور حدیث کی رو سے صحیح ہے۔ کیونکہ خدائے قدوس نے مجھے اس قدر علم عطا فرمایا ہے کہ میں ضعیف وقوی میں اچھی طرح فرق کر سکتا ہوں اور فتویٰ دیتے وقت مستفتی کے حال کی بخوبی رعایت کر سکتا ہوں۔ ہر مقلد مذہب کو اس کے مسلک کے مطابق جواب دیتا ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے مذاہب مشہورہ کی معرفت عنایت فرمائی ہے''

ایک اور جگہ وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فروعی مسائل میں ان علما محدثین کا اتباع کرنا چاہئے جو فقہ وحدیث کے جامع ہوں۔ تفریعات فقہیہ کو ہمیشہ کتاب وسنت سے منطبق کرتے رہنا چاہئے۔ جو مسائل تفریعی کتاب وسنت کے موافق ہوں قبول کئے جائیں جو خلاف ہوں ان کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ امت محمدی کے واسطے اجتہادی مسائل کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھنا نہایت ضروری ہے، کسی حال میں اس سے

مغز نہیں، ایسے خشک دماغ فقہا کی بات کبھی نہ سننی چاہیئے۔ جو کسی ایک عالم کی تقلید کو اپنی دستاویز سمجھ لے اور سنت رسول کو ترک کردے۔ اس قسم کے کوڑھ مغز فقہا کی طرف کبھی بھی التفات نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ خدا کی خوشنودی اور قرب ان لوگوں سے دور رہنے میں ہے"۔

انفاس العارفین میں تحریر فرماتے ہیں: "مخفی نہ رہے کہ میں بیشتر امور میں مذہب حنفی کے مطابق عمل کرتا ہوں لیکن بعض امور کو حدیث اور وجدان (حکمت وعقل) کے ذریعہ پرکھ کر دیگر مذاہب کے مطابق سرانجام دیتا ہوں۔ مثلاً قرأۃ فاتحہ خلف الامام اور قرأۃ فاتحہ درنماز جنازہ وغیرہ"

عادات وخصائل:-

شاہ صاحب نہایت سادہ طبیعت اور منکسر المزاج تھے۔ ہر شخص سے خواہ وہ کسی درجہ رتبہ یا مذہب کا ہو نہایت خندہ پیشانی سے ملتے۔ خلوت وجلوت میں کبھی کسی کی برائی بیان نہ کرتے اور دشمن کے حق میں بھی سوائے کلمہ خیر کے کچھ نہ کہتے۔ مزاج میں نرمی اور نفاست تھی۔ لیکن ریا ونمود اور ظاہری نمائش وشان وشوکت سے پرہیز فرماتے تھے۔ بازار میں نکلتے تو ہم عصر پیروں اور مشائخ کے برخلاف بالکل معمولی حیثیت سے مریدین کا کوئی بڑا ہجوم ساتھ نہ ہوتا۔ نہایت بلند ہمت، فراخ حوصلہ اور جفاکش تھے۔ بہادری اور شجاعت میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ مسجد فتح پوری کا واقعہ اور جہاد بالسیف کے متعلق آپ کا قول پہلے گزر چکا ہے اسی سے آپ کی دلیری اور مردانگی کا ثبوت ملتا ہے۔ مشکلات ومصائب کے مواقع پر نہایت صبر وسکون سے قائم رہتے اور پایۂ استقلال میں جنبش نہ آتی، اظہار حق کے سلسلہ میں آپ کو مختلف طریقہ سے ستانے کی کوشش کی گئی لیکن آپ نے نہایت مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔

آپ کے زمانہ میں شہر دہلی فتنوں اور خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ جب صورت حال بہت خراب ہوگئی تو دہلی کے شرفا نے ہندو رسم کے مطابق "جوہر" کا ارادہ کرلیا تاکہ عزت وناموس بچا کر سب آگ میں جل مریں، لیکن شاہ صاحب کو جب ان کے اس ارادہ کا علم ہوا تو کربلا کے واقعات یاد دلا کر صبر وضبط کی تلقین کی جس سے متاثر ہو کر وہ اس قبیح ارادہ سے باز رہے۔

شاہ صاحب معیشت کے لحاظ سے متوسط طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر مسکینوں،

ناداروں اور ضرورتمندوں کی امداد فرماتے تھے۔طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی معیشت کا بھی خاص خیال رکھتے۔اور بزرگوں کی مخلصانہ خدمات اور احباب کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔باوجود متمول ہونے کے نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ،اکثر اوقات آپ کے خوان پر سادہ روٹی اور بعض وقت سبزی ہوتی ،شان بے نیازی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ نے کبھی شاہان وقت کی طرف چشم ارادہ سے نہ دیکھا۔

الغرض اس علم وفضل کے ساتھ آپ محاسن اخلاق ،طاعت وزہد اور ورع وتقویٰ میں سلف صالحین کی سی شان رکھتے تھے۔

طرز تحریر وتقریر اور خصوصیات تصنیف:۔

ایک مصنف کی حیثیت سے شاہ صاحب کا درجہ نہایت بلند ہے۔آپ نے مروجہ طرز نگارش کو جو محض نامانوس اور پرشکوہ الفاظ کے طلسم اور فضول قافیہ پیمائی کے افسوں میں گھرا ہوا تھا وسعت بخشی اور اس قابل کردیا کہ وہ ان لفظی گورکھ دھندوں اور بیجا ثقالت کی پابندیوں سے آزاد ہوکر حکیمانہ خیالات اور علمی مضامین کو بطریق احسن پیش کرسکے۔زمانہ ماضی میں سب سے پہلے ابن خلدون نے یہ خدمت انجام دی تھی پھر ابن خلدون کے بعد آپ ہی ایک ایسے مصنف ہیں جنھوں نے اس اسلوب کو زندہ کیا۔

باوجود عجمی اور ہندوستانی ہونے کے آپ نے عربی فصاحت وبلاغت کا بےنظیر نمونہ پیش کیا جس کی عظمت وکمال کا اعتراف اہل زبان نے بھی کیا ہے۔مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی فرماتے ہیں۔''شاہ ولی اللہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف (خصوصاً حجتہ اللہ البالغہ) میں اہل زبان کی سی روانی وقدرت اور عرب کی سی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں جو عجمی علما کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں''۔

اس کے علاوہ آپ ایک نئے اسلوب اور جداگانہ طرز کے بانی وموجد تھے ،جو جامعیت ،زور بیان ،تحکم واعتماد اور فصاحت وبلاغت میں نبی صلعم کے طرز تکلم سے مشابہ ہے۔جناب مولانا مناظر احسن گیلانی اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔''عربی زبان میں انھوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشا کی جوان کا مخصوص اسلوب ہے۔پوری پابندی کی ہے۔

شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر "جوامع الکلم، النبی الخاتم صلعم کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے۔ حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور انہی محاوروں سے کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں"۔

آپ کی یہ کیفیت دراصل مراجعت حرمین کے بعد سے ہوگئی تھی، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ "حجاز سے واپس آنے کے بعد والد ماجد کی نسبت باطنی اور علم وتقریر کی حالت کچھ اور ہی ہوگئی تھی۔ جو آپ کے پرانے شاگرد تھے وہ آپ کی حالت حاضرہ کا حالت سابقہ سے مقابلہ کرتے تو ان کو اس کی نوعیت میں نمایاں فرق نظر آتا"۔ یہ دراصل "ٹوٹے ہوئے قلم" والے خواب کی تعبیر تھی جو آپ نے حرمین میں دیکھا تھا۔ خواب یہ تھا کہ ایک مکان میں حضرت امام حسنؓ وحسینؓ تشریف لائے، حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں ایک قلم ہے جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہ آپ نے شاہ صاحب کو یہ فرماتے ہوئے عطا کرنا چاہا کہ یہ قلم ہمارے جد امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، لیکن یہ کہہ کر ہاتھ روک لیا اور فرمانے لگے ذرا ٹھہرو، حسینؓ اسے درست کردیں۔ حضرت حسینؓ نے وہ قلم لیا اور درست کرکے شاہ صاحب کو عنایت فرمایا اس خواب کی نہایت واضح تعبیر یہی ہے کہ مسلمانوں کے تصنیفی زوال اور علمی انحطاط کے بعد یہ خدمت آپ کے سپرد کی جائے گی۔ کہ تحریر وتصنیف کی خرابیاں دور فرما کر علم وادب کو بام عروج تک پہنچائیں اور یہ کہ آپ کے اسلوب تحریر کو "جوامع الکلم" کی خصوصیات حاصل ہوں۔

علاوہ ازیں آپ کی تحریر میں تحقیق وعلم اور فکر ونظر کے ساتھ ساتھ سوز واخلاص اور دردمندی کے جوہر بھی پائے جاتے ہیں جس کے باعث وہ محض ایک تحقیقی تصنیف ہی نہیں رہتی بلکہ ایک دینی مصلح کا پیغام اور اخلاقی معلم کا درس بن جاتی ہے۔ آپ نے اپنی اکثر کتب نہایت پرفتن وپرآشوب زمانہ میں تصنیف فرمائی ہیں۔ لیکن آپ حالات گردوپیش سے متاثر ہوکر جذبات کی رو میں نہیں بہہ جاتے اور نہ عام مصنفین کی طرح اپنی کتب میں زمانہ کا رونا روتے ہیں۔ بلکہ نہایت توازن واعتدال کے ساتھ قلم کو رواں رکھتے ہیں اور مرکزی نقطہ خیال سے تجاوز نہیں فرماتے۔ آپ کی اسی خصوصیت کے متعلق علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں: "شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جائیے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارھویں صدی ہجری کے پرآشوب زمانہ

کی پیداوار ہے، جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی، صرف یہ معلوم ہوگا کہ فضل وعلم کا ایک دریا ہے جو کسی شور وغل کے بغیر سکون وآرام کے ساتھ بہہ رہا ہے جو زمان ومکان کے خس وخاشاک کی گندگی سے پاک وصاف ہے"۔

آپ کی ایک بڑی خصوصیت سبقت واولیت ہے آپ نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جو اس سے قبل چھیڑے نہ گئے تھے اور بالکل نئے مضامین بیان کئے۔ چنانچہ اسلام کے نظری، فکری، شرعی، اخلاقی اور اقتصادی نظام کو ایک منظم ومرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش سب سے پہلے آپ ہی نے کی ہے۔ اس کے علاوہ احکام شرعی کے حکم ومصالح بیان کرنا اور پورے نظام شرعی کو بہ دلائل وبراہین عین فطرت کے مطابق ثابت کرنا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ اور اس ضمن میں فلسفہ، تصوف، علم کلام اور فقہ وحدیث کے بارے میں جو متنوع مضامین آگئے ہیں۔ وہ اس کے علاوہ ہیں، فن اصول تفسیر پر جو کچھ آپ سے قبل لکھا گیا وہ برائے نام ہے۔ اس فن کے اصول وقواعد کو باضابطہ طور پر آپ ہی نے مدون کیا۔ اور قرآن کے طرز بیان بلاغت اور اس کے مقاصد ومطالب، شان نزول، ناسخ، منسوخ اور آیات کی تطبیق وغیرہ بالکل نئے انداز پر بیان کی۔ خلافت اور اسلام کے نظام حکومت کی تشریح اور اختلاف مذاہب پر محققانہ تبصرہ جس طرح آپ نے فرمایا ہے اس کی توفیق آپ سے پیشتر کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ قرآن مجید وحدیث کا فارسی ترجمہ بھی آپ کی اولیت کا ثبوت ہے۔

اس فضل تقدم اور شرف اوّلیت کے علاوہ آپ کی تصانیف میں شش جہتی بھی پائی جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی فن ہوگا جس پر آپ نے خامہ فرسائی نہ کی ہو اور جس موضوع پر قلم اٹھایا اس پر سیر حاصل اور تشفی بخش گفتگو کی آپ کی تحریر میں ایجاز، وسعت نظر، سلامت فہم، سلاست بیان، قوت انشا اور رفعت خیال ودقت نظر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی طرح آپ کی تقریر بھی نہایت مؤثر اور دلآویز ہوتی تھی۔ دینی مجالس اور علمی محفلوں میں آپ کی خوش بیانی اور لذت تقریر سامعین پر محویت کا عالم طاری کر دیتی تھی۔ آپ کی فصاحت وبلاغت اور قادر الکلامی کے موافق ومخالف سب معترف تھے۔

شاہ صاحب اگرچہ فطری طور پر شاعر نہ تھے لیکن بعض اوقات جب قلبی واردات اور باطنی

احساسات سے مضطرب ہوتے تو دلی تاثرات وجذبات کسی نہ کسی صورت سے کلام موزوں بن کر دل کی گہرائی سے نوک زبان پر آہی جاتے۔ عربی میں آپ کے نعتیہ قصائد اور فارسی میں کچھ غزلیں اور رباعیاں ملتی ہیں جو تمام تر آپ کے قلبی التہاب اور سوز وگداز کا عکس ہیں، فارسی میں آپ امین تخلص فرماتے تھے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

دلے دارم ز خود خالی حبابش میتواں گفتن
درو کیفیتے جوش شرابش میتواں گفتن

ایک دوسری غزل کا شعر ہے۔

جہان وجاں فدائے وضع شوخ شہر آشوبت
قیامت می نمائی ودم عیسیٰ ومرہم ، ہم

ایک اور غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

بہ زلف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را
خروش درد دل شبہا نمی کردم چہ می کردم
دلے پر درد، جاں فگار، یار تند خودارم
جہاں را پر زیاریہا نمی کردم چہ می کردم

ایک رباعی ملاحظہ ہو:

در عشق تو از جملہ جہاں بگزشتم
وزہرچہ بجز یاد تو ازاں بگزشتم
مقصود من بندہ بجز وصل تو نیست
اندر طلبت از دل وجاں بگزشتم

عربی کے نعتیہ قصیدہ ''اطیب النغم'' کا پہلا شعر ہے۔

كأن نجوما أومضت في الغياهب
عيون الأفاعي أو رؤس العقارب

''تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گویا ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے سر ہیں''

تصانیف:-

آپ کی تصانیف بے شمار ہیں، بعض مورخین دو سو سے زائد بیان کرتے ہیں۔ مصنف ''حیات ولی'' نے ان کی تعداد اکیاون بتائی ہے۔ لیکن آگے لکھا ہے کہ ''آپ کی تالیفات کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی کتابیں ہیں، جو قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں، مگر ہم نے صرف انہی کتابوں کا ذکر کیا ہے، جو مطبوع ہو کر شرق سے غرب تک نہایت وقعت کے ساتھ مشہور ہو چکی ہیں''۔

یہی نہیں کہ آپ کی تصنیفات کثیر ہیں بلکہ آپ نے ہر فن پر قلم اٹھایا ہے اور اس میں نئے نئے نکات اور نادر مضامین بیان کئے ہیں۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، فلسفہ، تصوف، سیاسیات، اقتصادیات وغیرہ تمام موضوعات پر اب بھی آپ کی بہت سی کتابیں ملتی ہیں۔ اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے یہ تمام کام جیسا کہ حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ستائیس اٹھائیس برس سے بھی کم مدت میں انجام دیا ہے۔ اور نہایت پر آشوب اور پرفتن زمانہ میں! آپ کی منزلت علمی اور کمال فن کا یہ ایک واضح ثبوت ہے لیکن آپ کا اصلی مقام و مرتبہ جو آپ کو اسلام کی علمی و تصنیفی تاریخ میں حاصل ہے اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب آپ کی کتب کا بامعان نظر مطالعہ کیا جائے۔

آپ کی چند مشہور اور متداول تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن:-

یہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے اور تاریخ اسلام میں سب سے پہلا اور بہترین ترجمہ ہے اتنی مدت گزر جانے کے باوجود اب تک اس کے مقابل کا کوئی ترجمہ نہیں ہو سکا اس کی چند خصوصیات پر شاہ صاحب نے خود مقدمہ فتح الرحمٰن میں روشنی ڈالی ہے۔ ترجمہ کے ساتھ جا بجا ''فوائد'' بھی ہیں جو نہایت مختصر ہیں لیکن جامعیت اور اشکال کی گرہ کشائی میں بے مثل ہیں۔ یہ ترجمہ ہندوستان میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے حال ہی میں ''اصح المطابع کراچی'' نے شیخ الہند مولانا محمود حسن

دیو بندیؒ کے فارسی ترجمہ (۱) اور مختصر تفسیر عثمانی کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۲۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر:۔

فارسی زبان میں اصول تفسیر پر مختصر لیکن جامع رسالہ ہے اس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کے علوم خمسہ، تاویل حروف مقطعات، رموز قصص انبیا اور اصول ناسخ و منسوخ پر نہایت مفید اور بصیرت افروز مقالات لکھے ہیں اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل مختصر الفاظ میں حل کر دیئے ہیں، یہ رسالہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے اردو اور عربی میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

۳۔ فتح الخبیر بمالا بد من حفظہ فی علم التفسیر:۔

عربی زبان میں آیات قرآنی کی تمام ماثورہ تفاسیر کا جو آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام سے صحیح طریقہ پر منقول ہیں ایک نہایت مختصر اور جامع نمونہ ہے۔ اس میں شرح غریب القرآن اور اسباب نزول پر جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ الفوز الکبیر کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

۴۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیا:۔

انبیا علیہم السلام کے مکذبین پر جو عذاب آئے اور رسولوں کے ذریعہ جن معجزات کا ظہور ہوا اس کتاب میں ان کو مطابق فطرت ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ مخفی اسباب مادیہ کے باعث ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان کا خارق عادت ہونا محض ہماری کوتاہ نظری کی بنا پر ہے اور خدا تعالیٰ کا نظام کائنات ناقابل تغیر ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۵۔ المسوّٰی من المؤطا:۔

عربی زبان میں مؤطا امام مالک کی شرح ہے۔ اس میں آپ نے احادیث کو اپنے مذاق کے موافق نئی ترتیب سے مدون کیا ہے اور شرح میں وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو طالب علم کے لئے سہل اور دل نشین ہو۔ حدیث سے مستنبط مسائل اور امام مالک پر دیگر ائمہ کے مناسب تعقبات بھی نہایت لطیف اشاروں میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب گویا آپ کے اختیار کردہ طریقہ درس حدیث کا نمونہ ہے۔ ہندوستان میں المصفے کے ساتھ طبع ہو چکی ہے، مکہ سے بھی شائع ہوئی ہے۔

---

(۱) حضرت شیخ الہند کا ترجمہ قرآن اردو زبان میں ہے۔ (قاسمی)

۶۔ المصفٰی شرح موطا:۔

موطا امام مالک کی فارسی شرح ہے۔ اس میں آپ نے احادیث اور آثار کو الگ الگ کر دیا ہے اور اقوال مالک کو مناسب طریقہ سے بیان کیا ہے۔ ان کے آگے دیگر فقہا کے اقوال نقل کئے ہیں اور احادیث پر مجتہدانہ طریق پر بحث کی ہے۔

۷۔ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری:۔

اس رسالہ میں آپ نے امام بخاریؒ کے قائم کردہ عنوانات ابواب کی تشریح اور توجیہ اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے ذیل میں دی ہوئی احادیث سے ابواب کی مناسبت صحیح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے اور کوئی اغلاق باقی نہیں رہتا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور ''دائرۃ المعارف حیدر آباد'' سے شائع ہو چکا ہے۔ ''اصح المطابع'' نے بھی اسے صحیح بخاری کے ساتھ بطور مقدمہ شائع کیا ہے۔

۸۔ حجۃ اللہ البالغہ:۔

یہ کتاب بجا طور پر آپ کا تصنیفی شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ: ''شاہ صاحب کی یہ مایہ ناز تصنیف آنحضرت صلعم کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد آپ کے امتیوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔ اور جن سے اپنے وقت میں رسول اللہ صلعم کا اعجاز نمایاں اور اللہ کی حجت تمام ہوئی''۔

یہ کتاب دراصل اسی تعریف کے لائق ہے۔ اس میں آپ نے تعلیمات اسلام کو مطابق فطرت اور احکام دینی کو مبنی برعدل ثابت کیا ہے۔ ہر حکم الٰہی اور امر شریعت کے اسرار و مصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان کئے ہیں جس سے ایک طرف تو متشکک اور متردد حضرات کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے اور دوسری جانب معترضین کے احکام اسلام پر معاندانہ اعتراضات کا منہ توڑ جواب مل جاتا ہے۔ شاہ صاحب کو یقین تھا کہ کچھ عرصہ بعد دور ''عقلیت'' شروع ہونے والا ہے جس میں احکام شریعت کے متعلق اوہام و شکوک کی گرم بازاری ہوگی۔ اسی خطرہ کا سدباب کرنے کے لئے آپ نے یہ بے نظیر کتاب لکھی۔

اس کتاب میں آپ نے مابعد الطبیعی مسائل سے ابتدا کی ہے اور فلسفہ اسلام کو ایک مرتب

شکل میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔قدرت کے قانون مکافات کو فلسفیانہ طرز پر بیان کیا ہے۔اس کے بعد آپ نے ارتفاقات کے زیر عنوان اقتصادیات اور سیاسیات کے مسائل پر بحث کی ہے، پھر اخلاقیات کا موضوع لیا ہے اور انسانی سعادت پر بحث کی ہے، اس کے بعد نظام شریعت اس کے عقائد وارکان پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اسرار وحکم بیان فرمائے ہیں اور معاصی وآثام پر تفصیلی بحث کی ہے۔بعد ازاں تاریخ مذاہب پر تبصرہ کیا ہے اور تشریع وقانون سازی کے بارے میں نہایت مفید نکات بیان کئے ہیں۔آخر میں آپ نے حدیث سے استنباط کا صحیح طریقہ بتایا ہے۔اور فقہ سے متعلق بیش بہا معلومات بہم پہنچائی ہیں۔دوسرے حصے میں آپ نے فقہی طرز پر ابواب قائم کر کے شریعت کے جملہ احکام پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔اور ہر حکم کی علت اس کی حکمت اور فوائد ومصالح بیان کئے ہیں جس سے پڑھنے والا ان احکام پر علی وجہ البصیرت ایمان لے آتا ہے اور اس کے تمام شکوک وشبہات زائل ہو جاتے ہیں۔اس سلسلہ میں جناب محمد منظور صاحب نعمانی کی اپنی سرگزشت ملاحظہ ہو۔فرماتے ہیں: ''میں اپنی زندگی میں کسی بشر کی کتاب سے اتنا مستفید نہیں ہوا جس قدر کہ اس کتاب سے خدا نے مجھے فائدہ پہنچایا۔میں نے اسلام کو ایک مکمل اور مرتبط الاجزا نظام حیات کی حیثیت سے اس کتاب ہی سے جانا ہے۔دین مقدس کی ایسی بہت سی باتیں جن کو پہلے میں صرف تقلیداً مانتا تھا اس جلیل القدر کتاب کے مطالعہ کے بعد الحمد للہ میں ان پر تحقیقاً اور علی وجہ البصیرت یقین رکھتا ہوں''۔

نواب صدیق حسن خاں۔''اتحاف النبلا میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایں کتاب اگر چہ در علم حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ، وحکم واسرار آں بیان نمودہ، تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ، ومثل آن دریں دوازدہ صد سال ہجری، ہیچ یکے از علمائے عرب وعجم تصنیفے موجود نیامدہ''۔

یہ کتاب ہند ومصر سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔اس کے اردو تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ایک ترجمہ بعنوان ''آیات اللہ الکاملہ'' از جناب مولوی خلیل احمد صاحب اسرائیلی ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء میں لاہور سے بغیر متن طبع ہوا تھا۔اس کے بعد لاہور ہی سے ایک اور ترجمہ از عبدالحق صاحب حقانی مع متن عربی کے ساتھ بعنوان ''شموس اللہ البالغہ'' شائع ہوا جو سرتاسر ''آیات اللہ الکاملہ'' کی نقل ہے،

صرف شروع کے چند ابواب کا ترجمہ بدل دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک دوسرا ترجمہ جناب محمد بشیر صاحب نے کیا اور کچھ تشریحی فوائد بھی شامل کئے۔ لیکن یہ ترجمہ نامکمل ہے اور مبحث دوم پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹے سائز پر بغیر متن کے شائع ہوا ہے۔ حال ہی میں لاہور سے مولانا عبدالرحیم صاحب کا ترجمہ بھی بغیر متن عربی شائع ہوا ہے۔ ان سب تراجم سے پہلے جناب ابومحمد عبدالحق حقانی دہلوی مؤلف تفسیر حقانی نے اس بے نظیر کتاب کا ترجمہ عظیم آباد پٹنہ میں جناب مولوی سید محمد فضل الرحمٰن صاحب کے ایماء پر ۱۳۰۲ھ-۱۸۸۵ء میں کیا تھا۔ اور یہ مطبع رحمانی پٹنہ سے مولوی محمد صاحب کے زیر اہتمام ۱۳۱۰ھ-۱۸۹۳ء میں دو ضخیم جلدوں میں بغیر متن عربی کے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ''نعمۃ اللہ السابغۃ'' کے نام سے موسوم ہے۔ ایک غیر اہم اور غیر علمی مقام سے شائع ہونے کے بعد یہ زیادہ معروف نہ ہو سکا۔ اور علمی حلقوں سے حجاب میں رہا۔ حسن اتفاق سے اس کا ایک نسخہ پیر صاحب جھنڈا (سندھ) کے کتب خانہ عالیہ علمیہ میں موجود تھا۔ ''اصح المطابع کراچی'' نے اس پر نظر ثانی کرا کر عربی متن کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۹۔ البدور البازغہ:۔

اس دقیق کتاب میں فلسفہ اور تصوف کے حقائق و معارف بیان کئے گئے ہیں اور بعض ابواب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے مضامین کا خلاصہ ہیں۔ عربی زبان میں ہے اور مجلس علمی ''ڈابھیل'' کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے۔

۱۰۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء:۔

''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے بعد یہ آپ کی دوسری معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ اس میں آپ نے خلفائے راشدین کی خلافت قرآن مجید، احادیث، تفسیر، تاریخ وغیرہ سے دلائل و براہین دے کر حق ثابت کی ہے اور شیعہ سنی کے باہمی اختلافات کو نہایت عدل و انصاف سے حل کیا ہے جس سے جانبین کی غلط فہمیاں اور شدت و تعصب دور ہو جاتا ہے۔ اثبات خلافت راشدہ کے ساتھ ساتھ اس میں سیرت، تاریخ اور سیاست و خلافت کے بارے میں دیگر بیش بہا نکات بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً اسلام میں صحابہ کرام کا درجہ و مقام ان کے حقوق و فضائل، خلافت خاصہ کی تعریف اس کے اوصاف اور نبی، خلیفہ، محدث اور صدیق کی تعریف، حضرت عمر فاروق کے شاندار

کارنامے اور قابل قدر خدمات دینی، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار اور ان پر ہر پہلو سے تبصرہ، اسلام کا تمدنی وعمرانی نظام اور اصول وسیاست وغیرہ۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ ''اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں''۔ یہ فارسی زبان میں ہے اور ''مطبع صدیقی بریلی'' سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا اوّل چہارم حصہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے اپنے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا تھا، ایک ترجمہ بغیر متن فارسی لاہور سے بھی شائع ہوا تھا لیکن وہ کثیر الغلط ہے۔

۱۱۔ التفہیمات الالٰہیہ:۔

یہ کتاب بقول جناب محمد منظور صاحب نعمانی ''ولی اللہی کشکول'' ہے اس میں زیادہ تر تصوف وسلوک سے متعلق مقالات ہیں، اور علوم شریعت کے بارے میں بھی مضامین ملتے ہیں بعض مقامات پر اپنے دور میں پیدا شدہ خرابیوں اور لوگوں کے عیوب ونقائص کی نشاندہی کی ہے اور معاشرہ کے ہر طبقہ کو مخاطب کر کے اصلاح پر ابھارا ہے۔ کچھ باتیں ماوراالطبیعی فلسفہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض مقالات فارسی میں ہیں اور بعض عربی میں۔ پوری کتاب دو جلدوں میں ہے اور ''مجلس علمی ڈابھیل'' کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے۔

۱۲۔ الخیر الکثیر:۔

تصوف اور ''علم اسرار وحقائق'' میں ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے۔ یہ بھی ''مجلس علمی'' نے شائع کی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اصل زبان عربی ہے۔

۱۳۔ فیوض الحرمین:۔

قیام حرمین کے دوران جو فیوض وبرکات بصورت خواب یا القا آپ کو حاصل ہوئے یہ ان ہی کا مجموعہ ہے۔ بعض جگہ پیشین گوئیاں بھی ہیں۔ اصل کتاب عربی میں ہے اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۱۴۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف:۔

اس رسالہ میں احکام شرعیہ کے متعلق صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات کے اسباب اور اس کی تاریخ بیان کی ہے۔ اور ہر گروہ کی افراط وتفریط پر تنقید کی ہے۔ بے حد مفید

رسالہ ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ مصر میں بھی شائع ہوا ہے۔

۱۵۔ عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید :-

اس عربی رسالہ میں آپ نے اجتہاد اور تقلید کے مسئلہ پر نہایت محققانہ اور منصفانہ بحث کی ہے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۱۶۔ البلاغ المبین :-

بعض نے اس کو "تحفۃ الموحدین" لکھا ہے۔ یہ ردِ شرک و بدعت اور دعوت توحید خالص میں فارسی زبان میں ایک مختصر لیکن جامع رسالہ ہے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" گویا اسی کی شرح ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۱۷۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین :-

تفضیل شیخین کے متعلق فارسی زبان میں نہایت عمدہ کتاب ہے، طبع ہو چکی ہے۔

۱۸۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین :-

شاہ صاحب نے دوران قیام حرمین میں جن شیوخ و اساتذہ سے اکتساب فیض کیا اس رسالہ میں انہی کے حالات ہیں۔

۱۹۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین :-

اس رسالہ میں ان بشارتوں کا بیان ہے جو آپ کو اور آپ کے نسبی یا روحانی بزرگوں کو نبی صلعم سے ہوئیں۔ عربی زبان میں ہے۔

۲۰۔ انفاس العارفین :-

شاہ صاحب نے اس رسالہ میں اپنے بزرگوں کے حالات درج کئے ہیں۔ فارسی زبان میں ہے۔

۲۱۔ القول الجمیل :-

تصوف، وظائف واذکار اور طریقت کے چاروں سلاسل کے بیان میں مختصر سی کتاب ہے۔ عربی میں ہے اور ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۲۲۔الطاف القدس:۔

اس رسالہ میں شاہ صاحب نے تصوف کا وہ طریقہ لکھا ہے۔ جو آپ کے خیال میں انسب اور زمانۂ حاضر میں قابل عمل ہے۔اس کا مضمون عام فہم نہیں، زبان فارسی ہے۔

۲۳۔ہمعات:۔

یہ بھی تصوف سے متعلق رسالہ ہے اور مضمون ''الطاف القدس'' سے مشابہ ہے۔ دونوں رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

۲۴۔سرورالمحزون فی ترجمۃ''نورالعیون'':۔

ابن سید الناسؒ نے سیرت نبوی پر ایک ضخیم کتاب ''عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر'' تالیف کی، اور پھر اس کا ایک جامع خلاصہ لکھا اور ''نور العیون فی تلخیص سیر الامین والمامون'' کے نام سے موسوم کیا۔شاہ صاحب نے بعض دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر اس خلاصہ کا فارسی میں ''سرورالمحزون'' کے نام سے ترجمہ کیا۔کافی عرصہ ہوا یہ کانپور سے شائع ہوا تھا۔ حیدرآباد (دکن) سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۲۵۔مکتوبات مع مناقب امام بخاریؒ وابن تیمیہؒ:۔

آپ کے چند اہم مکاتیب اور امام بخاریؒ وابن تیمیہؒ کے حالات پر دو مختصر رسائل کا مجموعہ ہے۔مع اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

۲۶۔مکتوب المعارف مع مکاتیب ثلثہ:۔

ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں آپ کے بعض خاص مکاتیب شامل ہیں۔

۲۷۔الجزاللطیف فی ترجمۃ العبدالضعیف:۔

ایک مختصر سا فارسی رسالہ ہے جس میں آپ نے اپنی آپ بیتی درج فرمائی ہے اس کے اردو وعربی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

۲۸۔المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیہ:۔

فارسی زبان میں ایک مختصر سا وصیت نامہ ہے جس میں آپ نے اپنی اولاد، دوستوں، عقیدتمندوں اور شاگردوں کو آٹھ نصیحتیں فرمائیں ہیں اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۲۹۔ چہل حدیث:۔

اس رسالہ میں آپ نے وہ احادیث جمع کر دی ہیں جو اسلام کے بنیادی اصول سے متعلق ہیں مع ترجمہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

۳۰۔ اطیب النغم:۔

عربی میں آپ کے سوز و گداز سے معمور نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے۔

ان کے علاوہ دیگر رسائل و کتب کے نام حسب ذیل ہیں۔ ان میں سے کچھ تو طبع ہو چکی ہے لیکن بعض کے محض نام ہی نام تذکروں میں ملتے ہیں۔

(۳۱) الزہراوین، (۳۲) شفاء القلوب، (۳۳) الھوامع شرح حزب البحر، (۳۴) لمعات، (۳۵) سطعات، (۳۶) المسلسلات، (۳۷) الذکر المیمون، (۳۸) السر المکتوم، (۳۹) اعراب القرآن، (۴۰) الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین، (۴۱) العقیدہ والحسنہ، (۴۲) المقدمۃ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ، (۴۳) شرح رباعیتین، (۴۴) العطیۃ الصمدیہ، (۴۵) فتح الودود فی معرفۃ الجنود، (۴۶) الارشاد الی مہمات الاسناد، (۴۷) رسالہ اوائل، (۴۸) تراجم البخاری (شرح تراجم ابواب البخاری) کے علاوہ ایک ورقہ رسالہ ہے) (۴۹) ما یجب حفظہ للناظر (یہ چار مختصر رسالے فن حدیث سے متعلق ہیں اور ''مجموعۂ رسائل اربعہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں) (۵۰) آثار الاجداد، (۵۱) رسالہ دانشمندی، (۵۲) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، (۵۳) رسائل تفہیمات، (۵۴) النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر۔

آپ کی بیشتر کتب امتداد زمانہ کے باعث ضائع ہو چکی ہیں اور ان کے نام تک نہیں معلوم۔ بہت سی ایسی تصانیف ہیں جو اگرچہ معدوم تو نہیں ہوئیں لیکن اب تک لائبریریوں کی زینت ہیں اور طباعت سے محروم۔ بعض مطبوعہ کتب بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔

دیباچہ

سب طرح کی حمد و ثنا اس خدا کے لئے ہے، جس نے انسان کی فطرت میں اسلام اور ہدایت رکھی اور ان کے لئے ملت حق و آسان و واضح کو جبلی کیا، پھر از خود وہ جہل اور برائی میں پڑ گئے، لیکن ان پر خدا نے بڑا رحم کیا کہ ان کے لئے انبیا، ظلمت سے نور کی طرف لانے اور تنگی سے میدانِ فراخی میں پہنچانے کے واسطے بھیجے، اپنی اطاعت کا ان کی اطاعت پر مدار ٹھہرایا، اس بزرگی اور مرتبہ کا کیا ٹھکانا، پھر اس نے (یہ عنایت کی کہ) انبیا کے بعض متبعین کو ان کے علوم حاصل کرنے اور اسرار شریعت پر مطلع ہونے کی توفیق دی، یہاں تک کہ اس کے فضل و کرم سے بہت سے لوگوں نے ان کے اسرار و انوار کو جمع کر لیا اور انھوں نے اتنا بڑا درجہ حاصل کر لیا کہ ان میں سے ایک ایک شخص ہزار عابد سے (فضیلت میں) زائد ہو گیا اور عالم ملکوت میں وہ بڑے مرتبہ والے کہلائے جانے لگے۔ اور کل مخلوق خدا یہاں تک کہ دریاں کی مچھلیاں بھی ان کے لئے دعا گو ہوئیں۔ خدائے پاک ان پر اور ان کے متبعین پر ہمیشہ رحم فرماتا رہے۔ بالخصوص ہمارے سردار جناب محمد علیہ السلام کو (جنھیں کھلے کھلے معجزات عطا ہوئے ہیں) افضل صلوات اور اکرم تحیات کے ساتھ خاص فرمائے اور ان کی آل و اصحاب پر اپنی رحمت کا مینہ برسائے اور انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کے بعد فقیر الی اللہ الکریم احمد المشہور بہ ولی اللہ بن عبدالرحیم یہ کہتا ہے کہ تمام علوم یقینیہ اور فنون دینیہ سے عمدہ اور ان کا سر علم حدیث ہے جس میں جناب افضل المرسلین علیہ السلام کے قول و فعل اور تقریر کا بیان ہوتا ہے، تو اس طرح وہ (اقوال و افعال) ظلمت کے چراغ اور ہدایت کے راستوں کی عمدہ منار ہیں اور گویا ماہتاب جہانتاب ہیں۔ پس جس نے ان کو یاد کر کے ان پر عمل کیا

تو اس نے ہدایت اور مراد پائی اور جس نے ان سے اعراض کیا اس نے اپنی عمر اکارت گنوائی کیونکہ آنحضرت صلعم نے امر ونہی اور بری بھلی بات سب کچھ بیان فرمائی، وعظ ونصیحت کی اور مثالیں دے دے کر بھی سمجھایا اس لئے وہ احادیث (شمار میں) قرآن کے برابر یا اس سے بھی زائد ہیں اور یہ بھی واضح رہے کہ اس علم کے چند مختلف طبقات اور اہل علم کے باہم متفاوت درجات ہیں اور اس علم کا مغز و پوست اور صدف دور بھی ہے اور اس کے اکثر فنون کو علما نے اپنی کتابوں میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے جن سے بڑے بڑے دقیق مضامین اور مشکل مسائل کے مطالب بآسانی اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اس علم کا پوست ظاہری وہ علم ہے جس میں حدیث کی صحت وضعف اور استفاضہ وغرابت کا ذکر ہوتا ہے۔ اس فن میں بھی علمائے محدثین اور حفاظ متقدمین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کے بعد وہ فن ہے جس میں احادیث غریبہ ومشکلہ کے معانی بیان کئے جاتے ہیں، اس میں بھی علمائے فنون ادبیہ و ماہران علوم عربیہ نے خوب عرق ریزی کی ہے۔ پھر اس کے بعد وہ فن ہے جس میں معانی شرعیہ اور استنباط احکام فرعیہ و مسائل قیاسیہ سے جو کہ منصوص فی العبارۃ سے حاصل ہوتے ہیں، بحث کی جاتی ہے۔ نیز اس فن میں ایما واشارہ سے استدلال کا طریقہ اور منسوخ ومحکم اور مرجوع ومبرم کی پہچان بیان کی جاتی ہے اور یہ فن عام علما کے نزدیک تمام فنون حدیث کا لب لباب اور گوہر ہے، اس میں بھی فقہائے محققین نے بڑی جانفشانی کی ہے۔ یہ سب کچھ سہی مگر میرے نزدیک تمام فنون حدیث میں سب سے زیادہ دقیق اور سب کی جڑ واصل اور سب سے بلند وبرتر اور تمام علوم شرعیہ سے بہتر اور منزلت میں اعلیٰ وافضل اور قدر و قیمت میں سب سے بڑھ کر علم اسرار دین ہے جس میں احکام کی حکمت اور ان کی لم اور خواص اعمال کے اسرار ونکات بیان ہوتے ہیں۔

بخدا یہ وہ علم ہے جس کو خدا نصیب کرے وہ فرض عبادات سے فراغ کے بعد اپنے تمام عزیز اوقات اسی میں صرف کرے اور اس کو اپنا توشۂ آخرت بنا لے، کیونکہ اس علم کی بدولت آدمی شریعت کے حقائق پر مطلع ہو جاتا ہے اور اس کو ان اخبار شریعت سے وہ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، جو صاحب عروض کو اشعار سے منطقی کو براہین حکماء سے، نحوی کو کلام فصحا سے اور اصولی کو تفریعات فقہا سے ہوتی ہے۔ اسی علم کی وجہ سے انسان حاطب لیل اور غائص سیل ہونے سے محفوظ رہتا

ہے(۱)۔ اوراس کا ماہر تو ندی والی (چندی) اونٹنی کی طرح ٹیڑھا ٹیڑھا نہیں چلتا اور نہ اندھے گھوڑے کو سواری بناتا ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنے طبیب سے سیب کھانے کو سنے لیکن احمق حنظل (اندرائن) کو مشابہت ظاہری سے اس پر قیاس کر کے کھا جائے اور اسی علم کے طفیل مومن کو خدا کی طرف سے بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ بمنزلہ اس شخص کے ہو جاتا ہے جس کو کوئی طبیب حاذق سنکھیا کھانے سے منع کرے کہ وہ قاتل ہے تو وہ شخص اس کی تصدیق کرے اور پھر اپنے قرائن سے یہ دیکھے کہ درحقیقت سنکھیا کی حرارت اور خشکی ایسی غایت درجہ کی ہوتی ہے کہ مزاج انسانی کو فاسد کر دیتی ہے۔ تب اس شخص کو اس حکیم کے قول پر دیکھو کس قدر یقین زیادہ ہو جائے گا اور اس علم کے گو احادیث نبوی نے اصول وفروع بیان کر دیئے ہیں اور آثار صحابہ وتابعین نے اس کا اجمال اور تفصیل سب واضح کر دی ہے اور مجتہدین ہر باب شرعی میں مصالح مرعیہ (ملحوظ) بیان کرتے چلے آئے ہیں اور انہی کے متبع محققین نے نکات جلیلہ اور مدققین نے رموزات جمیلہ بھی بیان کئے ہیں، اسی وجہ سے اب اس علم میں کچھ قیل وقال کرنا اجماع امت کے خلاف یا کوئی نئی بات نہیں سمجھا گیا لیکن بہت ہی کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس فن میں کوئی کتاب تصنیف کی ہو یا اس کی اساس وبنیاد پر غور وخوض کیا ہو یا اس کے اصول وقواعد مقرر کئے ہوں یا ایسا کام کیا ہو جو اس علم میں کما حقہ کافی اور وافی ہو، جس سے پڑھنے والا اچھی طرح مستفیض ہو سکے اور تشنگان علم کی سیرابی ہو۔ مثل مشہور ہے ''جب تو شیر کی سواری کرے گا تو تیرا ردیف، ہمرکاب کون بنے گا'' اور یہ ہو بھی کیونکر سکتا ہے جبکہ یہ وہ فن ہے کہ اس پر وہی مطلع ہو سکتا ہے جس کو تمام علوم شرعیہ اور تمام فنون الٰہیہ سے مکمل آگاہی ہو اور اس علم کو وہی چھان سکتا ہے جس کا سینہ خدا نے علم لدنی کے لئے کھول دیا ہو اور اس کا دل اسرار وہبی سے بھر دیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس کی طبیعت میں تیزی اور ذہن میں روانی ہو، تحریر وتقریر میں حاذق اور توجیہ وتزئین کلام میں فائق ہو یہ بھی جانتا ہو کہ اصول مقرر کر کے ان پر فروع کی بنیاد کس طرح قائم کرتے ہیں اور قواعد مقرر کر کے ان

---

(۱) رات کو لکڑیاں جمع کرنے والے کو حاطب لیل کہتے ہیں وہ رات کی تاریکی کی وجہ سے خشک اور گیلی لکڑیوں میں فرق نہیں کر سکتا اسی طرح غائص سیل یعنی پانی میں غوطہ مارنے والا بھی نہیں دیکھ سکتا تو ایسا ہی وہ شخص ہوتا ہے جو اس علم سے بے بہرہ ہو۔

پر عقلی ونقلی دلائل وشواہد کس طرح لاتے ہیں۔ مجھ پر خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس فن میں سے مجھ کو بھی ایک حصہ عطا کیا ہے اور یوں تو مجھے ہمیشہ اپنی تقصیر کا اقرار واعتراف رہا ہے' اور اپنے نفس کو میں پاک نہیں کہتا کیونکہ نفس کو تو بری باتوں پر اصرار ہوتا ہی ہے''۔

میں ایک دن عصر کی نماز کے بعد مراقبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکا یک نبی صلعم کی روح مبارک مجھ کو نظر آئی اور ایک کپڑا سا مجھ پر ڈال دیا گیا اور اسی وقت میرے دل میں اس کے یہ معنی معلوم ہوئے کہ یہ دین کو ایک خاص طرز سے بیان کرنے کی طرف اشارہ ہے اور اسی وقت سے میرے دل میں ایک ایسا نور معلوم ہوا جو کہ ہر وقت ترقی پذیر تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد مجھ کو یہ الہام ہوا کہ اس عظیم الشان کام کے لئے کسی نہ کسی دن آمادہ ہونا میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے اور اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے تمام زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھی ہے اور گویا عین غروب کے وقت روشنی نے اپنی شعاعیں زمین پر پھینکی ہیں اور وقت آ گیا ہے کہ شریعت مصطفویہ دلائل وبراہین کے مکمل لباس میں ملبوس کر کے میدان میں لائی جائے پھر اس کے بعد خواب میں میں نے حضرت امامین حسنؓ وحسینؓ کو مکہ میں اس طرح دیکھا کہ انھوں نے مجھ کو ایک قلم عطا فرمایا اور کہا کہ یہ ہمارے نانا رسول اللہ صلعم کا قلم ہے اور مدت سے میرے دل میں یہ خیال گزرتا تھا کہ اس فن میں ایک ایسی کتاب تصنیف کروں جس کا فائدہ مبتدی ومنتہی اور حاضر وغائب کو یکساں پہنچے اور اہل مجلس بھی فیض پائیں۔ لیکن میں ان باتوں پر نظر کر کے متردد ہو جاتا اور اپنے ارادہ سے رک جاتا تھا کہ میرے آس پاس کوئی ایسا معتبر عالم نہ تھا جس سے بوقت ضرورت میں اپنے شبہات کو حل کر سکوں اور نہ ہی خود مجھ کو اس قدر علم تھا اور زمانہ کا جہل وتعصب اور ہر شخص کا اپنی رائے ناقص پر اترانا تو مجھ کو اور بھی پست ہمت کئے دیتا تھا، اس کے علاوہ ہمعصری منافرت کی جڑ ہوتی ہی ہے اور مصنف ملامت کے تیروں کا شکار بنایا ہی جاتا ہے۔

الغرض میں اسی شش وپنج میں تھا کہ میرے معظم بھائی اور پیارے دوست میاں محمد سلمہ کو جو عاشق کے نام سے مشہور ہیں اس علم کی فضیلت معلوم ہوئی اور ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ بغیر اس علم کے سعادت پوری پوری نصیب نہیں ہوتی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ علم بغیر مجاہدۂ شکوک وشبہات اور بلا مشقت اختلاف ومناقضات کے حاصل نہیں ہو سکتا، اور ایسے شخص کی مدد لئے بغیر جس نے سب

سے پہلے اس علم کا دروازہ کھولا ہو اور ہر طرح کی مشکلات فن اس کے آگے دست بستہ کھڑی ہوں اس فن میں کچھ غور و خوض بھی نہیں ہو سکتا، پھر تو وہ اس کی تلاش میں ہر اس شہر میں جس میں کہ جا سکتے تھے گھومتے پھرے اور جس سے بھی کچھ مطلب حاصل ہوتا دیکھا اس سے گفتگو کی اور ہر ایک کھوٹے کھرے کو پرکھتے پھرے لیکن کہیں ان کا مطلب حل نہ ہوا اور کوئی ایسا نہ ملا جو انہیں اس بارے میں کوئی مفید معلومات بہم پہنچا سکے۔ پھر جب انھوں نے یہ دیکھا تو مجھ سے التجا کر کے چمٹ گئے، میں جب بھی ان سے کچھ عذر کرتا تو وہ مجھ کو حدیث لجام (۱) یاد دلاتے یہاں تک کہ انھوں نے میرا کوئی عذر نہ مانا اور مجھ کو ہر طرف سے گھیر کر مجبور کر دیا تب تو میں نے یہ جان لیا کہ جس کا مجھ کو الہام ہوا تھا یہ وہی آئندہ پیش آنے والی صورت ہے اور یہ کہ یہ امر شدنی ہے۔ پس میں نے جناب باری کی طرف توجہ کی اور اس سے استخارہ کیا اور اعانت طلب کی اور اپنی قدرت و طاقت کو بالکلیہ ہٹا دیا اور ایسا ہو گیا جیسے مردہ غسال کے ہاتھوں میں بے اختیار ہوتا ہے اور پھر جس کی انھوں نے مجھ سے التجا کی تھی، اس کو شروع کیا اور خدائے پاک سے نہایت عاجزی کے ساتھ یہ عرض کی کہ میرے دل کو لغو باتوں سے پھیر دے اور ہر چیز کی اصل حقیقت سے مجھ کو آگاہ کر دے اور میرے دل کو راستی، زبان کو فصاحت اور ہر بات میں صداقت عطا کر اور میرے دلی ارادوں کے پورا کرنے میں اعانت اور مدد فرما۔ بیشک وہ خدا قریب اور مجیب ہے لیکن میں نے ان حضرت سے اول ہی بار کہہ دیا تھا کہ بھائی میں مجلس بیان میں گونگا اور تیز رو گھوڑوں کے میدان میں لنگڑا ہوں۔ میرے علم کی پونجی کھوٹی ہے اور بجائے بوٹی کے ہڈی پر قناعت ہے اور میرا دل تفکرات میں بیحد پریشان ہے جن سے ذرا بھی فرصت نہیں، لہٰذا اوراق بینی میں غور و فکر کرنا میرے لئے اس وقت آسان نہیں اور نہ مجھ سے لوگوں کے اقوال بدرجۂ کمال منضبط ہو سکتے ہیں کہ ان کو ہر آئے گئے کے گاؤں میں تو جو کرتا ہوں خود کرتا ہوں اپنی مٹی آپ اکٹھی کرتا ہوں، اپنے وقت کا بندہ ہوں، اپنے بخت کا تلمیذ ہوں، جو کچھ مجھ کو سوجھ گیا اس کا پابند ہوں اور جو کچھ دل میں سما گیا اس کو پسند کرتا ہوں پس جس کو اس پر قناعت منظور ہو تو یہ حاضر ہے لیکن جس کو کچھ اور مطلب ہو تو اس کو اختیار ہے

---

(۱) حدیث الجام کا مضمون یہ ہے کہ جس سے بھی کوئی علم کی بات پوچھی جائے اور وہ اس کو چھپائے تو ایسے شخص کو قیامت میں آگ کی لگام دی جائے گی۔

جو چاہے سو کرے اور جبکہ تکلیف، جزا اور شریعت باعث رحمت وہدایت کے اسرار کی طرف اس آیت فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ میں اشارہ ہوا ہے اور یہ کتاب بھی اسی کی ایک شاخ اور اسی افق کا ایک درخشاں چاند ہے تو مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب کا نام "حجتہ اللہ البالغہ" رکھا جائے۔ خدا ہی کا آسرا کافی ہے وہی بہترین کارساز ہے اس بلند وبرتر کی مدد کے بغیر نہ کوئی طاقت ہے اور نہ کوئی قوت۔

مقدمہ

اکثر یوں خیال کیا جاتا ہے کہ احکام شرعیہ کسی مصلحت پر مبنی نہیں اور نہ اعمال اور ان کی جزا میں کوئی مناسبت ہے، جیسے کوئی آقا اپنے نوکر کو اس کی فرمانبرداری کا امتحان لینے کے لئے یونہی بلا فائدہ کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کو ہاتھ لگانے کا حکم دے پھر اگر وہ اطاعت کرے تو اس کو جزا دے اور اگر نافرمانی کرے تو سزا دے۔ لیکن یہ گمان بالکل غلط ہے اور سنت و اجماع خیر القرون اس کی تردید کرتا ہے اور جو شخص یہ باتیں بھی نہیں جان سکتا (کہ اعمال کا اعتبار نیت پر اور اس کی خوبی کا مدار طبیعت پر ہے جیسا کہ نبی صلعم نے فرمایا ہے ''اعمال نیتوں پر موقوف ہیں'' اور جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا اللہ کے پاس نہ تو تمہاری ان قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ تمہارا تقویٰ اس کے پاس پہنچتا ہے، اور نماز، ذکر الٰہی اور اس سے مناجات کرنے کے واسطے مقرر ہوئی۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ہماری یاد اور ذکر کرنے کے لئے نماز پڑھا کرو'' اور نیز اس لئے مقرر ہوئی کہ اس کی وجہ سے آخرت میں اس کے جمال کا مشاہدہ اور دیدار حاصل ہو جیسا کہ نبی صلعم نے فرمایا ''تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھتے ہو اور اس کے دیدار میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ کرو گے تو اگر تم ایسا کر سکو کہ نماز فجر اور عصر کے وقت (شیطان سے) مغلوب نہ ہو تو ایسا ہی کیا کرو اور زکوٰۃ اس لئے مقرر ہوئی کہ فقرا کی حاجت برآری ہو اور دل پر بخل نہ طاری ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ مانعین زکوٰۃ کی برائی میں فرماتا ہے ''جن کو خدا نے کچھ اپنے فضل سے دیا ہے وہ لوگ بخل کو اپنے لئے بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے حق میں نہایت برا ہے کیونکہ جس مال میں یہ بخل کرتے ہیں قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں پہنایا

جائے گا''۔ اور جیسا کہ نبی صلعم نے (معاذؓ بن جبلؓ سے) فرمایا تھا کہ ''ان (اہل یمن) سے کہہ دینا کہ یہ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے تم پر اس لئے فرض کی ہے کہ تمہارے امراء سے لیکر تمہارے فقرا کو دی جائے (۱)۔ اور روزہ نفس کے زیر کرنے کے لئے مقرر ہوا ہے، جیسا کہ نبی صلعم نے فرمایا۔ ''روزہ رکھنا شہوت کے حق میں بمنزلہ خصی ہونے کے ہے''۔ اور حج خدا کے مقامات کی تعظیم کے لئے مقرر ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے بابرکت ہے اور دنیا کا رہنما ہے، اس میں کھلی نشانیاں ہیں الخ'' اور فرمایا ''صفا و مروہ (کی پہاڑیاں) خدا کی نشانیاں ہیں'' اور قصاص قتل کے بند کرنے کے واسطے مقرر ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے عقلمندو! قصاص میں تمہاری زندگی مضمر ہے اور حدود کفارات، معاصی کے روکنے کے واسطے مقرر ہوئے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تاکہ وہ (چور) اپنے لیے کا مزہ چکھے۔ (اور باز آجائے) اور جہاد خدا کا کلمہ بلند کرنے اور شر انگیزوں کا فتنہ مٹانے کے لئے مقرر ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ قدم مٹ جائے اور دین خالص اللہ ہی کا ہو جائے''۔ اور احکام معاملات اور بیاہ شادی کے مسائل سب عدل وانصاف کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے احکام ہیں جن پر آیات کریمہ اور احادیث نبویہ دلالت کرتی ہیں اور (ہر زمانے میں علما نے ان کو بیان بھی کیا ہے) (پس جس کو ان باتوں کا علم نہیں) تو اس کو علم سے کچھ بھی مس نہیں، اگر ہے تو ایسا ہے جیسے کوئی سوئی کو سمندر میں ڈبو کر نکالے، اور اس کی بات پر تو کیا اعتبار کیا جائے بلکہ اس کو مناسب ہے کہ اپنے حال پر تاسف کرے اور روئے، میں پھر کہتا ہوں کہ خود نبی صلعم نے بعض مواقع پر تعیین اوقات کے اسرار ظاہر فرمائے مثلاً ظہر کی پہلی چار رکعت کی نسبت فرماتے ہیں۔ ''اس وقت آسمانوں کے دروازے کھلتے ہیں لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل صالح اس وقت اوپر جائے'' اور یوم عاشورہ کے روزہ کی نسبت آپ سے یوں مروی ہے کہ اس کے جاری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس دن موسیٰؑ اور ان کی قوم کو فرعون سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ پس اس کا ہمارے لئے مقرر ہونا سنت موسیٰؑ کا اتباع ہے اور بعض احکام کی وجوہات بھی بیان فرمائیں۔

---

(۱) پہلی مثال زکوٰۃ کا مقصد بخل دور کرنا بتاتی ہے اور دوسری فقرا کی حاجت برآری بیان کرتی ہے۔

چنانچہ دیکھئے جو شخص سو کر اٹھے اس کو ہاتھ دھونے کے لئے فرمایا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ ''اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ رات کو اس کا ہاتھ کہاں پڑا رہا'' اور ناک میں پانی ڈالنے اور سنکنے کی نسبت یوں فرمایا کہ ''انسان کے نتھنوں پر رات بھر شیطان رہتا ہے'' (یعنی رطوبت اور گندگی بہتی ہے) اور نیند سے وضو ٹوٹ جانے کی نسبت یوں فرمایا کہ ''سوتے میں انسان کو جوڑ بند ڈھیلے پڑ جاتے ہیں (۱)'' اور رمی الجمار کی نسبت فرمایا ''اس میں ذکر الٰہی کیا جاتا ہے'' اور کسی کے گھر میں نظر نہ ڈالنے کی وجہ یہ فرمائی کہ ''اجازت لینے سے یہی تو مقصود ہے کہ اچانک گھر والوں پر نظر نہ پڑ جائے'' اور بلی کے پس خوردہ کی نسبت یوں فرمایا کہ ''یہ ناپاک نہیں کیونکہ یہ گھر میں پھرنے والے جانوروں میں سے ہے (۲)'' اور بعض جگہ احکام کی یہ حکمت بیان فرمائی کہ اس میں دفع مضرت ہے، جیسا کہ ایام رضاعت میں جماع کرنے سے منع فرمایا تھا کیونکہ (یہ معلوم ہوا تھا کہ) اس سے بچہ کو ضرر پہنچتا ہے۔ یا فرقہ کفار سے امتیاز اور مخالفت جیسا کہ طلوع آفتاب کے وقت نماز سے اس لئے منع فرمایا کہ ''یہ وقت پرستش کفار کا ہے اور آفتاب شیطان کے سر کے اوپر سے نکلتا ہے (۳)'' یا دروازۂ تحریف بند کرنے کی مصلحت ہوتی ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اس شخص کی نسبت جس نے نفل کو فرض ملا کر پڑھنا چاہا فرمایا کہ ''پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہو گئے'' پھر اس کی تائید میں آپ نے فرمایا ''ابن خطابؓ خدا تم کو اصابت رائے عطا فرمائے (تم نے ٹھیک کہا)'' یا وہ مصلحت دفع حرج کے لئے ہوتی ہے جیسا کہ آپ نے ایک شخص سے فرمایا کہ ''کیا (تیری طرح) ہر شخص کے پاس دو دو کپڑے ہوتے ہیں'' اور اللہ تعالیٰ نے بھی سحری کی نسبت اسی بنا پر اس آیت میں اجازت دی خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم اپنے دلوں میں خیانت کرتے تھے، پس اب خدا نے تم پر رحمت کی اور معاف کر دیا۔ اب تم اپنی بیویوں سے رمضان کی راتوں میں مل سکتے ہو الخ اور بعض جگہ ترغیب وترہیب کے اسرار بیان فرمائے حتیٰ کہ صحابہؓ نے اپنے شکوک وشبہات جو وہاں پیدا ہوتے تھے آپ سے عرض کئے اور آپ نے حل فرما دیئے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا ''آدمی کی نمازِ جماعت اس کی اس نماز سے جو وہ تنہا گھر میں یا بازار اور

---

(۱) پس احتمال ہے کہ ریح وغیرہ خارج ہوئی ہو لہٰذا وضو کرنا لازم ہے۔ (۲) اس سے احتیاط مشکل ہے اور ناپاک قرار دینے میں حرج ہے۔ (۳) یعنی جو اس وقت سجدہ کرتا ہے گویا شیطان کو سجدہ کرتا ہے۔

دوکان میں پڑھتا ہے پچیس درجہ (ثواب میں) زیادہ ہے۔ اور یہ اس لئے کہ جب کوئی شخص اچھی طرح وضو کرکے مسجد میں آتا ہے اور صرف نماز ہی کیلئے چلتا ہے تو ہر قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور ایک نیکی ملتی ہے۔'' الحدیث'' اور ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ بیوی کے ساتھ صحبت کرنے میں بھی اجر ہے، صحابہ نے عرض کیا'' یارسول اللہ! یہ تو قضائے شہوت ہے اس میں کیا اجر ہوگا''۔ آپ نے فرمایا'' اچھا اگر اس کو وہ حرام میں صرف کرتا تو کیا اس پر گناہ نہ ہوتا، تو اسی طرح جب اس نے حلال میں صرف کیا تو اس کو اجر ملا، اور پھر ایک جگہ آپ نے فرمایا'' جب دو مسلمان تلوار لیکر باہم مقابل ہوتے ہیں تو قاتل مقتول دونوں دوزخ میں جاتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا قاتل تو خیر ٹھیک ہے مگر یہ مقتول کس لئے دوزخ میں گیا۔ آپ نے جواب دیا کہ'' وہ بھی اپنے مقابل کو قتل کا خواہاں تھا''۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مقامات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور ابن عباسؓ نے جمعہ کے روز غسل کرنے کی مصلحت بیان کی اور زید بن ثابتؓ نے پھلوں کی فروخت، ان کی پختگی سے پہلے ممنوع ہونے کا سبب بیان کیا، اور ابن عمرؓ نے طواف میں خانہ کعبہ کے صرف دو رکنوں کے بوسہ پر اکتفا کی وجہ بیان فرمائی۔ پھر اس کے بعد تابعین اور ان کے بعد مجتہدین احکام کے علل و مصالح برابر سمجھتے رہے اور ہر حکم صریح کی کوئی نہ کوئی علت خواہ وہ حصول نفع ہو یا دفع مضرت ضرور قرار دیتے رہے جیسا کہ ان کی کتابوں میں مفصل مذکور ہے۔

پھر تو غزالیؒ، خطابیؒ اور ابن عبدالسلامؒ وغیرہم نے عجیب عجیب لطائف و نکات اور عمدہ عمدہ تحقیقات بیان کیں، خدا ان کو ان کی اس سعی کا عوض دے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ قطع نظر ان مصالح اور منافع کے شرع کا ان احکام کو از خود واجب اور حرام بنانا بھی فی نفسہٖ ایک سبب عظیم ہے کہ اس سے مطیع کا ثواب اور عاصی کو عذاب دیا جائے اور یہ بات نہیں کہ اعمال کا حسن و قبح، ان معنوں میں کہ ان کا فاعل مستحق ثواب یا عذاب ہو محض عقلی ہے، اور نہ شرع کا محض یہی کام ہے کہ وہ اعمال کی صرف خاصیات بیان کردے اور از خود کسی چیز کو حرام یا فرض نہ کرے جس طرح کہ طبیب ادویہ کی خاصیت اور حرارت و برودت بیان کردیتا اور مرض کی اقسام گنا دیتا ہے (دواؤں میں از خود کوئی خاصیت پیدا نہیں کرتا) چنانچہ بعض لوگوں کا شریعت کے بارے میں یہی خیال ہے مگر یہ خیال بالکل غلط ہے، بادی النظر ہی میں زبان اسے دور پھینک دیتی ہے اور یہ کہنا قبول نہیں کرتی اور

آخر ایسا کیوں نہ ہو، دیکھئے نبی صلعم نے تراویح میں شریک نہ ہونے کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ ''میں ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے'' اور فرمایا کہ بڑا سخت گنہگار وہ مسلمان ہے کہ پہلے کوئی چیز حرام نہ ہو پھر اس کے سوال کرنے سے وہ حرام ہو جائے (۱) اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں اور اگر وہ خیال صحیح ہوتا تو اس مقیم کو جسے مسافر کی مانند مشقت اور تکالیف لاحق ہوں روزہ افطار کرنا جائز ہوتا کیونکہ جس حرج کی بنا پر رخصت افطار دی گئی ہے وہ دونوں میں برابر پایا جاتا ہے اور خوشحال مسافر کو مقیم کی طرح آرام میں ہونے کی وجہ سے افطار درست نہ ہوتا اور یہی حال باقی سب حدود کا ہے جن کو شرع نے مقرر کیا ہے اور سنت نے یہ بات بھی واجب کر دی ہے کہ جب کوئی حکم صحیح روایت سے ثابت ہو جائے تو اس کی فوراً تعمیل کرنی چاہئے اس کی مصلحت دریافت کرنے پر (تعمیل کو) موقوف نہ رکھے کیونکہ بہت سے لوگوں کی عقلیں احکام کی مصلحتوں کے دریافت کرنے سے قاصر ہیں۔ اور نبی صلعم کی عقل ہماری سب کی عقل سے زیادہ معتبر ہے اور اسی لئے یہ علم نااہلوں کے واسطے قابل تعلیم نہ سمجھا گیا اور اس کے لئے وہ شرائط قرار دی گئیں جو کتاب اللہ کی تفسیر کے لئے ہیں اور اس میں اس رائے محض سے جس میں سنت سے مدد نہ لی گئی ہو، غور وخوض کرنا حرام ہے۔

ہمارے بیان سے یہ خوب ظاہر ہو گیا کہ حق بات یہ ہے کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ایسی مثال ہے جیسے کسی امیر کے چند غلام بیمار ہو جائیں اور وہ کسی خاص آدمی کو ان کے دوا پلانے پر مقرر کرے تو اب اگر وہ (غلام) اس کا کہا مانیں گے تو گویا اپنے اصل آقا کی اطاعت کریں گے۔ اور وہ ان سے خوش ہو کر ان کو بہترین انعام عطا کرے گا اور وہ اس مرض سے بھی نجات پائیں گے اور اگر انھوں نے اس کا کہنا نہ مانا تو گویا اپنے اصل آقا کی نافرمانی کی جس سے وہ ان پر غصہ ہوا اور ان کو بڑی سے بڑی سزا دی اور وہ خود بھی اس مرض سے ہلاک ہو گئے اور نبی صلعم نے جس جگہ اپنے متعلق فرشتوں کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ اس شخص (یعنی پیغمبرؐ) کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے ایک مکان بنا کر اس میں طرح طرح کے کھانے چنے اور پھر ایک بلانے والے کو بھیجا کہ لوگوں کو

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی مصلحت یا علت کے محض رسول کے کہنے یا کرنے سے بھی بعض احکام فرض ہو جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ ہر حکم کی کوئی لِم یا وجہ بیان کی جائے۔

بلائے تو جس کسی نے اس کا کہا مانا تو وہ گھر میں بھی آیا اور اس نے کھانا بھی کھایا۔ لیکن جس نے اس کا کہنا نہ مانا تو نہ تو وہ گھر میں آیا اور نہ ہی اس کو وہ کھانا نصیب ہوا۔ تو اس جگہ اس سے آپ کی بھی وہی مراد ہے جو ہم نے بیان کی۔ اور آپ کے اس قول سے بھی یہی مراد ہے اور جو کچھ خدا نے مجھ کو دیکر بھیجا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی قوم سے آکر یہ کہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے (دشمن کا) لشکر دیکھا ہے میں کھلم کھلا ڈرانے والا اور ہوشیار کرنے والا ہوں، تم یہاں سے بھاگ جاؤ تو اس کی قوم کے ایک گروہ نے تو اس کا کہنا مان لیا اور اس لشکر کے آنے سے پہلے ہی تڑکے اٹھ کر چلا آیا اور اس طرح اس لشکر سے بچ گیا لیکن اسی قوم کا ایک گروہ اس کو جھوٹا سمجھ کر صبح تک وہیں پڑا رہا تو صبح کو اس لشکر نے آتے ہی ان لوگوں کو مار ڈالا اور ستیاناس کر دیا۔ نیز آپ نے خدائے پاک سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تمہارے ہی اعمال تو ہوں گے جو تم کو واپس کر دیئے جائیں گے۔ اور ہمارے اس بیان سے (کہ اصل بات دو باتوں کے بیچ میں ہے اور اعمال کو اور قضائے الٰہی کا کسی چیز کو حرام و حلال کرنے کو (دونوں کو) کسی کے مستحق ثواب وعذاب ہونے میں خاص دخل ہے) ان دلائل میں جو جاہلیت کے لوگوں کے ثواب وعذاب میں متعارض ہیں تطبیق ہو سکتی ہے (۱)۔

بعض لوگ فقط اس قدر تو جانتے ہیں کہ احکام کے چند مصالح اور علتیں ہوتی ہیں اور اعمال

(۱) تفصیل اس کی یہ ہے کہ مصنف نے مذہب متوسط اختیار کیا، نہ تو یہی ہے کہ شرع محض طبیب کی طرح خواص اعمال بیان کر دیتی ہے اس کو حرام وحلال کرنے میں کچھ دخل نہیں اور نہ یہی ہے کہ بلا مناسبت اور بغیر کسی مصلحت کے شرع حرام وحلال کرتی ہے اس میں عقل کو کچھ دخل ہی نہیں بلکہ ایک درمیانی بات ہے وہ یہ کہ اعمال کی علل بھی ہیں اور شرع کو بھی حلال وحرام کرنے میں بڑا اختیار ہے، پس اس مذہب سے ان دلائل میں جو مردمان جاہلیت کے ثواب وعذاب میں متعارض ہیں تطبیق ہو سکتی ہے جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ عقل کو اس بارے میں کچھ دخل ہی نہیں شرع نے حکم دیا یا حرام کا حلال کر دیا تو ان کے نزدیک مردمان جاہلیت کو کچھ عذاب نہیں کیونکہ اس زمانہ میں شرع تو تھی ہی نہیں اور عقل کچھ کام نہیں کر سکتی تھی اور جن کے نزدیک عقل حاکم ہے ان کے نزدیک ان کو بسبب عقل ہونے کے عذاب ہوگا کیونکہ باوجود عقل کے احکام الٰہی پر عمل کیوں نہ کیا لیکن مصنف نے مذہب متوسط اختیار کیا تو اس طرح توحید وغیرہ امور جن میں عقل کافی ہوتی ہے بسبب شرک کے عذاب ہوگا۔

کی جزا و سزا اس لئے مترتب ہوتی ہے کہ وہ ان نفسانی ہیئتوں (مثلاً شوق وخوف وغیرہ) ہی کی وجہ سے صادر ہوتی ہے جن سے انسان درست ہوتا اور بگڑتا ہے۔ جیسا کہ نبی صلعم نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا کہ ''خبردار انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب تک وہ درست رہتا ہے تمام بدن درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے اور وہ دل ہے'' لیکن وہ لوگ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس فن کی تدوین کرنا اور اس کی اصول وفروع مقرر کرنا ممنوع ہے، عقلاً تو اس لئے کہ اس کے مسائل نہایت باریک اور دقیق ہیں اور شرعاً اس لئے کہ سلف (متقدمین نے باوجود اس کے کہ نبی صلعم کے زمانہ سے ان کو نہایت قرب تھا اور خوب علم رکھتے تھے۔ مگر اس فن میں کچھ تصنیف نہ کیا تو گویا اب اس کے ترک پر اتفاق ہو گیا یا کوئی یوں کہے کہ اس کی تدوین میں کچھ معتد بہ فائدہ نہیں کیونکہ شرع پر عمل کرنا کچھ اس کی مصلحت جاننے پر موقوف نہیں، تو یہ گمان بھی غلط ہے۔ کیونکہ اگر ان کے اس کہنے کا کہ ''اس کے مسائل نہایت باریک اور دقیق ہیں''۔ یہ مطلب ہے کہ ''اس کی تدوین بالکل ممکن ہی نہیں'' اس لئے غلط ہے کہ مسائل کے باریک وخفی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا، دیکھئے علم توحید کے مسائل کا احاطہ ان سے بھی مشکل اور ان کا ادراک ان سے بھی دقیق تر ہے تاہم ان کی تدوین خداوند تعالیٰ نے جس کے لئے چاہی آسان کر دی اور اسی طرح ہر علم ظاہر میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس میں بحث کرنا محال اور اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے لیکن جب اس کے لوازمات ومتعلقات میں کاوش کی جاتی ہے اور اس کے مقدمات بتدریج بتائے جاتے ہیں تو اس میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے قواعد کی تمہید اور اس کے متعلقات وفروعات کا استنباط آسان ہو جاتا ہے، اور اگر ان کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ''وہ کس قدر مشکل ہے'' تو یہ تسلیم! لیکن اشکال ہی سے تو بعض علما کو بعض پر شرف حاصل ہوتا ہے اور مطالب کو تو انسان محنت اور سختیوں سے ہی پاتا ہے اور علوم کی گردن پر تو آدمی عقل کے کام میں لانے اور فہم کے تیز کرنے سے ہی سوار ہوتا ہے اور جہاں تک ان کے اس کہنے کا تعلق ہے کہ سلف نے اس کو مدون نہیں کیا۔

تو میں کہتا ہوں کہ سلف کا تدوین نہ کرنا کچھ مضر نہیں کیونکہ نبی صلعم نے اس کے اصول وفروع مقرر کر دیئے اور فقہا صحابہ مثلاً امیر المومنین عمرؓ اور علیؓ اور زیدؓ اور ابن عباسؓ اور عائشہؓ وغیرہم

نے آپ کا اتباع کیا اور اس علم میں بحث کی اور اس کی وجوہات بیان فرمائیں، پھر اس کے بعد علما دین اور سالکان راہ یقین ہمیشہ اپنے مقابلوں کے سامنے جب کہ وہ شکوک وشبہات پیدا کرنے کی فتنہ انگیزی کرتے، خدا کے عطا کردہ علم میں سے بقدر ضرورت بیان فرماتے تھے اور اس طرح ان بدعتیوں کے لشکر کو مناظرہ و بحث کی تلوار سونت کر زیر وزبر کرتے تھے اور بے دینوں کے جھمگھٹ کو تتر بتر کرتے تھے اور ہم اب تک یہی بات مناسب سمجھتے ہیں کہ بہ نسبت اقوال متفرقہ کے اس فن کے اصول کا ایک کتاب میں یکجا مجتمع ہونا نہایت مناسب ہے، متقدمین کو اس فن کی تدوین کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ ان کا زمانہ آنحضرتؐ سے نہایت قریب تھا اور آپ کا فیض صحبت ان کو نصیب تھا اور اسی برکت صحبت سے ان میں اختلاف کم تھا اور عقیدے صاف تھے نیز ان کو ہر طرح کا اطمینان حاصل تھا کیونکہ وہ ہر اس بات میں جو آنحضرتؐ سے ثابت ہوتی، زیادہ دریافت وتفتیش نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی منقول کو معقول سے تطبیق دینے کا وہاں دستور تھا اس کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے گہرے علوم میں وہ معتبر علما سے استفسار کر سکتے تھے (اور وہ اس فن کی تدوین سے بالکل اسی طرح مستغنی تھے) جس طرح کہ (بسبب اس بات کے کہ ان کا زمانہ قرن اول یعنی زمانۂ نبوت سے نہایت قریب تھا اور راویان حدیث سے تو بالکل ملا ہوا تھا ان کی ہر بات دیکھتے اور سنتے تھے اور مشکل مسائل معتبر علما سے پوچھ سکتے تھے۔ اس وقت اختلاف بھی کم تھا اور موضوع احادیث کے روایت ہونے کا خوف بھی کم تھا) تمام فنون حدیث کی تدوین سے مستغنی تھے مثلا شرح غریب الحدیث، فن اسماء الرجال ومراتب عدالت رواۃ، فن مشکل الحدیث، واصول الحدیث ومختلف الحدیث وفقہ الحدیث، وتمیز الضعیف من الصحیح والموضوع من الثابت (۱)۔

اور یہ تمام فنون مذکورہ ایک مدت دراز کے بعد اس وقت مدون کئے گئے اور ان کے اصول وفروع اس وقت مقرر ہوئے جبکہ مسلمانوں کو ان کی ضرورت پڑی اور اسلام کی خیر خواہی انہی پر موقوف نظر آئی، پھر اس کے بعد فقہا کے درمیان احکام کی علتوں میں اختلاف کرنے کی وجہ سے

(۱) یعنی حدیث کے غیر مانوس الفاظ کی شرح، راویان حدیث کے نام ونسب وسیرت اور ان کی معتبر یا غیر معتبر ہونے کے مدارج، مشتبہ ومشکل احادیث کی شرح وحل حدیث کے اصول وقواعد، احادیث کے اختلاف کی تطبیق، حدیث سے مسائل کا استنباط وتفقہ، کمزور وضعیف احادیث کو صحیح احادیث سے علیحدہ کرنا اور بناوٹی وموضوع احادیث کو ثابت شدہ احادیث سے چننا اور چھانٹنا۔

کافی اختلاف واقع ہوا یہاں تک کہ علل احکام میں اس نظر سے بحث شروع ہوئی کہ ان میں کوئی مصلحت معتبر بھی ہے کہ نہیں اور یہ کہ ان سے وہ مصلحت کیسے حاصل ہو سکتی ہیں جو شرع میں معتبر ہیں اور مباحث دینیہ میں بہت سی جگہ دلائل عقلیہ سے تمسک کرنے لگے اور اعتقادی و عملی مسئلوں میں شکوک کرنے لگے اور پھر یہ بات پیدا ہوگئی منقولات کو دلائل عقلیہ سے مطابق اور مدلل کرنا اور سنی ہوئی باتوں اور سمجھی ہوئی باتوں میں مطابقت پیدا کرنا، دین کی پوری پوری حمایت اور اس کی کامل تائید و امداد سمجھا جانے لگا یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے تفرقہ دور کرنے میں اس کو سعی جمیل اور باعث تقرب الٰہی اور بڑی سے بڑی عبادت سمجھا جانے لگا، ان کا یہ کہنا کہ ''اس کی تدوین میں کچھ فائدہ نہیں''۔ بالکل غلط ہے ہم کہتے ہیں کہ اس میں بڑے بڑے فوائد ہیں۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔ اول یہ کہ اس سے آنحضرت صلعم کا ایک بڑا معجزہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت صلعم کو جیسا قرآن مجید عطا ہوا اس زمانہ کے بلغا اس سے عاجز آ گئے اور اس کی جیسی ایک سورت بھی بنا کر نہ لا سکے، پھر جب وہ زمانہ عرب العربا کا گزر چکا اور لوگوں پر اس کی وجوہ اعجاز مخفی ہوتی چلیں تو علما امت ان کے بیان و اظہار کے لئے آمادہ ہوئے تا کہ انھیں ہر ایک سمجھ جائے، اسی طرح آپ کو خدائی شریعت عطا ہوئی جو پہلی تمام شریعتوں سے کامل تھی اور جس میں ایسی ایسی مصلحتیں بھری ہوئی تھیں جن کی رعایت بشر سے محال ہے۔ اس کی خوبی کو آپ کے ہم زمانہ لوگوں نے تو ایک طرح کے نور معرفت سے پہچان لیا، یہاں تک کہ ان کی زبانوں پر اس کا اقرار اور ان کے محاورات اور تقریرات میں اس کا اظہار تھا لیکن اس زمانہ کے بعد یہ امر ضروری ہوا کہ آپ کی شریعت کی خوبیاں ظاہر کی جائیں تا کہ ہر شخص یقین کرلے کہ یہ شریعت آسمانی اور کامل ترین شریعت ہے اور یہ کہ بشر سے اس کا ظاہر ہونا اتنا بڑا اور اتنا مشہور و معروف معجزہ ہے کہ ذکر کا محتاج نہیں۔

دوم یہ کہ اس سے پورا پورا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ ابراہیمؑ نے خداوند تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ ''کیوں نہیں (اے اللہ! میں مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان تو رکھتا ہوں) لیکن صرف اس لئے (یہ مردوں کا زندہ ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں) کہ کسی طرح میرا دل مطمئن ہو جائے''۔ کیونکہ کثرت دلائل اور یقین دلانے کے مختلف طریقوں کے استعمال کرنے سے دل مضبوط اور اضطراب قلب دور ہو جاتا ہے، سوم یہ کہ طالب خیر جب نیکیوں میں انتہائی کوشش کرتا

ہے اور وہ ان کے مشروع ہونے کی وجہ سے بھی بخوبی جانتا ہے اور ان کے تقاضوں ولوازمات پر پوری طرح نگاہ رکھتا ہے تو وہ تھوڑی عبادت بھی اس کو بہت فائدہ دیتی ہے اور وہ اس کو خوب پکا ہو کر دیکھ بھال کرتا ہے اندھا دھند نہیں چلتا اور اسی لئے امام غزالیؒ نے کتب سلوک میں بڑی توجہ واہتمام کے ساتھ لوگوں کو اسرار عبادات سے روشناس کرایا ہے، چہارم یہ کہ فقہا کا بعض فروعی احکام میں اختلاف اس لئے ہے کہ ان کی علل قیاسیہ میں ان کا اختلاف ہے کہ کونسی علت مناسب اور کونسی نامناسب ہے (۱) پس تحقیق حق بغیر اس بات کے کہ ان کی مصلحتیں جانو، ہو ہی نہیں سکتی، پنجم یہ کہ بدعتی لوگوں نے بہت سے دینی مسائل میں شکوک وشبہات کرنے شروع کئے اور کہنے لگے کہ یہ عقل کے خلاف ہیں اور جو مسائل عقل کے خلاف ہوں ان کو یا تو رد کر دینا چاہئے یا کچھ تاویل کرنی چاہئے، چنانچہ عذاب قبر کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ یہ عقل وشعور کے خلاف ہے اور اسی طرح حساب، کتاب اور پل صراط اور ترازوئے اعمال میں کلام کر کے لچر اور دور از کار تاویلیں کرنے لگے اور غبار شکوک کو جہاں میں اڑا دیا، خلق خدا کو اس بلا میں پھنسا دیا کہ ایک فرقہ (اسماعیلیہ) نے تو شکوک وشبہات کا بڑا فتنہ برپا کیا کہنے لگے کہ کیا بات ہے کہ رمضان کے آخری دن کا روزہ تو واجب ہوا لیکن (اسی کے دوسرے دن) شوال کی پہلی تاریخ (عید الفطر) کا روزہ ممنوع وحرام کر دیا گیا؟ اور اسی طرح کی اور باتیں بنائیں اور ثواب وعذاب کی باتوں کا بھی مضحکہ اڑانے لگے کہ یہ محض ترغیب وتحریص (ابھارنے اور اکسانے) کی باتیں ہیں ورنہ درحقیقت کچھ نہیں یہاں تک کہ زمانہ کا ایک بد بخت بگین کی حدیث بنا کر مسلمانوں پر تعریض کرنے لگا کہ ان کی ہاں برے بھلے کی کچھ تمیز نہیں (۲)۔

اب فرمائیے ان مفاسد کے بند کرنے کے سوائے اس کے کہ ہر چیز کی مصلحت اور کچھ فوائد بیان کئے جائیں اور ان کے اصول قرار دیئے جائیں اور کیا صورت ہے جس طرح کہ یہود ونصاریٰ اور دہریوں وغیرہ کے مقابلہ میں کیا گیا۔ ششم یہ کہ فقہا کی ایک جماعت نے یہ فیصلہ

---

(۱) یعنی بعض مجتہدین بعض چیزوں کو نادرست اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اس کی علت نادرستی نکالتے ہیں اور بعض اسی کی ایک خوبی سمجھ کر اس کو درست کہتے ہیں، تو اس کی تحقیق بس اس فن کے بغیر ممکن نہیں۔ (۲) اس میں بد بخت سے مراد ابن راوندی ہے اس نے بگین کی مدح میں چند جھوٹیں حدیثیں اس لئے بنائی تھیں کہ مسلمانوں کی سادہ لوحی ثابت کرے کہ ان کے ہاں ہر روایت مسلم ہوتی ہے کچھ حقیقت کی طرف نظر نہیں کرتے۔

دے دیا کہ جو حدیث بھی کلی طور پر خلاف قیاس ہو اس کا رد کرنا جائز ہے۔ اس طرح تو بہت سی صحیح حدیثوں میں بھی خلل واقع ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا جیسے حدیث مصراۃ (۱) اور حدیث قلتین (۲)۔ پھر تو محدثین کو سوائے اس کے کہ ان کی مصلحتیں بیان کریں اور کچھ بن نہ آیا ان کے علاوہ اس فن کے اور بیشمار فائدے ہیں اور آپ دیکھئے گا کہ میں جہاں کہیں میدان بیان اور تمہید قواعد میں رواں ہوں گا تو کچھ حسب مقام ایسی ایسی باتیں کہوں گا جو کسی اہل مناظرہ اور کسی اہل کلام نے نہ کہی ہوں گی جیسے خدائے پاک کا حشر کے میدانوں میں مختلف صورتوں اور شکلوں میں تجلی فرمانا اور یہ کہ عالم عنصری کے علاوہ ایک اور ایسے عالم کا وجود میں ہونا جس میں اعمال اور معانی (مخفی چیزیں) جاکر اپنے مناسب ایک صورت جسمانی پیدا کرتے ہیں اور حوادث زمانہ زمین پر ظاہر ہونے سے پیشتر وہاں پیدا ہوتی ہیں (مراد عالم مثال) اور یہ اعمال کا ہیئت نفسانی (مثلاً شوق امید وخوف وغیرہ) سے ایسا لگاؤ رکھنا کہ درحقیقت یہی ہیئت موت کے بعد اور زندگی میں جزا وسزا کی باعث ہے اور یہ قضا وقدر کے اثر کا لازمی ہونا وغیرہ وغیرہ، اور آپ یہ بھی خیال رکھیں کہ میں ان باتوں کا جب قائل ہوا ہوں جبکہ اول میں نے آیات واحادیث وآثار صحابہ وتابعین کو ان کا مثبت ومؤید پالیا ہے اور ان کے لئے معین دیکھ لیا ہے اور اہل سنت کے ان خاص لوگوں کو جن کو علم لدنی ملا ہے ان کا قائل پالیا اور (یہ پایا کہ) انھوں نے اپنے بہت سے اصول وقواعد کی بنیاد انہیں پر رکھی ہے اور سنت

---

(۱) حدیث مصراۃ بخاری، مسلم، موطا امام مالک اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ جس کا یہ مطلب ہے کہ جو شیر دار جانور اونٹنی بکری بھینس وغیرہ کو زیادہ دودھ دینے والا دکھانے کے لئے اس کا دودھ تھنو میں روک کر فروخت کرے (تاکہ خریدار دھوکہ میں آکر زیادہ دام دے دے اور پھر خریدار کو دودھ دوہنے کے بعد اس کا حال معلوم ہوجائے) تو خریدار کو (تین روز تک) اختیار ہے کہ وہ اس جانور کو بہ مع ایک صاع تمر (سوا دو سیر چھوارے) یا اتنا اناج (بعوض دودھ) دے کر واپس کردے، فقہاء (حنفیہ) کہتے ہیں کہ حضرت کی ہر ادا کو راوی حدیث نہیں سمجھا اور نہ دودھ کے معاوضہ میں صاع تمر معنوی وصوری کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتا اگر اس کی قیمت جس قدر کہ ہو یا دودھ کے عوض دودھ واپس کرے یہ فرماتے تو ایک بات تھی۔ (اس حدیث کی بحث آگے ''باب البیوع الممنوع عنھما'' میں آئے گی۔ (۲) حدیث قلتین کو بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، احمد، دارمی اور دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ اس کا مضمون یہ ہے کہ جب پانی دو مشکیزہ کی مقدار کا ہو (جس کا اندازہ سات من ہے) تو ناپاک چیز سے ناپاک نہیں ہوتا'' اس حدیث کی صحت میں محدثین کو بہت کچھ کلام ہے جس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں خدا جانے شاہ صاحب نے کیا سمجھ کر اس کو صحیح کہہ دیا۔

دراصل کسی خاص مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ اہل اسلام باوجود اس بات کے کہ دین کی ضروریات کے سب قائل ہیں، بعض مسائل میں مختلف ہو کر مختلف فرقے ہو گئے اور وہ اختلافی مسائل دو قسم کے ہیں، پہلی قسم کے وہ ہیں جو قرآن کی صریح آیات واحادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اور سلف کے لوگ صحابہ وتابعین ان کے قائل ہیں پھر جب یہ زمانہ آیا کہ ہر شخص اپنی ہی رائے کا پابند ہونے لگا اور اپنے ہی خیالات فاسدہ کو پسند کرنے لگا تو ایک قوم نے ظاہر قرآن واحادیث کو نہایت مضبوط پکڑ لیا اور وہ عقائد سلف ہی پر قائم رہی اور قواعد عقلیہ کی موافقت اور مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کی اور جہاں کہیں کچھ دلائل عقلیہ بیان کئے بھی تو محض مخالف کے رد اور اپنے اطمینان کامل کے لئے بیان کئے۔ اس لئے کہ ان سے عقائد کا اثبات مقصود ہو، اس گروہ کا نام اہل سنت ہے لیکن ایک قوم نے جہاں کہیں ان کو اپنے عقلی ڈھکوسلوں کے مخالف پایا تو کوئی تاویل لچرسی کردی اور ظاہری معنی سے انحراف کیا، سوالِ قبر، اوزن اعمال، صراط پر چلنا، دیدار الٰہی اور کرامات اولیا، اسی قبیل کی ہیں یہ سب باتیں کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور سلف اسی پر قائم تھے لیکن ایک قوم کی عقل ان کے ادراک سے عاجز آ گئی اور وہ ان کا انکار اور تاویل کرنے لگی اور ایک قوم نے یہ کہا کہ گو ہم ان کی حقیقت نہیں جانتے مگر ان پر ایمان رکھتے ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان بھی لائے اور بفضل الٰہی ان کی حقیقت بھی ہم کو معلوم ہے اور دوسری قسم کے وہ مسائل ہیں جو نہ تو قرآن سے ثابت ہیں نہ احادیث سے اور نہ ہی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس میں کچھ گفتگو کی ہے، بس وہ یونہی نہ کئے ہوئے رکھے رہے پھر اس کے بعد وہ لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے ان مسائل میں یا تو دلائل عقلیہ پر نظر کر کے گفتگو کی جیسے ملائکہ پر انبیا علیہم السلام کی فضیلت کا مسئلہ یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت کا مسئلہ، یا اس وجہ سے ان مسائل میں گفتگو کی کہ ان پر جو چیزیں موقوف تھیں جو سنت سے ثابت ہیں جیسے امور عامہ کے مسائل یا کچھ جواہر واعراض کے مباحث کیونکہ مسئلہ حدوث عالم، ابطال ہیولیٰ، اور اثبات جز لا تجزی پر موقوف ہے(۱) اور یہ مسئلہ کہ خداوند تعالیٰ نے عالم کو بغیر کسی چیز کے توسط سے پیدا کیا ہے''۔

---

(۱) یہ حل بر سبیل مشہور حضرت شاہ صاحب مرحوم نے فرمایا ورنہ مسئلے حدوث عالم بغیر ابطال ہیولیٰ واثبات جز لا تجزی کی بھی ثابت ہے اس پر کچھ موقوف نہیں۔

اس قول حکما کے ابطال پر موقوف ہے کہ ''ایک چیز سے صرف ایک ہی چیز نکلتی، اور صادر ہوتی ہے'' اور ثبوت معجزات ''اسباب و مسببات میں لزوم عقلی کے ابطال پر موقوف ہے اور مسئلہ معاد جسمانی''، امکان اعادہ معدوم پر موقوف ہے، ان کے علاوہ اور بہت سے مسائل ہیں جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں، یا ان مسائل میں اس لئے اختلاف ہوا کہ جو چیز قرآن و احادیث سے تو ثابت ہے مگر اس کی تفصیل اور تفسیر میں نزاع واقع ہوا لیکن اس کی اصل میں سب کو اتفاق ہے جیسے خداوند تعالیٰ کی صفات سمع (سننا) و بصر (دیکھنا) کے ثبوت میں تو سب متفق ہیں لیکن اس کی تفصیل میں اختلاف ہے۔

چنانچہ ایک قوم نے تو یوں کہا کہ اس سے مسموعات و مبصرات (دیکھنے اور سننے کی چیزوں) کا جاننا مراد ہے (نہ کہ دیکھنا اور سننا) لیکن ایک قوم نے یہ کہا ہے کہ نہیں یہ دونوں صفات جداگانہ ہیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حی (زندہ) علیم (جاننے والا) مرید (ارادہ کرنے والا) قدیر (ہر چیز پر قدرت رکھنے والا) متکلم (کلام کرنے والا) ہونے میں تو سب کا اتفاق ہے لیکن ان کی تفسیر میں اختلاف ہے چنانچہ ایک قوم نے اس کی یہ تفسیر کی کہ (ان سے ان کے ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ ان سے ان کے غایات، اثرات اور افعال وغیرہ مراد ہیں اور ان ساتوں (مذکورہ بالا صفات اور رحمت غضب اور جود (سخاوت و بخشش) میں اس لحاظ سے کچھ بھی فرق نہیں ہے اور یہ کہ احادیث سے بھی ان کا یہ فرق ثابت نہیں، لیکن دوسری قوم نے یہ کہا کہ (نہیں بلکہ) یہ امور (خدا کی) ذات واجب میں موجود ہیں اسی طرح استواء علی العرش (تخت پر جلوہ افروز ہونا) وجہ (چہرہ و منہ) اور ضحک (ہنسی) پر تو مجملاً کسی قدر متفق ہیں لیکن اس کے بعد (ان کی تفسیر) میں اختلاف ہے، چنانچہ ایک قوم نے کہا کہ ان صفات سے وہ معانی، مطالب مراد ہیں جو ان سے خاص مناسبت رکھتے ہوں مثلاً استواء سے اس کا قبضہ، غلبہ و حکومت مراد ہے اور وجہ (منہ) سے اس کی ذات مراد ہے لیکن ایک قوم نے اس کو مطلق چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ ہم کو نہیں معلوم کہ ان سے کیا مراد ہے۔

میں اس قسم کے مسائل میں کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر اہل سنت و حدیث کے مطابق ہونے میں فوقیت نہیں دے سکتا، کیونکہ اگر خالص سنت پر عمل مطلوب ہو تو سرے سے ان مسائل میں غور و خوض ہی نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ سلف نے نہیں کیا، لیکن جب زیادہ بیان کی ضرورت

آپڑے تو یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ انھوں نے کتاب وسنت سے استنباط کیا ہو وہ سب کا سب صحیح اور راجح ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو انھوں نے موقوف علیہ سمجھا ہو تو وہ موقوف علیہ ہی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو انھوں نے غلط اور مردود ٹھہرایا ہو وہ کل کا کل غلط ہی ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو انھوں نے مشکل سمجھ کر متروک البحث سمجھا سو وہ درحقیقت مشکل ہی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو کچھ تفصیل وتفسیر انھوں نے بیان کی ہو وہ تمام کے تمام حق اور غیر کی تفصیل وتفسیر سے سراسر درست ہی ہو اور جبکہ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ پہلی قسم کے مسائل میں سنی ہونا ضروری ہے نہ کہ دوسری قسم کے مسائل میں چنانچہ آپ قسم دوم کے مسائل میں خود اہل سنت کو ہی باہم بہت سی جگہ مختلف پائیں گے جیسے اشاعرہ اور ماتریدیہ ہیں اور اسی لئے آپ بڑے بڑے ماہر علما کو بھی ہر زمانہ میں دیکھیں گے کہ وہ کسی بھی باریک سے باریک نکتہ اور دقیقہ کے بیان کرنے سے نہیں رُکے اور نہ کسی قسم کا گریز کیا بشرطیکہ وہ مخالف سنت نہ ہو گو متقدمین اس کے قائل ہوں یا نہ ہوں اور جب کہیں لوگوں کے راستے مختلف ہوں گے تو میں صاف روشن اور سیدھی راہ چلوں گا۔ ادھر اُدھر نہ دیکھوں گا اور نہ کناروں کو تاکوں گا بلکہ بیچوں بیچ چلوں گا اور لوگوں کی تفریعات وتخریجات کو بھی نہ لوں گا۔

اور یہ بھی دیکھئے کہ ہر فن کا ایک خاصہ اور ہر مقام کا ایک مقتضیٰ ہوا کرتا ہے، جس طرح فن غریب کے مناسب نہیں کہ وہ فن صحت وضعیف حدیث سے بحث کرے اور نہ حافظ حدیث کو لائق ہے کہ وہ فروعات فقہیہ اور ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینے واختیار کرنے سے بحث کرے بالکل اسی طرح حدیث کے اسرار ورموز سے بحث کرنے والے کو بھی زیبا نہیں دیتا کہ وہ ان باتوں میں کلام کرے، اس کی غرض وغایت اور مطمح نظر تو یہی ہے کہ وہ نبی صلعم کے قول کے وہ اسرار ورموز بیان کردے جو خود نبی صلعم نے اس میں ملحوظ رکھے خواہ وہ حکم محکم ہو یا منسوخ یا اس کے لئے کوئی اور دلیل متعارض ہو یا نہ ہو جس کسی وجہ سے فقہا نے اس کو مرجوح سمجھا ہو، ہاں! کسی فن کے مدون کو اس سے بھی چارہ نہیں کہ بعض وہ باتیں جو اس فن سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ہوں ان کو بیان کرے اور فن حدیث کے لئے بھی یہ بات موزوں ہے کہ اس میں وہ باتیں ذکر کی جائیں جو شہروں میں مدون شدہ احادیث اور آثار فقہا کے بعد درج ہوئی ہوں اور متابع علیہ کو متفرد بہ سے اور قوی وکثیر الروایہ کو ان کی کمتر سے ممیّز کیا جائے پھر بھی اگر کوئی بات تبعاً ذکر بھی ہوئی ہو تو مسائل

اجتہاد یہ اور حق بات کی تحقیق میں اہل علم کا کلام کرنا نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ کسی پر موجب طعن ہے۔ میں تو جہاں تک ہوسکتا ہے اصلاح کرنا چاہتا ہوں، باقی (اس میں) کامیاب ہونا نہ ہونا خدا کی مدد پر (موقوف) ہے میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں یہ بھی یاد رہے کہ جو بات مجھ سے خلاف قرآن وحدیث یا اہل قرن خیر کے مخالف یا جمہور مجتہدین کے خلاف یا مسلمانوں کے سوادِ اعظم (بڑی عام جماعت) کے برخلاف صادر ہو تو میں اس سے بری ہوں تاہم اگر مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوگئی ہو تو اس کو بھول چوک سمجھے جو کوئی ہم کو خواب غفلت سے بیدار کرے گا یا کوتاہیوں سے متنبہ کرے گا، خدا تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے گا باقی جو لوگ متقدمین کے کلام کو چرا کر کج بحثی کرتے ہیں اور اہل مناظرہ ومجادلہ کے نام سے منسوب ہیں ان کی ہر بات سے اتفاق کرنا یا ان کا اتباع کرنا ہمارے لئے کچھ ضروری نہیں ہے۔ وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی ہیں۔ کبھی انکا پلہ بھاری ہوتا ہے کبھی ہمارا۔

میں نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصے میں وہ قواعد کلیہ ہیں جن میں ایسی مصلحتیں مذکور ہیں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ کے تمام مذاہب میں مسلم الثبوت اور متفق علیہ تھیں اور کسی کو بھی ان میں اختلاف نہ تھا اور صحابہؓ کو گو ان کے دریافت کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی لیکن آنحضرت صلعم ان کو یہ مصلحتیں بتادیا کرتے تھے بالکل اسی طرح جیسے کوئی فروعات بتاتے وقت ایسے اصولوں کی طرف اشارہ کردے جن سے فروعات حاصل ہوتی ہیں۔ تاکہ بوقت ضرورت سامعین ان سے فروعات حاصل کرسکیں کیونکہ صحابہؓ نے ان نظیروں کو دیکھ لیا تھا جو اس زمانہ کے ملت اسماعیلیہ والے جاہل عرب اور یہود ونصاریٰ اور مجوسیوں میں پائی جاتی تھیں لہٰذا وہ اس فن میں خوب ماہر ہوگئے اور ان کو اس ہنر میں بڑا ملکہ حاصل ہوگیا میں نے یہ دیکھا کہ اگر تمام شرائع کے اسرار ورموز کی تفاصیل پر غور کیا جائے تو وہ دو اصولوں پر مبنی نظر آتی ہیں۔ ایک تو نیکی وبدی کا مبحث۔ دوسرے ملی وقومی سیاسیات کا مبحث، پھر یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ نیکی وبدی کی پوری پوری حقیقت جب ہی معلوم ہوسکتی ہے کہ ان سے پیشتر جزائے اعمال، طریقہ ہائے انتفاع اور سعادت نوعیہ کے مباحث معلوم ہوجائیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مباحث چند ایسے مسائل پر موقوف ہیں جن کو اس علم میں پہلے ہی تسلیم کرلیا گیا ہے اور جن کی حقیقت اس علم میں اس لئے بیان

نہیں ہوتی کہ ان کو ہر شخص خود بخود یا تو اس لئے تصدیق کرتا ہے کہ ہر مذہب میں وہ مسلم ہیں یہاں تک کہ وہ مشہورات میں شمار کئے گئے ہیں یا اس لئے کہ ان کے معلم کی نسبت حسن ظن ہے یا ان کے دلائل اس سے کسی اور اعلیٰ علم میں بیان ہو چکے ہیں، میں نے بخوف طوالت یہ ضروری نہ جانا کہ میں اپنی اس کتاب میں ''روح و نفس کا ثبوت و بقاء اور اس کا بدن سے الگ ہونے کے بعد رنج وراحت پانا'' ثابت کروں کیونکہ لوگوں کی کتابوں میں ان پر کافی بحث ہو چکی ہے البتہ ان مباحث میں سے میں نے صرف وہ مباحث ضرور ذکر کئے ہیں جن سے یا تو وہ کتابیں بالکل خالی تھیں یا ان کی وہ ترتیب و تفریعات نہیں کی گئی تھیں جن کی مجھ کو توفیق دی گئی اور مسلمات میں سے بھی وہی چیزیں ذکر کی ہیں جن کو (پچھلے) لوگوں نے نہیں لیا، اور دلائل مسموعہ (نقلی دلائل) بھی میں نے ان پر بہت کم بیان کئے ہیں، لہٰذا اس (اوّل) حصہ میں ہم وہی مسائل بیان کریں گے جن کو بلا استفسار طیت و مصلحت یہاں اس فن میں تسلیم کرنا ضروری ہے۔ پھر زندگی میں اور موت کے بعد جزائے اعمال کی کیفیت۔ پھر انتفاع کے وہ طریقے جو بنی آدم کے لئے جبلی و پیدائشی بنائے گئے ہیں اور کسی نے بھی ان کو اس طرح نہ لیا کہ ان کی عقل میں آسکیں۔ پھر انسان کی باعتبار اس کی نوع کے سعادت و شقاوت اور باعتبار آخرت کے بھلائی، پھر نیکی اور بدی کے وہ اصول جن پر ہر اہل مذہب کو اتفاق ہے پھر جو کچھ امت کی سیاست کے لئے تقرر حدود و شرائع سے واجب سمجھا گیا۔ پھر شرائع کے نبی صلعم کے کلام سے استنباط کرنے کی کیفیت اور دوسرے حصہ میں مندرجہ ذیل ابواب کی احادیث کے اسرار و رموز کی شرح بیان کی ہے۔

ابواب ایمان، ابواب علم، ابواب طہارت، ابواب صلوٰۃ، ابواب زکوٰۃ، ابواب صوم، ابواب حج،، ابواب احسان (نیکی)، ابواب معاملات، ابواب تدبیر منازل (امور خانہ داری و گھریلو انتظامات) ابواب سیاست مدن (ملکی سیاست) ابواب آداب معیشت (رہنا سہنا) اور چند مختلف ابواب (سیرت نبیؐ، فتنے، مناقب کے بارے میں) اب مقصود بیان کرنے کا وقت آپہنچا، سب طرح کی حمد و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے، شروع میں بھی اور آخر میں بھی۔

حصۂ اوّل: اس میں وہ قواعد کلیہ ہیں جن سے وہ مصلحتیں سمجھی جاتی ہیں جو کہ احکام شرعیہ میں ملحوظ رکھی گئی ہیں اس میں سات مبحث اور ستر باب ہیں (۱)۔

مبحث اول

تکلیف اور جزا وسزا کے اس باب کے بیان میں

پہلا باب: — ابداع (۲)، اور پیدا کرنے اور تدبیر کے بیان میں۔

واضح ہو کہ خداوند تعالیٰ کی خلق و عالم کے پیدا کرنے میں بالترتیب تین صفات ہیں جو ایک دوسرے پر مترتب ہیں (اوّل) ابداع ہے اور وہ کسی چیز کا بغیر کسی سے پیدا کرنا ہے اس طرح کہ وہ چیز پردۂ عدم سے بغیر کسی مادہ کے ظہور کرے، چنانچہ نبی صلعم سے کسی نے سب سے پہلی مخلوق کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ اللہ ہی تھا اور اس سے پہلے کوئی نہ تھا (۳) (دوم) پیدا کرنا اور وہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے پیدا کرنا ہے، جیسے آدمؑ کو مٹی سے اور جنوں کو بغیر دھوئیں کی خالص آگ سے پیدا کیا، اور عقل ونقل دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کو چند انواع اور چند اجناس میں ظاہر فرما کر ہر ایک نوع اور جنس کے لئے ایک خاصہ مقرر فرمایا ہے۔ مثلاً انسان کا خاصہ کلام کرنا، صاف جلد ہونا، سیدھا قد ہونا، اور مخاطب کی بات کو سمجھنا ہے لیکن گھوڑے کی نوع کا خاصہ ہنہنانا، جلد پر بال ہونا، ٹیڑھا قد ہونا اور کلام کا نہ سمجھنا ہے اور زہر کی یہ خاصیت ہے کہ جو اس کو کھاتا ہے ہلاک ہو جاتا ہے اور سونٹھ کی خاصیت گرم خشک ہے، اور کافور کی خاصیت سرد ہے اور

---

(۱) یہاں مصنف نے ستر باب کہے ہیں حالانکہ اصل میں اسی باب ہیں، شاید سہو ہو گیا۔ (۲) ابداع کے معنی کسی چیز کو نئے طرز پر بے نمونہ کے پیدا کرنا یعنی ایجاد کرنا۔ (۳) یہ روایت صحیحین کی ہے جو عالم کے حدوث زمانی پر دلالت نہیں کرتی مگر دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے یہ فرمایا کہ "اللہ ہی تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی" یہ روایت حدوث عالم پر دلالت کرتی ہے۔

اسی طرح معدنیات نباتات اور حیوانات کی دیگر تمام اقسام وانواع کا حال ہے اور خداوند تعالیٰ کا قانون اسی طرح رہا ہے کہ کسی چیز کا خاصہ اس سے جدا نہیں ہوتا اور متشخص افراد اپنے خواص کے حق میں اس طرح مخصوص اور متعین ہیں جس طرح ممیّزات انواع، خواص اجناس کے حق میں (۱)۔ اور اسی طرح ان چیزوں کے معانی واثرات کا حال ہے جو ہر خاص وعام میں مترتب ہوتی رہتی ہیں اور مخصوص طور پر بھی پائے جاتے ہیں اور عام طور پر بھی، مثلاً جسم، نامی، حیوان، اور انسان اور یہ خواص بھی ظاہراً تو باہم ملے جلے نظر آتے ہیں لیکن عقل ان کے درمیان فرق معلوم کر کے ان کی اصل چیز کے ساتھ (ان کا رشتہ) ملا دیتی ہے۔

نبی صلعمؐ نے بہت سی چیزوں کے خواص بیان فرمائے اور ان کے اثرات کی نسبت ورشتہ انہیں سے ملا دیا، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "تلبینہ (حریرہ) (۲) مریض کے دل کو فرحت وقوت بخشتا ہے"۔ اور یہ کہ "کلونجی سوائے موت کے ہر ایک مرض کے لئے شفا ہے" ایک جگہ فرمایا کہ اونٹ کا پیشاب ودودھ بدہضمی ودست کا علاج ہے اور فرمایا کہ "شبرم گرم ہوتا ہے (۳)۔ (سوم) صفت تدبیر عالم موالید (۴) ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ کی ہر چیز اس نظام کے موافق ہو جو اس کی حکمت پسند کرتی ہے اور اس مصلحت کے مطابق ہو جو اس کی رحمت چاہتی ہے، جیسے بادل سے پانی برسایا اور اس سے زمین کا سبزہ نکال کر اس کو ایک مدت معینہ تک کے لئے انسانوں اور چوپایوں کی زندگی کا سبب بنایا اور جیسے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکوا کر پھر آگ کو ان کے زندہ رکھنے کے لئے مناسب طور پر سرد کر دیا اور جیسے حضرت ایوبؑ کے بدن میں مرض کا مادہ جمع کیا اور پھر ایک ایسا چشمہ بنایا جس سے ان کا مرض دور ہو گیا اور جیسے خدا نے ایک بار اہل زمین پر نظر کی تو ان پر (ان کی بداعمالی کی وجہ سے) بہت غصہ ہوا پھر اپنے ایک نبی کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ وہ ان کو ڈانٹے اور (عذاب سے) چوکنا کر دے اور ان سے جہاد کرے (یہ اس لئے کیا) تا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جسے چاہے تاریکی (کفر) سے نکال کر روشنی (ایمان) میں لے آئے، اور تفصیل اس کی

(۱) یعنی جس طرح افراد باہم خصوصیات اور تعینات سے ممتاز ہیں، اسی طرح اجناس، انواع کی وجہ سے ممیّز وممتاز ہیں۔ (۲) یہ حریرہ آٹے یا بھوسی سے بنایا جاتا ہے کبھی شہد بھی ملا لیتے ہیں۔ سفیدی اور ملائمت میں دودھ کی مانند ہوتا ہے۔ (۳) شبرم چنے کی طرح ایک دانہ ہوتا ہے جس کو جوش کر کے اس کا پانی دوا کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ (۴) موالید آسمان وزمین کے اندر کی مخلوقات، نباتات، حیوانات اور معدنیات وغیرہ کو کہتے ہیں۔

یہ ہے کہ موالید میں ودیعت شدہ قوتیں جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتیں جب آپس میں ملتی اور ٹکراتی ہیں تو حکمت الٰہی ان میں سے ایسے مختلف اطوار واثرات پیدا کرتی ہے جن میں سے بعض تو جواہر ہوتے ہیں اور بعض اعراض۔ اور اعراض یا تو ذی نفس چیزوں کے اعمال ہوتے ہیں یا ارادے یا ان دونوں کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتے ہیں اور ان اطوار واثرات میں فی نفسہ کوئی شر (قباحت وبرائی) ان معنوں میں نہیں کہ جس چیز کو ان کا سبب چاہتا ہے وہ صادر نہیں ہو رہی یا یہ کہ جس کو ان کا سبب چاہتا ہے اس کے بالکل مخالف صادر ہو رہا ہے (۱) اور (یہ تو ایک عام اصول ہے کہ) اگر کسی چیز کے وجود میں آنے کے اصل سبب ومقصد پر غور کیا جائے تو وہ لامحالہ اچھی اور مفید نظر آئے گی، دیکھئے کسی چیز کا کاٹنا یا مثلاً لوہے کا کاٹنا اس وجہ سے اچھا اور حسن ہے کہ لوہے کے جوہر کا یہی تقاضا ہے گو اس لحاظ سے برا ہے کہ اس سے انسانی معاشرہ ختم ہو جاتا ہے، ہاں ان اشیا میں شر ان معنوں میں ضرور پایا جاتا ہے کہ ان میں ایسی چیز پیدا ہو جو اثرات کے لحاظ سے مصلحت میں پہلی چیز سے کمتر ہو (یعنی خوبتر کی جگہ کم درجہ کی چیز پیدا ہو) یا کوئی ایسی چیز سرے سے پیدا ہی نہ ہو جس کے اثرات عمدہ ہوں (۲) اور جب اس قسم کے شر کے اسباب تیار ہو جاتے ہیں تو خدا کی وسیع رحمت اور لطف عام اور قدرت کاملہ اور علم محیط کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ان قوتوں اور ان چیزوں میں جو ان قوتوں کی حامل و مالک ہیں، قبض، بسط، احالہ اور الہام کے ذریعہ سے کچھ تصرف کرے تاکہ ان سے ان کا اصل مقصد ومطلوب حاصل ہو جائے۔ قبض (۳) کی مثال وہ ہے جس کا اس حدیث میں ذکر ہے کہ "دجال مرد مؤمن کو دوبارہ قتل کرنا چاہے گا (۴)۔ لیکن خدا اس کو قتل کی قدرت نہ دے گا باوجودیکہ اسباب وسامان قتل سب اس کے پاس صحیح وسالم موجود ہوگا۔ اور بسط (۵) کی مثال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے فرشتہ کی ٹھوکر سے چشمہ پیدا کر دیا۔

---

(۱) ان کی اصطلاح میں شر کی دو صورتیں ہیں اول یہ کہ جس کو سبب چاہتا ہے وہ نہ ہو جیسے پانی کا تقاضا ٹھنڈک ہے وہ اس سے حاصل نہ ہو دوم یہ کہ جس کو سبب چاہتا ہے اس کے خلاف صادر ہو جیسے پانی سے گرمی پیدا ہو، (۲) یہاں شر کی دو اور صورتیں بیان فرمائیں اول یہ کہ ایک چیز سے جیسا عمدہ اثر پیدا ہوتا تھا ویسا نہ ہو بلکہ کم درجہ کا ہو، دوم یہ کہ اس سے کوئی عمدہ اثر ہی پیدا نہ ہو، یہ دو قسم کا شر تو موالید میں پایا جاتا ہے، لیکن پہلی دو قسم کا نہیں پایا جاتا۔ (۳) قبض سکیڑ لینا، سلب کر لینا۔ (۴) یہ مرد مومن وہ شخص ہے جو مدینہ سے دجال کے مناظرہ کے لئے نکلے گا۔ (۵) بسط پھیلا دینا، قوت دینا۔

حالانکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوا کرتا کہ محض ٹھوکر مارنے سے چشمہ جاری ہو جایا کرے اور اسی طرح اپنے بعض مخلص بندوں کو جہاد میں ایسے ایسے کاموں کی قدرت دی جن کا ان کے سے بدن والوں بلکہ ان سے دگنے تگنے بدن والوں سے سرانجام پایا عقل میں نہیں آتا (۱) اور جو احالہ (۲) ہے اس کی مثال یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ کو خوشگوار اور فرحت بخش ہوا بنا دیا تھا۔ اب رہا الہام (۳) تو اس کی مثال حضرت خضرؑ کا قصہ ہے کہ انھوں نے کشتی کو توڑا، دیوار کو سیدھا کیا اور لڑکے کو قتل کیا، نیز کتابوں اور احکام کا انبیا پر نازل ہونا بھی الہام ہے۔ اور الہام کبھی خود اس شخص کو ہوتا ہے جو اس معاملہ میں گرفتار (ضرورتمند) ہوتا ہے اور کبھی اس کے لئے کسی اور کو ہو جاتا ہے اور قرآن مجید نے تدبیر کی اتنی انواع واقسام بیان کی ہیں کہ ان سے زیادہ کوئی بیان ہی نہیں کرسکتا۔

دوسرا باب عالم مثال کے بیان میں

معلوم ہونا چاہئے کہ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس عالم عنصری (مادی دنیا) کے علاوہ ایک اور ایسا عالم موجود ہے جس میں معنوی (مخفی) چیزیں (مثلاً صفات انسانی وغیرہ) اپنی صفت کے مناسب جسم میں ظہور میں آتی ہیں اور زمین سے پائے جانے سے پیشتر ہر چیز پہلے وہاں موجود ہوتی ہے پس جب پائی جاتی ہے تب ایک طرح سے یہ وہی ہوتی اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا عام لوگوں کے نزدیک جسم نہیں ہے وہ وہاں آتی جاتی ہیں۔ لیکن لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں، چنانچہ نبی صلعم نے فرمایا کہ ''جب خدا نے رحم (۴) سے (رشتہ مہربانی) کو پیدا کیا تو وہ کھڑا ہو کر یہ کہنے لگا کہ یہاں اس کا ٹھکانا ہے جو قطع رحم کرنے (رشتہ توڑنے) میں تجھ سے ڈرتا اور تیری پناہ مانگتا ہے اور فرمایا کہ ''سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران قیامت کے دن اس طرح سے آئیں گی کہ گویا وہ دو بدلیاں یا دو چھتریاں اور سائے یا صف بستہ پرندوں کے دو غول ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والے کی طرف سے ہو کر گفتگو کریں گی''۔

اور فرمایا کہ ''قیامت کے روز سب اعمال آئیں گے، پہلے نماز آئے گی پھر صدقہ پھر

---

(۱) جیسے حضرت علیؓ کا قلعۂ خیبر کے دروازہ کو اکھیڑ دینا۔ (۲) احالہ ایک چیز کو کچھ سے کچھ کر دینا۔ (۳) الہام، وحی دل میں کسی بات کا القا کرنا۔ (۴) رحم آپس کی محبت اور نرمی یعنی صلۂ رحم۔

روزے الخ اور فرمایا کہ "نیکی اور بدی وہ مجسم چیزیں بن کر قیامت کے روز کھڑی ہوں گی نیکی تو اپنے کرنے والے کو خوشخبری دے گی اور بدی کہے گی بچو! بچو! لیکن وہ (بدلوگ) اس سے بچ نہ سکیں گے" اور فرمایا کہ "قیامت کے روز خداوند تعالیٰ تمام دنوں کو تو ہو بہو لائے گا لیکن جمعہ کے دن کو نہایت چمک دمک سے ظاہر کرے گا"۔ اور فرمایا کہ "دنیا قیامت کے روز ایک ایسی ادھیڑ عمر بڑھیا کی صورت میں لائی جائے گی جس کے نیلے نیلے دانت ہوں گے اور پھیلا ہوا بدنما منہ ہوگا"۔ اور فرمایا کہ "(اے لوگو) جس کو میں دیکھتا ہوں کیا وہ تم کو بھی نظر آتا ہے میں تو تمہارے گھروں میں مینہ کی طرح فتنے وفساد برستے دیکھتا ہوں (۱)۔ اور حدیث معراج میں یہ فرمایا کہ "یکا یک مجھ کو چار نہریں دکھلائی دیں دو باطنی اور دو ظاہری۔ تو میں نے پوچھا کہ اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ یہ دو باطنی نہریں جنت میں ہیں اور جو باقی دو ظاہری ہیں وہ نیل اور فرات ہیں"۔ اور سورج گہن کی حدیث میں آپ نے یہ فرمایا کہ "مجھ کو جنت ودوزخ کی صورت دکھائی گئی"۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ "قبلہ کی (یعنی سامنے کی) دیوار اور میرے درمیان (جنت ودوزخ کی صورت دکھائی گئی" اور اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ "آپ نے جنت (کے پھولوں) کا ایک خوشہ لینے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا" اور یہ بھی ہے کہ "آپ (دوزخ کی) آگ کی گرمی سے اف اف کرتے ہوئے پیچھے ہٹے اور اس آگ میں حاجیوں کے مال چرانے والے کو دیکھا اور اس عورت کو بھی دیکھا جس نے کسی بلی کو باندھ کر بھوکا پیاسا مارا تھا، اور جنت میں اس رنڈی کو دیکھا جس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ (آنحضرتؐ اور محراب مسجد کا) وہ (درمیانی) فاصلہ جنت ودوزخ کی اس مقدار کی جو سب کو معلوم ہے کہاں گنجائش رکھ سکتا ہے۔ اور ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ "جنت ایسی تکلیف دہ چیزوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں اور دوزخ ایسی لذت والی چیزوں سے جن کی نفس کو خواہش ہے (۲)۔

پھر جبرئیل نے کہا کہ لو اب ان کو دیکھو، اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "جب بلا نازل ہوتی ہے

---

(۱) یہ آپ نے اہل مدینہ سے فرمایا تھا، چنانچہ آپ کے بعد ایسا ہی ہوا، شہادت حسینؓ اور قتل حراء وغیرہ جیسے سخت سخت مصائب اہل مدینہ پر نازل ہوئے۔ (۲) یعنی جنت میں جانے کے لئے بڑی مشکلات جھیلنی پڑتی ہیں اور دوزخ میں جانے والا اس میں داخل ہونے سے قبل بڑے عیش وآرام اور بغیر کسی تکلیف کے رہ چکا ہوگا۔

تو دعا اس سے لڑتی اور اس کو روکتی ہے"۔ اور فرمایا کہ اللہ نے عقل کو پیدا کر کے یہ کہا کہ سامنے آ، تو وہ آ گئی اور پھر کہا کہ چلی جا تو وہ چلی گئی" اور فرمایا کہ "یہ دو کتابیں پروردگار عالم کی طرف سے (ارسال کردہ) ہیں (۱) اور فرمایا کہ "موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لا کر جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ہم نے مریم کے پاس اپنا ایک فرشتہ بھیجا تو وہ ان کو ایک جوان آدمی کی شکل میں دکھائی دیا"۔ اور حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جبرئیلؑ آنحضرتؐ کے پاس آتے تھے تو آپ ان کو دیکھتے تھے اور ان سے باتیں بھی کرتے تھے لیکن اور لوگوں کو وہ نظر نہیں آتے تھے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "مومن کی قبر ستر در ستر گز کشادہ ہو جاتی ہے اور کافر کی تنگ یہاں تک کہ اس کی پسلیاں الٹ پلٹ کر ادھر کی ادھر نکل جاتی ہیں اور یہ کہ "قبر میں میت کے پاس فرشتے آ کر اس سے سوال کرتے ہیں اور اس کے اعمال اس کو ایک خاص شکل میں نظر آنے لگتے ہیں"۔ اور یہ جانکنی کے وقت فرشتے آتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں یا تو ریشم ہوتا ہے یا ٹاٹ" (۲)۔ اور یہ کہ "قبر میں فرشتے میت کو لوہے کے گرزوں اور ہتھوڑوں سے اس طرح مارتے ہیں کہ اس (کافر) کی چیخ کو مشرق سے مغرب تک (سوائے جن و انس کے) سب سنتے ہیں"۔ اور یہ کہ "ہر کافر پر اس کی قبر میں ننانوے زہریلے اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں تا کہ وہ اس کو قیامت کے آنے تک نوچتے اور ڈستے رہیں"۔

اور فرمایا کہ "جب مردہ کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو اسے آفتاب غروب ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے تب وہ بیٹھ کر آنکھیں ملنے لگتا ہے اور فرشتوں سے کہتا ہے کہ مجھے چھوڑو تو سہی میں ذرا نماز تو پڑھ لوں"۔ اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ "خداوند تعالیٰ قیامت میں اہل محشر کو مختلف صورتوں میں اپنی تجلی دکھائے گا اور یہ کہ "نبی صلعم خداوند تعالیٰ کے پاس جائیں گے اور وہ اپنی کرسی پر (جلوہ افروز) ہوگا" اور یہ کہ "خداوند تعالیٰ ابن آدم سے دوبدو کلام کرے گا"۔ اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔

---

(۱) اس میں شاید اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں ذکر ہے کہ آپؐ دو کتابیں لیے ہوئے نکلے اور فرمایا کہ ایک کتاب میں تو جنتیوں کے نام ہیں اور ایک میں دوزخیوں کے۔ (۲) تا کہ مرنے والا اگر مومن صالح ہو تو اس کی روح ریشم میں لے جائیں اور اگر فاسق فاجر کافر ہو تو ٹاٹ میں لے جائیں۔

اب ان احادیث کا دیکھنے والا تین حال سے خالی نہیں یا تو ان کے ظاہری معنی کا مقر ہو کر ایک اور عالم ثابت کرے گا جس کا حال ہم نے ذکر کیا۔ چنانچہ اہل حدیث کا یہی دستور ہے جیسے علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے فرمایا کہ میں تو اسی کا قائل ہوں اور یہی میرا مذہب ہے' یا وہ یوں کہے گا کہ یہ چیزیں محض حسن بصر میں دکھائی دیتی ہیں اور اصل میں ان کا کچھ بھی وجود نہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی اس آیت اس روز کا انتظار کرو جس روز آسمان کھلا کھلا دھواں لائے گا'' کی تفسیر میں ایسا ہی کہا ہے کہ ان کے زمانہ میں قحط سالی ہوگئی تھی اس وقت جب کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو بھوک کی وجہ سے اس کو دھواں سا نظر آتا تھا۔ اور ابن ماجشون سے منقول ہے کہ جس حدیث میں بھی خداوند تعالیٰ کی نسبت قیامت کے روز نقل و حرکت کرنے یا رویت و تجلی کا ذکر آیا ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کی نگاہ بدل دے گا جس سے وہ اس کو آسمان سے اترتا اور تجلی کرتا دیکھیں گے اور یوں سمجھیں گے کہ وہ ان سے کلام کر رہا ہے حالانکہ وہ اپنی اسی عظمت سے ہے نہ اترتا ہے نہ کوئی اور نقل و حرکت کرتا ہے اور یہ سب اس لئے ہے کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔ یا یوں کہے گا کہ ان احادیث سے کچھ اور معنی مراد ہیں اور ان معنی کو سمجھنے کے لئے یہ مثالیں بیان کی گئی ہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ یہ تیسرا قول کسی اہل حق کا نہیں۔

امام غزالی نے عذاب قبر کے باب میں ان تینوں مقامات کی صورت (بہت اچھی طرح) بیان کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی احادیث کے ظاہری معنی تو صحیح ہیں لیکن ان کے اسرار و بھید مخفی ہیں اور اہل بصیرت پر یہ سب بالکل واضح ہیں، لہٰذا جس کو ان کے اسرار معلوم نہ ہوں اور اصل حقیقت کا علم نہ ہو تو اسے ان کے ظاہری معنوں کا انکار نہیں کرنا چاہئے بلکہ سچا جان کر تسلیم کر لینا چاہئے کیونکہ یہی ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے اگر کوئی یوں کہے کہ ہم نے کافر کی قبر کو بار ہا کھول کر دیکھا اور عرصہ تک اس کی لاش کو بھی قبر میں پڑے دیکھا لیکن یہ چیزیں ہم نے کبھی نہیں دیکھیں (۱)۔ پھر خلاف مشاہدہ چیز کی کیسے تصدیق کی جائے تو اس کا جواب یوں ہے کہ انسان کے ہر ایسی باتوں کی تصدیق کرنے میں تین حال ہیں۔ پہلا حال جو کہ سب سے زیادہ واضح، صحیح اور قابل تسلیم ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب باتیں اپنی جگہ موجود ہیں، بیشک اس کو سانپ اور اژدھا ڈس رہا ہے لیکن تجھ

---

(۱) یعنی ان پر ثواب و عذاب ہوتے نہیں دیکھا۔

کو ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا کیونکہ ملکوتی امور کے دیکھنے کی ان آنکھوں میں صلاحیت ہی نہیں اور جو چیز بھی آخرت سے تعلق رکھتی ہے وہ ملکوتی ہے، دیکھئے صحابہؓ نزول جبرئیل پر کس طرح سے ایمان رکھتے تھے حالانکہ وہ ان کو دیکھتے نہیں تھے، اور ان کا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ آنحضرتؐ جبرئیل کو دیکھا کرتے ہیں، پس اگر تم کو اس بات پر ایمان نہیں تو تمہارا ملائکہ اور وحی پر بھی صحیح طور سے ایمان لانا بڑا مشکل ہے (لہذا پہلے اس کی تجدید وتصحیح ضروری ہے) اور اگر تم کو ایمان ہے اور تمہارے نزدیک ممکن ہے کہ ایک چیز امت کو نظر نہ آئے لیکن آنحضرتؐ کو دکھائی دے تو پھر میت کی بابت اس کے تسلیم کرنے میں تم کو کیوں تردد ہے اور جس طرح فرشتے آدم اور حیوانات کے مشابہ نہیں اسی طرح وہ سانپ اور بچھو جو میت کو ڈستے ہیں ہمارے عالم (عنصری) کے سانپ وبچھوؤں کی طرح نہیں بلکہ وہ کسی اور جنس کے ہیں اور کسی اور قسم کی (قوت) جس سے ادراک (علم) میں آسکتے ہیں، دوسرا حال یہ ہے سونے والے کی حالت تو تم کو یاد ہوگی کہ وہ خواب میں سانپ کو ڈستے دیکھتا ہے اور اس کی تکلیف وایذا بھی اس کو محسوس ہوتی ہے جس طرح کہ جاگتے کو محسوس ہوتی ہے یہاں تک کہ تم اس کو چیختے ہوئے اور ماتھے پر پسینہ آتے ہوئے دیکھتے ہو اور کبھی وہ اپنی جگہ سے اچھل بھی پڑتا ہے یہ سب باتیں وہی دیکھتا اور محسوس کرتا ہے لیکن ظاہر میں تم اس کو وہیں خاموش پڑا دیکھتے ہو نہ اس کے گرد سانپ دکھائی دیتے ہیں نہ بچھو حالانکہ اس کے لحاظ سے سانپ بھی اس کے پاس موجود ہیں اور بچھو بھی اور تکلیف بھی اسے برابر محسوس ہو رہی ہے، لیکن یہ سب باتیں تمہارے لحاظ سے مشاہدہ سے باہر ہیں اور جب سزا وعذاب دراصل ڈسنے کی تکالیف سے ہوتا ہے تو پھر خیالی سانپ ہونے یا حقیقی سانپ ہونے سے (اس میں) کیا فرق پڑ جاتا ہے۔

تیسرا حال یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ سانپ بذات خود کچھ تکلیف وضرر نہیں دیتا بلکہ جس چیز سے تم کو درد وتکلیف پہنچتی ہے وہ اس کا زہر ہے، پھر زہر بھی بذات خود کچھ (باعث) تکلیف نہیں بلکہ اس سے جو اثر حاصل ہوتا ہے دراصل وہی (باعث) تکلیف ہے تو اگر سوائے زہر کے چاہے کسی اور چیز سے یہ اثر حاصل ہو تو وہ بھی ایک قسم کی تکلیف وعذاب ہوگا جو اس سے کسی طرح کم نہ ہوگا لیکن اس عذاب (کی تکلیف) کو بغیر ایسے سبب کی طرف نسبت دیئے بیان نہ کر سکو گے جس سے عام طور پر اسی قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے جیسے جماع کی لذت اگر انسان کو

بغیر عورت سے صحبت کیے حاصل ہو جائے تو وہ اس کی تعریف مباشرت کی طرف نسبت دیئے بغیر نہیں کر سکتا۔ اور یہ نسبت محض سبب کے اثر کی تعریف کے لئے کرتے ہیں اور اس لئے کہ سبب کا ثمرہ حاصل و معلوم ہو جائے گو سبب کی صورت حاصل نہ ہو اور سبب (بیان کرنے) سے اس کا ثمرہ بتانا مقصود ہوتا ہے بذات خود سبب (بیان کرنا) مقصود نہیں ہوتا اور انسان کی یہ (زندگی کی) خراب عادتیں ہی موت کے وقت اس کو ایذا اور الم دینے کے لئے موجود ہو جاتی ہیں اور ان کا درد و الم سانپ کے ڈسنے کے برابر ہوتا ہے۔ گو سانپ وہاں موجود نہ ہوں (۱)، یہاں تک کہ امام غزالیؒ کا کلام تھا جو تمام ہو چکا (۲)۔

تیسرا باب ملأ اعلیٰ (مقرب و معزز فرشتوں) کے بیان میں

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ "عرش کے اٹھانے والے اور جو اس کے اردگرد (ملائکہ) ہیں اس کی حمد و تعریف کے ساتھ اس کی پاکی و خوبیاں بیان کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں کے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو نے ہر چیز کو (اپنی) رحمت اور علم سے گھیر لیا ہے (یعنی ہر چیز پر تیری نظر رحمت ہے اور تو ہر چیز کو جانتا ہے) پس تو اپنے ان بندوں کو بخش دے جو تیری طرف رجوع رکھتے ہیں اور تیرے (سیدھے) راستے پر چلتے ہیں اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا، اے ہمارے خداوند! ان کو اور ان کے باپ داداؤں اور بیبیوں اولاد میں سے جو نیک ہو گیا ہو اس کو ان ہمیشگی کی جنتوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے کیونکہ تو ہی زبردست اور حکمت والا ہے اور (اے ہمارے خداوند) ان کو برائیوں سے بھی بچا اور جس کو بھی تو نے اس دن برائیوں سے محفوظ رکھا تو اس پر تو نے (بڑا رحم کیا اور یہی

---

(۱) امام غزالیؒ کے تیسرے حال کا یہ مطلب ہوا کہ سبب سے مقصود اس کا ثمرہ ہوتا ہے اور ثمرہ کبھی بغیر اس سبب کے بھی حاصل ہو جاتا ہے جیسے پانی کا گرم ہونا آگ کے سبب سے ہوتا ہے تو کبھی وہ دھوپ سے بھی گرم ہو جاتا ہے لہٰذا اس صورت میں یوں کہنا کہ آگ کا گرم پانی محض کیفیت کے بیان کے لئے ہے، پس اسی طرح ممکن ہے کہ سانپ کے ڈسنے کی تکلیف اس کی بدعادات و اعمال ہی سے حاصل ہو اور شرع نے سانپ کا ڈسنا محض کیفیت کے بیان اور توضیح کے لئے فرمایا ہو۔ (۲) امام غزالیؒ نے جو یہ تین حال ذکر کئے تو ان سے مقصود یہ ہے کہ یہ تین طریقے مخالف کو جواب دینے کے ہیں ورنہ حق حال اول ہی ہے، ان آیات سے مصنف کا مقصود فرشتوں کی ایک جماعت ثابت کرنا ہے جس کو ملأ اعلیٰ (بڑی کچہری مقرب و معزز فرشتے یا مجلس بالا) کہتے ہیں اور وہ خدا کے نیک بندوں کے حق میں دعائے خیر کرتے رہتے ہیں۔

سب سے بڑی کامیابی اور مراد ہے۔ رسول اللہ صلعمؐ نے فرمایا ہے کہ جب ''خداوند تعالیٰ عرش پر سے کوئی فرمان صادر فرماتا ہے تو ڈر کے مارے فرشتے اپنے بازو اور پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور وہ آواز ایسی ہوتی ہے جس طرح گھنٹال یا زنجیر کو صاف چکنے پتھر پر مارنے سے آواز پیدا ہوتی ہے پھر جب ان کے دلوں سے وہ خوف اور اضطراب دور ہو جاتا ہے تو آپس میں پوچھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے کیا ارشاد فرمایا تھا تو کہتے ہیں کہ (فلانی) حق (بات فرمائی) اور وہی بلند اور برتر ہے''۔

اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب خداوند تعالیٰ کچھ حکم دیتا ہے تو عرش کے اٹھانے والے فرشتے اس کی تسبیح (وپاکی بیان کرتے ہیں۔(۱)۔ پھر اس آسمان کے فرشتے جو ان (اوپر والوں) سے متصل ہیں (پھر اس کے بعد ان سے نیچے والے) یہاں تک کہ وہ تسبیح اس نیچ (دنیا) دنیا والے آسمان کے فرشتوں تک پہنچتی ہے، پھر عرش کے نیچے والے عرش کے اٹھانے والوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا تھا تب وہ ان کو وہ بات بتا دیتے ہیں جو خداوند تعالیٰ نے کہی ہوتی ہے پھر ایک آسمان والے دوسرے آسمان والوں سے پوچھتے ہیں کہ یہاں تک کہ (اس طرح) اس ورلے (دنیا والے) آسمان کے فرشتوں کو بھی وہ خبر پہنچ جاتی ہے اور ایک جگہ آپؐ نے فرمایا کہ میں تہجد کے لئے اٹھا تو وضو کر کے جس قدر خدا نے چاہا نماز پڑھی پھر نماز ہی میں اونگھ آ گئی اور میں سو گیا یہاں تک کہ جب خوب بوجھل ہو گیا اور گہری نیند آ گئی تو (خواب میں) کیا دیکھتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ نہایت پاکیزہ شکل میں تجلی فرما ہے، پس اس نے فرمایا کہ اے محمد! میں نے عرض کیا کہ اے پروردگار حاضر ہوں، فرمایا کہ ملأ اعلیٰ (مقرب ومعزز فرشتے) کس بارے میں گفتگو کر رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ مجھ کو خبر نہیں، اسی طرح تین بار فرمایا اور میں نے یہی جواب دیا، پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ دیکھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے اس طرح کہ اس کی انگلیوں کے سروں کی ٹھنڈک میری چھاتی تک کو محسوس ہوئی پھر وہ سب باتیں مجھ پر کھل گئیں اور اس طرح اس کا جواب بھی مجھ کو معلوم ہو گیا، پھر خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد! میں نے عرض کیا اے پروردگار! حاضر ہوں، پھر فرمایا کہ (اے محمد) ملأ اعلیٰ کس بارے میں گفتگو کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ کفارات کے بارے میں (۲) فرمایا کہ وہ کیا ہیں، میں نے عرض کیا

---

(۱) یعنی سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے ہیں۔ (۲) یعنی ان چیزوں کے بارے میں جن سے گناہ مٹتے اور معاف ہوتے ہیں۔

جماعت (میں شریک ہونے) کے لئے (مسجد کی طرف) چلنا اور مسجدوں میں نماز کے بعد (عبادت کے لئے) بیٹھنا، اور تکلیف (سردہوا) کے وقتوں میں بھی وضو اچھی طرح اور پورا پورا کرنا پھر فرمایا کہ کس بارے میں گفتگو کررہے ہیں؟ عرض کیا کہ درجات کے بارے میں (۱) فرمایا کہ وہ کیا ہیں عرض کیا کہ (مسکین کو) کھانا کھلانا، نرمی سے بات کرنا اور لوگوں کے سونے کے وقت نماز پڑھنا (یعنی تہجد) اور ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ ''خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے اور اس کو دوست بناتا ہے تو جبرئیلؑ کو بلاکر فرما تادیتا ہے کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو تم بھی اس سے محبت کرو، فرمایا کہ جبرئیلؑ بھی اس سے محبت کرتے ہیں، پھر آسمانوں میں منادی کردی جاتی ہے کہ فلاں شخص خدا کا محبوب ہے اس سے محبت رکھو۔ پس اس سے آسمان کے باقی تمام لوگ بھی محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لئے زمین میں بھی مقبولیت پھیلا دی جاتی ہے (یعنی اس کی محبت ان کے دلوں میں سما جاتی ہے) اور جب خدا کو کسی سے نفرت ہوتی ہے تو جبرئیل کو بلاکر یہ فرمادیتا ہے کہ مجھے فلاں سے نفرت ہے تم بھی اس سے نفرت کرو، فرمایا کہ پھر جبرئیل بھی نفرت کرنے لگتے ہیں اور پھر آسمان کے تمام لوگوں میں منادی کردی جاتی ہے کہ فلاں شخص سے خداوند تعالیٰ کو نفرت ہے تم سب بھی اس سے نفرت کرو، پس سب نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ نفرت زمین پر بھی پھیلتی ہے۔

اور فرمایا کہ ''جب تک تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھ کر وہیں اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے تو فرشتے اس کے لئے اس وقت تک دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ ایذا نہیں دیتا اور جب تک کہ حدث نہیں کرتا (۲) اور یوں کہتے ہیں کہ یاالٰہی! اس پر رحم فرمایا، الٰہی! اس کو بخش دے یاالٰہی اس پر رحمت سے توجہ فرما''۔ اور فرمایا کہ ''ہر صبح کو دو فرشتے اترتے ہیں ان میں سے ایک یہ کہتا ہے کہ یا الٰہی! دینے والے اور خرچ کرنے والے کو اس کے بدلہ میں اور دے (یعنی اس کو مالدار کر) اور دوسرا کہتا ہے کہ یاالٰہی! مال روک رکھنے والے (بخیل) کو ٹوٹا دے اور اس کا مال تباہ کر''۔

---

(۱) یعنی ان چیزوں کے بارے میں جن سے انسان کے درجے بلند ہوتے ہیں۔ (۲) یعنی جب تک اس کا وضو رہتا ہے فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اور ایذا سے بھی یہی وضو ٹوٹنا مراد ہے کیونکہ روحانیات کو بدبو سے ایذا ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ شرع سے یہ بات ثابت ہے کہ خداوند تعالیٰ کے کچھ عمدہ بندے ہیں جو کہ بلند مرتبہ فرشتے اور اس کے دربار کے مقرب لوگ ہیں جو شخص اپنے آپ کو نیک بناتا ہے اور اپنے نفس کو بھی تمام عیبوں سے پاک کر کے نیک و پاکیزہ اخلاق والا بناتا ہے اور لوگوں کی اصلاح و رفاہ عام میں کوشش کرتا رہتا ہے تو وہ فرشتے اس کے لئے ہمیشہ دعائے خیر کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کی یہی دعا ان پر رحمت و برکت کے نزول کا سبب بنتی ہے اور یہی فرشتے خدا کے نافرمان اور مفسد لوگوں پر لعنت اور بددعا کرتے ہیں اور ان کی یہ بددعا اور لعنت ایسے بدکار لوگوں کے دل میں حسرت و ندامت کے وجود کا سبب بنتی ہے۔ اور اسی کے سبب سے ملأ سافل (نچلے فرشتوں یعنی زمین و آخری آسمان والوں کے دلوں میں یہ بات الہام ہوتی ہے کہ اس بدکار سے بغض و نفرت رکھیں اور یہ کہ اس کے ساتھ برائی سے پیش آئیں یا تو دنیا میں (اس کے جیتے جی) ورنہ اس وقت جبکہ فطری موت کے سبب اس کے بدن کا ڈھانچہ اس سے جدا ہو جاتا ہے (اور اس کی روح نفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے) اور یہ فرشتے خداوند تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان بطور سفیر اور ایلچی کے کام کرتے ہیں اور بنی آدم کے دلوں میں نیک باتیں الہام کرتے رہتے ہیں یعنی وہ یہ کسی نہ کسی طریقہ سے دل کے نیک خیالات واردات کا سبب بن جاتے ہیں اور جس طرح خداوند تعالیٰ چاہتا ہے اور جس جگہ چاہتا ہے ان کو جمع کر کے ان کے اجتماعات قائم فرماتا ہے اور اسی (کیفیت و مقام کے) اعتبار سے ان کو الگ الگ ناموں سے پکارتے ہیں۔

کبھی تو ان کو رفیق اعلیٰ (بلند مرتبہ مصاحب) کہتے ہیں، کبھی ندی اعلیٰ (مجلس بالا) اور کبھی ملأ اعلیٰ (معزز و مقرب فرشتے و سردار) کہتے ہیں، نیک و مقرب لوگوں کی ارواح بھی ان میں شامل ہو کر ان ہی سے جا ملتی ہیں جیسے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے روح مطمئن! اپنے پروردگار کی طرف خوشی خوشی چلی آ، اور میرے بندوں میں جا مل اور میری جنت میں آ رہ، اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں نے جعفر بن ابی طالب کو فرشتہ کی صورت میں دیکھا کہ وہ جنت میں فرشتوں کے ساتھ دو پروں سے اڑ رہے تھے، (اور یہیں) ملأ اعلیٰ میں تمام فیصلے و احکام الٰہی نازل ہوتے ہیں اور وہ امور بھی یہیں متعین ہوتے ہیں جن کا خداوند تعالیٰ نے ''اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے''، ''دنیا کے تمام امور جو حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں اسی (مبارک) رات (لیلۃ القدر) کو تصفیہ

پاتے ہیں''۔اور اسی جگہ کسی نہ کسی طور پر تمام شرائع مقرر ہوتی ہیں، یاد رہے کہ ملأاعلیٰ کی تین قسمیں ہیں۔ایک قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر حق سبحانہ نے اپنے نظام خیر موقوف رکھا، لہٰذا (اسی بات کو ملحوظ رکھ کر) اس نے موسیٰ کی آگ کی طرح کے اجسام نوری پیدا کر کے ان میں ارواح پاک ڈالدیں (۱)۔دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو عناصر کے لطیف و خفیف بخارات میں ایک خاص قسم کے مزاج وآمیزش کے پیدا ہونے سے بنتے ہیں اور ان پر ان نفوس عالیہ کا فیضان ہونا ہے جو آلائش بہیمیہ سے جلدی الگ ہو جاتے ہیں، تیسری قسم ان نفوس انسانیہ کی ہے جو ملأ اعلیٰ سے بہت ہی قریب ہیں۔

اور وہ ایسے ایسے نیک اعمال کرتے رہتے ہیں جو ان (ملأاعلیٰ) سے جا ملنے کے لئے ان کے حق میں مد ثابت ہوتے ہیں اور آخر کار جب لباس بدن ان کی روح سے اتر جاتا ہے تو وہ انہی میں جا شامل ہوتے ہیں اور ان کا شمار بھی انہی میں ہونے لگتا ہے، اور ملأاعلیٰ کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنے پروردگار کی طرف متوجہ رہیں اور کوئی مشغلہ ان کو اس سے روک نہ سکے اور اس قول الٰہی کہ وہ (ملأ اعلیٰ) اپنے پروردگار کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں۔ اور اس پر (پورا پورا) ایمان بھی رکھتے ہیں۔کا یہی مطلب ہے اور خدا کی طرف سے ان کے دلوں میں یہ بات بھی ڈالی جاتی ہے کہ وہ نظام صالح (عمدہ انتظام) کو اچھا سمجھیں اور پسند کریں (جس کی کہ انہیں خدمت عطا ہوئی ہے) اور یہ کہ غیر صالح نظام کو (جو کہ خلاف الٰہی ہے) برا جانیں اور اس سے نفرت کریں اور اس کلام الٰہی کہ ''وہ مومنوں کے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں'' (۲)۔کا یہی مطلب ہے اور ملأ اعلیٰ کے جو بلند مرتبہ اور اعلیٰ لوگ ہوتے ہیں ان کے انوار اس روح کے پاس آکر جمع ہوتے اور آپس میں ملتے ہیں جس کا نبی صلعم نے بہت سے منہ اور زبانوں کی صفت سے وصف بیان فرمایا ہے پھر وہ سب مل کر وہاں بمنزلہ ایک چیز کے ہو جاتے ہیں اور اسی کا نام

---

(۱) موسیٰ وہ آگ جس کے واسطے وہ اندھیرے میں چلے تھے اور اس میں خدا نے تجلی کی تھی۔ (۲) یہ دوسری قسم کے اور (صالح مومن) اور اسماء ہیں کہ مرنے کے بعد یہ بھی ملائکہ مقربین کے ساتھ اس دربار اقدس میں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جا ملتے ہیں۔ فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر ہے جو لوگ بھی ہیں بہشت کے باغوں اور نہروں میں سچی (عزت کی جگہ) بادشاہ (دوجہاں) قادر مطلق کے مقرب ہوں گے۔

حظیرۃ القدس (پاک ومقدس پارلیمنٹ) ہے اور کبھی حظیرۃ القدس میں اس بات کا مشورہ ہوتا ہے کہ بنی آدم کے دینی اور دنیاوی امور کو سرانجام دینے کے لئے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے کسی ایسے شخص کی تکمیل اور اس کے حکم کی تعمیل لوگوں میں کرانی چاہئے جو اس زمانہ کے سب لوگوں سے افضل ہو پھر اس مشورہ کی وجہ سے مستعد لوگوں کے دلوں میں یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ اس کی فرمانبرداری کر کے ایک ایسی عمدہ قوم بن جائیں جو تمام بنی نوع انسان (کی ہدایت) کے لئے میدان عمل میں نکالے جانے کے قابل ہوں اور اسی مشورہ کی وجہ سے وہ علوم سکھلائے اور تلقین کئے جاتے ہیں جن سے قوم کی اصلاح اور ہدایت ہوتی ہے۔ یہ الہام کبھی وحی کے ذریعہ ہوتے ہیں کبھی خواب کے ذریعہ اور کبھی غیبی آواز کے ذریعہ اور کبھی اس طرح سے کہ حظیرۃ القدس کے لوگ اس شخص سے (یعنی نبی سے) دوبدو کلام کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے اس (نبی) کے احباء ورفقا یعنی اصحاب کی مدد ہوتی ہے اور ان کی بھلائی اور بہتری کے اسباب وامکانات بڑھتے جاتے ہیں اور اس کے مخالف اور اللہ کے راستے سے روکنے والوں پر لعنت ہوتی ہے اور ان کی تکلیف، ناکامی ونامرادی کے اسباب وامکانات بڑھتے جاتے ہیں اور من جملہ دیگر اصول نبوت کے یہ بھی ایک اصل ہے اور ان (فرشتوں) کے مستقل اور دائمی اجماع کو تائید روح القدس کہتے ہیں اور پھر اس مقام پر (اس سے) ایسی ایسی بیشمار برکتیں حاصل ہوتی ہیں جو عادت کے خلاف ہوتی ہیں اور عام طور پر کبھی ظاہر نہیں ہوتیں اور ان کو معجزات کہتے ہیں۔

ان ملأ اعلیٰ سے کم درجہ کے چند اور ایسے نفوس ہوتے ہیں کہ سعادت ازلیہ نے ان کو ملأ اعلیٰ کے درجہ تک تو نہیں پہنچایا ہوتا لیکن ان کے فیضان سے لطیف وخفیف بخارات میں ایک ایسا معتدل سا مزاج ضرور پیدا ہو جاتا ہے جو ان میں یہ کمال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اوپر سے فیوضات کے برسنے کے منتظر رہتے ہیں، چنانچہ جب بھی جو کچھ قابل اور اس کی استعداد اور فاعل کی تاثیر کے موافق، ان پر برستا ہے تو وہ اپنے ذاتی ارادے سب مٹا کے اور اسی کی تعمیل میں جان لڑا کے اس کے سرانجام دینے کے لئے ایسے آمادہ ہو جاتے ہیں جس طرح چرند پرند اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، لہٰذا ان کا یہ کام ہے کہ وہ انسانوں اور جانوروں کے دلوں میں اثر پیدا کر کے ان کے ارادوں اور خیالات کو اس امر کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو ان کی مراد

مقصود کے مناسب ہوتا ہے اور بعض طبیعاتی چیزوں کی سرعت حرکات اور تبدلات میں بھی اثر کرتے ہیں۔ جیسے اگر کوئی پتھر حرکت کرتا ہے اور لڑھکتا ہے تو کوئی بزرگ فرشتہ اس کو عادات سے زیادہ تیز کر دیتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شکاری دریا میں جال ڈالتا ہے تو فرشتوں کی ایک جماعت بعض مچھلیوں کے دل میں یہ بات ڈالتی ہے کہ اس میں آ پڑو اور بعض کے دل میں یہ بات ڈالتی ہے کہ بھاگ جاؤ، اور بعض فرشتے رسی کو کھینچتے ہیں اور بعض پھیلاتے ہیں ان (مچھلیوں) کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم یہ کیوں کر رہے ہیں بلکہ وہ الہام کی تابع ہوتی ہیں اور کبھی دو لشکر آپس میں لڑتے ہیں تو فرشتے آ کر ان کے دلوں میں شجاعت ثابت قدمی اور غلبہ پانے کی تدبیریں اور اسی قسم کے خیالات جن سے تیر اندازی اور گولہ باری کی تدبیریں بن آئیں، لا ڈالتے ہیں اور دوسروں کے دلوں میں اس کے برخلاف خیالات (مثلاً بزدلی، ہراسانی اور بدحواسی) پیدا کرتے ہیں تاکہ مقدر کی بات ظاہر ہو جائے اور کبھی ان کو انسان کو راحت و آرام یا رنج والم پہنچانے کا حکم ہوتا ہے تو وہ اس میں بھی ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں اور ان (فرشتوں) کے برخلاف ایک اور جماعت بھی ہوتی ہے جن کے کام میں ہلکا پن، ڈر اور برائی ہوتی ہے وہ (جماعت) سڑے ہوئے تاریک بخارات سے پیدا ہوئی ہے، اور ان کو شیاطین کہتے ہیں (۱)۔ اور یہی وہ شیاطین ہیں جو ہمیشہ ان فرشتوں کی کوشش کے خلاف کوششیں کرتے رہتے ہیں، واللہ اعلم۔

چوتھا باب تبدیل نہ ہونے والی سنت الٰہی کے بیان میں

جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ ''تم خداوند تعالیٰ کی سنت وطریقہ کو بدلنے والا نہ پاؤ گے'' واضح ہو کہ خداوند تعالیٰ کے بعض افعال ان قوتوں پر جو عالم میں رکھے گئے ہیں کسی نہ کسی طرح سے مترتب ہوتے ہیں، عقل ونقل دونوں اس پر شاہد ہیں، رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو تمام زمین کی مشت خاک سے پیدا کیا ہے، اسی وجہ سے بنی آدم اس مٹی کے موافق، سرخ اور سیاہ اور ان کے بین بین اور نرم (خو) اور سخت (دل) اور برے اور اچھے پیدا ہوئے، ایک دفعہ عبداللہ بن سلامؓ نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! بچہ کس وجہ سے باپ یا ماں کی طرف کھنچ

(۱) یہاں سے معلوم ہوا کہ شیاطین ایک ایسی جماعت کا نام ہے جو مادہ ظلماتی سے پیدا ہوئی ہے اور برائی کرنا ان کا کام ہے۔ نہ یہ کہ شیاطین انسان کی بری قوتوں کا نام ہے جیسا کہ بعض ہمعصر کہتے ہیں۔

آتا ہے یعنی اس کے مشابہ پیدا ہوتا ہے، تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ جب باپ کی منی ماں کی منی سے پیش قدمی کرتی ہے تو باپ کے مشابہ ہو جاتا ہے اور جب ماں کی منی پیش قدمی کرتی ہے تو ماں کے مشابہ ہو جاتا ہے اور اس میں تو کسی کو بھی شک نہیں کہ موت تلوار کی ضرب یا زہر کھانے سے واقع ہوا کرتی ہے اور یہ کہ بچہ کی پیدائش اور بناوٹ رحم، اور منی میں آگے آنے سے ہوا کرتی ہے۔ اور یہ کہ اناج اور درخت، تخم ریزی اور آب، پانی کے بعد اگا کرتے ہیں اور اسی استطاعت کی وجہ سے انسان کو (شریعت کا) مکلّف بنایا گیا اور اس کو اوامر ونواہی بنا کر اعمال کی جزا وسزا کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے اب ان قوتوں کی (جن پر خداوند تعالیٰ کے بعض افعال کسی نہ کسی طرح مترتب ہوتے ہیں، چند اقسام ہیں۔ بعض ان میں سے عناصر کے خواص اور طبائع ہیں (مثلاً گرمی، خشکی، تری وغیرہ) اور بعض ان میں سے وہ احکام ہیں جو خداوند تعالیٰ نے ہر صورت نوعیہ میں رکھے ہیں اور بعض ان میں سے عالم مثال کے احوال اور وہ وجود ہیں جن کا زمین پر پائے جانے سے پیشتر وہاں حکم ہو چکا ہوتا ہے، اور بعض ان میں سے ملأ اعلیٰ کی وہ دعائیں ہیں جو شریف النفس اور مصلح لوگوں کے لئے بڑی جدوجہد سے مانگتے ہیں اور انہیں کی وہ بد دعائیں ہیں جو وہ اس کے برخلاف لوگوں (یعنی دوسروں) کے واسطے مانگتے ہیں، اور بعض ان میں سے وہ احکام شریعت ہیں جو بنی آدم پر مقرر ہوئے ہیں اور ان سے واجب وحرام امور کا علم ہوتا ہے پھر انہیں کی وجہ سے مطیع وفرمانبردار شخص کو تو ثواب ملتا ہے اور عاصی ونافرمان کو عذاب اور بعض ان میں سے یہ ہے خداوند تعالیٰ کسی چیز کے ہونے کا حکم دیتا ہے تو پھر اس سے کوئی اور بات بھی پیدا ہو جاتی ہے جو پہلی چیز کے وجود میں لانے کے لئے ضروری ہوتی ہے کیونکہ سنت الٰہی نے ان کو لازم وملزوم بنا دیا ہوتا ہے اور اس وجہ سے کہ خداوند تعالیٰ کو عمدہ نظام (کائنات) کا درہم برہم کرنا منظور نہیں، اس کی سند نبی صلعم کی یہ تحریر ہے کہ "جب خداوند تعالیٰ کو یہ منظور ہوتا ہے کہ فلاں شخص فلاں جگہ مرے تو وہاں اس کے جانے کے لئے کوئی نہ کوئی حاجت پیدا کر دیتا ہے"۔

یہ سب باتیں احادیث اور عقل سے ثابت ہیں (۱)۔ اور یہ بھی معلوم رہے کہ جب وہ

(۱) اس بات کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خدا کی عادت جس کو سنت اللہ کہتے ہیں یوں جاری ہے کہ وہ عالم کی قوتوں پر اپنا فعل مرتب کرتا ہے، دیکھئے تلوار کی ضرب جو ایک شخص کی قوت یا فعل ہے جب اس سے (بقیہ صفحہ ۹۷ پر)

اسباب جن پر حسب عادت الٰہی قضا و حکم کا جاری ہونا مترتب ہوتا ہے باہم متعارض ہو جائیں اور ان سب کے تقاضے اور مقصد پورے نہ ہوں تو اس وقت حکمت یہی ہے کہ جس میں خیر (بہتری) زیادہ پائی جائے اسی کی رعایت کی جائے (یعنی وہی کام وقوع پذیر ہو) اور جو میزان (ترازو) کے متعلق حدیث میں کہا گیا ہے کہ ترازو خدا کے ہاتھ میں ہے جس پلڑے کو چاہتا ہے اونچا کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے نیچا کر دیتا ہے (۱)۔ اس سے اور جو شان (کام) کے بارے میں اس آیت میں مذکور ہے کہ ''وہ (خدا) ہر وقت کسی نہ کسی کام میں (مصروف) رہتا ہے اس سے، دونوں سے یہی مراد ہے۔ (۲) اور کبھی ترجیح قوت اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی مترتبہ آثار و نتائج کے نفع کے اعتبار سے ہوتی ہے (۳)۔ اور اسی طرح خلق (پیدائش) کو تدبیر و انتظام پر ترجیح دیجاتی ہے اس کے علاوہ (ترجیح کی) اور بہت سی وجوہات ہوتی ہیں، اور ہم کو تعارض اسباب کے وقت اچھی طرح سے یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں کونسا حق ہے، لیکن یہ بات قطعاً جانتے ہیں کہ جو چیز پائی گئی اور وجود میں آئی اس کا وجود میں آنا اور پایا جانا ہی بہتر تھا اور اسی میں برکت تھی اور ہماری اس تقریر پر غور کرنے سے بہت سے اشکالات دور ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کواکب و ستاروں کی ہیئت و کیفیت کا تعلق ہے تو اس کے بعض اثرات تو ضرور ہوتے ہیں جیسے گرمی سردی کا بدلنا اور رات دن

(بقیہ صفحہ ۹۶ سے آگے) سرزد ہوتی ہے تب خداوند تعالیٰ موت کو جو اس کا فعل اس پر مرتب کرتا ہے الغرض سنت اللہ یہ ہے مگر وہ اسباب سے کام کرتا ہے اگر چہ پیاس کو بغیر پانی کے بجھا سکتا ہے اور بچہ کو اس کے باپ کے نطفہ کے بغیر پیدا کر سکتا ہے مگر عادت یوں ہی ہے کہ اس کو پانی سے بجھاتا اور اس کو نطفہ سے وجود میں لاتا ہے۔ ان اسباب کی جو قوائے عالم میں ہیں چند اقسام ہیں جن کو بہ لفظ بعض شمار کیا گیا ہے اول خواص عناصر ہیں (جیسے آگ کی حرارت پانی کی ٹھنڈک) جو کسی چیز کے گرم یا سرد ہونے کے اسباب بن جاتے ہیں اور وہ گرم اور سرد کرنا ان کا فعل نہیں بلکہ خدا کا ہے، دوم صورت نوعیہ کے احکام مثلاً صورت نوعیہ ہونے کا یہ حکم ہے کہ وہ خشک کرتی ہے لہٰذا یہ خشک کرنا جو بسبب ہوا کے حاصل ہوا خدا کا فعل ہے، اسی طرح ملأ اعلیٰ کی دعا خیر و شر کے لئے اور احکام الٰہی کا کرنا یا نہ کرنا مثلاً چوری کرنا عذاب کا اور صدقہ دینا ثواب کا سبب ہو جاتا ہے البتہ ستاروں کی گردش انسان کی سعادت نحوست یا قحط و ارزانی کا سبب نہیں، یہ محض جہلا کے تخیلات میں اسی طرح اور بہت سے جاہلوں کے ڈھکو سلے ہیں۔ (۱) یعنی مقدور کے رزق و عمل کو کچھ زیادہ کرنا ہے بعض نے کہا کہ ترازو کے اونچا کرنے سے رزق کا زیادہ کرنا مراد ہے اور نیچا کرنے سے اس کا کم کرنا مراد ہے۔ (۲) یعنی جانب خیر کی رعایت کو ملحوظ رکھنا۔ (۳) یعنی کبھی وہ ظاہر ہوتی ہے جس کے اسباب قوی ہوتے ہیں اور کبھی وہ ظاہر ہوتی ہے جو نفع میں زیادہ ہوتی ہے۔

کا بڑا چھوٹا ہونا آفتاب کی مختلف تبدیلیوں کے باعث ہوتا ہے اور جیسے مدو جزر (جوار بھاٹے) کا گھٹتے بڑھتے رہنا، چاند کے گھٹنے بڑھنے کے مطابق ہوتا ہے اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ ''جب ثریا (نامی تارہ) طلوع ہوتا ہے تو آفت دور ہو جاتی ہے''۔ یعنی عادت یونہی جاری ہے لیکن تنگدستی وتونگری، ارزانی وقحط اور زندگی کا ستاروں کی خاص خاص حرکات کے باعث وقوع پذیر ہونا شرع سے ثابت نہیں بلکہ نبی صلعم نے اس بارے میں دماغ صرف کرنے تک سے منع فرمایا ہے چنانچہ فرمایا کہ ''جس نے کوئی شعبۂ نجوم کا حاصل کیا تو اس نے گویا ایک شعبہ سحر (جادو) کا حاصل کیا (جو قطعی حرام ہے) اور جہلائے عرب کے اس قول میں تو نہایت ہی تشدد فرمایا ہے کہ ہم پر فلاں فلاں تارے کے نور (۱) (غروب ہونے یا طلوع ہونے) سے بارش ہوئی اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ شریعت محمدیہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ستاروں میں کوئی ایسی خاصیت نہیں رکھی جس سے بواسطہ تغیر ہوا (جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے) کوئی حادثہ پیدا نہیں ہوتا یا کوئی اور اس طرح کی بات ظہور میں نہیں آتی اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ نبی صلعم نے کہانت سے منع فرمایا ہے (اور کہانت جنوں سے پوچھ پوچھ کر غیب کی خبریں دینے کو کہتے ہیں) اور کاہن کے پاس جانے والے اور اس کی تصدیق کرنے والے سے بڑی بیزاری ظاہر فرمائی ہے، پھر جب کاہنوں کی حقیقت حال جو پوچھی گئی تو یوں فرمایا کہ ''جو قضائے آسمانی میں بعض فرشتے کچھ باتیں قضا وقدر کی ذکر کرتے ہیں تو شیاطین وہ بات لے بھاگتے ہیں، پھر اس کو کاہنوں سے کہتے ہیں آگے وہ ایک سچ میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں سے بیان کرتے پھرتے ہیں''۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''اے مومنو! ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے کفر کیا اور اپنے ان بھائیوں کے بارے میں جو سفر پر یا لڑائی پر نکلے تھے (اور مارے گئے تھے) یہ کہا کہ اگر (ہمارے) وہ (بھائی) ہمارے ہی پاس رہتے اور باہر نہ نکلتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے'' اور نبی صلعم نے فرمایا ہے کہ تم کو (صرف) تمہارا عمل

(۱) نور طلوع وغروب کو کہتے ہیں ایک ستارے کا مغرب میں غروب ہونا اور اسی وقت مشرق میں دوسرے ستارے کا جو اس کے مقابل طلوع ہوا، یہ موقع سال بھر میں اٹھائیس دفعہ ہوتے ہیں زمانہ جاہلیت میں عرب کو یہ خیال تھا کہ ایک ستارے کے طلوع اور دوسرے کے غروب ہوتے وقت بارش یا ہوا کا ہونا ضروری ہے اسی وجہ سے وہ بارش کو اسی تارے کی طرف منسوب کرتے تھے جس کے طلوع کے وقت ہوتی تھی اور مندرجہ بالا قول کہے تھے جس سے حضرت صلعم نے منع فرمایا۔

جنت میں نہیں لے جائے گا (بلکہ خدا کا فضل بھی کوئی چیز ہے اور فرمایا کہ تم تو مہربان ساتھی، (رفیق) ہو، اور طبیب اللہ ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ منع کرنے میں بہت سی مصلحتیں اور بیشمار فوائد ہیں۔ واللہ اعلم۔

پانچواں باب حقیقت روح کے بیان میں

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''(اے محمد) لوگ تم سے روح کا حال دریافت کرتے ہیں، تو کہدو کہ روح تو اللہ کے حکم سے ہے اور تم کو (اس کے بارے میں) تھوڑا سا علم دیا گیا۔'' اعمش ؒ نے بروایت ابن مسعودؓ وما اوتیتم کی جگہ وما اوتوا پڑھا ہے (بصیغہ غائب) جس کے یہ معنی ہوئے کہ ''ان کو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے'' پس یہاں سے صاف معلوم ہوگیا کہ یہ کلام ان یہودیوں کے مقابلہ میں ہے۔ جو آپ سے حقیقت روح دریافت کرتے تھے اور اس آیت سے صاف طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ امت مرحومہ میں سے کسی کو روح کی حقیقت معلوم ہی نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس چیز کے بیان سے شارع نے سکوت کیا ہو اس کا علم کسی کو ممکن ہی نہ ہو، بلکہ بسا اوقات بعض چیزوں (کے بیان) سے اس لئے سکوت اختیار کیا گیا کہ وہ دقیق الفہم ہیں ہر شخص ان کو سمجھ نہیں سکتا، چاہے کوئی ان کو سمجھ سکتا ہو۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سب سے پہلی چیز جو کہ حقیقت روح کی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ روح ایک ایسی چیز ہے جو جاندار کی زندگی وحیات کا مبدأ اور منبع ہے اس کے (بدن کے) اندر رہنے سے جاندار زندہ اور باہر نکل جانے سے مردہ ہوجاتا ہے پھر ذرا اور غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدن میں کچھ ایسے لطیف وخفیف بخارات ہیں۔ جو خالص اور صالح اخلاط (مرکبات جسمانی مثلاً خون، بلغم، سودا، صفرا) سے قلب میں پیدا ہوتے ہیں اور قوائے حساسہ ومحرکہ ومدبرہ غذا (بدن) کو اٹھائے پھرتے ہیں اور ان میں طب کا حکم چلتا ہے اور تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بخارات کا رقیق (پتلا) اور غلیظ (گاڑھا) صاف اور مکدر ہونا ان (مذکورہ) قوئ پر اور جو افعال ان قوی سے پیدا ہوتے ہیں ان پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی عضو پر یا ان بخارات کی پیدائش وبناوٹ پر جو اس عضو سے خاص مناسبت رکھتے ہیں کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ ان بخارات میں بگاڑ، اور ان کے افعال میں گڑبڑ پیدا کردیتی

ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بخارات کا پیدا ہونا حیات کا اور تحلیل ہونا، موت کا باعث ہوتا ہے، بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روح یہی بخارات ہیں لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بخارات تو روح کا ادنی طبقہ ہیں اور ان کو بدن سے وہ نسبت ہے جو بو کو گل سے یا آگ کو کوئلہ سے ہوتی ہے، پھر جب ذرا اور غور کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بخارات روح نہیں بلکہ روح حقیقی کا مرکب اور اس کے (بدن سے) متعلق ہونے کا مادہ ہے اور دلیل اس پر یہ ہے کہ ہم بار ہا دیکھتے ہیں کہ لڑکا جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہوتا ہے اس کے اخلاط بدن (جسمانی مرکبات مثلاً خون بلغم وغیرہ) بدلتے جاتے ہیں اور جو روح اور بخارات ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی پہلے سے ہزار گنا زیادہ ہو جاتے ہیں پھر وہ لڑکا کبھی چھوٹا ہوتا ہے کبھی بڑا کبھی سیاہ ہوتا ہے۔ کبھی سفید، کبھی عالم ہوتا ہے کبھی جاہل، اس کے علاوہ اور صدہا حالات اس کے بدلتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ شخص وہی کا وہی رہتا ہے۔ اگر یہاں کوئی (اس کے حالات کے تبدیل ہونے اور نہ ہونے میں حیل و حجت کرے تو ہم یوں کہتے ہیں کہ ہم ان تغیرات کو فرضی طور پر تسلیم کر لیتے ہیں ورنہ اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ اس کے حالات متغیر ہوتے رہتے ہیں حالانکہ وہ وہی رہتا ہے یا یوں کہیں گے کہ ان احوال کے بحال خود باقی رہنے کا تو ہم کو کسی طرح یقین نہیں لیکن اس لڑکے کے بحال خود باقی رہنے کا یقین کامل ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ حالات اس کے عوارض ہیں وہ خود نہیں (پس) ثابت ہوا کہ جس چیز سے انسان (زندہ) وقائم رہتا ہے وہ یہ روح (یعنی بخارات) نہیں اور نہ ہی یہ بدن ہے اور نہ وہ مشخصات ہیں جو بادی النظر میں دکھلائی دیتے ہیں بلکہ روح حقیقی ایک منفرد اور جداگانہ چیز ہے اور ایک ایسا نکتۂ نورانی ہے جو ان اعراض متغیرہ اور اطوار متبدلہ سے جو بعض جواہر اور بعض اعراض میں بالکل الگ ہے اور یہ روح حقیقی جس طرح چھوٹے (جاندار) میں۔ ہے اسی طرح بڑے میں بھی ہے اور جس طرح سیاہ میں ہے اسی طرح سفید میں بھی ہے اور ایسے ہی دیگر تمام مثال ہائے اضداد میں یہ بلا تفاوت موجود ہوتی ہے اور اس حقیقی روح کا اصلی علاقہ اور تعلق تو بخارات (۱) ہی کے ساتھ ہے اور انہیں کی وجہ سے بدن سے بھی ہے کیونکہ بدن تو نسمہ کا (یعنی بخارات کا جن کو روح ہوائی کہتے ہیں) مرکب ہے، اور یہ روح حقیقی عالم قدس

---

(۱) جو بادی الرائے میں روح سمجھے جاتے ہیں۔

کی ایک ایسی کھڑکی ہے کہ جن جن چیزوں کی روح ہوائی کو قابلیت واستعداد ہوتی ہے وہ سب اسی راہ سے اس پر اترتی ہیں، اب رہے یہ تغیرات تو یہ سب اسباب ارضیہ کی وجہ سے ہوتے ہیں، دیکھو آفتاب کی دھوپ وگرمی کپڑے کو تو سفید کر دیتی ہے لیکن دھوبی کو سیاہ کر دیتی ہے اور ہم کو اپنے وجدان صحیح سے یہ بھی معلوم ومتحقق ہو گیا ہے کہ بدن میں جب روح ہوائی (کے پیدا ہونے) کی استعداد نہیں رہتی تب روح ہوائی وہاں سے الگ ہو جاتی ہے۔ (۱) اور اسی کا نام موت ہے نہ کہ روح ہوائی سے روح حقیقی کا جدا ہونا، اور جب مہلک امراض میں روح ہوائی و بخارات تحلیل ہو جاتے ہیں تو حکمت الٰہی کے بموجب وہ اس قدر تو ضرور باقی رہتے ہیں کہ ان سے روح حقیقی (والٰہی) کا علاقہ وتعلق قائم رہے جس طرح سے کہ آپ کسی شیشی کی ہوا کو منہ سے اتنا کھینچیں کہ اس سے زیادہ نہ کھینچ سکیں یہاں تک کہ شیشی کے ٹوٹنے کا خوف ہو تب بھی اس میں کسی قدر ہوا ضرور باقی رہ جاتی ہے جو پھر متخلل ہو کر اس میں پھیل جاتی ہے سو یہ ہوا کی طبیعت کا سر اور راز یا جوہر ہے، پس اسی طرح نسمہ (یعنی روح ہوائی) میں بھی ایک سر اور راز یا جوہر ہے اور اس کی ایک خاص مقررہ حد اور اندازہ ہے جس سے تجاوز نہیں ہو سکتا اور جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کی روح ہوائی کی اور ہی صورت پیدا ہو جاتی ہے، پھر روح حقیقی کی وجہ سے اس کی حس مشترک میں سے جو کچھ باقی تھا اس میں ایک ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جو عالم مثال کی مدد سے قوت گویائی وشنوائی وبینائی کا کام دیتی ہے یعنی اس کو ایک ایسی قوت ملتی ہے جو محسوسات ومجردات کے بین بین ہوتی ہے جیسے کہ افلاک میں یکساں قوت رکھی گئی ہے، اور بسا اوقات روح ہوائی کو عالم مثال کے ذریعہ سے لباس نورانی یا ظلماتی کی قابلیت واستعداد پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے عالم برزخ کے عجائبات ظاہر ہوتے ہیں پھر جب صور (نرسنگھا) پھونکا جائے گا (یعنی جب باری الصور کی طرف سے وہ فیض عام ہوگا جو شروع میں پیدائش عالم کے وقت ہوا تھا جب کہ اجسام میں ارواح ڈالی گئی تھیں اور اس طرح عالم موالید کی بنیاد مستحکم کی گئی تھی) تو اس وقت روح الٰہی (یعنی حقیقی روح) کے فیضان سے اس کو پھر لباس جسمانی یا ایسا لباس پہنایا جائے گا جو عالم مثال اور جسم کے بین بین ہوگا، پھر وہ سب باتیں جن کی مخبر صادق علیہ السلام نے خبر دی تھی ایک ایک کر کے پیش آئیں گی، اور

---

(۱) جس کے ساتھ روح حقیقی بھی چلی جاتی ہے۔

جب کہ روح ہوائی جسم ارضی اور روح الٰہی کے بیچ میں ایک برزخ اور واسطہ ہے تو یہ ضروری ہوا کہ اس کو کچھ مناسبت اس طرف ہو اور کچھ اس طرف۔ پس وہ مناسبت جو (عالم) قدس کی طرف ہے اس کو ملکیت (یعنی فرشتہ پن) اور جو مناسبت جسم ارضی کی طرف ہے اس کو بہیمیت (یعنی وحشی پن) کہتے ہیں (۱)۔ علم حقیقت روح کے بارے میں ہم کو اسی قدر مقدمات و جہادیات پر اکتفا کرنا چاہئے تاکہ اس علم میں ان کو تسلیم کرنے کے بعد ان پر تفرادات مرتب کی جائیں اور مختلف مسائل مستنبط کئے جائیں قبل اس کے کہ کسی اعلیٰ وارفع علم میں اس کا حجاب اٹھے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب سرتکلیف (۲) کے بیان میں

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے آگے امانت کو پیش کیا تو وہ اس کے اٹھانے سے انکار کر گئے اور ڈر گئے، لیکن انسان نے اس کو اٹھا لیا کیونکہ وہ جفا کار اور بیوقوف تھا، یہ اس لئے ہوا کہ خدا، منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور مشرک مرد اور مشرک عورتوں کو عذاب وسزا دے اور مومن مرد اور مومن عورتوں پر مہربانی فرمائی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے"۔ امام غزالیؒ اور بیضاوی وغیرہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ یہاں امانت سے مراد عہدۂ تکلیف ہے جو کہ آسمان و زمین کے آگے پیش کیا گیا اور جس کی وجہ سے (خدا کی) اطاعت

---

(۱) اس بات کا خلاصہ یہ ہے کہ جب خوب غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی دو روح ہیں ایک روح ہوائی یعنی بدن کے بخارات لطیفہ جس کو نسمہ بھی کہتے ہیں۔ دوسری روح حقیقی جس کو روح قدسی اور روح الٰہی بھی کہتے ہیں اور روح حقیقی کا مرکب روح ہوائی ہے۔ پس موت یہ ہے کہ انسان کے بدن سے روح بمع روح ہوائی کے جدا ہو جاتی ہے اور روح ہوائی کو عالم برزخ میں اس کی قابلیت کے موافق ایک جسم نورانی یا ظلماتی دیا جاتا ہے اور شنوائی اور گویائی و بینائی کی سب قوتیں اس کو حاصل ہو جاتی ہیں اس طرح پر کہ وہ مرنے کے بعد سنتا، دیکھتا اور کلام کرتا ہے، عالم برزخ میں اسی لباس نورانی یا ظلماتی کی وجہ سے اس پر صدہا رنج و راحت گزرتے ہیں اور حشر کے دن اس کو پھر جسمانی لباس یا ایسا مناسب لباس جو عالم مثال اور جسم کے بین بین ہو پہنا کر وہاں کے عذاب و ثواب دکھائے جائیں گے اور چونکہ اس روح ہوائی میں دو جہت ہیں ایک جسم کی جانب جس کی وجہ سے بہیمیت یعنی کھانا پینا، شہوت و غصہ وغیرہ امور سرزد ہوتے ہیں اور دوسری روح الٰہی کی جانب، اس سے ملکیت یعنی عبادت و معرفت وغیرہ امور سرزد ہوتے ہیں، الغرض انسان عجوبہ خمیر اور طرفہ معجون مرکب ہے۔ ؎ یا رب یہ دل ہے یا کوئی مہمان سرائے ہے – غم رہ گیا کبھی کبھی آرام رہ گیا۔ (۲) تکلیف سے بندے کو اوامر و نواہی و دیگر احکام کا متحمل بنانا مراد ہے یعنی خدا کی اس میں کیا حکمت ہے کہ بندے پر اپنی چند باتیں واجب کیں جیسے نماز، روزہ و دیگر اخلاق و اعمال اور چند سے منع فرمایا جیسے چوری و زنا وغیرہ، بندے کو یوں ہی کیوں نہ چھوڑ دیا مثل اور بہائم کے۔

کرنے سے ثواب اور اس کی معصیت و نافرمانی کرنے سے عذاب ملتا ہے اور یہ کہ ان کے آگے پیش کرنے سے ان کی استعداد و قابلیت کا اندازہ لگانا مراد ہے (کہ وہ اس کو سرانجام دے سکتے ہیں یا نہیں) اور ان کے انکار کرنے سے ان کی عدم لیاقتی اور لا استعدادی مراد ہے (یعنی وہ اس کو سرانجام نہیں دے سکتے) اور انسان کے اٹھانے سے اس کی لیاقت اور استعداد مراد ہے (۱)۔

جناب میں کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر خداوند تعالیٰ کا یہ قول کہ ''اور انسان ظالم و جفا کار اور جاہل و بیوقوف تھا''۔ اس کی استعداد کی علت بیان کر رہا ہے، کیونکہ ظالم وہ ہوتا ہے جو کہ عادل نہ ہو لیکن اس میں عدل کی لیاقت ہو اور اسی طرح جاہل وہ ہوتا ہے جو کہ جانتا نہ ہو لیکن اس میں جاننے کی لیاقت ہو، چنانچہ سوائے انسان کے اور جس قدر مخلوق ہے وہ محض عالم و عادل ہے کہ ظلم و جہل کی وہاں رسائی ہی نہیں جیسے کہ ملائکہ ہیں اور یا وہ محض ظالم و جاہل ہیں کہ ان کو عدل و علم کی لیاقت ہی نہیں جیسے کہ بہائم و چوپائے ہیں، لہٰذا اس (امانت و تکلیف) کا وہی مستحق ہو سکتا ہے جس میں کمال بالقوۃ ہو بالفعل نہ ہو۔ (یعنی کسبی ہو فطری نہ ہو) اور لام اس قول الٰہی (لِيُعَذِّبَ) میں لام عاقبت ہے (۲)۔ یعنی اس امانت کے اٹھانے کا انجام رنج و راحت ہے، اور اگر آپ حقیقت حال کا انکشاف چاہتے ہیں تو یوں خیال کر لیجئے کہ ملائکہ میں قوت بہیمیہ کی نہ تفریط ہے جیسے بھوک پیاس اور خوف و غم اور نہ افراط ہے، جیسے شہوت، غصہ اور تکبر اور نہ ان کو تغذیہ و تنمیہ (خوراک و صحت و تندرستی) اور ان کو متعلقات کی پرواہ ہے وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز ہو کر حکم

---

(۱) حاصل مطلب یہ ہوا کہ آسمان و زمین کو سرے سے اوامر و نواہی کے ساتھ مامور ہونے اور مکلّف ہونے کی لیاقت ہی نہیں تھی، اس کی لیاقت تو اس انسان ناعاقبت اندیش کو تھی کہ جس کی وجہ سے اس کو اس کی نیکی اور بدی کی جزا و سزا ملے کسی نے کیا خوب کہا ہے ۔ (۲) یہاں لام کو عاقبت پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ اگر اس لام کا تعلق (عَرَضْنَا) یعنی خداوند تعالیٰ کے امانت آگے پیش کرنے سے ہے تو یہ ٹھیک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے افعال کسی غرض و حاجت کی وجہ سے پیش نہیں آتے اور اگر اس کا تعلق (حَمَلَهَا الْإِنسَانُ) یعنی انسان کے امانت اٹھانے سے ہے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ انسان کی اس بار امانت اٹھاتے وقت یہ غرض و نیت نہیں معلوم ہوتی کہ وہ خدا کا عذاب سہے یا آرام و نعمت حاصل کرے کیونکہ غرض تو وہ ہے جو فاعل کو فعل اختیاری پر مجبور و آمادہ کرے اور اٹھانے سے یہاں مراد قابلیت و استعداد ہے جو کہ اختیاری نہیں تو یہ ثابت ہوا کہ لام سے یہاں لام عاقبت مراد ہے جیسے خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ (لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا) لام عاقبت کے معنی غایت و انجام کے ہوتے ہیں یعنی آخر کار انجام ایسا ہوگا جیسے اس قول میں ہے۔

آسمانی کے انتظار میں رہتے ہیں، پھر جب کوئی حکم کسی مطلوبہ نظام کے قیام کے متعلق یا کسی سے بغض وخوشنودی رکھنے کے بارے میں نازل ہوتا ہے تو وہ ملائکہ اپنی خواہشوں سے یکسو ہو کر بدل وجان اس کی تعمیل میں لگ جاتے ہیں، پھر ان کے بعد بہائم کی حالت پر غور فرمائیے کہ ان کا کیسا برا حال ہوتا ہے اور وہ کیسی کیسی بدخصلتوں میں آلودہ رہتے ہیں کہ سوائے لذات جسمانی کے اور کچھ نہیں جانتے محض اپنے منافع جسمانی شہوت رانی یا غصہ کی طغیانی میں غرق رہتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بھی دیکھئے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے انسان میں دو قوتیں رکھیں ہیں۔ ایک تو قوت ملکیہ ہے جو اس روح انسانی کا فیضان ہے جو روح طبعی کو (جو سارے بدن میں پھیلی ہوئی ہے) ہر وقت اپنا فیض پہنچاتی رہتی ہے اور اس فیض کو قبول کرنا اس کا خاصہ ہے اور فیض اس پر غالب آتا ہے۔ دوسری قوت بہیمیہ ہے جس کا مبدأ ومنبع وہ نفس حیوانی ہے جو تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے اور جس میں وہ تمام قویٰ حاصل وموجود ہوتی ہیں جو روح طبعی میں پائی جاتی ہیں اور وہ (قوت بہیمیہ) خود مختار ہوتی ہے اور روح انسانی اس کا حکم مان لیتی ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ ان دونوں قوتوں میں باہم تخالف وتجاذب (کھینچ تان ہوتی) ہے۔ کبھی یہ (قوت ملکیہ) بلندی کی طرف کھینچتی ہے کبھی وہ (قوت بہیمیہ) پستی کی طرف گھسیٹتی ہے۔ جب بہیمیت غالب اور اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو ملکیت پست ومغلوب ہو جاتی ہے اور اسی طرح جب ملکیت غالب ہوتی ہے تو بہیمیت پست ہو جاتی ہے، اور خداوند تعالیٰ تو ہر نظام کو چاہتا ہے (اس طرح کہ وہ ایک خاص انداز سے مناسب مواقع پر وقوع پذیر ہوں) چنانچہ استعداد اصلی (یعنی فطری وذاتی) اور کسبی جس چیز کا تقاضا کرتی ہے خداوند تعالیٰ اس کو وہی عطا فرماتا ہے۔ اگر کوئی عادات بہیمیہ (یعنی وحشیانہ خصلتیں) پیدا کرتا ہے تو خداوند تعالیٰ بھی اس کے سامان مہیا کر دیتا ہے اور جب کوئی عادات ملکیہ (یعنی فرشتہ پن کی عادتیں) حاصل کرتا ہے تو خداوند تعالیٰ بھی اس کو اسی کے مناسب سامان عطا کر دیتا ہے۔ جیسے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”جو کوئی اللہ کی راہ میں (مال وزر) دیتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اور امر حق کی تصدیق کرتا ہے تو ہم اس کے لئے نیک باتیں آسان کر دیتے ہیں اور جو کوئی بخل کرتا ہے اور خدا سے بے خوف رہتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے تو ہم اس کے لئے بری باتیں آسان کر دیتے ہیں“۔ اور ایک جگہ فرماتا ہے کہ ”(اے محمد! ہم تمہارے رب کی عنایت

وبخشش سے ہر گروہ کی مدد کرتے ہیں اس کی بھی اور اُس کی بھی، کیونکہ تمہارے رب کی یہ (دنیوی) عنایت وبخشش (کسی پر) بند نہیں"۔ اور ہر ایک قوت میں رنج اور راحت ہوتی ہے (یعنی لذت والم ہوتا ہے) لذت تو اپنی طبیعت کے موافق چیزوں کے محسوس کرنے کو کہتے ہیں اور الم اپنی طبیعت کے مخالف چیزوں کے سہنے اور برداشت کرنے کو کہتے ہیں۔ دیکھئے جب آدمی کو کوئی مخدر (سن کرنے والی) چیز لگائی جاتی ہے (۱) تو پھر اس کو کسی چیز سے تکلیف نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اگر اس کے عضو کو آگ سے جلائیں بھی تب بھی اس کو کچھ بھی خبر نہ ہوگی اور پھر جب اس (مخدّر چیز) کا اثر جاتا رہتا ہے اور حس دوبارہ لوٹ آتی ہے تو کس قدر تکلیف معلوم ہوتی ہے اور آدمی کا حال گلاب سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اطبا نے بیان کیا ہے کہ اس میں تین قوتیں رکھی گئی ہیں۔ ایک تو قوت ارضیہ ہے جو کہ کھنے اور لگانے سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری قوت مائیہ ہے جو کہ نچوڑنے اور پینے کے وقت ظاہر ہوتی ہے اور تیسری قوت ہوائیہ ہے جو کہ سونگھنے کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ تکلیف (جو آدمی پر ڈالی گئی ہے) اس (کی) نوع کا تقاضا ہے۔ اور انسان اپنی زبان استعداد سے یہی خدمت مانگتا رہتا ہے کہ قوت ملکیہ کے مناسب چیزیں اس پر واجب کی جائیں تاکہ اس کو اس کا ثواب ملے اور بہیمیت (۲) میں غرق رہنا اس پر حرام کیا جائے تاکہ وہ عذاب سے بچے۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب تقدیر سے تکلیف پیدا ہونے کے بیان میں

واضح ہو کہ مخلوقات الٰہی میں ایسی بہت سی نشانیاں ہیں جن پر غور کرنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو اپنے بندوں کو احکام وشرائع کا مکلّف بنایا ہے اور اس میں بڑی مصلحت ہے اور اس کے پاس اس کی قوی دلیل بھی ہے۔ اب ذرا درختوں کے پتے اور پھول پھل اور وہ کیفیات دیکھئے جو دیکھنے چکھنے اور سونگھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دیکھئے خداوند تعالیٰ نے ہر قسم کے پتے کو ایک خاص شکل وصورت اور ہر نوع کے پھول کو ایک خاص رنگ وبو اور ان کے پھلوں کو ایک خاص مزہ وذائقہ عطا کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ پھل یا پھول یا پتہ

---

(۱) جیسے کلوروفارم۔ (۲) یعنی چوپایوں اور حیوانوں کی خصلتیں مثلاً شہوت رانی، ہر وقت کھانا پینا، غصہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

فلاں قسم (کے درخت) کا ہے۔ اور یہ سب چیزیں صورت نوعیہ کے ساتھ وابستہ ہیں، جہاں سے اور جیسے صورت نوعیہ آتی ہے وہیں سے اور ویسے ہی یہ بھی آتی ہیں۔ خداوند تعالیٰ کی قضا و قدر نے ہر ایک درخت کا ایک خاص مادہ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً کھجور کے لئے ایک خاص مٹی کو معین کر دیا اور مجملاً فرمادیا کہ یہ مادہ کھجور کی صورت میں نمودار ہونا چاہئے اور تفصیلاً اس طرح ارشاد ہوگا کہ اس کا ایسا پھل ہو اور ایسا شگوفہ اور پتا ہو۔ اور کسی نوع کے بعض خواص کو تو ہر ذی عقل جانتا ہے۔ لیکن کچھ خواص ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کوئی دانا ہی جان سکتا ہے مثال کے طور پر یاقوت کی ایک تاثیر کو لے لو کہ وہ جس کے پاس ہوتا ہے اس کے قلب میں فرحت و شجاعت پیدا کرتا ہے (یہ تاثیر ہر کس و ناکس کو معلوم نہیں ہوتی) پھر انواع کے بعض ایسے خواص ہوتے ہیں جو ان کے ہر ہر فرد میں پائے جاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو صرف چند ایسے افراد میں پائے جاتے ہیں جن کا مادہ صلاحیت رکھتا ہے (اور باقی جن افراد کا مادہ صلاحیت نہیں رکھتا ان میں نہیں پائے جاتے حالانکہ ان کی نوع اور قسم وہی ہے) مثلاً ہلیلہ اسی کے حق میں مسہل (دست آور) ہے جو اسے اپنی مٹھی میں بند رکھے اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کھجور کے پھل ایسے کیوں ہوئے؟ اس لئے کہ یہ سوال بیجا ہے کیونکہ لوازم ماہیت اسی کے ساتھ گرہ بندھ رہتے ہیں اور ان کی لم اور وجہ نہیں پوچھی جاتی۔ پھر اس کے بعد اگر آپ حیوانات کی انواع واقسام کو ملاحظہ فرمائیں گے تو درختوں کی طرح ان کی بھی ہر نوع کی صورت و شکل جدا جدا ہی نظر آئے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نظر آئے گا کہ ان کو چند ایسی حرکات اختیاریہ اور الہامات طبیعیہ اور تدبیرات جبلیہ بھی عطا ہوئی ہیں کہ ان سے ہر نوع دوسری سے ممتاز ہو جاتی ہے چنانچہ مویشی (ڈھور ڈنگر مثلاً گائے بکری) گھاس کھاتے اور جگالی کرتے ہیں اور گھوڑے گدھے اور خچر وغیرہ گھاس تو کھاتے ہیں لیکن جگالی نہیں کرتے اور درندے گوشت ہی کھا کر جیتے ہیں۔ پرندے ہوا میں اڑتے ہیں۔ مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں۔ ہر نوع حیوان کی ایک جداگانہ آواز ہے۔ جفتی و مجامعت کرنے کا بھی الگ الگ طریقہ ہے بچے پالنے اور انڈے سینے کے ڈھنگ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور اگر اس سے زیادہ تفصیل سے بیان کیا جائے تو کلام طویل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ پھر ہر نوع کو وہی علوم الہام ہوئے ہیں جو کہ اس کے مزاج کے مطابق اور اس کے حق میں فائدہ مند ہیں۔

یہ سارے الہامات ان کے پروردگار کی طرف سے صورت نوعیہ کے سوراخ سے ہو کر آتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کہ پھولوں کے وضع، وضع کے نقش ونگار اور پھلوں کے ذائقہ دار مزے اپنی صورت نوعیہ کے پابند ہیں۔ اور احکام انواع میں سے بعض احکام تو ایسے ہوتے ہیں جو ایک نوع کے تمام افراد میں پائے جاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو کہ صرف انھیں افراد میں پائے جاتے ہیں۔ جن میں مادہ صلاحیت رکھتا ہے اور اسباب بھی جمع ہوتے ہیں۔ اگرچہ اصل استعداد سب افراد میں برابر پائی جاتی ہے۔ جیسے شہد کی مکھیوں میں ایک فرد (ان کا سردار) یعسوب (۱) ہوتا ہے اور پرندوں میں سے ایک طوطا ہے جو کہ سکھانے اور مشق کرانے کے بعد لوگوں کی آوازوں کی ہو بہو نقل اتارنا سیکھ جاتا ہے پھر آپ ذرا نوع انسان کو دیکھئے اس میں آپ کو وہ سب باتیں ملیں گی جو نباتات وحیوانات میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کھانسنا، جمائی لینا، ڈکار لینا، فضلات کا دفع کرنا اور پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتیوں (سے دودھ) کو چوسنا اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ باتیں بھی ملیں گی جن کی وجہ سے وہ تمام حیوانات سے ممتاز ہے مثلاً گفتگو کرنا، گفتگو سمجھنا مقدمات بدیہیہ (آسان وسہل ابتدائی اصول) کو سمجھ کر، تجربے حاصل کر کے، تلاش وجستجو کر کے اور اپنی دانائی وزیرکی اور گمان واندازے کو کام میں لا کے، کسبی علوم کا حاصل کرنا، اور ان امور کا اہتمام کرنا جن کو صرف اس کی عقل اچھا جانتی ہے گو وہ اس کے وہم اور حس میں نہیں آسکتے جیسے تہذیب وتزکیۂ نفس اور اقالیم وممالک کو اپنے قبضۂ قدرت میں لینا اور یہ باتیں چونکہ نوعی اور پیدائشی ہیں اس لئے تمام قومیں اور سکان زمین یہاں تک کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے بھی ان باتوں میں مشترک اور یکساں ہیں۔

اور یہ سب باتیں اس کی صورت نوعیہ کے طفیل سے ہیں اور اس کا اصل راز یہ ہے کہ انسان کا مزاج یہ چاہتا ہے کہ اس کی عقل اس کے قلب پر غالب رہے اور قلب نفس پر۔ پھر اس کے بعد خداوند تعالیٰ کی حسن تدبیر اور اس تربیت ولطف وکرم کو دیکھئے جو ہر نوع میں شامل حال ہے۔ دیکھئے کہ نباتات میں چونکہ حس وحرکت کا مادہ نہ تھا، لہٰذا ان کی جڑوں کو ایسی قوت عطا فرمائی کہ وہ اس مادہ کو جو ہوا، پانی اور لطیف وباریک خاک سے جمع ہو جاتا ہے چوس کر اپنی شاخوں میں صورت

(۱) بڑے مکھے کو کہتے ہیں جو سارے مہال کا بادشاہ ہوتا ہے۔

نوعیہ کے حکم کے مطابق اور ضرورت کے موافق اپنی شاخوں وغیرہ میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور حیوان چونکہ حساس ہے اور مرضی کے موافق حرکت بھی کر سکتا ہے تو اس کو زمین سے غذا و مادہ چوسنے والی رگیں اور جڑیں نہیں دیں بلکہ اس کو یہ الہام کیا کہ وہ اناج اور گھاس اور پانی ان مقامات سے حاصل کرے جہاں کہ وہ ملا کرتے ہیں۔ اور دیگر تمام ضروریات کے مہیا کرنے کا طریقہ الہام کیا۔ اور جو انواع زمین سے کیڑوں کی طرح پیدا نہیں ہوتیں تو ان میں خداوند تعالیٰ نے یہ تدبیر و انتظام کیا کہ ان کو توالد و تناسل کی قوت دی اور مادہ (مؤنث) میں ایک ایسی رطوبت پیدا کی کہ وہ اس کو وہ جنین (حمل کے بچہ) کی تربیت میں صرف کرتی ہے، پھر اس (رطوبت) کو خالص دودھ بنایا اور بچہ کو الہام کیا وہ چھاتیاں چوسے اور پھر دودھ کو اس کے حلق سے اتارا (اس طرح وہ دودھ پینے کے قابل ہوا) اور مرغی میں ایسی رطوبت رکھی جس کو وہ انڈے بنانے میں صرف کرتی ہے۔ پھر جب انڈے دے چکتی ہے تو اس کے مزاج میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور پیٹ خالی ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کو ایک ایسا جنون سا پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر وہ اپنے ہم جنس سے اختلاط (ملنا جلنا) ترک کر کے ان انڈوں کو اپنے پیٹ کے نیچے سینے کو پسند کرتی ہے تا کہ اپنے پیٹ کے خلا کو پر رکھے۔ اور کبوتر کے جوڑے میں عجیب قسم کی محبت و الفت پیدا کی اور کبوتری کے پیٹ کے خلا کو انڈے سینے کا باعث بنایا پھر اس کی زائد رطوبت کو قے میں تبدیل کر کے بچوں پر اس کو رحمت کا باعث بنا دیا تا کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو دانہ پانی چگاتی رہے اور اس کے نر کو اس کا گرویدہ بنا دیا جس کے سبب سے وہ (اس بارے میں) اس کی تقلید کرتا ہے۔ اور ان بچوں (چوزوں) کا مزاج مرطوب بنایا پھر اس رطوبت کو پر بنانے میں صرف کر دیا تا کہ وہ ان کے ذریعہ اڑ سکیں۔ اور انسان چونکہ باحس و باحرکت ہونے اور الہامات جبلیہ اور علوم طبیعیہ کے قبول کرنے کی وجہ سے عاقل اور علوم کسبیہ کا حاصل کرنے والا تھا تو اس کو کھیتی کرنا، درخت لگانا اور تجارت و معاملات میں الہام فرمایا اور بعض کو بالطبع و بالاتفاق سردار و آقا اور بعض کو اسی طرح سے غلام و محکوم بنایا اور کسی کو بادشاہ بنایا اور کسی کو اس کی رعیت اور کچھ کو حکیم و دانا بنایا کہ وہ حکمت الٰہیہ اور حکمت طبیعیہ اور ریاضیہ اور عملیہ کے دقائق و حقائق بیان کریں اور کچھ کو ایسا غبی پیدا کیا کہ وہ بغیر تقلید کے ان علوم کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

آپ تمام لوگوں کو چاہیئے وہ شہری ہوں یا دیہاتی اسی طرح دیکھیں گے کہ یہ تمام باتیں ان پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں۔ یہ تمام کا تمام بیان ان خواص اور ظاہری تدبیروں کی شرح ہے جو اس (انسان) کے معاش اور قوت بہیمیہ سے متعلق ہیں۔ اب اس کی قوت ملکیہ کی طرف چلئے۔ یہ بھی آپ کو یاد رہے کہ یہ انسان اور حیوانوں کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کو دانائی سب حیوانات سے عمدہ دی گئی ہے اور اس کے ان علوم میں سے جن کی (سوائے ان کے جن کا مادہ احکام نوعی میں سرکش ہے) سب کو پیروی کرنی پڑتی ہے یہ ہیں کہ وہ اپنی ایجاد (پیدائش) وتربیت (زندگی) کا سبب دریافت کرتا ہے۔ اور یہ بات بھی ضرور معلوم کر کے رہتا ہے کہ اس تمام عالم کا کوئی نہ کوئی مدبر اور چلانے والا ہے جس نے سب کو بنایا اور رزق عطا فرمایا ہے۔ اور وہ اور اس کے تمام ابنائے جنس ہمیشہ زبان حال سے ہمہ تن اپنے باری و پالنہار اور مدبر کے آگے نہایت عجز وانکساری میں مصروف رہتے ہیں اور اس قول الٰہی سے بھی یہی مراد ہے کہ "کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اہل آسمان واہل زمین اور آفتاب اور ماہتاب اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے (سب کے سب) اور بہت سے آدمی بھی اس کو سجدہ کرتے ہیں لیکن بہت سے آدمی ایسے بھی ہیں جن کے حق میں (سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے) عذاب لکھ دیا گیا ہے"۔ دیکھئے درخت کا ہر جز اس کی شاخیں اس کے پتے اور اس کے پھول ہر دم اس نفس نباتی کے آگے جو درخت کا مدبر ہے ہاتھ پھیلائے رہتے ہیں (۱)۔ اگر ان چیزوں کو (درخت کی) عقل ہوتی تو وہ نفس نباتی کی بڑی ستائش کرتے اور پہلے سے کہیں زیادہ شکریہ ادا کرتے اور اگر ذرا سمجھ ہوتی تو سوال حالی کی جگہ سوال مقالی کرتے۔ پس یہیں سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان چونکہ بڑا عاقل اور دانا تھا لہٰذا وہ بجائے سوال حالی کے سوال علمی کرتا ہے (۲)۔ اور انسان کی نوع کا یہ بھی خاصہ ہے کہ اس کی نوع میں ایک نہ ایک ایسا شخص ضرور ہوتا ہے جو علوم عقلیہ کے منبع (۳) کی طرف ہمہ تن منہمک ومتوجہ رہتا ہے اور وہ اس (منبع) سے وحی یا حدس (۴) (فراست) کے ذریعہ یا خواب میں علوم سیکھتا ہے پھر اور لوگ اس میں رشد وبرکت کے آثار دیکھ کر اوامر ونواہی میں اس کی پیروی واطاعت کرتے ہیں۔ اور ہر انسان کو غیب

---

(۱) ہاتھ پھیلانا یعنی سوال کرنا مانگنا سے مراد ٹہنیوں وغیرہ کا لہلہانا۔ (۲) یعنی وہ اس کو ہر وقت حاجت روا جانتا۔ (۳) منبع علوم ذات باری یا عالم قدس کے وہ لوگ جن پر اس کے انوار کی پوری شعاعیں پڑتی ہیں۔ (۴) حدس یعنی ظن۔

کی بات دریافت کرنے کی طاقت دی گئی ہے۔ خواہ وہ اس کو بذریعہ خواب کے جانے یا اپنی رائے وبصیرت سے معلوم کرے یا ہاتف غیب سے سن پائے (۱) یا حدس (فراست) سے معلوم کرے مگر اتنا فرق ضروری ہے کہ بعض اس میں کامل اور بعض ناقص ہوتے ہیں۔ اور جو ناقص ہوتے ہیں تو وہ کاملوں کے محتاج ہوتے ہیں اس کے علاوہ انسان کی اور بہت سی ایسی صفات ہیں جو سب حیوانات میں نہیں پائی جاتیں جیسے خشوع (انکساری) پاکیزگی وصفائی، عدل وانصاف اور سخاوت وفراخ دلی اور جیسے اس کی دعا سے عالم جبروت اور ملکوت کے انوار چمکنا اور اسی طرح اور حالات ہیں جیسے کرامت وغیرہ، الغرض جن باتوں میں انسان تمام حیوانات سے ممتاز ہے بہت سی ہیں لیکن ان سب کا اصل اصول دو خصلتیں ہیں ایک تو قوت عقلیہ کی زیادتی ہے۔ اور اس کی دو شاخیں ہیں ایک شاخ مصلحت نظام بشری اور اس کے دقائق کی طرف جھکتی ہے اور دوسری شاخ ان علوم عینیہ کی طرف گئی ہے جو بطریق وہب (عطا خداوندی) حاصل ہوتی ہیں۔

اور دوسری خصلت قوت عملیہ کا کمال ہے۔ اور اس کی بھی دو شاخیں ہیں ایک تو وہ ہے کہ جس کی وجہ سے انسان اعمال کو اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے بخلاف بہائم وحیوانات کے کہ وہ اپنے اختیار وارادے سے کچھ نہیں کرتے اور نہ یہ افعال ان کی ذات میں داخل ہوتے ہیں اور نہ ان افعال کی ارواح سے ان کو کچھ اثر پہنچتا ہے بلکہ ان کا اثر ان قویٰ سے متعلق ہے جو کہ ان کی روح ہوائی سے قائم ہیں۔ اور اس لئے یہ افعال حیوانوں سے بہ سہولت سرزد ہوتے ہیں۔ مگر انسان جب ان افعال کو کرتا ہے تو یہ افعال تو فنا ہو جاتے ہیں لیکن ان کی ارواح باقی رہ جاتی ہیں جن کو نفس نگل جاتا ہے اور وہ اس میں شامل ہو کر اپنے اثرات دکھاتی ہیں، پھر یا تو نفس میں انوار ظاہر ہوتے ہیں یا ظلمات اور شرع کا یہ قول کہ "افعال میں مواخذہ ہونے کی یہ شرط ہے کہ (انسان) ان کو با اختیار خود (قصداً) کرے" بمنزلہ اس قول طبیب کے ہے کہ "زہر سے ضرر پانے اور تریاق سے نفع اٹھانے کی یہ شرط ہے کہ ان کو (انسان) کھا کر شکم تک پہنچائے اور ہمارے اس قول کی کہ "نفس انسانی افعال کی ارواح کو کھاتا اور نگلتا ہے" یہ دلیل ہے کہ تمام بنی آدم اس بات پر متفق ہیں کہ

(۱) ہاتف آواز دینے والے کو کہتے ہیں۔ ملائکہ کی ایک جماعت اسی کام پر متعین ہے کہ وہ بھولے بسرے کو آواز دیکر بتا دیتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔

ریاضات وعبادات کرنا اچھا ہے کیونکہ ان کو اپنے وجدان سے اس کے انوار معلوم ہو گئے ہیں اور اس کے برخلاف گناہ ومعاصی کے ارتکاب کو برا سمجھتے ہیں کیونکہ اپنے وجدان سے اس کی ظلمت وخرابیاں دیکھ لی ہیں۔ اور ایک شاخ حالات رفیعہ اور مقامات عالیہ ہیں جو کسی جنس بہائم وحیوانات میں نہیں پائے جاتے مثلاً خدا کی محبت اور اس کی ذات پر توکل کرنا۔

واضح ہو کہ انسان کا اعتدال مزاج جو اس کی صورت نوعیہ سے پیدا ہوا جبکہ ان چند چیزوں کے بغیر تمام وکامل نہ ہوتا تھا۔ (اوّل) وہ علوم جو سب انسانوں میں سے اعلیٰ اور عمدہ شخص کو حاصل ہوئے اور پھر دوسرے لوگوں نے اس کی تقلید کی۔ (دوم) شریعت الٰہیہ جس میں معارف الٰہیہ اور عمدہ انتظام ومنفعت کی تدابیر ہوں (سوم) وہ قواعد جن میں انسان کے افعال اختیاریہ سے بحث ہو اور ان کی ان اقسام خمسہ، واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کی تصریح ہو۔ (چہارم) وہ مقدمات جن سے احسان وسلوک کی خوبیاں واضح ہوتی ہیں۔ تو خداوند تعالیٰ کی رحمت وحکمت نے عالم غیب قدس میں یہ تجویز کی کہ اس کو وہ قوت عقلیہ دی جائے جس کا مستحق سب سے ذکی شخص ہو جو اس کی طرف منہمک ہو کر یہیں (عالم قدس) سے اس کو حاصل کرے اور باقی سب لوگ اس کی اطاعت کریں جیسے مہال کی مکھیوں میں یعسوب (سردار مہال) سب کا انتظام کرتا ہے۔ اگر اس کو یہ قوت بواسطہ یا بلا واسطہ عطا نہ ہوتی تو یہ کمال پورا نہ ہوتا۔ پس جس طرح کوئی شخص کسی ایسے حیوان کو دیکھے جو بغیر گھاس کے زندہ نہیں رہ سکتا تو وہ ضرور یہ یقین کر لے گا کہ اس کے لئے خداوند تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی گھاس کا جنگل ضرور بنایا ہوگا۔ پس اسی طرح خداوند تعالیٰ کی صنعتوں میں غور ونظر کرنے والا یہ یقین کر لے گا کہ یہاں خداوند تعالیٰ نے چند ایسے علوم ضرور عطا کئے ہوں گے جن سے عقل کام لے کر اپنے نقائص دور کر کے کمال حاصل کر سکتی ہے۔ من جملہ ان علوم کے ایک علم توحید وصفات ہے جس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اتنا واضح اور مشرح ہو کہ اس کو ہر شخص کی عقل از خود جان سکے اور اتنا پیچیدہ اور مغلق نہ ہو کہ اس کو کوئی بھی سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ اس علم کی شرح (خداوند تعالیٰ نے) معرفت کے ذریعہ کر دی جس کا اشارہ اس کے قول میں ہے کہ سبحان اللّٰہ وبحمدہ ''اللّٰہ اپنی صفات کے ساتھ پاک ہے'' پس اس نے اپنے لئے وہ صفات ثابت کیں جن کو لوگ جانتے ہیں اور ان کو باہم استعمال کرتے رہتے ہیں جیسے حیات، سمع (سننا)، بصر (دیکھنا)،

قدرت، ارادہ، کلام، غضب، سخط (ناراضگی)، رحمت، ملک (مالک ہونا) غنا (بے نیازی) وغیرہ۔اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت کر دیا کہ کوئی شخص ان صفات میں اس کا ہم پلہ (یا اس جیسا) نہیں۔لہٰذا اس کی حیات وزندگی ہماری زندگی کی طرح نہیں۔اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، اس کی قدرت ہماری قدرت کے مثل نہیں۔اس کا ارادہ ہمارے ارادہ جیسا نہیں اور اس کا کلام ہمارے کلام کے مانند نہیں اور اسی طرح اور صفات (ہماری صفات سے مختلف نوعیت رکھتی ہیں)۔ پھر اس عدم مماثلت (یعنی بے نظیری) کی تفسیر یہ ہے کہ وہ صفات ہماری جنس میں بالکل مستبعد اور دور معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بارش کے قطروں کی تعداد اور ریگستانوں کے ریت کے ذرات کا شمار اور تمام درختوں کے پتوں اور سب جانداروں کے سانسوں کی گنتی جانتا ہے اور اندھیری رات میں بھی چیونٹی تک کی چال کو دیکھتا ہے اور بند کمروں میں لحافوں کے نیچے جو کھڑ کھڑاہٹ یا کھسر پھسر ہوتی ہے اس کو بھی سنتا ہے اور اسی طرح کی اور باتیں (۱)۔اور من جملہ ان علوم عبادت (۲) اور علم طریق انتفاعات ومنافع (۳) اور علم بحث ومخاصمت ہے یعنی (وہ علم جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ) نفوس سفلیہ میں جب ایسے شبہات پیدا ہو جائیں جن سے امر حق میں خلجان واقع ہو تو ان کو کس طرح سے دور کیا جائے اور من جملہ ان کے ایک وہ علم (تذکیر) ہے جس میں خداوند تعالیٰ کی نعمتوں اور سختیوں (۴)، وقائع برزخ اور وقائع محشر کو بیان کر کے ڈرسنایا اور اس کی اس قابلیت واستعداد کو دیکھا جو اس کے ابنائے نوع (یعنی ہم جنسوں) میں میراث کے طور پر نسل درنسل چلی آتی ہے اور نیز اس کی قوت ملکیہ کو اور اس تدبیر کو دیکھا جس کی وہ ان علوم مذکورہ سے تکمیل واصلاح کرتا ہے تو یہ علوم، عالم الغیب (۵) میں محدود طور پر متمثل ہو گئے۔اور اس تمثل کو اشاعرہ کلام (۶) نفسی کہتے ہیں۔اور یہ چیز، علم، ارادہ اور قدرت کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے پھر جب ملائکہ کے پیدا کرنے کا وقت آیا تو خداوند تعالیٰ نے یہ جانا کہ افراد انسانی کی مصلحت بغیر ایسے نفوس کریمہ (یعنی ملائکہ) پیدا کیے پوری نہ ہوگی جن کی نسبت وتعلق پوری نوع انسانی سے

---

(۱) چنانچہ اس طرح کا دیکھنا سننا ہماری جنس میں مستبعد ومفقود ہے۔(۲) یعنی یہ علم کہ خدائی بندگی کس کی، کی جائے۔(۳) یعنی یہ علم کہ دنیا میں کس طرح زندگی گزاری جائے۔(۴) یعنی موجودہ اور سابقہ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب وواقعات۔(۵) تجلی اعظم سے اوپر کا درجہ۔(۶) یعنی کلام قدیم جو اللہ تعالیٰ کی خاص ذات سے متعلق ہے۔

ایسا ہی ہو جیسے قوائے عقلیہ کا ہمارے نفوس سے ہے تب ملائکہ محض افراد انسانی پر نظر رحمت فرما کر کن (ہو جاؤ) کے کہتے ہی پیدا کر دیا۔ پھر ان کے دلوں میں ان علوم کی جھلک ڈالی جو عالم غیب الغیب میں محدود تھے۔ پس وہ (ملائکہ) (۱) روحانی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ اور خداوند تعالیٰ کے اس قول میں انہی کی طرف اشارہ ہے کہ "عرش کے اٹھانے والے اور جو اسکے ارد گرد ہیں الخ۔

پھر جب سلطنتوں اور مذہبوں وملتوں کے تغیر وتبدل کا زمانہ آیا (۲) تو حکمت الٰہی ان علوم کے لئے کسی اور وجود روحانی کی مقتضی ہوئی تب وہ علوم ان زمانوں کی ضروریات کے موافق (۳) اور بھی زیادہ مشروح اور مفصل ہو گئے اور اس قول الٰہی میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ "ہم نے اس (قرآن) کو ایک رات بابرکات (یعنی شب قدر) میں نازل کیا ہے۔ ہم آگاہ کرنے والے تھے (۴)۔ اسی رات ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے اور تقسیم کیا جاتا ہے"۔ پھر حکمت الٰہی ایک ایسے ذکی و پاک شخص (یعنی نبی) کی منتظر ہوئی جو وحی کی استعداد رکھتا ہو۔ اور اس کے لئے اعلیٰ درجہ اور بلند مرتبہ مقرر کیا گیا۔ یہاں تک کہ جب وہ موجود پایا گیا تو اس کو اپنے لئے منتخب کر لیا اور اپنی مراد و مقصود کے پورا کرنے کا ذریعہ بنا دیا۔ اس پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور اس کی اطاعت لوگوں پر فرض ٹھہرائی۔ حضرت موسیٰ سے خداوند تعالیٰ اس قول میں یہی فرماتا ہے کہ "(اے موسیٰ!) میں نے تم کو اپنے لئے منتخب کیا ہے"۔ پس جس کی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے ان علوم کو عالم غیب الغیب میں متعین کیا تھا وہ عنایت بالنوع (یعنی نوع انسانی پر نظر رحمت) ہی تو تھی۔ اور جس نے حق تعالیٰ سے نفوس ملأ اعلیٰ کے فیضان (وپیدائش) کا سوال کیا تھا وہ استعداد نوع (یعنی نوع انسانی کی قابلیت) ہی تو تھی۔ اور جو چیز ان تغیر ممالک ومذاہب کے زمانوں (کی ضروریات) کے موافق ایک خاص (مشروح ومفصل) شریعت کی خواستگار وملتجی ہوئی تھی تو وہ احوال نوع (نوع انسانی) کے مختلف حالات ہی تو تھے" لہذا (معلوم ہوا کہ) اللہ کی دلیل مضبوط ومحکم اور غالب (۵) ہے" پھر اس کو کوئی یوں کہے کہ انسان پر نماز کہاں سے فرض ہوئی اور اطاعت

(۱) یا وہ علوم۔ (۲) یعنی نظام سماوی میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے۔ (۳) یعنی اس وقت کے آسمانی حالات کے مطابق۔ (۴) یعنی اس کے نازل کرنے سے ہمارا مقصد لوگوں کو ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کرنا تھا۔ (۵) یعنی اس کی حجت نوع انسانی پر پوری ہوئی اب اس پر کوئی الزام نہیں آ سکتا۔

رسول کہاں سے واجب ہوئی؟ اور زنا اور چوری کہاں حرام ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حرام وہاں سے ہوئی جہاں سے کہ بہائم وچوپایوں (۱) پر گھاس کھانا حلال واجب اور گوشت کھانا حرام اور درندوں پر گوشت کھانا واجب اور گھاس حرام ہوئی۔ اور جہاں سے کہ مہال کی مکھیوں پر (سردار مہال) یعسوب کا اتباع واجب ہوا۔ (یعنی جس طرح یہ چیزیں واجب وحرام ہوئیں اسی طرح وہ بھی واجب وحرام ہیں) ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ حیوانوں کو یہ علوم بطور الہام جبلی، یعنی نظری وپیدائشی القا کے ذریعہ عطا ہوئے ہیں لیکن انسان نے ان کو اپنے ذاتی تجربہ وکسب وغور ونظر یا وحی یا تقلید (پیروی) کے ذریعہ حاصل کیا۔

آٹھواں باب اس بیان میں تکلیف جزا وسزا کا باعث ہے

واضح ہو کہ انسان کو اس کے اعمال کے موجب جزا ملے گی۔ اگر اعمال اچھے تو جزا بھی اچھی اور اگر اعمال برے تو جزا بھی بری۔ اس کی چار صورتیں ہیں (اوّل) انسان کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر جب چوپایہ (۲) گھاس اور درندہ گوشت کھائے گا۔ تو ان دونوں کا مزاج صحیح رہے گا اور اگر چوپایہ گوشت اور درندہ گھاس کھائے گا تو ان کا مزاج خراب ہو جائے گا اسی طرح انسان ہے اگر وہ ایسے اعمال کرے گا جن کی ارواح حق تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنا اور طہارت وپاکیزگی، سماحت وتقویٰ (۳) اور عدالت وانصاف کرنا ہوتے ہیں تو اس کا مزاج ملکی صحیح رہے گا۔ اور جب ایسے اعمال کرے گا جن کی ارواح ان کے برخلاف ہوتی ہیں تو اس کا مزاج ملکی خراب ہو جائے گا اور جب وہ بدن کے بوجھ سے ہلکا (۴) ہوگا تو ان کی نرمی اور سختی (۵) ایسی محسوس کرے گا جس طرح کہ اب ہم جلنے کی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

(دوم) ملأ اعلیٰ کا اثر ہے۔ جس طرح انسان کے دماغ میں قوائے احساس موجود ہیں (جن کی وجہ سے اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے پاؤں کے نیچے کوئی انگارہ آ گیا ہے یا برف کا ٹکڑا) اسی طرح انسان کی اس نوعی صورت کے لئے جو عالم ملکوت میں متمثل ہے (۶) ملائکہ لوگ خدام

---

(۱) چوپائے، گائے بیل وغیرہ یعنی چرنے والے جانور۔ (۲) چوپایہ، گائے بیل وغیرہ گھاس چرنے والا جانور۔ (۳) یعنی دنیاوی لذتوں میں نہ پھنسنا۔ (۴) یعنی جب مرے گا۔ (۵) یعنی نیک اعمال کی نرمی اور برے برے اعمال کی سختی۔ (۶) امام نوع انسانی یا انسان اکبر کہتے ہیں۔

ہیں۔ان کو حق تعالیٰ نے اس نوع انسانی پر خاص عنایت فرما کر پیدا کیا ہے۔کیونکہ جس طرح ہم میں سے کسی کا کام بغیر قوائے ادراک و احساس کے نہیں چلتا اسی طرح اس نوع انسانی کا کام ان (ملائکہ) کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔چنانچہ افراد انسانی میں سے جب کوئی شخص عمدہ کام کرتا ہے تو ان ملائکہ خدام سے خوشی وشادمانی کی (نورانی) شعاعیں نکلتی ہیں اور جب کوئی برا کام کرتا ہے تو بغض ونفرت کی (ظلماتی) شعاعیں نکلتی ہیں اور پھر وہ شعاعیں تو خوشی وشادمانی پیدا کرتی ہیں۔یا وحشت وپریشانی (۱)۔اور کبھی یہی شعاعیں بعض ملائکہ اور بعض مخصوص لوگوں کے نفوس میں تحلیل ہو جاتی ہیں جس سے ان کو یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ اس سے محبت رکھیں اور نیک سلوک کریں یا اس سے نفرت رکھیں اور بدسلوکی سے پیش آئیں (۲)۔(اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ) جیسے کسی کا پاؤں آگ کی چنگاری پر پڑ جاتا ہے تو اس کو قوائے احساس وادراک کے ذریعہ جلنے کی تکلیف محسوس ہوتی ہے پھر دماغ سے ایک قسم کی شعاعیں نکل کر قلب میں اثر کرتی ہیں۔جس سے رنج ہوتا ہے اور طبیعت گھلتی ہے۔ان ملائکہ کا ہمارے نفسوں میں اثر پہنچانا بھی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہماری قوائے احساس وادراک ہمارے بدن میں اثر پہنچاتے ہیں۔چنانچہ جس طرح ہم میں سے کسی کو رنج وذلت وغیرہ کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ کانپنے لگتا ہے اور اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور بدن نڈھال ہو جاتا ہے اور کبھی تو اس کی شہوت بھی ساقط ہو جاتی ہے اور پیشاب سرخ ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا سخت خوف ہوتا ہے کہ اس کا ڈر کے مارے پیشاب یا پاخانہ تک نکل جاتا ہے۔یہ سب باتیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ قوائے احساس وادراک انسان کی طبیعت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔اور اس کے دماغ میں پیغام پہنچاتی ہیں۔جس سے اس چیز کا تصور غالب آ جاتا ہے۔بالکل اسی طرح ان ملائکہ کا حال ہے جو بنی آدم پر متعین ہیں۔ان کی طرف سے انسانوں پر اور ملائکہ سفلیہ کے نفوس پر الہامات جبلیہ (۳) اور تغیرات طبیعیہ (۴) اترتے رہتے ہیں۔افراد انسانی کو (ملائکہ کی) قوائے طبیعیہ سے وہ نسبت وتعلق ہے جو انسان کو اپنی قوائے ادراک واحساس ہے۔اور جس طرح یہ (نورانی وظلماتی) شعاعیں

---

(۱) خوشی وسرور نیک کاموں سے اور وحشت وپریشانی برے کاموں سے۔(۲) اگر نیک کام کرے تو محبت ونیک سلوک کریں اور برے کام کرے تو نفرت وبدسلوکی کریں۔ (۳) انسان کی طبیعت پر خفیہ طریقہ سے اثر انداز ہونے والا القا جس کا عقل انسانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔(۴) وہ حالتیں جن سے مزاج انسانی بدلتا رہتا ہے مثلاً رنج وغم کی حالت۔سرور کی کیفیت وغیرہ۔

اوپر (ملائکہ کی طرف) سے نیچے اترتی ہیں اسی طرح نیچے سے حظیرۃ القدس تک وہ شعاعیں اوپر پہنچتی ہیں جن سے ایک قسم کا (نورانی) رنگ پیدا ہوتا ہے اور وہ رنگ (تجلی الٰہی میں) ایک قسم کی ہیئت پیدا کر دیتا ہے جس کو رحمت و رضا اور غضب و لعنت کہتے ہیں (۱) (یہ بالکل اسی طرح ہوتا ہے) جیسے پانی کو آگ کے نزدیک رکھنے کی وجہ سے اس میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور مقدمات کو ترتیب دینے سے نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے اور جس طرح دعا قبولیت و اجابت (دعا) کا باعث بنتی ہے، چنانچہ اس وقت (جبکہ یہ رنگ پیدا ہوتا ہے تو) عالم جبروت میں نئی نئی حالتیں و تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں۔ چنانچہ کبھی تو غضب و غصہ ہوتا ہے پھر اسی کے بعد توبہ ہو جاتی ہے اور کبھی رحمت ہوتی ہے تو اسی کے بعد عذاب و عقاب ہو جاتا ہے (۲)

خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے (۳)'' اور نبی صلعم نے بھی بہت سی احادیث میں یہ بتایا ہے کہ ''ملائکہ بنی آدم کے اعمال اوپر خداوند تعالیٰ کے پاس لے جاتے ہیں'' اور یہ کہ ''خداوند تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ (یعنی جب تم انہیں چھوڑ کر آ رہے تھے تو وہ کیا کر رہے تھے؟)'' اور دن کے اعمال اس کے پاس رات کے اعمال سے پہلے پہنچ جاتے ہیں'' اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ بنی آدم اور اس نور الٰہی کے درمیان جو حظیرۃ القدس کے وسط میں قائم ہے۔ ملائکہ بطور واسطہ کے ہیں (سوم) اس شریعت کا تقاضا ہے جو لوگوں پر فرض قرار دی گئی ہے۔ (اس کی ایسی صورت ہے کہ) جس طرح ایک منجم یہ جانتا ہے کہ کواکب کو جب اپنے تمام مقامات و منازل میں سے کوئی مخصوص مقام حاصل ہوتا ہے تو ان (کواکب) کی قوتوں سے مل کر ایک قسم کی روحانیت و روحانی فضا پیدا ہوتی ہے جو فلک کے کسی حصہ میں مرکوز و متمثل ہو جاتی ہے۔ پھر جب احکام فلکیات کا منتقل کرنے والا یعنی ماہتاب جہان تاب اس روحانیت کو زمین کی طرف لاتا ہے تو

(۱) نیک اعمال کے وقت رحمت و رضا اور بد اعمال کے وقت غضب و لعنت۔ (۲) یعنی مختلف شعاعوں کے چڑھنے کے اعتبار سے عالم جبروت میں مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں کبھی اس پر اس کے اعمال کی وجہ سے غضب وغیرہ ہوتا ہے کبھی اس کے اعمال کی وجہ سے اس کو توبہ نصیب ہوتی ہے پھر کبھی رحمت ہوتی ہے پھر اسی کی بدی کی وجہ سے اس پر ناراضگی ہوتی ہے۔ (۳) یعنی جب تک کوئی قوم برے کام نہیں کرتی خدا اس کے ساتھ برائی سے پیش نہیں آتا اور اسی طرح جب تک وہ اچھے کام نہیں کرتی خدا اس کے ساتھ نیکی سے پیش نہیں آتا۔

لوگوں کے دل اور ان کی توجہات اس روحانیت کی طرف پھر جاتی ہیں (۱)۔ بالکل اسی طرح عارف باللہ (۲) جانتا ہے کہ جب ایک خاص وقت آتا ہے جس کو شرع میں لیلۂ مبارک (برکت والی رات) کہتے ہیں اور جس میں تمام حکمت آمیز امور طے ہوتے اور بٹتے ہیں تو اس وقت عالم ملکوت میں ایک قسم کی روحانیت پیدا ہوتی ہے جو احکام نوع انسانی سے مرتب ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق وقت کی مناسبت سے وہاں سے اس زمانہ کے سب لوگوں میں عمدہ اوراذکی شخص (یعنی نبی) پر الہامات نازل ہوتے ہیں۔ اور اسی کے واسطہ سے ان نفوس ذکیہ پر الہامات ہوتے ہیں جو عمدگی وذکاوت میں اس کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں۔ پھر اس کے بعد باقی تمام لوگوں کو یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ ان الہامات کو دل سے قبول کریں اور اچھا جانیں۔ اور پھر ان (الہامات) کے معاون ومددگاروں کی تو تائید وامداد ہوتی ہے اور معاندین ومخالفین کی رسوائی وذلت اور ملائکہ سفلیہ کو یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ ان (الہامات) کے مطیع وفرمانبردار کے ساتھ نیک سلوکی سے پیش آئیں اور ان کے عاصی ونافرمان کے ساتھ بدسلوکی سے۔ پھر اس کے بعد ایک قسم کا (نورانی) رنگ واثر ملأ اعلیٰ اور حظیرۃ القدس میں پہنچتا ہے اور پھر وہاں سے رضامندی وخوشنودی یا ناراضگی وناخوشی پیدا ہوتی ہے (۳)۔

(چہارم) نبی کی اطاعت ہے اور وہ اس طرح ہے کہ جب خداوند تعالیٰ کسی نبی کو لوگوں میں (رسول بنا کر) بھیجتا ہے اور اس کی بعثت سے ان پر لطف ومہربانی اور خیر رسائی چاہتا ہے اور اس کی اطاعت ان پر لازم قرار دیتا ہے تو وہ علم جو اس کے پاس بذریعہ وحی پہنچتا ہے متشخص اور متمثل ہو جاتا ہے۔ اور اس نبی کی ہمت ودعا کے ساتھ مل جاتا ہے اور اس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ اس کی مدد ہو، تاکہ اس کا کام مستحکم اور مضبوط ہو جائے، پہلی دونوں صورتوں میں جزا وسزا (جو تقاضائے

---

(۱) یعنی جب اجرام فلکی میں ایک خاص قسم کی ہیئت پیدا ہو جاتی ہے جیسے چاند پر عکس پڑتا ہے اور چاند کے جس رخ پر عکس پڑتا ہے وہ مہینہ کی چودھویں رات کو دنیا کی طرف نظر آتا ہے تو اس روشنی اور ٹھنڈک سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور اس سے لوگ فیض اٹھاتے ہیں۔ (۲) یعنی خداشناس جو حکمت الٰہی سے واقف ہوتا ہے۔ (۳) یعنی جس طرح اجرام فلکی کا نظام قائم ہے اسی طرح آسمانی نظام بھی قائم ہے۔ لیلۂ مبارک (شب قدر) اسی نظام کے تحت ایک خاص وقت میں وارد ہوتی ہے اور جیسے چاندنی روشنی وٹھنڈک سے لوگ مادی فیض حاصل کرتے ہیں اسی طرح اس مبارک رات سے روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔

صورت نوعیہ اور جہت ملأ اعلیٰ ہے وہ) اس فطرت الٰہیہ کا نتیجہ ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور جو کبھی تبدیل ہی نہیں ہوتی لیکن یہ نیکی و بدی کے اصول اور کلیات ہی میں جاری ہے فروعات میں نہیں۔ اور یہ فطرت وہ دین ہے جو کہ زمانوں کے بدلنے سے بھی نہیں بدلتا اور تمام انبیا اس پر متفق ہوتے ہیں جیسے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ ہے تم سب کا طریقہ جو ایک ہی طریقہ ہے"۔ اور نبی صلعم نے بھی فرمایا ہے کہ "تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں کہ ان کا باپ تو ایک ہی ہے لیکن مائیں مختلف ہیں (۱)۔ اور اس قدر مؤاخذہ (جو دین) فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ شخص سے ضرور بالضرور ہوتا ہے چاہے وہ انبیا کی بعثت سے پہلے گزرا ہو، چاہے بعد میں (۲)۔

لیکن جو تیسری قسم کی جزا و سزا (جو شریعت کا تقاضا) ہے تو وہ زمانوں کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہے اور اسی کے لئے نبی اور رسول مبعوث ہوا کرتے ہیں چنانچہ نبی صلعم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ "میری اور جو کچھ خدا نے مجھ کو دے کر بھیجا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی قوم کے پاس آکر یہ کہے کہ "اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے (دشمن کی) فوج دیکھی ہے اور میں تم کو کھلم کھلا (اس سے) ڈراتا اور چوکنا کرتا ہوں لہٰذا تم بھاگو اور اپنی جان بچاؤ۔ تو اس قوم کے ایک گروہ نے تو اس کی بات مان لی اور اس فوج کے آنے سے پہلے پہلے راتوں رات سویرے سے اٹھ کر آرام کے ساتھ چل دیئے اور بچ گئے۔ لیکن ایک گروہ نے اس کو جھوٹا جانا (اور اس کی بات کو نہ مانا) اور صبح تک وہیں اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ تو صبح کو اس (دشمن کی) فوج نے آکر اس کو مار ڈالا اور اس کا ستیاناس کر دیا تو ایسی ہی اس کی مثال ہے جس نے میری اطاعت کی اور میرا کہا مانا اور جو میں لایا اس کی پیروی کی (کہ وہ نجات پائے گا) اور ایسی ہی اس کی مثال ہے جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق بات میں لے کر آیا ہوں اس کو جھٹلایا (کہ وہ ہلاک ہوگا)

"اب رہی چوتھی قسم کی جزا و سزا کی صورت جو بعثت انبیا کی وجہ سے ہوتی ہے) تو وہ اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ انبیا مبعوث نہ ہو جائیں اور (لوگوں کے) شکوک وشبہات ورنہ ہو جائیں اور تبلیغ (دین) اچھے طریقہ سے نہ ہو جائے تاکہ جس کو (گمراہ و) ہلاک ہونا ہو وہ (اتمام حجت کے

---

(۱) ایک باپ سے مراد امور فطری میں اتفاق اور چند مختلف ماؤں سے مراد احکام کی جزئیات میں اختلاف ہے۔
(۲) اس لئے کہ ان فطری احکام کے لئے کسی نبی کی ضرورت نہیں عام انسانی عقل اس کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

بعد) دلائل دیکھ کر (دانستہ) ہلاک ہو اور جس کو (ہدایت یاب و) زندہ ہونا ہو تو وہ بھی دلائل دیکھ کر (علی وجہ البصیرت) زندہ ہو''۔

نواں باب اس بیان میں کہ لوگوں کو جبلت کے اختلاف کی وجہ سے ان کے اخلاق واعمال اور مراتب کمال میں اختلاف وفرق پایا جاتا ہے

اور دلیل اس بارے میں نبی صلعم کی یہ حدیث ہے کہ '' جب تم یہ سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کو تو چاہے سچ جان لو لیکن اگر یہ سنو کہ فلاں شخص کے اخلاق وعادات (جبلی) بدل گئے تو اس کو کبھی سچ نہ جانو کیونکہ وہ شخص پھر اپنی جبلی حالت (واصلیت) پر لوٹ آئے گا''۔ اور ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ '' دیکھو! بنی آدم مختلف طور پر پیدا کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مومن پیدا ہوتے ہیں لیکن کافر ہو کر مرتے ہیں (۱) الخ پھر آپ نے آگے تک پوری حدیث بیان فرمائی اور غصہ اور حقوق وقرض کے تقاضے میں ان کے مختلف درجات کا ذکر فرمایا (۲) اور ایک جگہ یہ بھی فرمایا کہ '' لوگ سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح (نسب وقبول فیضان الٰہی کے لحاظ سے) مختلف طور پر (پیدا ہوئے) ہیں اور خداوند تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ (اے محمد) کہہ دو کہ ہر شخص اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے۔ یعنی اپنے جبلی و پیدائشی طریقہ پر۔ اور اگر آپ کو یہ منظور ہے کہ ان احادیث کے معانی اور جو کچھ اس بارے میں مجھ پر منکشف ہوا ہے وہ آپ کو بھی معلوم ہو جائے تو ذرا متوجہ ہو کر سنئے کہ قوت ملکیہ لوگوں میں دو قسم کی پیدا کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک تو وہ ہے جو ان ملا اعلیٰ کے مناسب وموافق ہوتی ہے۔ جن کا یہ کام اور مشغلہ ہے کہ وہ علوم اسماء وصفات سے رنگین رہتے ہیں۔ عالم جبروت کے دقائق وباریک نکات سے باخبر رہتے ہیں اور (کائنات کے) نظام عمدہ (کے امور) کو خوب اچھی طرح حاصل کرتے رہتے ہیں تاکہ اس کا احاطہ کر لیں اور اس کو وجود میں لانے کے لئے اپنی تمام کوششیں اور ہمتیں اس کی طرف مرکوز ومصروف رکھتے ہیں اور دوسری قسم کی وہ قوت ہے جو ملأ سافل کے مناسب ہے (یعنی ان سے مناسبت رکھتی ہے) ان (ملأ سافل) کا

---

(۱) یہ آگے ہے کہ بعض کافر پیدا ہوتے ہیں اور کافر ہو کر مرتے ہیں اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں لیکن کافر ہی مرتے ہیں اور بعض مومن پیدا ہوتے ہیں اور مومن ہی مرتے ہیں۔ (۲) یعنی یہ فرمایا کہ بعض کو جلد غصہ آتا ہے لیکن جلد ہی فرد ہو جاتا ہے اور بعض کو دیر میں آتا ہے اور دیر میں فرد ہوتا ہے اور بعض کو دیر میں آتا ہے اور جلد فرو ہو جاتا ہے اور بعض کو جلد آتا ہے لیکن دیر میں فرو ہوتا ہے اسی طرح قرض کا معاملہ ہے بعض تقاضے میں سخت ہوتے ہیں۔

کام اور مشغلہ یہ ہے کہ وہ محض حکم بالائی کی تعمیل کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں نہ تو اس کا احاطہ کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف اپنی کوششیں اور ہمتیں مصروف و مرکوز کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ اور نہ انہیں معرفت اسماء وصفات ہوتی ہے۔ البتہ ان میں نورانیت ضرور ہوتی ہے جو ان کو بہیمی آلودگیوں سے پاک رکھ سکتی ہے (۱)۔ اور اسی طرح قوت بہیمیہ بھی دو قسم کی پیدا کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک تو وہ ہے جو نہایت شدید اور سخت بنائی گئی ہے، جیسے اس قوی نر سانڈ ھ کی قوت جو بہت سی (عمدہ عمدہ) غذائیں کھلا کر پالا گیا ہو اور جس کی تربیت و پرورش بڑے اہتمام اور نہایت عمدہ ڈھنگ پر کی گئی ہو۔ تو اس طرح وہ نہایت جسیم، بلند آواز، شہ زور، قوی ہیکل، ہٹ کا پکا یا ہمت نڈر، بڑا اکڑفوں، نہایت غصیلی، سخت کینہ ور، قوی شہوت والا غلبہ اور فتح کا لالچی اور شیر دل ہوگا (۲)۔

اور دوسری قسم کی قوت بہیمیہ وہ ہے جو نہایت کمزور وضعیف ہوتی ہے۔ جیسے اس جانور کی قوت جو خصی، لنجا اور پیدائشی کچا ہو اور اس کے علاوہ وہ قحط کا مارا ہو، فاقوں میں پلا ہو اور نامناسب طریقہ پر اس کی پرورش کی گئی ہو۔ تو اس طرح وہ نہایت ضعیف ولاغر بدن، پست آواز، کمزور وناتواں، بزدل، بے ہمت اور غلبہ وفتح سے بے رغبت ہوگا (۳)۔ ان دونوں قوتوں میں سے ہر ایک کی ایک خاص جبلت ہوتی ہے جو کہ ہر فرد میں مخصوص ہوتی ہے اور اس بات کی تخصیص کر دیتی ہے کہ فلاں کس قسم کی قوت کا مالک ہے (ملکی کا یا بہیمی کا) پھر اس کے بعد کسبی اعمال سے اس کو تائید، قوت اور مدد ملتی رہتی ہے (جس سے اس میں اور ترقی ہو جاتی ہے) اور ان دونوں قوتوں (قوت ملکیہ اور بہیمیہ) کا ان (لوگوں) میں یکجا جمع ہونا بھی دو طور پر ہوتا ہے۔ ایک طور تجاذب (۴) ہے کہ باہمی کھینچا تانی کے بعد وہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں جبکہ ہر ایک قوت اپنے مقتضا کے حاصل کرنے میں کوشاں اور اپنی اصلی غایت ومقصد کی طلبگار اور اپنے طبعی طور طریقہ کی

---

(۱) اسی طرح جو انسان اس قسم کی قوت ملکیہ کے مالک ہوں گے وہ از خود تو کوئی عمدہ نظام ذمہ دارانہ طریقے پر نہیں چلا سکتے البتہ ایسے دوسروں کا سہارا لیکر جو ذمہ دار ہوں کچھ کام کر سکتے ہیں۔ (۲) جس انسان میں شدید بہیمیت ہوگی اس میں ایسی ہی صفات پائی جائیں گی۔ (۳) جس کی بہیمیت کمزور ہوگی وہ ایسی صفات کا مالک ہوگا۔ (۴) یعنی مزاحمت، کشاکشی اور کھینچا تانی۔

خواہشمند رہتی ہے تو لامحالہ ان میں کشاکشی پیدا ہوگی۔ اگر ان میں سے کوئی ایک غالب آئے گی تو دوسرے کے آثار کو مٹا دے گی۔ دوسرا طور باہمی صلح و مصالحت اور اتفاق ہے۔ اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ قوت ملکیہ کسی قدر اپنی خالص و اصلی باتوں سے نیچے اتر کر (یعنی ان سے ہٹ کر) اس کے قریب قریب کی باتوں ہی کو اختیار کر لیتی ہے (اور انہی پر اکتفا کرتی ہے) جیسے عقل، سخاوت نفس، عفت طبع، سب کے نفع و بھلائی کو اپنے ذاتی نفع سے مقدم سمجھنا فوری (یعنی دنیاوی) نفع کو چھوڑ کر آئندہ کے (یعنی اخروی) فائدہ کا منتظر رہنا۔ ہر بات میں پاکیزگی و نفاست کو پسند کرنا۔ اسی طرح قوت بہیمیہ بھی کسی قدر اپنی خالص باتوں سے ذرا اونچی ہو جاتی ہے اور اپنا اصلی شیوہ چھوڑ کر وہ باتیں اختیار کر لیتی ہے جو رائے کلی سے بعید اور مخالف نہیں ہوتیں (۱) تو اس طرح یہ دونوں (قوتیں) باہم مصالحت کر لیتی ہیں۔ ان کے اس باہمی ملاپ سے ایک ایسا مزاج و اختلاط پیدا ہو جاتا ہے جس میں کسی قسم کی باہمی مخالفت نہیں ہوتی۔ قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ اور اجتماعی قوت (مخلوط جو ان کے باہمی ملاپ سے پیدا ہوتی ہے) ان میں سے ہر قوت کے مدارج کے لحاظ سے دو کنارے اور ایک مرکز (یا وسط) ہوتا ہے (۲)۔

پھر اس کے بعد وہ درجے ہوتے ہیں جو یا تو کنارے سے قرب رکھتے ہیں یا مرکز سے، غرض اس طرح بیشمار اقسام پیدا ہوتی ہیں لیکن بڑی بڑی اقسام (جو اپنے احکام و خاصیتوں کے لحاظ سے جدا جدا ہیں اور جن کے جاننے سے اور اقسام بھی معلوم ہو جاتی ہیں) کل آٹھ ہیں۔ ان میں سے چار تو وہ ہیں جو ان دونوں قوتوں کے باہمی تجاذب اور کشاکش سے پیدا ہوتی ہے (اوّل) وہ جو ملکیت عالیہ اور بہیمیت شدیدہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ (دوم) جو ملکیت عالیہ اور بہیمیت ضعیفہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ (سوم) جو ملکیت سافلہ اور بہیمیت شدیدہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ (چہارم) جو ملکیت سافلہ اور بہیمیت ضعیفہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے باہمی ملاپ و مصالحت سے بھی انہی جیسی چار اقسام پیدا ہوتی ہیں اور ان میں سے بھی ہر قسم کا حکم و خاصیت جدا ہے جو کسی طرح بھی نہیں بدلتی جس کسی کو بھی اس کے احکام و خاصیات معلوم

(۱) یعنی نہ تو بالکل اپنی باتیں اس سے منواتی ہے اور نہ اس کی ساری باتیں مان لیتی ہے بلکہ اس کے بین بین ہے۔
(۲) یعنی ایک کنارہ اعلیٰ درجہ کا دوسرا ادنیٰ درجہ کا اور ایک درمیانہ درجہ۔

ہو جائیں گی تو وہ بہت سی پریشانیوں اور الجھنوں سے نجات حاصل کر لے گا لیکن ہم یہاں صرف ان باتوں کو بیان کریں گے جن کی ہمیں آئندہ اس کتاب میں ضرورت ہے تو (معلوم ہونا چاہئے کہ) سخت ریاضتوں کا سب سے زیادہ محتاج وضرورتمند وہ شخص ہوگا جس کی قوت بہیمیہ سخت ہوگی۔ خصوصا وہ جو صاحب تجاذب (۱) ہوگا اور کمالات سے بہرہ مند وہ ہوگا جس کی قوت ملکیہ عالی (غالب) ہوگی۔ لیکن صاحب مصالحت (۲) ادب اور عمل میں ان سب سے بہتر ہوگا اور صاحب تجاذب قوت بہیمیہ سے چھٹکارا پانے کے بعد علم اور معرفت میں ان سب سے بڑھ کر ہوگا مگر عمل کی چنداں پرواہ نہ کرے گا (۳) اور بڑے بھاری کاموں (۴) میں بے رغبتی وہی برتے گا (اور ان سے جی چرائے گا) جس کی قوت بہیمیہ ضعیف ہوگی۔ لیکن صاحب قوت عالیہ (۵) سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خدا کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اور صاحب قوت سافلہ کو اگر فرصت ملے گی یا بہیمیت سے چھٹکارا پائے گا تو آخرت کے واسطے سب کاروبار ترک کر دے گا ورنہ سستی اور آرام طلبی کی خاطر اسے ترک کر دے گا اور بڑے بھاری کاموں میں سب سے زیادہ تندہی سے گھسے گا اور مشغول ہوگا جس کی قوت بہیمیہ شدید اور زیادہ ہوگی لیکن صاحب قوت عالیہ (۶) ''امور ریاست، سرداری، ولیڈری جیسے کاموں کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا اور وہ سب کام کرے گا جو رائے کلی کے مناسب ہوتے ہیں (۷) اور صاحب قوت سافلہ (۸) جنگ وجدل اور باربرداری جیسے کاموں میں زیادہ مصروف ہوگا اور ہر صاحب تجاذب جب پستی کی طرف گرے گا تو صرف دنیوی امور میں مشغول رہے گا اور جب بلندی کی طرف ترقی کرے گا تو صرف دینی امور، اصلاح نفس اور اس کے تزکیہ ہی میں مصروف رہے گا اور ہر صاحب مصالحت ان دونوں کی طرف برابر توجہ صرف کرے گا اور دونوں کو بیک وقت کرے گا لیکن ان میں سے جس کی قوت عالیہ بہت ہی بلند ہوگی تو وہ دین ودنیا دونوں کی سرداری کے لائق ہوگا اور حق تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق اسی پر ہمیشہ

(۱) یعنی وہ شخص جس میں قوت ملکیہ اور بہیمیہ بڑی کھینچا تانی اور تجاذب کے بعد یک جا ہوئی ہے۔ (۲) یعنی وہ شخص جس میں قوت ملکیہ وبہیمیہ باہمی مصالحت وملاپ سے یک جا جمع ہوئی ہوں۔ (۳) کیونکہ اس میں بہیمیت مغلوب ہوگئی ہے جو عمل میں کام آتی ہے۔ (۴) جیسے جہاد وغیرہ۔ (۵) یعنی اعلیٰ قوت ملکیہ والا۔ (۶) یعنی جس کی قوت ملکیہ کمزور اور سافل ہوگی۔ (۷) یعنی جس کی قوت ملکیہ غالب اور عالی اور قوت بہیمیہ کمزور اور ضعیف ہوگی۔ (۸) یعنی جس کی قوت ملکیہ کمزور وسافل ہوگی اور قوت بہیمیہ سخت وغالب ہوگی۔

ڈٹا رہے گا۔ نظام کلی کے اہتمام (جیسے خلافت اور دین وملت کی امامت) میں بمنزلہ اس کے دست راست کے ہوگا یہی لوگ انبیا اور ان کے ورثا اور ستون دین اور سلاطین وقت اور اولوالامر ہوتے ہیں اور جن لوگوں کا دین الٰہی میں اتباع واجب ہوتا ہے وہ لوگ ایسے اہل مصالحت ہوتے ہیں جن کی قوت ملکیہ عالی وغالب ہوتی ہے اور ان لوگوں کے زیادہ مطیع وہ اہل مصالحت ہوتے ہیں جن کی قوت ملکیہ کمزور وسافل ہوتی ہے کیونکہ یہ لوگ نوامیس (یعنی اسرار الٰہی) کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں اور ان سے دور تر اہل تجاذب ہوتے ہیں کیونکہ یہ لوگ (اہل تجاذب) یا تو سراسر ظلمات طبیعت میں اس طرح غرق رہتے ہیں کہ سنت راشدہ وراہ راست پر اچھی طرح قائم نہیں رہتے اور جب اس پر غالب آتے ہیں تو اس طرح غالب آتے ہیں کہ اگر اہل علو (بلند خیال) ہوں تو ارواح نوامیس (اسرار الٰہیہ کی ارواح) کے ساتھ چمٹے رہیں گے اور ان کی ظاہری صورتوں کو چھوڑ دیں گے اور ان کی اکثر کوششیں اور ہمتیں عالم جبروت کے دقائق (صفات الٰہیہ کی باریکیاں) معلوم کرنے اور ان کے رنگ میں رنگین ہونے میں مصروف رہیں گے اور اگر اس (علو) سے کم ہوں تو ریاضتوں اور دردوں میں پھنسے رہیں گے اور کشف واشراف (۱) اور قبولیت دعا وغیرہ جیسے انوار ملکیہ سے خوش رہیں گے لیکن خاص نوامیس (یعنی اسرار الٰہیہ) ان کے دل کی تہہ میں نہیں بیٹھیں گی (۲) جب تک کہ طبیعت پر جبر نہ کریں یا انوار کا سہارا نہ لیں (۳) تو یہ ہیں وہ اصول جو میرے پروردگار نے مجھے عطا فرمائے ہیں جو ان کو غور سے سمجھ لے گا تو اہل اللہ کے احوال اس پر روشن ہو جائیں گے ان کے ذاتی کمالات واشارات کی انتہا سے وہ واقف ہو جائے گا اور ان کے سلوک کے مراتب بھی اس کو معلوم ہو جائیں گے۔ یہ (علم) محض خداوند تعالیٰ کے اس فضل کی بدولت (عطا ہوا) ہے جو اس نے ہم پر اور باقی تمام لوگوں پر کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس کی ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے۔

---

(۱) اشراف، یعنی کسی کے دل کی بات پر مطلع ہونا۔ (۲) یعنی وہ صرف ان چیزوں کو لے لیتے ہیں جن سے نفس مغلوب ہو باقی احکام کی پابندی عادت کے طور پر کرتے ہیں نہ کہ شوق سے۔ (۳) یعنی ان کا میلان طبع نوامیس کی طرف کم ہوتا ہے اگر ہوتا ہے تو طبیعت پر جبر کر کے عادتاً یا اس کو انوار کا سہارا دیکر۔

دسواں باب ان خواطر (۱) وخیالات کے اسباب کے بیان میں جو اعمال پر اکساتے ہیں

واضح ہو کہ انسان کے ان دلی خواطر وخیالات کا جو اس کو کسی کام پر اکساتے اور رغبت دلاتے ہیں ضرور کوئی نہ کوئی سبب ہوگا کیونکہ تمام حوادث (نو پیدا شدہ چیزوں) میں عادت الٰہی یونہی جاری ہے کہ ان کے وجود میں آنے کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ مشاہدے، تجربہ اور صحیح غور وفکر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے بہت سے اسباب ہیں جو یہ ہیں من جملہ ان اسباب کے سب سے بڑا سبب انسان کی وہ جبلت ہے جو اس کی خلقت میں رکھی گئی ہے چنانچہ اس کا ذکر ایک حدیث میں اس سے پیشتر آچکا ہے (۲) منجملہ ان کے انسان کا مزاج طبعی ہے جو کھانے پینے وغیرہ جیسی ضروری تدابیر وحالات سے بدلتا رہتا ہے چنانچہ بھوکا آدمی کھانا طلب کرتا ہے اور پیاسا پانی مانگتا ہے بالغ اور تیز شہوت والا شخص عورت کی خواہش کرتا ہے بعض اوقات انسان ایسی غذائیں کھاتا ہے جو قوت باہ (شہوت) کو تقویت پہنچاتی ہیں جس سے اس میں عورتوں کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اس کے دل میں ایسے ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن کا تعلق عورتوں سے ہوتا ہے اور پھر یہی خیالات اس کو بہت سے (ناقابل ذکر) افعال کے کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات انسان ایسی سخت غذائیں کھاتا ہے جن سے اس کا دل بھی سخت ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ قتل تک کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور بہت سی ان باتوں پر بھی غصہ ہو جاتا ہے جن پر اور لوگ غصہ نہیں ہوتے اور نہ وہ باتیں قابل غصہ ہوتی ہیں۔ پھر یہی دونوں قسم کے اشخاص جب صیام وقیام سے ریاضت نفس کرنے لگتے ہیں یا بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں یا سخت بیمار پڑ جاتے ہیں تو ان کی پہلی حالت بہت حد تک بدل جاتی ہے یعنی دل نرم ہو جاتا ہے اور نفس سیدھا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بوڑھے اور جوان کے حالات میں بڑا فرق پایا جاتا ہے اور اسی (فرق) کی بنا پر نبی صلعم نے روزہ کی حالت میں بوڑھے کو تو (بیوی کا) بوسہ لینے کی اجازت دے دی لیکن جوان کو نہ دی منجملہ ان کے کسی چیز کی عادت اور الفت ہے۔ کیونکہ جب انسان کسی بات کو

---

(۱) دل کے خیالات یعنی ان خیالات کا جو عمل کی طرف رغبت دلاتے ہیں کیا سبب ہے۔ (۲) یہ وہ حدیث ہے کہ پہاڑ کا ٹل جانا سنو تو چاہے سچ جان لینا لیکن اگر کسی کی عادت کا بدل جانا سنو تو کبھی سچ نہ جاننا۔

کثرت کے ساتھ کرتا ہے اور اس طرح اس کے لوح دل پر اس کی مناسب شکل وصورت منقش ہو جاتی ہے تو دل میں بسا اوقات اسی کے خیال آتے ہیں منجملہ ان کے یہ بات ہے کہ کبھی نفس ناطقہ (۱) قوت بہیمیہ کی قید سے نکل بھاگتا ہے اور مقام ملأ اعلیٰ سے (حظیرۃ القدس) سے حسب توفیق کچھ ہیئت نورانی اڑا لاتا ہے، جو کبھی تو نیک کام سے انس ومحبت اور اطمینان وسکون کا باعث ہوتی ہے اور کبھی کسی اعلیٰ ونیک فعل (کے کرنے) کا عزم پیدا کر دیتی ہے منجملہ ان کے ایک یہ بات بھی ہے کہ بعض نفوس خسیسہ (ادنیٰ نفوس) شیاطین سے متاثر ہو کر ان کے رنگ میں رنگ (مل) جاتے ہیں۔ تو کبھی اسی ہیئت سے دل میں خواطر وخیالات پیدا ہوتے اور برے افعال سرزد ہوتے ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ خواب کی باتیں بھی وہی حیثیت رکھتی ہیں جو دل کے خیالات وجذبات رکھتے ہیں (۲) فرق صرف اتنا ہے کہ خواب کی باتوں کے لئے نفس مجرد (اکیلا وتنہا) اور صاف ہو جاتا ہے تب وہ باتیں اس پر کسی خاص شکل وصورت میں ظاہر ہوتی ہیں (۳) محمد بن سیرین (۴) فرماتے ہیں کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔ حدیث نفس (دل کی اندرونی باتیں) تخویف شیاطین (شیطانوں کا ڈراوا) بشارت من اللہ (خدا کی طرف سے خوش خبریاں)

گیارھواں باب انسان کے اعمال کا اس کے نفس پر لگایا اور چپکایا جانا اور اس کے لئے گن کر محفوظ رکھا جانا

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر انسان کے عمل کو اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے اور اس کو اس کے لئے قیامت کے دن کتاب بنا کر پیش کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا، (پھر ہم کہیں گے) لے! اپنی کتاب پڑھ آج اپنا حساب لینے کے لئے تو خود کافی ہے۔ نبی صلعم خداوند تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں (۵) کہ (وہ قیامت کے روز فرمائے گا کہ) "یہ تمہارے ہی

---

(۱) یعنی روح انسانی۔ (۲) یعنی یہ دونوں کے پیدا ہونے کے اسباب ایک ہی ہیں۔ (۳) یعنی دونوں ایک ہی اصول کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں فرق یہ ہے کہ جاگتے میں خیالات منتشر ہوتے ہیں ایک تخیل پر مرکوز نہیں ہوتے اس لئے وہ خیالات واضح طور پر تصویر کی شکل میں نہیں آتے لیکن سوتے میں خیالات ہر طرف سے ہٹ کر صرف اسی تخیل پر جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کی صاف فلم اور تصویر سامنے آجاتی ہے۔ (۴) آپ تابعی اور علم تعبیر خواب کے امام مانے جاتے ہیں ان کی عجائب تعبیریں مشہور ہیں۔ (۵) یعنی اس آیت کی تفسیر میں۔

اعمال تو ہیں جن کو میں نے تمہارے لئے سینت کر محفوظ رکھا تھا اب میں تم کو انہیں کا بدلہ دیتا ہوں تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے تو وہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے(۱)'' اور آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نفس (دل) تمنا اور خواہش کیا کرتا ہے پھر فرج (عضو بدن) اس کو سچا اور جھوٹا کرتا ہے(۲)''

واضح ہو کہ جن اعمال کو انسان قصداً کرتا ہے ان کا اور ان عادات واخلاق کا جو اس میں راسخ ہوتے ہیں، نفس ناطقہ (روح) مبدأ ومنبع ہے(۳) وہ اسی سے نکل کر اسی کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں پھر اس کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں اور سینت کر اس میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں اب رہی یہ بات کہ اس سے پیدا کیوں ہوتے ہیں تو اس کی وجوہات وہ ہیں جو آپ جان چکے ہیں کہ قوت ملکیہ اور بہیمیہ اور ان کے امتزاج (مرکب) کی چند اقسام بن جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک کی جدا جدا خاصیت ہوتی ہے اور انسان کے مزاج طبعی کا غلبہ اور ملائکہ یا شیاطین کے رنگ میں رنگین ہونا اور اسی طرح کے دوسرے اسباب (جن کی وجہ سے خواطر ظہور میں آتے ہیں) انسان کی جبلت ہی سے پیدا ہوتے اور اس میں مناسبت پیدا کرتے ہیں (۴) لہٰذا (معلوم ہوا کہ) ان کا مرجع یہی اصل نفس ہی ہے خواہ بواسطہ یا بلا واسطہ (۵) اب دیکھئے (اس کی زندہ مثال) کہ جب مخنث (بچہ) ابتدا میں نازک مزاج پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت اس بات سے ماہر نفسیات جان جاتا ہے کہ اگر یہ (بچہ) اپنے اسی مزاج پر جوان ہوگا تو ضرور عورتوں کی سی عادات وصفات اور لباس وزیب وزینت اور انہیں کی سی رسومات وطور طریق اختیار کرے گا اور اسی طرح طبیب یا

---

(۱) خدا کا شکر اس لئے کہ خدا نے اس کی فطرت میں ابتدا ہی میں ایسی استعداد رکھی کہ اس کی وجہ سے وہ اچھے کام کر کے اجر پائے گا اور اپنے آپ کو ملامت اس لئے کہ خدا نے تو اس کی فطرت میں استعداد رکھی تھی لیکن اس نے اسے نہ ترقی دی اور نہ صحیح استعمال کیا۔ (۲) یعنی دل میں گونا گوں آرزو اور خواہش ہو مگر اس کی تصدیق وتکذیب فرج کے اختیار میں ہے کہ اس میں اس کی مدد کرے یا نہیں اگر اس نے وہ فعل کر لیا تو خواہش سچی ہوگئی اور وہ گناہ ہو گیا ورنہ نہیں۔ (۳) یعنی ان کا مادہ اسی کے اندر موجود ہوتا ہے کہیں باہر سے یہ چیز واقع نہیں ہوتے۔ (۴) یعنی اندرونی استعداد ہی ہے جو بیرونی اسباب کا اثر لے کر عمل کرتی ہے۔ (۵) بواسطہ اس طرح کہ استعداد کی قوت اور مضبوطی کی وجہ سے از خود عمل کرے اور بواسطہ اس طرح کہ کمزور ہونے کی صورت میں بیرونی اثرات سے متاثر ہو کر عمل کرے۔

ڈاکٹر بھی یہ جانتا ہے کہ اگر فلاں بچہ اپنے مزاج کے موافق جوان ہوگا اور (پرورش کے دوران میں) اس کو کوئی ایسی ویسی بات (بیماری وغیرہ) پیش نہ آئے گی تو آیا وہ قویٰ چست و چالاک وہونہار رہوگا یا کمزور و مرجھایا ہوا اور بزدل (۱) اب رہا یہ سوال کہ وہ اعمال اس کے نفس ناطقہ کی طرف واپس کیوں لوٹ آتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کسی کام کو بکثرت کرتا ہے تو وہ اس کا اس درجہ عادی ہو جاتا ہے کہ اس سے بغیر کسی غور وفکر کے نہایت آسانی کے ساتھ خود بخود ایسے افعال سرزد ہونے لگتے ہیں اب اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہتا کہ اس کے نفس نے اس (فعل) سے متاثر ہو کر اس کا رنگ قبول کر لیا ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ اس تاثر میں (جو انسان بے شمار اعمال سے قبول کرتا ہے) ہم جنس اعمال کے ایک ایک عمل کو دخل ہوتا ہے چاہے وہ (تاثیر یا اثر) کتنا ہی باریک یا خفیف کیوں نہ ہو۔

نبی صلعم کی اس حدیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ''گمراہیوں کے خیالات (فتنے) دلوں کو بوریہ کے تنکے کی طرح تہ بہ تہ گھیر لیتے ہیں (۲) پھر جو دل ان کے اثر کو قبول کرتا ہے تو اس میں ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے اور جو دل اس کو قبول نہیں کرتا اس میں سفید نشان ہو جاتا ہے آخرکار (بڑھتے بڑھتے) ان دونوں دلوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ سفید نشان والا تو (پورا کا پورا) ایسا صاف شفاف ہو جاتا ہے جیسے سنگ مرمر اور پھر اس کو آئندہ کے لئے کسی قسم کے فتنہ یا بدعملی کی نقصان دہی کا اندیشہ نہیں رہتا اور دوسرا سیاہ دھبہ والا کالا سیاہ غبار آلودہ اور چکنے گھڑے کے مانند ہو جاتا ہے (۳) کہ سوائے اپنی دلی خواہشوں کے نیکی بدی کچھ نہیں جانتا اب رہی یہ بات کہ اعمال نفس کے دامن سے کیوں چمٹ جاتے ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس ناطقہ شروع شروع میں صاف وسادہ ہیولانی صورت میں پیدا کیا جاتا ہے ہر قسم کے خدوخال اور رنگ واثر سے خالی ہوتا ہے پھر اس کے بعد قوت سے فعل کی طرف دن بدن ترقی کرتا رہتا ہے۔ اور ہر پچھلی

---

(۱) قوی اس صورت میں کہ اس کا مزاج قوی ہو اور کمزور اس صورت میں کہ اس کا مزاج کمزور ہو۔ (۲) مطلب یہ ہے کہ فتنوں کی بھرمار ہوتی ہے ایک اٹھا، ابھی وہ دور ہوا نہیں کہ دوسرا اٹھ جاتا ہے۔ (۳) چکنا یا الٹا گھڑا اس لئے کہا کہ جس طرح اس میں پانی نہیں رہتا اور نہ نیا آتا ہے اسی طرح اس دل کا حال ہو جاتا ہے کہ اس میں کوئی نیک بات نہ آتی ہے اور نہ ٹھہرتی ہے، اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ وہ کالا، سفیدی ملا ہو (یعنی راکھ کے رنگ کا) اور جھکے ہوئے آبخورے کی طرح ہو جاتا ہے۔ یہاں اوپر محاورہ کی رعایت رکھی گئی ہے۔

حالت کے لئے پہلی حالت معد (۱) ہوتی ہے اوران معدات کا سلسلہ ترتیب وار ہوتا ہے کوئی ایک بھی آگے کی پیچھے اور پیچھے کی آگے نہیں ہوسکتی جونفس ناطقہ آج موجود ہے اس میں معدات سابقہ میں سے ہر معد کا ویسا کا ویسا ہی اثر موجود ہے گو کسی خارجی شغل میں توجہ پلٹنے کی وجہ سے نفس کو اس کا پوری طرح احساس نہ ہو صرف دو صورتوں میں اس اثر کے زائل ہو جانے کا احتمال ہے۔ اول یہ کہ وہ چیز ہی فنا ہو جائے جس میں وہ قوت موجود رہتی ہے جس سے اعمال پیدا ہوتے ہیں جیسے کہ بوڑھے اور مریض کے بارے میں ہم ذکر کر چکے ہیں (۲)۔

دوسرے یہ کہ (حظیرۃ القدس کی) کوئی ہیئت بالائی اس پر غالب آ کر اس کے نظام (سابق) کو اس طرح بدل دے جیسے کہ وہ مذکورہ بالا صورت میں بدل جاتا ہے (۳) چنانچہ اسی کی بابت خداوند تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ''نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں''۔ اور یہ بھی فرماتا ہے کہ ''اگر تو شرک (اختیار) کرے گا تو تیرے سب اعمال برباد ہو جائیں گے'' اب رہی یہ بات کہ وہ اعمال اس کے لئے جمع کر کے محفوظ کیوں رکھے جاتے ہیں؟ تو اس کا راز جو کچھ مجھے اپنے ذوق سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نظام فوقانی کی عطا کے موافق ومناسب عالم مثال کے بالائی طبقے میں ہر انسان کی ایک صورت ظاہر ہوتی ہے اور میثاق کے قصہ میں جس کا ظہور ہوا وہ اسی کی ایک شاخ تھی (۴) پھر جب وہ شخص عالم وجود میں آتا ہے تو وہ صورت اس پر لگ جاتی ہے اور اس طرح اس کے ساتھ مل کر ایک ہو جاتی ہے پھر جب وہ شخص کوئی (اچھا) عمل کرتا ہے تو وہ صورت اس (عمل) سے بلا اختیار طبعی طور پر خوش ہو جاتی ہے (۵) پھر (مرنے کے بعد) عالم معاد میں کبھی تو یوں ظاہر ہوگا کہ اوپر اس کے اعمال اس کے لئے سینت کر محفوظ رکھ لئے گئے ہیں چنانچہ نامہ اعمال پڑھنے سے یہی

---

(۱) معد اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں جو خود معدوم ہو کر دوسرے کے وجود اور ترقی میں مدد کرے جیسے ایام، یعنی آج کا دن ہو چکے گا تو کل کا دن آئے گا۔ اس طرح ہر آنے والی چیز پچھلی چیز کی استعداد سے پیدا ہوتی ہے۔ (۲) یعنی یہ کہ بوڑھے اور مریض کی استعداد وقوت ختم ہو جاتی ہے اس کے دل میں ایسے خواطر آنے بند ہو جاتے ہیں کیونکہ بیماری اور بڑھاپے کے ساتھ ہی ساتھ اس کا مزاج طبعی بھی بدل جاتا ہے۔ (۳) یعنی بیماری اور بڑھاپے کی صورت میں۔ (۴) یعنی یوم الست کا واقعہ جو روز عہد کہلاتا ہے جبکہ خداوند تعالیٰ نے بنی آدم سے عہد لیا تھا اور الست بربکم فرمایا تھا وہاں انسانوں کی یہ صورتیں موجود ہوئی تھیں۔ سورۂ اعراف ۱۷۲ میں یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ (۵) یا پھیل جاتی ہے۔

مراد ہے اور کبھی یوں ظاہر ہوگا کہ وہ اعمال اس کے اعضا سے چمٹے ہوئے ہیں چنانچہ ہاتھ پاؤں کے کلام کرنے (اور گواہی دینے) سے یہی مراد ہے پھر (یہ بھی ایک بات ہے کہ) عمل کی صورت وشکل اس کے دنیاوی واخروی ثمرہ ونتیجہ کو اپنے آپ صاف صاف بیان کردیتی ہے(۱)۔ کبھی ملائکہ اس کی (صحیح) صورت وشکل بنانے میں تردد کرتے اور دیر لگاتے ہیں تو خداوند تعالیٰ فرمادیتا ہے کہ عمل کو ہو بہو لکھ لو (زیادہ کدوکاوش نہ کرو)

امام غزالی فرماتے ہیں کہ ''ابتدائے عالم سے لے کر اس کی انتہا تک جس جس چیز کا خداوند تعالیٰ نے اندازہ مقرر کرلیا ہے وہ سب ایک مخلوق چیز میں لکھا ہے۔ اس مخلوق کو بھی خداوند تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے کبھی تو اسے لوح محفوظ کہتے ہیں، کبھی کتاب مبین اور کبھی امام مبین. جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے (پس جو کچھ عالم میں ہو چکا ہے اور ہوگا اس لوح پر ایسے نقوش سے لکھا ہوا ہے جو ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ لوح (محفوظ) کسی لکڑی یا لوہے یا ہڈی کی تختی ہے اور وہ کتاب (مبین) کاغذ یا ورقوں کی بنی ہوئی ہے بلکہ آپ قطعی طور پر یہ جان لیجئے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات انسانوں کی ذات وصفات کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کی تختی اور کتاب ان کی تختیوں اور کتابوں جیسی نہیں۔ اگر آپ اس کو سمجھنے کے لئے کوئی مثال چاہیں تو حافظ قرآن کے دل ودماغ کو لے لیجئے کیونکہ لوح محفوظ میں خداوند تعالیٰ کے مقررہ اندازوں کا ریکارڈ بالکل اسی طرح محفوظ ہے جس طرح حافظ قرآن کے دل ودماغ میں قرآن کے الفاظ محفوظ ہوتے ہیں اور اس کو وہ دل ودماغ پر اس طرح لکھے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے کہ وہ پڑھتے وقت ان کو دیکھ رہا ہے مگر جب آپ اس کے دماغ کو چیر کر دیکھیں گے تو اس طرح کا لکھا ہوا کوئی حرف بھی دکھائی نہ دے گا پس لوح محفوظ میں بھی اسی طور پر سب کچھ (جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے) لکھا ہوا سمجھ لیجئے'' امام غزالی کا قول ختم ہوا۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ نفس نے جو کچھ کیا ہوتا ہے برا یا بھلا اس کو وہ اکثر یاد کرتا رہتا ہے اور اس کی جزا وسزا کی امید رکھتا ہے تو یہ بھی اس کے عمل برقرار رکھنے کی ایک اور وجہ بن جاتی ہے باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

---

(۱) یعنی ان کے دیکھنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا دنیاوی واخروی نتیجہ کیا ہوگا۔

بارھواں باب اعمال کا نفسی حالتوں سے وابستہ ہونا

واضح ہو کہ اعمال ہیئت نفسانی (۱) کے مظاہر، اس کے شکار کرنے کی گھاٹیاں (۲) اور اس کی شرح ہیں اور عرف عام میں اسی کے ساتھ متحد ہیں یعنی ساری کی ساری دنیا حال دل کسی طبعی وقدرتی سبب کی بنا پر جو صورت نوعیہ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اعمال کے ساتھ تعبیر کرتی ہے (۳) اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دلی ارادہ انسان کو کسی کام پر آمادہ کرتا ہے اور نفس اس کو پسند کر لیتا ہے تو وہ کھل کر ہشاش بشاش ہو جاتا ہے اور اگر ناپسند کرتا ہے تو وہ پژمردہ وافسردہ ہو کر مرجھا جاتا ہے اور پھر جب وہ اس کام کو کر چکتا ہے تو اس ارادہ کا مبدا ومنبع (خواہ قوت ملکیہ ہو یا بہیمیہ) مستقل اور قوی ہو جاتا ہے اور اس کا مخالف (منبع خواہ قوت ملکیہ ہو یا بہیمیہ) غیر مستقل اور کمزور ہو جاتا ہے۔ نبی صلعم کو اس قول سے یہی بات جھلکتی ہے کہ (انسان کا) نفس آرزو اور خواہش کرتا ہے اور فرج اور اس کی شرم گاہ اس خواہش نفسانی کو سچا کرتی ہے یا جھوٹا کرتی ہے، آپ جس خلق وعادات کو دیکھیں گے یہی پائیں گے کہ اس کے لئے چند افعال واعمال اور ہیئات وکیفیات مخصوص ہوتی ہیں جن کے ذریعہ سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور انہی سے اس کو بیان کرتے ہیں اور اس طرح وہ (اعمال وہیئات) اس خلق وعادت کے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی کو بہادر بتائے اور پھر اس سے اس کی بہادری کے متعلق دریافت کیا جائے تو لامحالہ وہ اس کے سخت سخت حملوں اور مہموں ہی کو بیان کر کے اس کی بہادری وشجاعت کا اظہار کرے گا اور اگر کوئی اس کی سخاوت وفیاضی بیان کرے گا تو (استفسار کے بعد) وہ بھی یہی کہے گا کہ وہ شخص روپیہ پیسہ خوب خرچ کرتا ہے اور اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ شجاعت اور سخاوت کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو وہ مجبور ہوگا کہ ان شجاعت وسخاوت کے اعمال کا ہی تصور خیال میں لائے ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ فطرت الٰہی ہی بدل جائے جس پر سب لوگ پیدا ہوئے ہیں (۴)۔

---

(۱) ہیئت نفسانی، نفسی حالت، کیفیت قلبی، حال دل، خلق اور ملکہ سب کا ایک ہی مطلب ہے۔ (۲) یعنی روحانی حالتیں، اعمال ہی کے ذریعہ نفس انسانی میں جمتی ہیں۔ (۳) یعنی جب کسی کی ہیئت نفسانی اور خلق کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے اعمال بیان کرتے ہیں۔ (۴) یعنی کوئی شخص مافوق الفطرت ہو عام لوگوں کی طرح نہ ہو بلکہ احساس میں اتنا بلند ہو کہ کسی صفت کے مخصوص اعمال وافعال کو خیال میں لائے بغیر ہی اس کا تصور اپنے ذہن میں قائم کر سکے یہ بہت کم واقع ہوتا ہے اس لئے ایسے لوگوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

اگر کوئی شخص (بہ تکلف) وہ خلق و عادت حاصل کرنا چاہے جو اس میں پہلے سے موجود نہیں ہے تو اس کو اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ اس کے صحیح موقعوں کو تاکتا رہے اور ان اعمال و افعال کو نہایت جانفشانی اور تندہی سے کرے جن کا اس (خلق) سے تعلق ہے اور ان لوگوں کے واقعات یاد کرے جو اس قسم کے کام کر گزرے ہیں پھر یہ اعمال ہی ہوتے ہیں جو قابو میں آسکتے ہیں ان ہی کے (کرنے) لئے اوقات کا تعین ہوسکتا ہے نظر بھی یہی آتے ہیں یہ ہی دکھائے بھی جا سکتے ہیں، بیان بھی کئے جا سکتے ہیں اور اثر انداز بھی ہو سکتے ہیں، نقل و پیروی بھی انہی سے ہو سکتی ہے اور قدرت و اختیار میں بھی یہی داخل ہوتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ سب نفوس اعمال اور ملکات (۱) کے محفوظ کرنے میں برابر نہیں ہوتے کیونکہ بعض نفوس تو ایسے قوی ہوتے ہیں جو اعمال سے زیادہ ملکات کو تصور میں لے آتے ہیں تو ان کا اصلی کمال اپنے اندر صرف اخلاق و ملکات پیدا کرنا ہوتا ہے لیکن اعمال بھی ان کے تصور میں متمثل ہو کر آتے ہیں کیونکہ یہ اعمال ان اخلاق و ملکات کے قالب اور تصویر ہوا کرتے ہیں تو اس طرح یہ اعمال محض اسی وجہ سے محفوظ کئے جاتے ہیں مگر ان کی محافظت اخلاق و ملکات کی محافظت سے کم ہوتی ہے یہ تمثل (۲) ایسا ہے جس طرح خواب میں معانی مقصودہ (۳) اعمال کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں جیسے موھنوں، شرمگاہوں پر مہر لگانا، دیکھنا (۴)۔ اور بعض نفوس ایسے کمزور ہوتے ہیں جو اپنے اعمال ہی کو اپنا اصلی کمال سمجھتے ہیں کیونکہ ان میں نفسی کیفیات اچھی طرح جمی ہوئی نہیں ہوتیں بلکہ اعمال ہی کے لباس میں نظر آتی ہیں لہٰذا ان میں اعمال کے جوہر محفوظ رہتے ہیں اور اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہوا کرتی ہے انہیں وقت کی پابندی کی بہت ضرورت ہوتی ہے اور اسی لئے شریعت میں معانی اور کیفیات کے مقابلہ میں اعمال کی طرف زیادہ توجہ دلائی گئی ہے اور ان ہی پر زیادہ زور دیا گیا ہے پھر ایک بات یہ بھی

---

(۱) اس کا واحد ہے ملکہ یعنی کسی کام کی مہارت جو اس کو بار بار کرنے سے انسان میں پیدا ہوتی ہے اسے کسی کام کا جوہر اور نتیجہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ (۲) تمثل یعنی کسی صورت میں ظاہر ہونا۔ (۳) یعنی وہ باتیں جو نظر نہیں آتیں۔

(۴) یہ اس خواب کی طرف اشارہ ہے جو کسی نے یوں دیکھا تھا کہ میں لوگوں کے موھنوں اور شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہوں۔ ابن سیرین سے جب اس کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے کہا کہ شاید تم موذن ہو گے رمضان میں قبل از وقت اذان دے دیتے ہو گے اور اس طرح لوگوں کا کھانا اور جماع کرنا بند کر دیتے ہو گے۔ چنانچہ اس کے اس فعل کے معنی اس طرح واضح شکل و صورت میں دکھائے گئے۔

ہے کہ بہت سے اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جو قطع نظر اس ہیئت نفسانی کے جس کی وجہ سے عام طور پر یہ ظہور میں آیا کرتے ہیں۔ براہِ راست ملأ اعلیٰ میں مقرر ہو کر پسند یا ناپسند کیے جاتے ہیں تو اس طرح کسی نیک کام کا کرنا گویا ملأ اعلیٰ کے اس الہام کو قبول کرنا ہوتا ہے کہ ''ہمارا تقرب حاصل کر، ہماری مشابہت اختیار کر، ہمارے انوار حاصل کر (۱)۔

اور برا کام کرنے سے اس کے خلاف حالت ہوتی ہے۔ ملأ اعلیٰ میں اعمال کا یہ تقرر چند وجوہات کی بنا پر ہوتا ہے من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ان کو خداوند تعالیٰ کی طرف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نظام بشری اس وقت تک نہیں سدھر سکتا جب تک کہ فلاں فلاں اعمال کو اختیار نہ کیا جائے اور فلاں فلاں اعمال سے اجتناب نہ کیا جائے لہٰذا وہ اعمال ملأ اعلیٰ میں متشکل ہو جاتے ہیں اور بعد ازاں وہاں سے (ہر نبی کی) شریعت میں نازل ہوتے ہیں۔ من جملہ ان کی ایک یہ ہے کہ جب وہ نفوس بشریہ جو ان اعمال (صالحہ) کو لگاتار کرتے رہنے سے ان میں مہارت پیدا کر لیتے ہیں جب (بعد از وفات) ملأ اعلیٰ میں پہنچ جاتے ہیں تو وہاں بھی ان کو پسند یا ناپسند کرنے لگتے ہیں اور اس طرح جب اسی میں ایک زمانہ دراز گزر جاتا ہے تو ان اعمال کی صورتیں وہاں ان کے پاس قرار پکڑ لیتی اور جم جاتی ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس صورت میں اعمال میں بالکل وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو بزرگوں سے منقولہ اور مجربہ تعویذوں اور منتروں میں ہوتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

تیرھواں باب جزا وسزا کے اسباب

واضح ہو کہ جزا وسزا کے اسباب اگرچہ بہت ہیں لیکن وہ سب ان دو باتوں پر مبنی ہیں اوّل یہ کہ نفس انسانی اپنی قوت ملکیہ کے ذریعہ اپنی کسی بدفعلی یا بدخلقی کو نامناسب سمجھتا ہے اس کے اس احساس سے اس میں ایک ندامت، افسوس اور الم دل خراش پیدا ہوتا ہے بسا اوقات اس کی وجہ سے خواب یا بیداری میں ایسے ایسے واقعات تصور میں آتے ہیں جو رنج والم، ذلت واہانت اور خوف وڈر کے باعث ہوتے ہیں۔ بہت سے نفوس ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو جس طرح کے اور علوم کے

---

(۱) یعنی ان اعمال کا تعلق دلی کیفیات سے نہیں ہوتا بلکہ وہ براہ راست ملأ اعلیٰ کے الہام سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔

الہام کی استعداد ہوتی ہے اسی طرح اس عمل کے نامناسب ہونے کے الہام کی بھی استعداد ہوتی ہے(۱) پس فرشتوں کی زبانی یہ خطاب ہوتا ہے کہ ان کو ظاہر کرکے دکھایا جائے اور بتایا جائے (۲)۔ اور اسی بات کی طرف خداوند تعالیٰ کی اس آیت میں اشارہ ہے کہ "ہاں! جنھوں نے گناہ کمائے اور ان کے گناہوں نے انہیں گھیر لیا تو وہی جہنمی ہیں ہمیشہ وہیں رہیں گے" دوم یہ کہ حظیرۃ القدس والے فرشتے بنی آدم کی طرف متوجہ رہتے ہیں (صورت حال یہ ہوتی ہے کہ) ملأ اعلیٰ کے پاس ہیئات نفسانی اور اخلاق و اعمال، اچھے اور برے پسندیدہ اور ناپسندیدہ سب رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس وہ اپنے رب سے یہ دعا وسوال کرتے ہیں کہ ان (نیکوکار) لوگوں کو راحت اور ثواب اور ان (بدکار) لوگوں کو مصیبت اور عذاب ملے۔ چنانچہ ان کی دعا قبول ہوتی ہے اور بنی آدم پر اپنا اثر اس طرح دکھاتی ہے کہ ان پر جس طرح دیگر علوم نازل ہوتے ہیں اسی طرح رحمت ولعنت برستی ہے (۳) جس کی وجہ سے المناک یا راحت کن واقعات ظہور میں آتے ہیں اور اس طرح ملأ اعلیٰ انہیں ڈراتے دھمکاتے ہوئے یا ان سے راضی وخوش نظر آتے ہیں (۴) کبھی ان نفوس پر ملأ اعلیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے ایسا اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان پر غشی یا مرض کی سی حالت طاری ہوجاتی ہے اور کبھی ان کا وہ قصد وارادہ نازل ہوتا ہے جو (انسان کی) کمزور حالتوں کو مضبوط کرتا ہے جیسے خواطر (کمزور خیالات) وغیرہ، تو اس کی وجہ سے ملائکہ یا بنی آدم کو الہام ہوتا ہے کہ وہ ان (بدکاروں) کے ساتھ برا سلوک اور ان (نیکوکاروں) کے ساتھ نیک سلوک روا رکھیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود اسکے اعمال اصلاح یا فساد پیدا کرکے اس کی راحت وثواب یا مصیبت وعذاب کا باعث بن جاتے ہیں۔ بلکہ دراصل سچی بات تو یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ازل سے جو انسان پر نظر عنایت ہے، وہ کبھی یہ نہیں چاہتی کہ انسان یونہی بیکار آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کے اعمال کی باز پرس نہ ہو لیکن چونکہ یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی تھی (کہ خدا کس طرح اچھا برا بدلہ دے گا؟) اس لئے ہم نے اس کو فرشتوں کی دعا اور بددعا کا عنوان دے دیا (کہ ان کی دعا

---

(۱) یعنی جس طرح اور علوم کا الہام ان کو ہوتا ہے اسی طرح اس کا الہام بھی ہوتا ہے۔ (۲) یعنی ان کو ان کی غلطی پر باخبر کردیا جاتا ہے۔ (۳) رحمت نیک کام کے وقت اور لعنت برے کام کے وقت۔ (۴) نیک عملی کے وقت رضامندی اور راحت کن واقعات اور بدعمل کے وقت دھمکی، ڈراوے اور المناک واقعات ہوتے ہیں۔

وبددعا سے ایسا ہو جاتا ہے) باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ اور اسی دوسری بات کی طرف اس قول الٰہی میں اشارہ ہے کہ "جو لوگ کافر ہوئے اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر خدا کی، فرشتوں کی اور سب آدمیوں کی لعنت ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے اسی حالت میں رہیں گے نہ تو کبھی ان پر عذاب کم ہوگا اور نہ (کسی قسم کی) مہلت ورعایت ملے گی (۱)۔

ان دونوں اسباب کی ترکیب اور باہمی ملاوٹ سے عمل اور نفس انسانی کی استعداد کے مطابق بہت سی عجیب عجیب صورتیں پیدا ہوتی ہیں لیکن پہلی بات ان اعمال واخلاق پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جن سے یا تو نفس کی اصلاح ہوتی ہے یا بگاڑ ہوتا ہے (۲)۔ اور ذکی اور قوی (ملکیت والے) نفوس اس کو زیادہ قبول کرتے ہیں اور دوسری بات ان اعمال واخلاق پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جن سے نظام کلی میں فرق پیدا ہوتا ہے یعنی ان پر جو مصالح عامہ اور مفاد کلی کے خلاف اور نظام انسانی کی اصلاح ودرستگی کے منافی ہوتے ہیں (۳) اور اس کو وہ نفوس زیادہ قبول کرتے ہیں جو ضعیف (ملکیت والے) اور بدتر و تنگ ہوتے ہیں۔ جزا وسزا کے ان دونوں اسباب کے بعض موانع بھی ہوا کرتے ہیں جو اس کو ایک خاص مدت تک کے لئے ملتوی کر دیتے ہیں۔ پہلے سبب سے تو یہ چیز مانع ہوتی ہے کہ نفس انسانی میں ملکیت کمزور ہو جاتی ہے اور بہیمیت غالب آ جاتی ہے اور یہ حالت بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ نفس سارا کا سارا بہیمی بن جاتا ہے اور پھر اس کو ملکیت کو تکلیف دینے والے افعال واعمال سے ذرا بھی رنج اور تکلیف نہیں ہوتی مگر جب نفس پر جامہ بہیمی الگ ہو جاتا ہے اور بہیمیت سے امداد ملنی بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ملکیت کے انوار چمکنے لگتے ہیں تو اس وقت اس کو رفتہ رفتہ رنج وعذاب یا راحت وثواب ملنا

---

(۱) مصنف نے جزا وسزا کے دو سبب بیان فرمائے ہیں جو سب کے اصل الاصول ہیں، پہلے کا یہ خلاصہ ہے کہ جزا وسزا کا ایک یہ طریقہ ہے کہ نفوس قدسیہ اپنے افعال واعمال پر حسرت وندامت کریں یا خوش ہوں پس ان کے لئے یہی عذاب وثواب ہے مگر یہ خاص نفوس قدسیہ کی بابت ان افعال میں ہے جو خاص انہیں کے ساتھ متعلق ہیں اور دوسرا طریقہ جزا وسزا کا یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ کی دعا یا بددعا سے ایسے واقعات ظہور میں آئیں جن سے رنج وراحت پہنچے۔ لیکن یہ ان افعال کی نسبت ہے جو باہم معاملات سے متعلق ہیں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عالم آخرت میں جنت ودوزخ کچھ نہ ہوگی بلکہ یہ ظاہراً دنیاوی جزا وسزا کی طرف اشارہ ہے۔ (۲) یعنی ذاتی وشخصی اعمال میں۔ (۳) یعنی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔

شروع ہو جاتا ہے(۱) اور دوسرے سبب سے یہ چیز مانع ہوتی ہے(۲) کہ اس کا جو حکم (عذابی) ہے اس کے مخالف اسباب جمع ہو جاتے ہیں (اس لئے وہ جزا و سزا ایک خاص وقت تک کے لئے ملتوی (۳) رہتی ہے) لیکن جب اس کا مقررہ وقت (موت) آ جاتا ہے تو اس وقت اس جزا و سزا کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور وہ طوفان و سیلاب کی طرح آ جاتی ہے چنانچہ اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے کہ "ہر قوم (کے عذاب) کا ایک وقت معین ہے جب وہ وقت آ پہنچتا ہے تو (جزا مل کر رہتی ہے) نہ ایک گھڑی دیر ہوتی ہے نہ سویر"

(۱) مثلاً جب آدمی طاقتور ہوتا ہے تو کسی کمزور پر ظلم کرتے ہوئے ذرا سا درد بھی محسوس نہیں کرتا لیکن جب وہ خود کمزور ہو جاتا ہے اور کوئی دوسرا طاقتور اس پر ظلم کرتا ہے تو اس کو اس ظلم کا احساس اور درد ہوتا ہے اسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً جوان اور بوڑھا ہونا، دولت مند و غریب ہونا وغیرہ وغیرہ۔ (۲) یعنی اس کے اثرات کو روک لیتی ہے۔ (۳) یعنی کچھ ایسی باتیں پیش آ جاتی ہیں جن کے مدنظر کچھ عرصہ کے لئے اس حکم عذاب کو ملتوی رکھنا پڑتا ہے۔ جیسے ابھی ان میں صالح و نیکوکار لوگ بھی شامل ہوتے ہیں یا ابھی دعوت و تبلیغ مکمل طریقہ سے نہیں ہوئی ہوتی وغیرہ وغیرہ۔

مبحث دوم

دنیاوی واخروی جزاوسزا کی کیفیت

پہلا باب: دنیا میں اعمال کی جزاوسزا

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم پر جو کچھ مصیبت پڑتی ہے تو وہ تمہارے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور بہت سی تو وہ معاف بھی کر دیتا ہے'' اور ایک جگہ فرماتا ہے کہ ''اگر وہ لوگ توریت، انجیل اور جو کچھ ان کے پاس ان کے خدا کی طرف سے آیا تھا اس پر عمل کرتے تو آسمان اور زمین کی نعمتیں کھاتے (یعنی رزق آسمان سے برستا اور زمین سے ابلتا)''۔ اور جو کچھ کنجوس باغ والوں کے قصہ میں خداوند تعالیٰ نے سورۂ نون میں فرمایا ہے وہ تو معلوم ہی ہے(۱) اور نبی صلعم نے اس آیت کی تفسیر میں کہ ''اپنے دل کی بات کو خواہ تم ظاہر کرو خواہ چھپاؤ، خدا تم سے سب کا حساب لے لے گا'' اور اس آیت کی تفسیر میں کہ ''جو کوئی بھی برا کام کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا'' یوں فرماتے ہیں کہ ''اس بدلہ اور جزا سے خدا کا وہ عتاب مراد ہے جو بندہ پر بخار یا اسی قسم کی کسی اور چھوٹی بڑی مصیبت وسختی کی صورت میں ہوتا ہے یہاں تک کہ جو پریشانی اور گھبراہٹ اس کو جیب میں رکھی ہوئی چیز کے گم ہو جانے سے ہوتی ہے وہ بھی اسی میں شمار ہوتی ہے اور اس طرح انسان مصائب کی صورت میں اپنے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ادا کرتے کرتے ان سے اس طرح پاک اور صاف ہو جاتا ہے جس طرح سونا بھٹی میں جلانے سے صاف ہو جاتا ہے۔

(۱) اس میں سورۂ نون کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے کہ تین بھائی ایک باغ کے مالک تھے کھیتی کاٹتے وقت مسکین لوگ خدا واسطے مانگنے آجایا کرتے تھے تو یہ کچھ دے دیا کرتے تھے ایک دفعہ یہ مشورہ ہوا کہ راتوں رات فقیروں کے آنے سے پہلے ہی کاٹ لاؤ، خدا نے ان کی اس بدنیتی کی وجہ سے اس باغ کو جلا دیا جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھ کر بڑے پشیمان ہوئے اور دعا کی کہ الٰہی ہمارے اس جرم کو معاف کر کے ہم کو اس کا عوض عنایت فرمادے۔

واضح ہو کہ قوت ملکیہ، قوت بہیمیہ کے ہاتھوں سے مغلوب ہو کر پھر غالب اور دب کر پھر ظاہر ہو جایا کرتی ہے، کبھی یہ بات طبعی موت سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی اختیاری موت سے طبعی موت سے اس طرح کہ اس وقت قوت بہیمیہ کو غذائی امداد ملنی بند ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے مواد رفتہ رفتہ اس طرح تحلیل ہو جاتے ہیں کہ نہ پھر ان کا کوئی بدل ہوتا ہے اور نہ بھوک پیاس غصہ وغیرہ سے نفس میں ہیجان وخواہش پیدا ہوتی ہے تو ان حالات میں اس پر عالم قدس کا رنگ آنے لگتا ہے (اور اس طرح قوت ملکیہ بیدار ہو جاتی ہے) اور اختیاری موت سے اس طرح کہ جب انسان اپنی قوت بہیمیہ کو ریاضت نفس سے توڑتا اور مغلوب کرتا رہتا ہے اور عالم قدس کی طرف متوجہ ہو کر اس کا تصور دل میں جمائے رہتا ہے تو اس پر کسی قدر قوت ملکیہ کے انوار چمکنے لگتے ہیں اور (یہ بھی واضح رہے کہ) ہر چیز اپنی مناسب باتوں سے خوش ہو کر کھلتی اور پھیل جاتی ہے (۱) اور مخالف باتوں سے رنجیدہ خاطر ہو کر پژمردہ اور منقبض ہو جاتی ہے (۲) (یہی حال قوت ملکیہ کا ہے) اور (یہ بھی معلوم رہنا چاہئے کہ) ہر درد ورنج اور لذت وخوشی کی ایک خاص صورت وشکل ہوتی ہے جس میں وہ متشکل ہو کر دکھائی دیتی ہے مثلاً خلط (مزاج) محرق کی شکل، بدن میں خراش اور چبھن ہونا ہے اور حرارت صفرا سے جو ایذا وتکلیف ہوتی ہے تو اس کی شکل کرب وبے چینی اور خواب میں آگ اور شعلے دکھائی دیتا ہے۔ اور بلغم کی ایذا ہی کی شکل سردی کی شدت اور خواب میں پانی اور برف دکھائی دینا ہے اسی طرح جب قوت ملکیہ کا غلبہ ہوتا ہے اور انسان اس سے مناسبت رکھنے والی صفات مثلاً نظافت وپاکیزگی اور خشوع وخضوع وغیرہ اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تو اسے خواب میں یا بیداری میں انس وسرور کی مخصوص صورتیں نظر آنے لگتی ہیں اور اگر اس کے برخلاف عمل کیا جائے تو وہ اعمال غیر معتدل کیفیات اور ایسے واقعات کی صورت میں نظر آئیں گے جن میں اہانت اور تہدید (ڈراوا اور دھمکی) پائی جاتی ہے مثلاً غصہ، کاٹتے نوچتے اور غراتے ہوئے درندہ کی صورت میں ظاہر ہوگا اور بخل ڈستے ہوئے سانپ کی صورت میں نظر آئے گا۔ خارجی (یعنی دنیاوی) جزا وسزا کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ وہ اسباب کے فراہم ہونے پر ملتی ہے (۳) پس جو

---

(۱) اس کو انبساط کہتے ہیں۔ (۲) اس کو انقباض کہتے ہیں۔ (۳) یعنی اگر وسائل پیدا ہو جائیں تو ملتی ہے ورنہ نہیں ملتی بلکہ ملتوی رہتی ہے۔

کوئی ان اسباب کو سمجھ لے اور ان اسباب سے جو نظام ظہور میں آتا ہے اس کو مدنظر رکھے تو وہ قطعی طور پر جان لے گا کہ خداوند تعالیٰ کسی گنہگار و نافرمان کو دنیا میں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا مگر ساتھ ساتھ اس نظام (کائنات کی مصلحتوں) کو بھی ملحوظ رکھتا ہے(۱) ہوتا یوں ہے کہ جب انسان کو راحت و آرام اور رنج و عذاب دینے کے ظاہری اسباب موقوف ہو جاتے ہیں تو اس کو نیک اعمال ہی کے ذریعہ راحت و آرام دیا جاتا ہے اور بد اعمال ہی کے ذریعہ رنج و عذاب دیا جاتا ہے(۲) اور جب کسی انسان کے لئے تکلیف و رنج کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ شخص ہوتا ہے نیکوکار۔ تو اگر ان اسباب کا بند کرنا اس کی نیکوکاری کے مقابلہ میں کچھ برا بھی نہیں ہوتا تو اس کے نیک اعمال اس بلا و مصیبت کو سرے سے دفع کرنے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو اس کی سختی قدرے کم کرنے میں صرف کئے جاتے ہیں اور اسی طرح جب کسی کے لئے اسباب تو راحت و آرام کے جمع ہو جاتے ہیں لیکن وہ شخص بدکار ہوتا ہے تو اس کے (بد) اعمال اس نعمت و آرام کے دور کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں اور گویا وہ ان اسباب کے عمل میں مانع ہو جاتا ہے اور اگر اس کے اعمال کے موافق اسباب جمع ہو جاتے ہیں تو اس وقت راحت بھی خوب ملتی ہے اور تکالیف و سزا بھی خوب ملتی ہے لیکن کبھی اعمال کے حکم سے نظام کائنات کا حکم زیادہ ضروری ہوتا ہے(۳) تو ایسے موقع پر بدکار کو تو نعمت و آرام دیکر کچھ عرصہ مہلت دے دی جاتی ہے اور نیکوکار کو ظاہری طور پر تنگی و مصیبت میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ تنگی اس کی قوت بہیمیہ کے توڑنے اور مغلوب کرنے میں صرف کی جاتی ہے اور پھر اس کو تنگی کی یہ مصلحت سمجھا دی جاتی ہے تب وہ اس پر اس طرح راضی ہو جاتا ہے جیسے کوئی شخص کڑوی دوا کو اس کے فائدہ کے مدنظر خوشی خوشی پی لیتا ہے۔ نبی صلعم کی اس حدیث کا یہی

---

(۱) یعنی اگر اس مجرم کو دنیاوی سزا دینے میں نظام کائنات میں کچھ خلل پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کی سزا کو ملتوی رکھتا ہے کیونکہ یہ دنیا جزا و سزا دینے کا مقام نہیں ہے بلکہ یہاں تو نظام کو درست رکھنا مقصود ہے اس لئے اگر ضمناً سزا مل سکتی ہے تو دے دی جاتی ہے ورنہ ملتوی رکھی جاتی ہے۔ (۲) یعنی نیک اعمال کرنے ہی میں اس کو لطف حاصل ہوتا ہے اور بد اعمال کرنے سے روحانی تکلیف ہوتی ہے یا یہ کہ نیک اعمال کرنے سے اور نیک اعمال کی توفیق دی جاتی ہے اور بد اعمال کرنے سے، بد اعمال کا راستہ کھول دیا جاتا ہے اور اس طرح جزا و سزا دگنی تگنی ہو کر نامۂ اعمال میں جمع ہوتی جاتی ہے۔ (۳) یعنی یہ زیادہ ضروری نہیں ہوتا کہ اعمال کی سزا و جزا اسی وقت دے دی جائے بلکہ یہ زیادہ ضروری ہوتا ہے کہ نظام کائنات موزونیت کے ساتھ چلتا رہے۔

مطلب ہے فرماتے ہیں کہ ''مومن نرم شاخ کے مانند ہوتا ہے۔ اس کو ہوا کبھی ادھر جھکا دیتی ہے اور کبھی اُدھر جھکا دیتی ہے کبھی زمین پر گرا دیتی ہے اور کبھی سیدھا کھڑا کر دیتی ہے یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آ جاتا ہے(۱)۔

اور منافق چیڑ اور سرو کے سیدھے اور مضبوط درخت کے مانند ہے (ہوا سے) اس کا کچھ نہیں بگڑتا لیکن آخر کار یکبارگی جڑ سے اکھڑ جاتا ہے(۲) اور اس حدیث سے بھی یہی مراد ہے فرماتے ہیں کہ ''جس مسلمان کو بھی مرض یا اس قسم کی دوسری مصیبتیں پہنچتی ہیں تو خداوند تعالیٰ ان سے اس کے گناہ صغیرہ اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں'' بہت سے ملک ایسے ہوتے ہیں جہاں شیطان کی اطاعت و بندگی زوروں پر ہوتی ہے وہاں کے لوگ (عیش ونشاط وظلم وغیرہ میں) بہائم اور درندوں کی طرح ہوتے ہیں تو ایسے لوگوں کی جزا بھی ایک خاص مدت تک کے لئے ملتوی کر دی جاتی ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنے اس قول مبارک میں یہی کچھ فرماتا ہے کہ ''ہم نے جب کسی نبی کو کسی بستی یا شہر میں بھیجا تو یہی کیا کہ وہاں کے لوگوں کو سختی، افلاس اور مصیبت میں ڈال دیا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں اور (خدا کے آگے) عاجزی کریں لیکن جب انھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر ہم نے تکلیفوں کے بجائے نعمتیں دے کر انھیں خوب خوش حال کر دیا (جب ان کی یہ حالت ہوئی) تو کہنے لگے کہ (اس سے پہلے) ہمارے آبا و اجداد کو بھی اسی قسم کی سختیاں اور نرمیاں پہنچتی رہی ہیں۔ (ان کا نیک و بد عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے) پھر ہم نے بھی ان کو یکا یک اس طرح آلیا کہ ان کو خبر بھی نہ ہوئی اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور ہماری بات مان کر پرہیزگاری اختیار کرتے (برے اعمال سے بچتے اور اچھے اعمال کرتے) تو ان پر ہم آسمان و زمین کی برکتوں کے دہانے کھول دیتے لیکن انھوں نے ہماری بات (نہ مانی بلکہ اس) کو جھٹلایا تو ہم نے بھی ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان کو (عذاب کے پھندے

---

(۱) یعنی مومن نرم شاخ کی طرح ہوتا ہے جب خدا کا کوئی حکم آتا ہے تو اس کے آگے سر جھکا دیتا ہے اور جب کوئی مصیبت یا ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس کے اجر کا منتظر رہتا ہے اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو اس کا شکر ادا کرتے ہوئے میانہ روی اختیار کرتا ہے۔ (۲) یعنی منافق کو بہت کم تکلیفیں پہنچتی ہیں لہٰذا اس کی تکلیفیں اس کی برائیوں اور گناہ صغیرہ کے دور کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتیں تاوقت موت آرام سے رہتا ہے۔

میں) جکڑ لیا''۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہاں (دنیا) کی جزا وسزا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سردار اپنی رعیت کو جزا دینے کے لئے پوری طرح فارغ نہ ہو۔ پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو وہ اعمال کی جزا دینے کے لئے سب کاموں سے فارغ ہو جائے گا (کسی اور طرف توجہ نہ دے گا (۱)) اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''اے جن وانس! ہم عنقریب تمہارے (حساب و کتاب) کے لئے فارغ ہونے والے ہیں''۔ دنیاوی جزا وسزا کی کئی صورتیں ہیں کبھی تو وہ اس طرح ہوتی ہے کہ انسان کے دل میں خوشی واطمینان یا رنج وگھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی اس طرح کہ اس کے بدن میں کچھ ہو جاتا ہے جیسے غم اور خوف سے پیدا ہونے والے امراض کا حملہ، نبی صلعم کا زمانہ نبوت سے قبل ستر کھولنے سے بیہوش ہو کر گرنا بھی جزائے بدنی کی ایک مثال ہے (۲) کبھی یہ دنیاوی جزا انسان کے مال وعیال کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ کبھی انسانوں، حیوانوں اور فرشتوں کو الہام ہوتا ہے کہ وہ اس (فلاں شخص) سے نیک سلوک کریں یا بدسلوکی سے پیش آئیں اور کبھی خود اس کو ایسے الہام وغیرہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ برائی یا بھلائی کے قریب آ جاتا ہے۔ جو شخص ہمارے مذکورہ بالا مضمون کو اچھی طرح سمجھ لے گا اور ہر بات کو اپنے موقع پر رکھے گا تو وہ بہت سے اشکالات سے نجات پالے گا جیسے یہ اشکال کہ باہم ان دونوں قسم کی حدیثوں میں معاوضہ اور اختلاف ہے کہ ایک قسم کی حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیکی سے رزق میں زیادتی اور گناہوں سے اس میں کمی ہوتی ہے لیکن دوسری قسم کی احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدکار لوگوں کو دنیا میں قبل از وقت جلد بھلائیاں اور نعمتیں دے دیجاتی ہیں اور نیک لوگوں پر بلائیں اور مصیبتیں آتی ہیں جو زیادتی ہیں جو زیادہ نیک اور افضل ہوتے ہیں ان پر زیادہ مصیبتیں، پھر درجہ بدرجہ اسی طرح کی

---

(۱) کیونکہ وہاں صرف یہی کام درپیش ہوگا کوئی دوسری مصلحت مانع نہ ہوگی۔ (۲) بعثت سے قبل جب کعبہ کی تعمیر کی گئی تو آنحضرت اور حضرت عباسؓ پتھر اٹھا اٹھا کر دیتے تھے تو حضرت عباس نے آپ سے کہا کہ اپنی ازار اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لو (ان کے اصرار پر آپ نے اپنی ازار اتار لی) مگر فوراً زمین پر گر پڑے اور آسمان کی طرف ٹکٹکی بندھ گئی پھر آپ نے فرمایا کہ میری ازار مجھ کو دے دو اور آپ نے پھر اس کو باندھ لیا (بخاری عن جابرؓ) وجہ یہ ہوئی تھی کہ آپ کے کندھے پتھروں کے اٹھانے اور لادنے سے چھل گئے تھے اور اس زمانہ میں برہنہ ہونا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا لوگ برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرنا زیادہ افضل سمجھتے تھے۔

اور بہت سی احادیث ہیں (جن میں اس قسم کا ظاہری اختلاف پایا جاتا ہے) واللہ اعلم۔

دوسرا باب: موت کی حقیقت

واضح ہو کہ صورت معدنی، نباتی، حیوانی اور انسانی ان میں سے ہر ایک صورت کی جدا جدا سواری اور جدا جدا کمالات (۱) ہوتے ہیں۔ گو ظاہر میں یہ بات ذرا مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ پس عناصر (آگ، ہوا، پانی، مٹی) جس وقت نہایت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور ریزے ہو کر مختلف مقدار میں (کوئی تھوڑے کوئی زیادہ) باہم ملتے اور ممیّز ہوتے ہیں تو ان سے کئی قسم کے مرکبات پیدا ہوتے ہیں مثلاً مرکب ثنائی (دو عنصر والے مرکب) جیسے بخارات یا بھاپ، غبار، دھواں، گیلی مٹی، جتی ہوئی زمین، انگارہ، لو یا لیٹ اور شعلہ وغیرہ ہوتا ہے۔ مرکب ثلاثی (تین عنصر والے مرکب) جیسے خمیرہ کردہ مٹی یا گارہ اور کائی وغیرہ اور مرکب رباعی اس کی بھی اسی طرح کی مثالیں ہیں ان تمام چیزوں کے جو خواص ہوتے ہیں وہ صرف ان کے اجزا کے خواص ہی سے مرکب ہوتے ہیں۔ اجزائے ترکیبی کے خواص کے علاوہ کوئی دوسری خاصیت باہر سے نہیں آجاتی اور نہ اندر سے پیدا ہوتی ہے اس قسم کی چیزوں کو کائنات الجو (۲) کہتے ہیں (۳)۔ پھر اس ترکیب کے بعد معدنی صورت آتی ہے جو اس مرکب مادہ پر مسلط ہو کر اس کو اپنی سواری بنالیتی ہے۔ اس کی نوع کے خواص اس کو عطا ہوتے ہیں اور وہ اس مادہ کے مزاج کو محفوظ رکھتی ہے۔ پھر اس کے بعد نباتی صورت آتی ہے اور اب اس مرکب مادہ کے جسم پر (جس کا مزاج محفوظ ہوتا ہے) مسلط ہو جاتی ہے اور اب اس میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ وہ مختلف اجزائے عنصری اور کائنات الجو کو بدل کر اپنے مزاج کے موافق بنالیتی ہے تاکہ ان اجزائے عنصری وغیرہ کو ایک کمال جو متوقع تھا بالفعل حاصل ہو جائے۔ پھر اس کے بعد حیوانی صورت آتی ہے جو روح ہوائی کو (جس میں غذا حاصل کرنے اور بڑھنے کی قوتیں) موجود ہوتی ہیں، اپنی سواری بنالیتی ہے اور اس میں یہ تصرفات کرتی ہے کہ اس میں قوت حس و ارادہ پیدا کر دیتی ہے جس سے اس میں اتنا احساس و ارادہ آجاتا ہے کہ وہ اپنی

---

(۱) سواری سے مراد وہ مادہ جس میں معدنیت یا حیوانیت وغیرہ پائی جاتی ہے اور کمال سے مراد اس کا عمل اور اثرات وغیرہ (۲) مثلاً بھاپ، پانی اور آگ سے مرکب ہے اور غبار، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے علی ہذا القیاس۔ (۳) یعنی آسمان کے نیچے کی مخلوقات، فضائی موجودات۔

مطلوبہ اور مفید چیز کے (حصول کے) لئے آمادہ اور کوشاں ہو جاتی ہے اور مضر چیز سے (بچنے کے لئے) پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد انسانی صورت آتی ہے جو اس نسمہ یعنی روح کو (جو بدن میں تصرف کرتی ہے) اپنی سواری بنا لیتی ہے اور ان اخلاق و ملکات کی طرف جو کسی (اچھے) کام کے کرنے پر آمادہ اور (برے) کام کو کرنے سے روکتے ہیں۔ خاص توجہ دیتی ہے لہٰذا وہ اپنے اس مقصد کے زیر نظر ان ملکات و اخلاقی قوتوں کو اجاگر کرتی اور ان کے نظام میں عمدگی پیدا کر کے ایک ضابطہ میں لے آتی ہے اور انہی کو عالم بالا سے حاصل ہونے والی تمام چیزوں کی جلوہ گاہ بناتی ہے(۱)۔ یہ بات (۲) گو بادی النظر میں کسی قدر مشتبہ معلوم ہوتی ہے لیکن (۳) جب غور کیا جاتا ہے تو ہر اثر اور نتیجہ کو اسی کے اپنے علیحدہ مبدأ و منبع کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے اور ہر صورت کو اس کی اپنی جدا سواری پر بیٹھانا پڑتا ہے (۴) اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہر صوت کے لئے ایک مادہ کا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ اس کے ساتھ وہ صورت قائم و برقرار رہ سکے اور مادہ بھی ہر صورت کے مناسب ہونا چاہئے۔ صورت کو مادے کی ایسی احتیاج ہوتی ہے جیسے موم کی اس صورت انسانی

---

(۱) مرکبات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو کیمیاوی دوسرے امتزاجی یا غیر کیمیاوی۔ کیمیاوی مرکبات میں اجزائے ترکیبی کے خواص کے علاوہ دیگر خواص پیدا ہو جاتے ہیں یعنی وہ پیدا شدہ خواص اجزائے ترکیبی میں نہیں پائے جاتے جیسے کوئلہ جلنے سے راکھ پیدا ہو جاتی ہے۔ غیر کیمیاوی مرکبات میں اجزائے ترکیبی کے خواص بدستور باقی رہتے ہیں جیسے نمک اور پانی کے ملنے سے نمکین پانی بن جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عناصر جب باہم مرکب ہو کر مزاج پیدا کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس پر صورت معدنیہ فائض ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ترکیب جدا نہیں ہونے پاتی بلکہ برقرار رہتی ہے، پھر اس پر صورت نباتیہ فائض ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ عناصر پھل پھول کر اور بڑھ کر اپنا کمال مقدر حاصل کرتے ہیں، پھر اس پر صورت حیوانیہ فائض ہوتی ہے جس سے اس جسم میں قوت حس وحرکت و ارادہ وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر اس پر صورت انسانیہ فائض ہوتی ہے جس سے وہ اپنی ان حس وحرکت ارادہ وغیرہ جیسی قوتوں کو اچھی طرح کام میں لاتی اور اخلاق حمیدہ میں صرف کر کے اس کو اس قابل کر دیتی ہے کہ اس پر عالم بالا کے فیوضات نازل ہو سکیں اور یہ کمال جسم طبعی کا چوتھی مرتبہ میں کمال اعلیٰ ہے جیسا کہ معدنیت کمال اول اور نباتیت کمال دوم اور حیوانیت کمال سوم تھا۔ (۲) یعنی مرکبات اور صورتوں کی یہ ترتیب۔ (۳) کہ انسانیت کے تحت پچھلی سب صورتیں معدنیت، نباتیت اور حیوانیت اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔ (۴) یعنی جسم انسانی میں ہر صورت نوعیہ خواہ معدنیت و نباتیت ہو یا حیوانیت سب اپنی اپنی سواری اور مادہ پر فائض ہو کر اپنا اپنا کام سرانجام دے رہی ہے اسی طرح جسم حیوانی میں معدنیت و نباتیت اپنی اپنی سواری اور مادہ پر فائض اور منہمک ہے۔

کو ہوتی ہے جو موم میں بنادی گئی ہو چنانچہ وہ صورت انسانی بغیر موم کے وجود میں نہیں رہ سکتی لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ "نفس انسانی (یا نفس ناطقہ) موت کے بعد مادہ سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے" وہ غلط کہتا ہے ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ نفس انسانی کے دو مادے ہوتے ہیں (جن پر وہ سوار ہوتا ہے) ان میں سے ایک اصلی ہوتا ہے جسے نسمہ یا روح ہوائی کہتے ہیں (اس کا تعلق اس سے براہ راست ہوتا ہے اور دوسرا عارضی ہوتا ہے جسے جسم ارضی (زمینی بدن) کہتے ہیں۔ (اس کا تعلق اس سے بالواسطہ ہوتا ہے) پس جب انسان مرتا ہے تو مادہ ارضی کے چھوٹ جانے سے اس کے نفس ناطقہ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ وہ نسمہ (یعنی روح ہوائی) کے ساتھ جڑا رہتا ہے اور بالکل اس طرح رہتا ہے جیسے کسی ماہر خوشنویس کے اگر ہاتھ بھی کٹ جائیں تو اس کا ملکۂ کتابت اس میں بدستور باقی رہتا ہے یا کسی تیز رو آدمی کے پاؤں ٹوٹ جائیں یا کوئی دیکھنے سننے والا آدمی اندھا بہرا ہو جائے تو جس طرح ان سب کا ملکہ بغیر اعضائے متعلقہ کے باقی رہتا ہے اسی طرح نفس و روح انسانی کا حال ہے کہ وہ بغیر مادۂ ارضی کے صرف نسمہ سے وابستہ رہتی ہے (۱)۔

واضح ہو کہ انسان کے افعال کی چند قسمیں ہیں، بعض وہ افعال ہوتے ہیں جن کو وہ اپنی خواہش قلبی سے کرتا ہے۔ اگر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ضرور ان کو عمل میں لائے گا اور ان کے خلاف کبھی نہیں چلے گا اور بعض وہ افعال ہوتے ہیں جن کو وہ محض ابنائے جنس کی موافقت کی وجہ سے یا کسی اور خارجی وجہ سے کرتا ہے جیسے بھوک پیاس وغیرہ، جب وہ (عارضی) سبب جاتا رہتا ہے تو پھر اس میں ان افعال کی خواہش بھی نہیں رہتی بشرطیکہ ان کا ایسا عادی نہ بن گیا ہو کہ ان کو چھوڑ ہی نہ سکے۔ دیکھئے بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی خاص شخص یا فن شاعری یا کسی اور چیز کے عشق میں گرویدہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کو مجبوراً ان لوگوں کا سا طرز لباس و روش اختیار کرنی پڑتی ہے مگر جب ان کو ان کی طبیعت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو ان کو اس روش کے ترک کرنے میں کچھ بھی دریغ نہیں ہوتا لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اس روش ولباس کو دل سے اختیار کرتے ہیں

---

(۱) شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اصل روح (یعنی نفس ناطقہ) کا بدن سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ نسمہ (یعنی روح ہوائی) پر سواری رہتی ہے اور نسمہ جسم ارضی ختم ہو جاتا ہے تو اس کی اصل روح نسمہ پر بدستور سواری رہتی ہے۔

اگر ان کو اپنی طبیعت پر بھی چھوڑ دیا جائے تب بھی وہ اس کو ترک نہیں کرتے۔ اور بعض لوگ ایسے بیدار طبع ہوتے ہیں کہ وہ بہت سی متفرق باتوں میں سے اصل بات کو ذہن نشین کر لیتے ہیں ان کی نظر معلومات (نتائج) کو چھوڑ کر علت (سبب) کی طرف رہتی ہے وہ ملکہ (مہارت) کے پابند رہتے ہیں اور ان افعال کی طرف دھیان نہیں کرتے جن سے یہ ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اور بعض لوگ ایسے خفتہ طبع کے ہوتے ہیں کہ ایک اصل چیز سے غافل اور بہت سی چیزوں کی طرف متوجہ رہتے ہیں ملکات سے ان کو کوئی غرض نہیں ہوتی صرف افعال کو زیر نظر رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح افعال کی روح سے تو بے خبر رہتے ہیں لیکن ان کی ظاہری صورتوں کو خوب ذہن میں رکھتے ہیں۔

واضح ہو کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا جسم ارضی گل سڑ کر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کا نفس ناطقہ (روح) نسمہ (یعنی روح ہوائی) کے ساتھ متعلق رہتا ہے اور اس کے اندر جو جو خاصیتیں ہوتی ہیں ان کے لئے وہ فارغ ہو جاتا ہے (تاکہ وہ ظاہر ہوں) اور جس قدر افعال اس سے قلبی خواہش کے بغیر محض دنیاوی زندگی کی ضروریات کی وجہ سے سرزد ہوتے تھے سب علیحدہ ہو جاتے ہیں اور صرف وہ افعال باقی رہ جاتے ہیں جو مقصود بالذات اور خالص اسی کے تھے اور جن کو اس نے اپنے جوہر اصلی میں محفوظ کر رکھا تھا اور اس وقت ملکیت غالب اور بہیمیت مغلوب ہونے لگتی ہے اور پھر جب عالم بالا سے اس کے دل میں حظیرۃ القدس کا اور ان اعمال کا علم و یقین ڈالا جاتا ہے جو وہاں اس کے لئے محفوظ رکھے جاتے تھے تو اس وقت اس کی ملکیت یا تو رنج و درد و تکلیف اٹھاتی ہے یا راحت و آرام حاصل کرتی ہے یہ بھی معلوم رہے کہ جب ملکیت (دنیا میں) بہیمیت کے ساتھ گھلتی ملتی اور اختلاط پیدا کرتی ہے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر اس میں ضرور پہنچتا ہے اور وہ اس کی کچھ نہ کچھ باتیں ضرور مان لیتی ہے لیکن بری سے بری اور سخت نقصان دہ بات یہ ہے کہ ملکیت میں اس کے مقصد و انجام کے مخالف عادات و کیفیات جم کر پیوست ہو جائیں اور سب سے عمدہ اور مفید بات یہ ہے کہ اس میں اس کے مقصد و انجام کے موافق و مناسب عادات و کیفیات جاگزیں ہو جائیں۔ من جملہ مخالف باتوں کے ایک یہ بات ہے کہ اس کا دل مال اور اہل و عیال کی محبت میں یہاں تک گرفتار ہو جائے کہ اس کو سوائے ان دونوں چیزوں کے زندگی کا اور کوئی مقصد نظر نہ آئے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے دل پر ادنیٰ درجہ کی بری بری عادات و کیفیات منقش

ہوجائیں جو اس کی سماحت وتقوے سے دور کردیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ وہ نجاستوں میں ملوث اور خداوند تعالیٰ سے متکبر ہوجائے یہاں تک کہ نہ کبھی اس کو جاننے کی کوشش کرے اور نہ کسی روز اس کے آگے عجز وانکساری کرے۔ الغرض ایسی باتیں پیدا ہوں جو نیکی اور احسان کے برخلاف ہوں اور چوتھی یہ بات ہے کہ اس کا رویہ حق کی اعانت اور تعظیم امر الٰہی اور بعثت انبیا اور پسندیدہ نظام خیر کے قیام میں عالم بالا (یعنی حظیرۃ القدس) کے خلاف ہوجائے (۱) حتی کہ اس پر وہاں سے بغض اور لعنت برسنے لگے۔ اور من جملہ مناسب اور موافق باتوں کے ایک یہ بات ہے کہ وہ ایسے اچھے کام کرنے لگے جن سے طہارت اور خدا کے حضور میں عجز وانکسار حاصل ہوتا ہے اور ملائکہ کے حالات یاد آتے ہیں اور ایسے عقائد کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جن کی وجہ سے انسان صرف حیات دنیوی پر مطمئن ہوکر بیٹھا نہیں رہتا اور دوسری یہ بات ہے کہ وہ شخص سماحت اور تقوے کا پتلا بن جائے نرم دل ورحم دل ہوجائے اور تیسری یہ بات کہ (وہ اتنا پاکباز بن جائے کہ) عالم بالا (یعنی ملأ اعلیٰ) کی دعائیں اور ان کی وہ توجہات (یعنی نظر خاص) جو پسندیدہ نظام خیر کے لئے مخصوص ہوتی ہیں ان کو نصیب ہونے لگیں (تاکہ وہ نظام خیر کی طرف متوجہ ہو) باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

تیسرا باب: عالم برزخ میں لوگوں کے مختلف احوال

واضح ہو کہ عالم برزخ میں لوگوں کے مختلف احوال ودرجات ہوتے ہیں ان سب احوال ودرجات کا شمار نہیں ہوسکتا لیکن ان کی بڑی بڑی قسمیں چار ہیں۔ قسم اوّل کے لوگ بیدار طبع ہوتے ہیں ان کو آرام وثواب اور تکلیف وعذاب محض مناسب اور مخالف ہیئات وکیفیات ہی سے دیا جاتا ہے (۲) چنانچہ اس آیت میں اسی قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے ارشاد ہے کہ ''(کہیں ایسا نہ ہو) کہ (کل قیامت کو) کوئی شخص یوں کہنے لگے کہ ہائے افسوس میری اس کوتاہی اور تقصیر پر جو

---

(۱) یعنی بجائے اس کے کہ حق کی اعانت کرے اس سے عداوت کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ اوامر الٰہی کی تعظیم وتوقیر کرے اور ان کو بجالائے ان کی تحقیر اور مخالفت کرتا ہے، ان کے خلاف عمل کرتا ہے۔ وقس علیہ۔ (۲) یعنی وہ اتنے حساس ہوتے ہیں کہ نیک عمل یا بدعمل کی ظاہری صورت ہی کو تصور میں لانے سے راحت یا تکلیف پاتے ہیں۔

میں نے خدا کے حق میں کی، میں تو (اس کی باتوں کا) مذاق اڑانے ہی میں رہ گیا'' میں نے اولیا اللہ (اللہ والوں) کا ایک ایسا گروہ دیکھا ہے جن کے نفوس (روحیں) ایسے تھے جیسے ساکن پانی سے بھرے ہوئے تالاب: دں ان کا پانی ہوا سے بھی حرکت نہ کرے پھر جب ان پر ٹھیک دوپہر کے وقت آفتاب کی شعاعیں پڑیں تو وہ سراپا نور کے ٹکڑے کی طرح ہو جائیں۔ وہ نور یا تو نیک اعمال کا نور ہو یا یادداشت کا یا رحمت (۱) کا۔ قسم دوم کے لوگ ان ہی کے قریب ہوتے ہیں لیکن یہ طبعی نیند والے ہوتے ہیں اور خواب میں فیضیاب ہوتے ہیں (۲) اور خواب کی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے آگے وہ چیزیں حاضر ہو جاتی ہیں جو ہماری حس مشترک میں تو جمع ہوتی ہیں مگر حالت بیداری ان کی طرف خیال کرنے اور توجہ دینے سے مانع ہوتی اور روکتی ہے اور یہی بات دل میں جمائے رکھتی ہے کہ یہ چیزیں محض خیالات ہیں لیکن جب ہم سو جاتے ہیں تو ان کو ہو بہو وہی چیزیں پاتے ہیں جن کی وہ تصویریں ہوتی ہیں۔ مثلاً کبھی صفراوی مزاج والا خواب میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی خشک جنگل میں ہے گرمی کا موسم ہے، سخت لو چل رہی ہے اسی اثنا میں (جنگل میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ) آگ اس کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہے وہ ادھر اُدھر بھاگنے لگتا ہے مگر اسے بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی لہٰذا وہ اس میں جل جاتا ہے اور اس طرح اس کو بہت سخت درد و تکلیف ہوتی ہے۔ اور بلغمی مزاج والا یہ دیکھتا ہے کہ سردی کی رات ہے اور وہ کشتی میں سوار ہے نہر میں نہایت ٹھنڈا پانی بہہ رہا ہے اور سخت سرد ہوا چل رہی ہے اتنے میں دیکھتا ہے کہ موجوں نے اس کی کشتی کو

(۱) نیک اعمال کا نور نیک اعمال کو لگاتار کرتے رہنے سے پیدا ہوتا ہے اور یادداشت کا نور ہمہ وقت خدا کی طرف دھیان لگانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کہ وہ شخص کوئی بھی کام کرے لیکن خدا کی یاد دل سے نہ جائے ہمیشہ خود اور اس کے احکام کو مدنظر رکھے اگر کوئی یہ کہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی دو کام بہ یک وقت کرے کہ دنیاوی امور بھی انجام دے اور ساتھ ہی ساتھ خدا کی یاد بھی دل میں قائم رکھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل اس طرح ہوتا ہے جیسے سائیکل چلانے والا جب چلتے چلتے کسی سے باتیں کرتا ہے تو وہ باتوں کی طرف بھی پوری پوری توجہ رکھتا اور سائیکل کا توازن قائم رکھنے کی طرف بھی، چنانچہ اسی قسم کی اور دوسری مثالیں ہیں، ان صورتوں میں اگرچہ شروع شروع میں کچھ مشکل پڑتی ہے لیکن بعد میں یہ عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ رحمت کا نور دل میں برائی کا خیال تک نہ لانے سے پیدا ہوتا ہے اس صورت میں ان سے ایسا سلوک ہوتا ہے جیسے ماں باپ اپنے بچوں سے کرتے ہیں۔
(۲) یعنی ان لوگوں کو ملکیت کے احساسات مثلاً راحت و تکلیف بیداری کی حالت میں محسوس نہیں ہوتی بلکہ جب ایک خاص قسم کی خواب کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے تب اس کا احساس ہوتا ہے۔

الٹ دیا (اور وہ ڈوبنے لگا) اب وہ وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتا اور غرق ہو جاتا ہے تب اس کو بہت سخت درد و تکلیف ہوتی ہے۔ اگر آپ لوگوں کے حالات کو تلاش کریں گے تو ہر شخص کو ایسا ہی پائیں گے کہ اس نے خواب میں اس قسم کے مختلف پراگندہ خیالات وحوادث کو ضرور آرام یا تکلیف کی ایسی صورتوں میں دیکھا ہوگا جو ان خیالات اور اس شخص کی طبیعت دونوں سے مناسبت رکھتی ہوں۔ پس یہ عالم برزخ میں عذاب وثواب میں مبتلا ہونا گویا خواب میں مبتلا ہونا ہے (۱) فرق صرف اس قدر ہے کہ یہ ایک ایسا خواب ہوتا ہے جس سے انسان حشر (قیامت) تک بیدار نہیں ہوتا۔ خواب دیکھنے والا دوران خواب میں یہ نہیں جانتا کہ یہ چیزیں جو میں دیکھ رہا ہوں ان کا خارج میں وجود نہیں صرف خیال ہی خیال ہے۔ اور نہ یہ کہ اصلی حالت میں اس کو کچھ راحت و تکلیف نہیں ہو رہی بلکہ وہ اس کو حالت اصلی جانتا ہے اور اگر وہ (ہمیشہ خواب میں رہتا اور قیامت کو) بیدار نہ ہوتا تو (حالت اصلی نہ ہونے کا) یہ راز اسے کبھی معلوم نہ ہوتا لہٰذا اس عالم برزخ کو عالم خارجی کہنا عالم خواب کہنے سے زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔ پس درندہ خصلت انسان (عالم برزخ میں) اکثر یہ دیکھا کرتا ہے کہ اس کو کوئی درندہ چیر پھاڑ کر ہلاک کر رہا ہے اور بخیل شخص یہ دیکھتا ہے کہ اس کو سانپ بچھو کاٹ رہے ہیں۔ اور (انسان کا) عالم بالا کے علوم سے بے بہرہ ہونا دو فرشتوں (منکر نکیر) کی صورت میں نظر آتا ہے جو اس سے سوال کرتے ہیں کہ "تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تو نبی صلعم کو کیا سمجھتا ہے؟" قسم سوم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی قوت بہیمیہ اور ملکیہ دونوں کمزور اور ضعیف ہوتی ہیں وہ لوگ (مرنے کے بعد عالم برزخ میں) ملائکہ سافلہ (نچلے درجہ کے فرشتوں) میں جا ملتے ہیں کبھی تو جبلی اور پیدائشی اسباب کی بنا پر اور کبھی کسبی اسباب کی وجہ سے۔ جبلی اسباب یہ ہیں کہ ان کی قوت ملکیہ قوت بہیمیہ میں بہت ہی کم غرق ہوتی تھی نہ تو اس کا حکم مانتی تھی نہ اس سے متاثر ہوتی تھی۔ اور کسبی اسباب یہ ہیں کہ اس شخص نے قلبی خواہش وارادہ سے طہارت و پاکیزگی کا جامہ پہنا اور اسے اچھی طرح اختیار کیا اور (ریاضت وعبادت کرکے) اپنی روح میں الہامات وانوار ملکیہ کو خوب جگہ دی (۲) (یہ سب بالکل اسی طرح

---

(۱) یعنی عذاب قبر ایک طرح کا خواب ہوتا ہے۔ (۲) یعنی یہ لوگ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے تھے اس کی جگہ یہ طہارت۔ ذکر و نوافل کا التزام کرتے رہے اور اس طرح اپنا درجہ بلند کیا۔

ہوتا ہے) جیسے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض اشخاص پیدا تو مردانی صورت میں ہوتے ہیں لیکن ان کے مزاج میں زنانہ پن اور عورتوں کی عادات کی طرف میلان ہوتا ہے اگر چہ لڑکپن میں وہ مرد وعورت کی جدا جدا شہوت میں تمیز نہیں کر سکتے بلکہ ان سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کیونکہ اس عمر میں انسان کو کھانے پینے اور کھیلنے کودنے ہی کی خواہش ہوا کرتی ہے دوسری طرف توجہ بالکل نہیں ہوتی ، چنانچہ اس عمر میں جب ان کو مردانہ روش پر چلنے کا حکم دیا جاتا ہے اور زنانہ روش سے باز رکھا جاتا ہے تو وہ جبراً وقہراً اس زنانہ روش کو چھوڑ کر مردانہ روش ہی پر چلتے رہتے ہیں لیکن جب وہ جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی بے باک طبیعت پر آ جاتے ہیں تو پھر خوب اچھی طرح جم کر اور مستقل طور پر عورتوں کی روش اور انہیں کی سی وضع قطع اور عادات وخصائل اختیار کر لیتے ہیں اور شہوت اُبنی (یعنی مفعول بننے کی خواہش) ہونے لگتی ہے(۱) اور پھر وہ عورتوں کے سے کام کرتے اور ان ہی کے مانند کلام کرتے ہیں اور ان ہی کے سے اپنے نام رکھتے ہیں (اور اس طرح ایک عرصہ تک زنانہ طریقہ پر زندگی بسر کرنے کے بعد) اب وہ مردوں کے زمرہ سے بالکل نکل جاتے ہیں بالکل اسی طرح انسان کا حال ہے کہ وہ اپنی دنیاوی زندگی میں کھانے پینے اور شہوت نفسانی اور اسی طرح دیگر طبعی تقاضوں کو پورا کرنے اور زندگی کے مختلف مراسم ومعاملات میں مصروف رہتا ہے(۲) لیکن اس کا قریبی تعلق ملائکہ سافل سے ہوتا ہے اور انہی کی جانب اس کو زیادہ میلان اور کشش ہوتی ہے(۳)۔

لہٰذا جب وہ مرجاتا ہے تو اس کے تمام جسمانی علاقے وتعلق ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ اپنی اصلی طبیعت کی طرف عود کر آتا ہے اور پھر ملائکہ میں مل کر انہی میں کا ہو جاتا ہے(۴) اور انہی کے سے الہامات اس کو بھی ہونے لگتے ہیں اور ان کے جیسے کام وہ بھی کرنے لگتا ہے (اور اس طرح ان کا دست وبازو بن جاتا ہے) چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ”میں نے جعفر بن ابی طالب کو ایک فرشتہ

---

(۱) یعنی یہ کہ ان سے کوئی اغلام یا لواطت کرے۔ (۲) جس طرح ایک بچہ کھانے پینے کھیلنے کودنے میں مشغول رہتا ہے۔(۳) جیسے اس بچہ کو زنانہ پن کی طرف رغبت ہوتی ہے۔(۴) کیونکہ وہ مجبوراً دنیاوی معاملات میں پھنسا ہوا تھا اصل طبیعت اس کی وہی تھی جو فرشتوں کی ہوتی ہے لہٰذا جب مجبوریاں جاتی رہیں تو وہ ان کو ترک کر کے فرشتوں سے جا ملا جیسے کہ وہ مخنث بچہ جوان ہو کر زنانوں میں مل جاتا ہے۔

کی صورت میں اور فرشتوں کے ساتھ دو بازوؤں اور پروں سے جنت میں اڑتے دیکھا ہے(۱) قسم سوم کی یہ لوگ کبھی اعلاء کلمتہ اللہ اور حزب اللہ (خداوندی گروہ) کی مدد میں مصروف ہو جاتے ہیں (۲) اور کبھی انسان کے دل میں نیکی کے خیال القا کرتے ہیں اور کبھی ان میں سے بعض لوگ اپنے جبلی شوق کی وجہ سے صورت جسمانی کے بہت شائق ہوتے ہیں تو (ان کی اس خواہش کی وجہ سے) عالم مثال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ان کی روح ہوائی (نسمہ) میں ایک قسم کی مثالی قوت مل جل جاتی ہے اور وہ ایک نورانی جسم سا بن جاتا ہے اور کبھی ان میں سے بعض لوگ کھانے وغیرہ کی خواہش کرتے ہیں تو ان کی خواہش پوری کرنے کے واسطے ان کو وہاں سے ایسی ہی چیزیں ملتی ہیں (جن کی وہ خواہش کرتے ہیں) چنانچہ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ان کو مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس سے رزق وروزی پاتے ہیں اور جو کچھ ان کو اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس پر خوش ہیں الایۃ'' اور انہی کے مقابل میں ایک اور قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو شیاطین سے بہت مناسبت رکھتے ہیں، یا تو جبلی طور سے یا کسبی طور سے، جبلی طور سے اس طرح کہ ان کا مزاج ہی فاسد ہوتا ہے جس سے وہ ایسی باتیں سوچتے ہیں جو کہ حق کے مخالف، نظام کلی کی رائے کے برخلاف اور مکارم اخلاق سے بعید ہوتی ہیں۔ اور اختیاری وکسبی طور سے اس طرح کہ وہ خسیس وکمینی عادتوں اور فاسد افکار وخیالات کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ اور شیطانی خیالات کے تابع ہو جاتے ہیں اور ان کو خدا کی ناراضگی ولعنت گھیر لیتی ہے، چنانچہ جب وہ مر جاتے ہیں تو شیاطین میں جا ملتے ہیں اور ظلمانی لباس پہنا کر ان کو وہ کمینی عادتیں اور بری لذتیں جو وہ اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے کے لئے کرتے تھے متشکل بنا کے دکھائی جاتی ہیں۔

---

(۱) جنگ موتہ میں لڑتے لڑتے جب آپ کا ایک ہاتھ کٹ گیا تو آپ نے دوسرے ہاتھ سے جھنڈا تھام لیا اور جب وہ بھی کٹ گیا تو اس کو چمٹا لیا اور جہاد میں شریک رہے آخر کار تلواروں اور برچھیوں کے نوے زخم کھانے کے بعد گرے اور شہادت پائی۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کے بجائے دو پر عطا کر دیئے۔ (۲) چنانچہ جب روم اور روس میں سیپا سٹوں کے قلعہ پر لڑائی ہوئی تو بہت سے اہل اللہ نے تہجد کے وقت مسجد نبوی میں آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کو تیر مارتے دیکھا چنانچہ اسی روز صبح کو لشکر اسلام غالب آیا۔

پہلی قسم کے لوگ (۱) دل میں خوشی پیدا ہونے سے ثواب و آرام پاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ (۲) گھٹنے اور غم وغصہ کھانے سے عذاب و تکلیف پاتے ہیں جیسے کہ مخنث یہ سمجھ کر کہ یہ زنانہ پن انسان کی بدترین حالت ہوتی ہے دل میں گھٹتا اور غم کھاتا ہے۔ لیکن اس سے باز نہیں آ سکتا۔ قسم چہارم میں وہ اہل اصطلاح (صاحب مصالحت) (۳) لوگ ہوتے ہیں جن کی قوت بہیمیہ غالب اور قوت ملکیہ مغلوب ہوتی ہے اکثر لوگ اسی قسم کے ہوتے ہیں، ان کے اکثر امور اس صورت حیوانیہ کے تابع رہتے ہیں جو بدن میں تصرف کرنے میں غرق رہتی ہے چنانچہ موت واقع ہوجانے سے ان کی روحوں کا تعلق ان کے جسم سے بالکل ہی منقطع نہیں ہوجاتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ تدبیری تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور وہمی وخیالی تعلق باقی رہتا ہے ان کا نفس بغیر کسی شک وشبہ کے قطعی طور پر یہ جانتا اور یقین کرتا ہے کہ وہ عین جسم ہے، حتی کہ اگر جسم کو کچلا جائے یا کاٹا جائے تو ان کا نفس (۴) یہ یقین کرتا ہے کہ یہ معاملہ خود مجھ سے ہورہا ہے ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ یہ لوگ خالص دل سے اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ ہماری روح خود جسم ہے یا وہ روح ایک عرض (۵) ہے جو جسم پر طاری ہے، گو کسی کی تقلید یا رسم کی وجہ سے زبان قال سے اس کے خلاف کہیں۔

یہ لوگ جب مرجاتے ہیں تو ان پر اس عالم کے ملکے سے انوار چمکتے ہیں اور اچٹتے ہوئے خیالات وتصورات نظر آتے ہیں اور بالکل وہی حالت پیش آتی ہے جو یہاں اہل ریاضت کو پیش آتی ہے اور ان کو سب باتیں کبھی خیالی صورتوں کے پیرائے میں اور کبھی عالم مثال کی دوسری خارجی صورتوں کے پیرائے میں دکھائی جاتی ہیں جیسے کہ اہل ریاضت کو دکھائی جاتی ہیں پس اگر انھوں نے اعمال ملکیہ کیے ہوتے ہیں تو ان کے اعمال کی درستگی کا علم ان کو ایسے فرشتوں کی صورت میں دکھایا جاتا ہے جن کی نہایت حسین شکل وصورت ہوتی ہے اور ان کے ہاتھوں میں ملائم ریشمی کپڑے ہوتے ہیں اور وہ ان سے نہایت نرم لہجہ اور عمدہ طرز سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کے لئے

---

(۱) جو فرشتوں سے جا ملتے ہیں۔ (۲) جو شیاطین سے جا ملتے ہیں۔ (۳) اہل اصطلاح یا صاحب مصالحت ان کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں ملاحظہ ہو نواں باب کتاب ہذا۔ (۴) روح۔ (۵) عرض اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنا الگ وجود نہیں رکھتی بلکہ کسی دوسرے جسم کے ساتھ مل کر پائی جاتی ہو جیسے رنگ وغیرہ۔

جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس میں سے اس کی خوشبوئیں آنے لگتی ہیں۔ اور اگر انھوں نے برے اعمال کئے ہوتے ہیں (جو ملکیت کے خلاف اور موجب لعنت ہوتے ہیں) تو ان (اعمال کی نادرستگی) کا علم ایسے بدشکل فرشتوں کی صورت میں نظر آتا ہے جن کے سیاہ چہرے ہوتے ہیں اور وہ سخت لہجہ سے ہیبت ناک باتیں کہتے ہیں (۱) (یہ سب اسی طرح دکھایا جاتا ہے) جس طرح غصہ کو درندے کی صورت میں اور بزدلی و نامردی کو خرگوش کی صورت میں دکھایا جاتا ہے اور وہاں (عالم برزخ میں) ایسے فرشتے ہوتے ہیں جن کو ان کی استعداد کے بموجب اسی قسم کے کاموں پر مقرر کیا گیا ہے اور انہیں (وہاں آنے والے) لوگوں کو تکلیف و عذاب دینے یا راحت و ثواب پہنچانے پر بھی مامور کیا گیا ہے۔ پس اہل عذاب ثواب ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں گو وہ اہل دنیا کو ان کی (ناقص) نظروں سے دکھائی نہیں دیتے۔

واضح رہے کہ عالم قبر (یا عالم برزخ کوئی علیحدہ نیا عالم نہیں بلکہ) اسی عالم کا تتمہ اور بقایا حصہ ہے اور اس جگہ پردۂ غیب کے پیچھے سے علوم مترشح ہوتے ہیں اور ہر شخص کے خاص خاص احوال (یعنی انفرادی احکام ظاہر) ہوتے ہیں برخلاف عالم حشر کے حوادث کے کہ وہاں یہ خاص (انفرادی) احکام مٹ جائیں گے اور اس کی جگہ تمام افراد انسانی کے نوعی و اجتماعی احکام ظاہر ہوں گے (۲) باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

چوتھا باب: واقعات حشر کے اسرار و رموز

واضح ہو کہ انسانی روحوں کا (عالم مثال میں) ایک مرجع اور مقام خاص ہے جس کی طرف یہ روحیں اس طرح کھینچتی ہیں جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھینچتا ہے اور وہ مقام "حظیرۃ القدس" کہلاتا ہے اس جگہ تمام روحیں بدنوں سے جدا ہو کر اس "روح اعظم" سے جا ملتی ہیں جس کی تعریف نبی صلعم نے بہت سے مونہوں اور بہت سی زبانوں اور بہت سی بولیوں کے وصف کے ساتھ بیان کی ہے۔

---

(۱) یہ اشارہ اس حدیث کے مضمون کی طرف ہے جس میں یوں آیا ہے کہ جب مومن کی روح قبض کی جاتی ہے تو نہایت حسین صورت فرشتے ہاتھوں میں ریشم لئے ہوئے آتے ہیں اور پھر قبر میں اس کو طرح طرح کے عیش و آرام بہم پہنچاتے ہیں جنت کی طرف دریچی کھول دیتے ہیں اور کافر سے اس کے برعکس معاملہ کیا جاتا ہے۔ الحدیث۔

(۲) جو بحیثیت مجموعی تمام انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں خاص خاص انسانوں کا حکم وہاں کبھی زیر غور نہ ہوگا یعنی وہ انفرادی درجہ یہیں قبر میں ختم ہو جائے گا اس کے بعد جس قدر ترقی ہوگی وہ اجتماعی ترقی ہوگی۔

اور یہ اجتماع گاہ (روح اعظم) عالم مثال یا عالم ذکر (جو چاہے نام لیجئے اس) میں صورتِ نوع انسانی کی شکل یا تصویر ہوتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں وہ احکام جو انفرادی خصوصیات سے پیدا ہوتے ہیں۔فنا ہو جاتے ہیں۔

اور وہ باتیں جو نوع سے پیدا ہوتی ہیں یا ان میں نوعی حالت غالب ہوتی ہے(۱) باقی رہ جاتی ہیں اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ تمام فرد انسانی میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز نظر آتے ہیں اور بعض باتیں ایسی ہیں جن میں سب شریک ہیں اور وہ سب میں پائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں (جو سب میں پائی جاتی ہیں) ''احکام نوع'' کہلائیں گی (انہیں فطرت بھی کہتے ہیں) اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ'' ہر بچہ انسانی فطرت (سلیمہ) پہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں)'' پھر ہر نوع کے احکام مخصوصہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ان میں سے ایک قسم تو ظاہری احکام کی ہوتی ہے جیسے پیدائش و بناوٹ یعنی رنگ،شکل،مقدار اور آواز وغیرہ۔پس نوع کا جو فرد اس ہیئت اور شکل پر پایا جائے گا جس کو اس کی نوع چاہتی ہے تو اس میں یہ تمام ظاہری احکام پوری طرح ضرور پائے جائیں گے بشرطیکہ اس کی ساخت کے مادہ میں کوئی کمی و نقص نہ ہو،چنانچہ نوع انسان کا ہر فرد طویل القامت ناطق اور صاف جلد ہوتا ہے۔اور گھوڑے کی نوع کا ہر فرد کج قامت ہنہنانے والا اور بالدار جلد کا ہوتا ہے ان کے علاوہ بہت سی باتیں اور بھی ہیں جو افراد سے کبھی جدا نہیں ہوتیں بشرطیکہ ان کا مزاج صحیح و سالم رہے۔ دوسری قسم باطنی احکام کی ہوتی ہے جیسے قوت ادراک (سمجھنا) معاش کے لئے ہدایات حاصل کرنا اور اپنے مقصد کے حصول اور آنے والی مصیبت سے بچاؤ کے لئے مستعد ہونا،غرض ہر نوع کا ایک جداگانہ طریقہ ہوتا ہے،چنانچہ شہد کی مکھی کو دیکھئے کہ خداوند تعالیٰ نے اس کو کس طرح وحی کی کہ وہ درختوں کو ڈھونڈھ کر ان کے پھل کھائے اور اپنے ہم جنسوں کے لئے ایک گھر بنائے اور پھر اس میں شہد جمع کرے۔اور اسی طرح

---

(۱) اور انفرادی جہات مغلوب ہوتی ہے۔

چڑیا کو یہ وحی کی کہ اس کا نر مادہ کی طرف راغب ہو پھر دونوں مل کر گھونسلا بنائیں، انڈے سئیں اور بچے نکالیں اور جب بچے اڑنے لگیں تب ان کو یہ سکھایا کہ یہاں پانی اور وہاں دانہ ہے اور انہیں ان کا دوست اور دشمن بتلا دیا اور یہ بھی سکھلا دیا کہ بلی اور شکاری وغیرہ دشمن سے بھاگ کر یوں اڑ جانا چاہئے اور اپنے ہم جنس سے حصول منفعت اور دفع مضرت کے لئے یوں لڑنا چاہئے۔ کیا کوئی عقل سلیم والا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ احکام، نوع کے احکام نہیں ہیں؟

واضح ہو کہ افراد کی سعادت (بہتری) یہی ہے کہ ان میں نوع کے احکام پورے پورے پائے جائیں اور ان کا مادہ ان سے گریز بھی نہ کرے اور نہ کوئی کمی چھوڑے کہ اس کے بعض نوعی خواص ظاہر نہ ہوسکیں اور اسی لئے آپ افراد نوع کو سعادت اور شقاوت میں مختلف الحال پاتے ہیں اور جب تک وہ افراد اپنی نوع کے مقتضا کے موافق رہتے ہیں ان کو تکلیف نہیں پہنچتی، لیکن ان افراد کی فطرت کبھی عارضی اسباب کی وجہ سے متغیر ہو جاتی ہے جیسے ورم وغیرہ، آنحضرتؐ کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے "پھر اس (بچہ) کی ماں، باپ اسے یہودی، نصرانی، یا مجوسی بنا دیتے ہیں (۱) معلوم ہونا چاہئے کہ انسانی روحیں نوعی حیثیت سے "حظیرۃ القدس" کی طرف کبھی تو بصیرت اور ہمت سے کھینچ کر جاتی ہیں اور کبھی اس وجہ سے کہ ثواب وعذاب دینے کے لئے وہاں اس کے آثار متشکل ہو چکے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے انجذاب وکشش (جو بصیرت و ہمت پر مبنی ہے) اس کا تو یہ حال ہے کہ جہاں کوئی شخص بہیمی نجاست سے پاک وصاف ہو جاتا ہے تو جھٹ وہاں پہنچ جاتا ہے اور وہاں کی کچھ نہ کچھ باتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں، چنانچہ نبی صلعم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ "آدم اور موسیٰ اپنے خدا کے ہاں جمع ہوئے" اور آنحضرت سے متعدد طریق سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ "صالح لوگوں کی ارواح، روح اعظم کے پاس اکٹھی ہو جاتی ہیں"۔ اور جہاں تک دوسری قسم کے انجذاب وکشش کا تعلق ہے تو اس کی تشریح یوں ہے کہ جسموں کا قیامت کے دن دوبارہ اٹھنا اور پھر ان میں ارواح کا واپس آنا کوئی نئی زندگی نہیں ہے بلکہ یہ پہلی (دنیاوی) زندگی ہی کا تتمہ ہے جیسے بہت زیادہ کھانے کا تتمہ بدہضمی ہے، کیونکہ اگر یوں

---

(۱) یعنی انسان بچپن میں صحیح فطرت پر ہوتا پھر ماحول کے اثر سے وہ بگڑ جاتا ہے گویا وہ پہلے تندرست تھا اب اس کو ورم ہو گیا اور پوری سعادت حاصل نہ کر سکا۔

نہ ہوتا تو پھر وہ لوگ پہلے لوگ نہ ہوتے بلکہ ان کے غیر ہوتے اور اپنے افعال پر ماخوذ نہ ہوتے (۱)۔ واضح ہو کہ بہت سی ایسی چیزیں جو خارج میں پائی جاتی ہیں مناسب معنوی اجسام میں متشکل ہو کر عالم بیداری میں اس طرح پیش ہوتی ہیں جیسے کہ عالم خواب میں پیش ہوا کرتی ہیں، مثلاً حضرت داؤد کے سامنے دو فرشتے مدعی اور مدعیٰ علیہ کی صورت میں ظاہر ہوئے اور ایک جھگڑا فیصل کرانے لائے، پس داؤدؑ نے جان لیا کہ یہ وہ قصور ہے جو مجھ سے اوریا کی بیوی کی بابت سرزد ہوا ہے لہٰذا انھوں نے مغفرت مانگی اور تائب ہوئے (۲)۔ اور جیسے (شب معراج کو) آنحضرت صلعم کے روبرو دو پیالے پیش کئے گئے ایک شراب کا اور ایک دودھ کا، تو آپ نے دودھ کا پیالہ پسند فرمایا۔ اس واقعہ میں فطرت اسلامی اور شہوت نفسانی ان دونوں پیالوں کی صورت میں آکر آپ کی امت کے سامنے ظاہر ہوئی تھیں، اور آپ کا دودھ کو پسند فرمانا اہل رشد و ہدایت کا فطرت اسلامی کو اختیار کرنا ہے اور جیسے آنحضرت صلعم اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کا ایک کنویں کی منڈیر پر مل کر بیٹھنا اور حضرت عثمانؓ کا (جگہ نہ ہونے کی وجہ سے) ان سے علیحدہ ہو کر بیٹھنا اس امر کا تصور تھا کہ قبر میں یہ تینوں صاحب تو مجتمع رہیں گے اور ایک جا دفن ہوں گے لیکن حضرت عثمان ان سے علیحدہ دفن ہوں گے۔ چنانچہ سعد بن مسیب نے بھی اس معاملہ کی یہی تعبیر بیان فرمائی ہے حشر کے واقعات سمجھنے کے لئے یہ مثالیں آپ کو کافی ہیں۔ کیونکہ وہاں اکثر واقعات اسی طرح کے پیش ہوں گے۔

واضح ہو کہ عام لوگوں کے نفوس ناطقہ (روح الٰہی) کا نسمہ (روح حیوانی یا ہوائی) سے بہت ہی گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ (عالم مثال کے) علوم بعیدہ کے سمجھنے میں ایسے ہوتے ہیں جیسے مادرزاد اندھا ہوتا ہے کہ وہ رنگ اور روشنی کا تخیل ہی نہیں کر سکتا اور نہ اس کے تخیل کی خواہش رکھتا ہے۔ البتہ ایک مدت دراز اور طویل زمانہ میں مختلف صورتوں اور مثالوں کو سمجھ کر وہ انکا تخیل قائم کر سکتا ہے (اسی طرح ان عام لوگوں میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے حشر میں کچھ واقعات ظہور پذیر

---

(۱) یعنی اخروی زندگی اگر دنیاوی زندگی کا تتمہ اور اسی کا ایک سلسلہ نہ ہوتا تو عذاب دیئے جانے والے لوگ کوئی اور لوگ ہوتے وہ لوگ نہ ہوتے جو دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ (۲) یہ قصہ اگر کسی کے نزدیک غلط ہو تو اس کی مثال دینے سے چنداں حرج واقع نہیں ہوتا۔ شاہ صاحبؒ ذاتی طور پر اس قصہ کے بدنما حصہ کو حذف کر کے ایک حد تک اس کو صحیح مانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "تاویل الاحادیث"۔

ہوں گے(۱) چنانچہ) جب اوّل اوّل نفوس مبعوث ہوں گے تو ان سے آسان حساب یا مشکل حساب لے کر جزا(۲) دی جائے گی اور بعض کو پل صراط پر سے گزارا جائے گا کچھ تو اس پر سے سلامتی کے ساتھ گزر جائیں گے اور کچھ خراشیں اور چوٹیں کھا کر(۳) یا اس طرح ہوگا کہ ہر شخص اپنے مقتدا و امام کے پیچھے جائے گا اور اس کی پیروی میں یا تو ہلاک ہوگا یا نجات پائے گا(۴) یا اس طرح ہوگا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کلام کریں گے اور وہ نامۂ اعمال کو پڑھے گا(۵) یا اس طرح ہوگا کہ اس کا بخل ظہور میں آئے گا اور اس کو وہ پیٹھ پر اٹھائے گا یا اس سے اس کو داغ دیا جائے گا(۶)۔ المختصر یہ سب کچھ جو ظہور میں آئے گا تو اس کے اعمال اور ادراکات اپنی اپنی صورت نوعیہ کے موافق متشکل اور مجسم ہوں گے اور ہر وہ انسان جس کا نفس پختہ اور وسیع اور روح ہوائی فراخ ہو گی تو یہ تمثیلات و تشکلات حشریہ اس کے حق میں خوب اور کامل طور پر ہوں گی(۷) اسی لئے نبی صلعم نے فرمایا کہ "میری امت کو اکثر عذاب قبر ہی میں ہوگا(۸) اور وہاں حشر میں بہت سے ایسے امور بھی متشکل ہوں گے جن کو سب لوگ برابر دیکھیں گے جیسے آنحضرت صلعم کی نبوت عامہ کی ہدایت حوض کوثر کی شکل میں اور نفوس انسانی کی محفوظ شدہ اعمال ترازو کی صورت میں ظاہر ہوں

---

(۱) اس سے ان کی بہیمیت دور ہوگی اور اپنی حقیقت سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔ (۲) اس سے ان کی ہمت، بصیرت اور روحانیت میں خوب ترقی ہوگی۔ (۳) اس سے دنیاوی ظلمات کے پردے ٹوٹ جائیں گے اور جو گمراہ تھا وہ علی وجہ البصیرت تباہ ہوگا اور جو ہدایت یافتہ تھا وہ بھی علی وجہ البصیرت سرخ رو ہوگا۔ (۴) اس سے ان کی بصیرت اور روشن ہو جائے گی اور لوگوں کو اپنے تمام اعمال یاد آ جائیں گے۔ (۵) اس سے اس پر بخل کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ (۶) یعنی جس قدر رجحانات زیادہ ہوں گے ان کو زائل کرنے کے لئے اسی قدر زیادہ کوشش درکار ہوگی۔ (۷) یعنی یہ امت بہ نسبت سابقہ امتوں کے کمزور ہے اس کو تمثیلات حشریہ کی زیادہ ضرورت نہیں ہوگی یہ تھوڑی سی بات سے جلد سمجھ جائیں گے۔ (۸) یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اس روایت کا مضمون یہ ہے کہ ایک جہنمی شخص یہ عرض کرے گا کہ اے اللہ مجھ کو جہنم کی گرمی اور آگ نے جھلس دیا ہے تو اپنی رحمت سے مجھ کو محروم نہ فرما حکم ہوگا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ وہ عرض کرے گا کہ میرا منہ آگ سے پھیر دے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ اس پر وہ بہت پکا عہد کرے گا پھر جب اس کا منہ پھر جائے گا تو جنت کے سایہ دار درخت دکھائی دیں گے تب وہ صبر نہ کر سکے گا لاچار عرض کرے گا کہ اے اللہ ان درختوں تک مجھ کو پہنچا دے پھر میں اور کچھ نہیں مانگوں گا تب اس سے خدا عہد لے کر اس کو ان درختوں کے پاس لے جائے گا وہ نہا دھو کر صاف ستھرا ہوگا پھر جنت کے اندر کے عیش و سامان دیکھ کر ہکا بکا ہو جائے گا اور تھوڑی دیر دل تھام کے بیٹھے گا لیکن رہ نہ سکے گا آخر سوال کرے گا۔ الحدیث۔

گے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہوں گی۔ اور اسی طرح نعمت الٰہی نہایت لذیذ کھانوں شراب طہور، لباس فاخرہ، حور مہ جبیں اور قصور دل نشیں کی صورت میں ظاہر ہوگی اور ظلمات تخلیط سے نجات پاکر نعمت الٰہی کی طرف آنے کے بہت سے عجیب عجیب طرز ہیں۔ چنانچہ نبی صلعم نے اس شخص کا طویل حال بیان فرمایا ہے جو سب سے آخر میں دوزخ سے نکلے گا نفوس کو نوعی تقاضے کے موافق خواہشات اور شہوات ہوں گی اور ان کے موافق نعمت الٰہی متمثل ہوگی اس کے علاوہ اور بھی شہوات ہوں گی جن کی وجہ سے ایک شخص دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے، چنانچہ نبی صلعم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے، فرماتے ہیں کہ ''میں جنت میں داخل ہوا تو ایک جوان لڑکی گندم گوں سرخ لب دکھائی دی، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون (۱) ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ خداوند تعالیٰ نے جعفر بن ابی طالب کی رغبت گندم گوں، سرخ لب لڑکی کی طرف پائی تو اسی کے موافق یہ عورت ان کے لئے پیدا کردی (۲)۔ ایک اور جگہ نبی صلعم فرماتے ہیں کہ ''جب تو جنت میں جاکر یہ چاہے گا کہ یاقوت کے سرخ گھوڑے پر سوار ہوکر اسے ہر جگہ اڑاتا پھرے تو اسی وقت یہ بات تجھ کو حاصل ہو جائے گی اور تیری خواہش پوری ہو جائے گی۔ اور ایک جگہ فرمایا ہے کہ ''ایک جنتی شخص اپنے رب سے کاشتکاری کی اجازت چاہے گا۔ خداوند تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ کیا تجھ کو تیرے دل کے موافق ہر چیز نہیں دی گئی؟ وہ عرض کرے گا کہ ہاں بیشک دی تو گئی ہے لیکن میں کھیتی سے بہت محبت رکھتا ہوں تب وہ بوئے گا اور جیسے ہی پلٹ کر دیکھے گا تو کھیتی اُگ جائے گی اور پک پکا کر کٹ بھی جائے گی اور پھٹکے ہوئے اناج کے پہاڑوں جیسے ڈھیر لگ جائیں گے تب خداوند تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابن آدم! لے، تیرا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرتا (۳) پھر ان سب چیزوں کے بعد خداوند تعالیٰ کے دیدار کی تجلیات سے مشک کے ٹیلوں پر چڑھ کر فیضیاب ہوں گے اس کے بعد کچھ اور بھی ہوگا جس کو میں رسول اللہ کی اقتدا کرتے ہوئے ذکر نہیں کرتا اور سکوت اختیار کرتا ہوں کیونکہ نبی صلعم نے بھی اس بارے میں سکوت فرمایا ہے۔

---

(۱) آپ کو تعجب اس لئے ہوا کہ عربی مزاج کے لحاظ سے وہ لڑکی خوبصورت نہیں تھی جو خوبصورت نہ ہو اس کا یہاں کیا کام؟ (۲) حبشہ میں اس قسم کی لڑکی کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے جعفر بن ابی طالب پہلی ہجرت میں کافی عرصہ تک حبشہ رہ چکے تھے لہٰذا انھوں نے اس قسم کی لڑکی پسند کی۔ (۳) یہ سب خاص خاص خواہشوں کی مثالیں ہیں جو وہاں پوری کی جائیں گی۔

تدبیرات نافعہ کا بیان

پہلا باب: تدابیر نافعہ کے حصول کی کیفیت

واضح ہو کہ ہر انسان کھانے، پینے، نکاح کرنے، گرمی اور بارش میں سایہ حاصل کرنے اور سردی میں گرمی حاصل کرنے اور اسی طرح کی دیگر حاجات میں اپنے ہم جنسوں کے مشابہ ہے اور خداوند تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت سے انسان کو اس کی صورت نوعیہ کے موافق اس بات کا طبعی الہام کیا ہے کہ وہ اپنی ان حاجات کو رفع کرنے کیلئے کیا کیا تدابیر اختیار کرے چنانچہ اس صفت میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی فطری طور پر ہی ناقص الخلقت ہو اور اس کا مادہ ساتھ نہ دے تو وہ الگ بات۔ دیکھئے مہال کی مکھیوں کو اس نے الہام کیا کہ وہ درختوں کے پھل اس طرح کھائیں اور اپنے ہم جنسوں کے باہم رہنے کے لئے اس طرح گھر بنائیں اور پھر اپنی سردار مکھی (ملکہ) کی اس طرح اطاعت کریں اور پھر اس طرح شہد بنائیں اور اسی طرح پرندوں کو وحی کی کہ وہ اس طرح کہیں سے دانے چن کر لائیں اور پانی اس طرح پئیں اور بلی، شکاری جیسے دشمنوں سے اس طرح بھاگ کر اڑ جائیں اور جو بھی ان کی ضروریات میں مانع ہو اس سے اس طرح جنگ کریں اور بوقت خواہش نر مادہ سے کس طرح جفتی کرے اور پھر وہ دونوں مل کر پہاڑ پر کس طرح گھونسلا بنائیں اور پھر وہ دونوں انڈوں کے سینے میں ایک دوسرے کے اس طرح معاون بنے رہیں اور پھر اس طرح بچے نکالیں اور انھیں چگائیں۔

غرض اس طرح ہر نوع کی ایک جداگانہ شریعت (طور طریق) ہے۔ ہر فرد کے دل میں اس کی صورت نوعیہ کے موافق احکام کا الہام ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ انسان کو بھی اس کی ضروریات کی

بابت الہام ہوا کہ وہ ان کو رفع کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرے مگر اس قدر فرق ہے کہ اس کی صورت نوعیہ کے اقتضا کے موافق ان باتوں کے علاوہ اس کو تین اور ایسی باتیں دی گئی ہیں جن سے وہ تمام انواع پر فائق شمار کیا گیا ہے۔ اوّل رائے کلی کے موافق کسی چیز کا ارادہ کرنا چنانچہ چوپایوں کو صرف طبعی خواہش کسی محسوس یا موہوم غرض کو پورا کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے جیسے بھوک، پیاس اور شہوت جماع، برخلاف انسان کے کہ وہ ایسے معقول نفع کے لئے قصد کرتا ہے جو اس کی طبیعت کی طرف سے نہیں ہوتا۔ چنانچہ کبھی تو وہ ملک وشہر میں صالح نظام قائم کرنے کا قصد کرتا ہے اور کبھی اپنے اخلاق کی تکمیل اور نفس کی تہذیب کرتا ہے اور کبھی عذاب آخرت سے رستگاری کی فکر کرتا ہے اور کبھی لوگوں سے وجاہت حاصل کرنے کا قصد کرتا ہے۔

دوم یہ کہ وہ ان حاجات کے پورا کرنے میں عمدگی اور لطافت بھی چاہتا ہے چنانچہ چوپائے صرف اپنی حاجت برآری سے کام رکھتے ہیں لیکن انسان حاجت روائی کے علاوہ اپنے دل کی خوشی اور جی کی لذت بھی چاہتا ہے قدر حاجت پر بس نہیں کرتا چنانچہ وہ حسین بیوی، لذیذ کھانے، عمدہ لباس اور بلند مکان پسند کرتا ہے۔ سوم یہ کہ نوع انسانی میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی عقل اور دانشمندی سے عمدہ عمدہ تدبیرات نافعہ سوچتے اور اختیار کرتے ہیں اور اس میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں وہی تدبیرات آتی ہیں جو دانشمندوں کے دل میں آتی ہیں لیکن یہ لوگ خود استنباط کرکے ان کو اختیار نہیں کرسکتے۔ چنانچہ یہ سب کسی دانا شخص کو تدبیر واستنباط کرتے ہوئے دیکھتے یا سنتے ہیں تو اس کی تدبیر کو دل سے پسند کرتے ہیں اور اس کو اپنے علم اجمالی کے موافق پاکر اس کے پابند ہوجاتے ہیں۔ بہت سے آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو بھوکے اور پیاسے ہوتے ہیں اور کھانا پانی نہ ملنے کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھاتے ہیں لیکن جب ان کو وہ کھانا پانی مل جاتا ہے تو اپنی حاجت رفع کرنے کے لئے اس کے موافق تدبیریں بھی کرتے ہیں مگر اچھی طرح نہیں کرسکتے۔

پھر اتفاق سے جب کسی دانشمند اور حکیم کو بھی ایسے حال میں پاتے ہیں تب کھانے کے قابل اناج کی تمیز کرنا اس کی زراعت کرنا، اس میں پانی سینچنا اور پھر اس کو کاٹ کر خرمن کو کوٹ کر ہوا میں صاف کرنا اور آئندہ حاجت کے لئے جمع کرکے رکھنا سیکھتے ہیں۔ اور اسی طرح چشموں اور

نہروں سے بعید زمین کے لئے کنوئیں کھودنا، تالاب، مشکیزے اور رہٹ کے ڈونگے بنانا، ایجاد کرتے ہیں پس اس سے تدبیرات کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بھوکا پیاسا کچا اناج چباتا ہے جو اس کے معدہ میں ہضم نہیں ہوتا اور کچے پھل کھاتا ہے وہ اس کے پیٹ میں نہیں پچتے تب وہ اس بارے میں کچھ کوشش کرتا ہے۔ مگر کامیاب نہیں ہوتا اسی اثنا میں وہ کسی ایسے حکیم ودانا شخص سے ملتا ہے جس کو پکانا، بھوننا اور روٹی پکانا آتا ہے وہ اس کو دیکھ کر ایک اور راہ اختیار کر لیتا ہے اور اس پر تدبیرات کا دوسرا دروازہ بھی کھل جاتا ہے پس اس پر انسان کی دیگر تمام حاجات کو قیاس کر لینا چاہئے ان وجوہات سے جن کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں ایک غور کرنے والا شہروں میں ایسی تدابیر کو پاتا ہے جو پہلے نہ تھیں زمانہ گزرتا گیا اور لوگ اسی طرح کرتے رہے حتی کہ ایک مقدار معین ایسے علوم الہامیہ کی جن کو تجربات کی مدد ملتی رہی تھی اور جو لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو گئے تھے حاصل ہو گئی اور انہی پر زندگی اور موت کا دارومدار ہے۔

حاصل کلام الہامات ضروریہ مع اپنے تینوں اقسام کے سانس اور نبض کے مانند ہیں کہ دونوں کا اصل وجود نہایت ضروری ہے باوجودیکہ چھوٹے اور بڑے سانس لینے میں اختیار ہے۔

اور جبکہ یہ تینوں باتیں تمام انسانوں میں برابر درجہ کی نہیں پائی جاتیں کیونکہ مزاج اور عقلوں جن سے رائے کلی کا حصول ہوتا ہے لوگوں میں مختلف ہیں، بعض لوگ ذہین ہوتے ہیں ان کے حالات تدابیر کے حاصل کرنے میں غور وفکر اور پیروی کرنے میں یکساں نہیں ہوتے علاوہ بریں بہت سی باتیں وجہ تفاوت بن جاتی ہیں اس لئے تدابیر کی دو حدیں مقرر ہوئیں۔

حد اوّل: یعنی تدابیر کا کم سے کم درجہ جس سے کسی کو مفر نہیں وہ ہے جس میں جنگلوں، پہاڑوں اور مہذب بستیوں سے دور دراز رہنے والے لوگ سب شریک ہیں اس کو ہم اپنی اصطلاح میں ارتفاق اوّل کہتے ہیں۔

حد دوم: یعنی وہ اعلیٰ درجہ جس میں شہروں اور آباد بستیوں کے لوگ شریک ہیں جہاں حکما اور عمدہ اخلاق کے لوگ پیدا ہوتے ہیں کیونکہ ایسی جگہوں میں اکثر لوگوں کا اجتماع رہتا ہے۔ ضروریات اور تجربات سے واسطہ پڑتا ہے اور ایک عمدہ معاشرت پیدا ہو جاتی جس کو ہر شخص دل وجان سے پسند کرتا ہے اس حد کی طرف اعلیٰ وہ ہے جس کو سلاطین عمل میں لاتے ہیں۔ جہاں

پورے سامان تعیش کی وجہ سے اطراف وجوانب کے حکما جمع ہو کر ایک عمدہ طریقۂ معاشرت پیدا کرتے ہیں اس کو ہم ارتفاق دوم کہتے ہیں۔ جب یہ ارتفاق پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے تو ارتفاق سوم پیدا ہو جاتا ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب لوگ بخیل، حاسد اور نادہند ہو جاتے ہیں ان میں اختلافات اور جھگڑے پڑ جاتے ہیں، بری خواہشات سے مغلوب اور دلیری سے لوٹ مار کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان سب کو عملی صورت دینے کے لئے ایک شخص میں طاقت نہیں ہوتی یا اس کو سہولت نہیں ملتی یا اتنا باہمت نہیں ہوتا تو مجبوراً یہ سب مل کر ایک رئیس مقرر کرتے ہیں جو ان میں عدل وانصاف سے فیصلے کرے جو مجرم اور سرکش لوگوں کو سزا دے جو لوگوں سے محصول و مال گزاری وصول کر کے ضروری مصارف پر خرچ کرے۔ اس تیسرے ارتفاق سے ارتفاق چہارم پیدا ہوتا ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہر رئیس اپنے اپنے شہر کا خود مختار ہوتا ہے ہر طرف سے اس کے پاس مال جمع ہونے لگتا ہے اور وہ اس میں حق تلفی کرتا ہے اور آپس میں بخل، حرص اور رنجش پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے باہم قتال کرنے لگتے ہیں اور ان کو ایک خلیفہ منتخب کرنے کی ضرورت پڑتی ہے یا ایسے شخص کو تسلیم کریں جس کا ان پر تسلط خلافت کبریٰ کی طرح ہمہ گیر ہو اور ہماری مراد خلیفہ سے ایسا شخص ہے جس کو اس درجہ شان و شوکت حاصل ہو کہ کوئی اس سے ملک چھین نہ سکتا ہو۔ اور کثیر جماعتیں اور کثیر اموال کے خرچ کئے بغیر کوئی اس سے تعرض نہ کر سکتا ہو۔ ایسے شخص زمانہ دراز کے بعد کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور لوگوں کی اختلاف عادات کی وجہ سے خلیفہ بھی مختلف الحال ہوتا ہے اور جس قوم کی طبیعت میں شدت اور تیزی زیادہ ہوتی ہے وہ بہ نسبت ان لوگوں کے جن میں بخل وعداوت کم ہوتی ہے خلفا اور ملوک کی زیادہ محتاج ہوتی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ان تدابیر اور معاشرت کے اصول اسی طرح بتلا دیں جس طرح مہذب اور صاحب اخلاق قوموں نے پسند کیا اور طریقہ کار بنایا ہے جن میں چھوٹے بڑے سب شریک ہیں۔ پس جو کچھ آپ کو بتلایا جائے اس کو غور سے سنئے۔

دوسرا باب: ارتفاق (۱) اوّل کا بیان

منجملہ اس کے لغت ہے جس کے ذریعہ انسان دلی امور بیان کرتا ہے۔ اور اس بارے میں اصل افعال، ہیئت اور اجسام ہیں جن کا کسی نہ کسی آواز سے تعلق ہوتا ہے خواہ یہ تعلق قرب کا ہو یا

---

(۱) ارتفاق سے مراد تدابیر اولی ہے۔

سبیت کا ہو یا کسی اور وجہ سے ہو پس ہو بہو اس آواز کو لغت کے ذریعہ نقل کیا جاتا ہے پھر اس لغت سے باعتبار معانی کے مختلف صیغے بنائے جاتے ہیں اور جو امور نظروں میں موثر معلوم ہوتے ہیں یا نفس کی ہیئت وجدانیہ سے پیدا ہوتے ہیں ان سب کو قسم اوّل کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور بے تکلف ہو بہو اسی طرح کی آواز بناتے ہیں۔ پھر بہ سبب مجاز کے جس میں مشابہت یا مقاربت کا تعلق ہو یا بذریعہ نقل کے جو کسی علاقہ کی وجہ سے واقع ہو، لغات میں اور بھی وسعت دی جاتی ہے۔ اس بارے میں اور بھی قواعد ہیں جن کو آپ ہماری بعض تقریروں میں پائیں گے من جملہ اس کی کھیتی کرنا، درخت لگانا، کنوئیں کھودنا، کھانا اور سالن پکانا ہے منجملہ اس کے برتن اور مشکیزے بنانا ہے۔ منجملہ اس کے چوپایوں کو اپنے قابو میں کرنا اور جمع کر کے رکھنا ہے تاکہ ان پر بوجھ لادا جائے اور ان کے گوشت، کھال، بال، اون، دودھ اور بچوں سے نفع حاصل کیا جائے۔ منجملہ اس کے جائے سکونت ہے جو اس کو گرمی، سردی سے محفوظ رکھے خواہ پہاڑ کی کوئی کھو ہو یا پھونس کا جھونپڑا ہو یا کچھ اور ہو۔ منجملہ اس کے لباس ہے جو پروں کے قائم مقام ہے خواہ چوپایوں کے چمڑے کا ہو یا درختوں کے پتوں کا ہو یا ہاتھ سے بنا ہوا ہو۔ من جملہ اس کے کسی عورت سے عقد کرنا ہے جس میں کوئی اور شریک نہ ہو اس سے اپنی شہوت پوری کرے پیدائش نسل کرے اور امور خانہ داری میں، اولاد کی پرورش اور تربیت میں اس سے مدد ملے۔

انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات میں زوجیت محض اتفاق کا نام ہے جو نر مادہ میں کسی وجہ سے یا ایک ساتھ پیدا ہونے اور دونوں کا بلوغ تک اکٹھا رہنے سے یا کسی اور بات کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ منجملہ اس کے ایسے آلات کا حاصل کرنا ہے جن کے بغیر کھیتی کرنا، درخت لگانا، کنواں کھودنا اور چوپایوں کا مسخر کرنا وغیرہ نہیں ہو سکتا، جیسے پھاوڑا، ڈول، ہل، رسیاں اور اس کے علاوہ دوسرے آلات ہیں۔ من جملہ اس کے اشیا کا تبادلہ اور دوسرے معاملات جو بعض امور میں ضروری ہیں سیکھے۔ من جملہ اس کے ان میں سب سے زیادہ سلیم الرائے اور زور آور کا پیدا ہونا ہے جو دوسروں کو مغلوب کر کے ان کا سردار بن جائے اور کسی نہ کسی طرح اپنی سرداری کو باقی رکھے۔ من جملہ اس کے یہ ہے کہ ان میں کوئی ایسا پختہ طریقہ ہو جس کی رو سے ان کے معاملات کے فیصلے کئے جائیں۔ ظالم کو ظلم کی سزا ملے اور جو کوئی جنگ کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کو روک دیا جائے۔ اور ہر قوم

میں ایسے شخص کا ہونا بھی ضروری ہے جو مہتمم بالشان امور میں تدابیر کے طریقے وضع کرے جس کے اور لوگ اتباع کریں۔ اور ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو زینت، عیش و آرام اور سہولت کو پسند کرتے ہیں خواہ وہ کسی طرح سے ہو اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے اخلاق، شجاعت، سخاوت، فصاحت اور دانائی وغیرہ پر فخر کرتے ہیں۔ اور بعض اس بات کو درست رکھتے ہیں کہ ان کے نام کی شہرت ہو اور لوگوں میں عزت ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑا احسان کیا کہ اس نے اپنی کتاب عظیم میں اس ارتفاق کی تمام شاخوں کا الہام کر دیا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ سب لوگوں کو قرآن پر چلنا پڑے گا اور ارتفاق کی یہ نوع ان سب میں پائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم

تیسرا باب: آداب معاش کا فن

آداب معاش اس علم کا نام ہے جس میں حد ثانی پر ان حاجات کی تدبیر سے بحث کی جاتی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں اور اس باب میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ارتفاق اول کو صحیح تجربہ کے موافق کرنا چاہئے پس جو صورتیں ضرر سے بعید اور نفع رساں ہوں ان کو اختیار کرنا چاہئے اور دوسری سب تدابیر کو چھوڑ دینا چاہئے اور اسی طرح ان اخلاق حمیدہ کے موافق کرنا چاہئے جو کامل مزاجوں کی فطرت میں ہیں پس جن کا اخلاق حمیدہ تقاضا کریں۔ ان کو اختیار کرنا چاہئے اور باقی سب کو چھوڑ دینا چاہئے اور اسی طرح حسن صحبت جو لوگوں میں موجود ہے اور باہمی مشارکت اور اس کے مثل وہ مقاصد جو رائے کلی سے پیدا ہوتے ہیں ان سب کے موافق کرنا چاہئے اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں۔ کھانے، پینے، چلنے، بیٹھنے، سونے، سفر کرنے کے آداب، قضائے حاجت، جماع، لباس، مکان، پاکیزگی، زینت اور باہمی بات چیت کے آداب، دوا کرنے، آفات میں جھاڑ منتر کرنے، ہجوم حوادث میں پیش بینی کرنے اور ولادت، نکاح، عید، قدوم مسافر وغیرہ کی خوشی میں ولیموں کے آداب، مصائب کے وقت ماتم کرنے، مریضوں کی عیادت کرنے اور میت کے دفن کرنے کے آداب سے واقف ہونا ہے کیونکہ آباد شہروں میں رہنے والے جس قدر صحیح المزاج اور معتبر لوگ ہیں سب اس پر متفق ہیں کہ برا کھانا نہ کھانا چاہئے۔ جیسے مردار جو اپنی موت سے مرا ہو اور متعفن اور وہ حیوان جس میں اعتدال مزاج اور انتظام اخلاق نہ ہو۔ اور برتن میں کھانا رکھنا اور دسترخوان وغیرہ چیزوں پر رکھ کر کھانا، منہ اور ہاتھوں کا کھاتے وقت صاف کرنا سب کے

نزدیک مستحب ہے اور اس طرح کھانے سے جس میں حماقت اور حرص پائی جائے یا اس طریقہ سے ساتھ والوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرے، احتراز واجب ہے۔ اور متعفن پانی کو نہ پیا جائے اور جانوروں کی طرح منہ سے پانی پینے اور گٹ گٹا کر پینے سے بچا جائے اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ بدن، لباس اور مکان دونوں قسم کی نجاستوں سے پاک وصاف رکھنا چاہئے۔

قسم اوّل وہ نجاستیں ہیں جن میں بدبو اور تعفن ہے۔ قسم دوم وہ میل کچیل ہے جو طبعی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ جیسے گندہ دہنی جو مسواک سے دور کی جاتی ہے اور جیسے بغل اور زیر ناف کے بال، کپڑوں کا تیل اور گھر کا کوڑہ کرکٹ اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آدمی لوگوں میں پاک وصاف ہے۔ اس کا لباس درست ہو، سر اور داڑھی میں کنگھی کرے اور عورت جب کسی کے نکاح میں ہو تو مہندی اور زیورات وغیرہ سے مزین رہے اور یہ کہ برہنگی عیب اور لباس زینت ہے اور دونوں شرم گاہوں کا کھلا رکھنا بے شرمی ہے اور پورا لباس وہ ہے جس سے تمام بدن چھپا رہے اور شرم گاہ چھپانے کا لباس باقی بدن چھپانے کے لباس سے جدا ہے اور اس پر اتفاق ہے کہ خواب یا نجوم یا شگون یا فال یا کہانت یا رمل وغیرہ سے کسی چیز کا پہلے سے معلوم ہو جانا معیوب ہے۔ اور جو شخص مزاج صحیح اور ذوق سلیم رکھتا ہے وہ اپنے کلام میں ضرور ایسے الفاظ استعمال کرے گا جن میں بے تعلقی اور زبان پر گرانی نہ ہو اور کلام میں ایسی ترکیب اختیار کرے گا جو نہایت درست ہو اور طرز کلام بھی ایسا رکھے گا کہ دل وکان اس کی طرف مائل ہوں۔ پس ایسا شخص فصاحت اور خوش بیانی کی میزان ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر باب میں اجمائی مسائل کو تمام شہریوں نے تسلیم کیا ہے۔ گو وہ ایک دوسرے سے دور دراز ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے بعد آداب معیشت کے قواعد مرتب کرنے میں لوگ مختلف ہیں۔ پس عالم طبیعت قواعد طب کے مستحبات کو پسند کرتا ہے اور نجومی ستاروں کی خاصیت کا لحاظ رکھتا ہے اور الٰہیات کا واقف اخلاص واحسان کی رعایت کرتا ہے جیسا کہ آپ ان کی کتابوں میں مفصل پاتے ہیں اور ہر قوم کی عادت وروش جدا جدا ہے کیونکہ ان کے مزاج وعادات و دیگر امور میں اختلاف ہے۔

چوتھا باب: خانگی تدابیر کا بیان

یہ وہ علم ہے جس میں ارتفاق ثانی پر اس رابطہ اور تعلق کے تحفظ کی کیفیت سے بحث کی جاتی

ہے جو ایک مکان کے رہنے والوں میں ہوا کرتا ہے اور اس کے چار حصے ہیں۔ ازدواج، ولادت، مالک ہونا، اور باہمی صحبت، اس کی اصل یہ ہے کہ حاجت جماع نے مرد اور عورت کے درمیان تعلق اور صحبت کو پیدا کیا پھر بچہ پر شفقت والدین، اس کی پرورش میں ایک دوسرے کے اعانت کی باعث ہوئی پھر جبکہ بالطبع عورت کو اولاد کی پرورش کے اچھے طریقے معلوم تھے وہ عقل میں کم محنت کے کاموں سے جی چرانے والی، زیادہ حیادار، خانہ نشینی کی طرف مائل، ادنی ادنی امور میں خوب کوشش کرنے والی اور فرماں بردار تھی۔ اور مرد بہ نسبت عورتوں کے عقل مند، غیرت مند، باہمت، بامردت، زور آور اور مقابلہ کرنے والا تھا اس لئے عورت کی زندگی بغیر مرد کے ناتمام تھی اور مرد کو عورت کی احتیاج تھی۔ اور عورتوں کے بارے میں مردوں کی مزاحمت اور غیرت اس بات کی باعث ہوئی کہ ان کی اصلاح اسی میں ہے کہ گواہوں کے سامنے اس کی بیوی کا اسی شخص کے لئے خاص ہونا طے ہو جائے اور عورت کی جانب مرد کی رغبت ولی کی نظر میں اس کی عزت اور حمایت اس بات کی باعث ہوئی کہ زوج کی جانب سے مہر اور منگنی اور ولی کی جانب سے کچھ بے پرواہی ہو اگر محارم میں اولیا کی رغبت جائز ہوتی تو عورت کو اس سے بڑا ضرر پہنچ سکتا تھا ولی عورت کو اس شخص سے روکتا جو عورت کی نظر میں مرغوب ہے اور عورت کے لئے کوئی ایسا شخص نہ ہوتا جو اس سے حقوق زوجیت کا مطالبہ کرتا حالانکہ اس کو ان حقوق کی نہایت ضرورت ہے اور سوکنوں کے جھگڑے وغیرہ سے صلۂ رحمی میں فرق آجاتا۔ اس کے علاوہ صحت مزاج کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی کو اس عورت کی طرف رغبت نہ ہو جس سے وہ خود پیدا ہوا ہے یا اس سے عورت پیدا ہوئی ہے۔ یا وہ دونوں ایک (۱) درخت کی دو شاخوں کے مانند ہیں اور حاجت جماع کے ذکر کرنے میں حیا کا ہونا اس بات کا باعث ہوا کہ یہ ضمن عروج (۲) میں پوشیدہ طور پر اس طرح ہوا کرے گو یا یہی دونوں کا مقصود اصلی تھا اور لطف شہرت اور ملاک منزلی جو عروج شمار کی جاتی ہے، ولیمہ، کی باعث ہوئی جس میں لوگوں کو بلایا جائے اور گانے بجانے کی خوشی ہو، حاصل کلام یہ ہے کہ بہت سی وجوہ ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے ذکر کیا اور بعض کو لوگوں کے فہم پر اعتماد کر کے حذف کر دیا۔ نکاح کی یہ حالت کذائی، کہ غیر محارم سے نکاح لوگوں کے مجمع میں ہو، اس سے پہلے مہر اور منگنی ہو، اولیا کی جانب

---

(۱) بھائی بہن۔ (۲) عورت کو اپنی جانب مائل کرنا۔

سے بے اعتنائی اور کفو کی رعایت ہو، ولیمہ کیا جائے، مرد، عورتوں کے سر پرست اور ان کی معاش کے کفیل رہیں، عورتیں خانگی خدمات میں مصروف رہیں، اولاد کی پرورش میں اطاعت سے رہیں، تمام لوگوں کی نظر میں لازمی طریقہ اور امر مسلم ہو گیا ہے اور امر فطری ہو گیا ہے جس پر لوگوں کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ عرب اور عجم میں کوئی اس میں اختلاف نہیں کرتا۔ اور جبکہ دونوں کی باہم التفات اور سعی اس طور پر کہ ہر ایک دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا ہی نفع ونقصان خیال کرے، بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ ہر ایک نکاح کے باقی رہنے کو دل وجان سے قبول کرے اور جب آپس میں ناموافقت ہو تو اس کے لئے کوئی خلاصی کا طریقہ بھی ضروری تھا اگر چہ یہ علیحدگی مباح امور میں سے نہایت ہی مبغوض ہے اس لئے طلاق اور عدت میں قیود کا لحاظ ضروری قرار دیا گیا۔ اور اسی طرح خاوند کی وفات میں عدت کا لحاظ رکھا گیا تا کہ نکاح کی تعظیم دلوں میں باقی رہے اور کسی قدر حق دوام اور معاہدہ مصاحبت کی وفاداری ادا ہو جائے۔ اور انساب خلط ملط بھی نہ ہوں اور اولاد کی آبا کی طرف احتیاج اور طبعاً والدین کی شفقت اس بات کی باعث ہوئی کہ وہ اولاد کو وہی باتیں تعلیم فرمائیں جو قانون فطرت کے موافق ان کے کام آئیں۔ اور آبا کا تقدم جو اولاد پر ہوتا ہے یہاں کہ اولاد بڑی ہو کر بھی عقل اور تجربہ میں ان کو زیادہ ہی پاتی ہے اور صحت اخلاق جس کا حکم ہے کہ بھلائی کے بدلہ میں بھلائی کی جائے۔ اور ان کی تربیت میں آبا کی محنتیں برداشت کرنا جو کسی شرح کی محتاج نہیں، ان سب باتوں نے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کو طریقہ لازمہ بنا دیا اور چونکہ لوگوں کی استعداد میں فرق ہے اس لئے یہ بھی ضروری کہ ان میں ایک شخص بالطبع سردار ہو، دانشمند ہو، امور معاش میں مستقل ہو، ان میں انتظام اور رفاہ عام کا پیدائشی مادہ ہو۔

اور ایک شخص بالطبع غلام، بیوقوف، تابع، کہنے کے بموجب چلنے والا ہو، ایسے دونوں شخصوں کی معاش بغیر ایک دوسرے کے مکمل نہیں ہو سکتی اور ہر ایک دوسرے کی راحت وتکلیف میں جب ہی مدد کرے گا کہ دونوں اس تعلق کے قیام ودوام کو دلوں میں ٹھان لیں اور بعض ارتفاقات اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ ایک دوسرے کو محکوم بنا لیتا ہے یہ حالت اسیری بھی لوگوں میں قابل لحاظ ہے اور علاقۂ مالکیت اور مملوکیت کا منتظم ہو جاتا ہے سو ایک قانون کی ضرورت پڑتی ہے جس کی پابندی مالک اور مملوک میں سے ہر ایک کرے اور ترک پر قابل ملامت ہو۔ اور اسیری سے رہا

ہونے کا طریقہ بھی ضروری ہے خواہ مال کے ذریعہ سے ہو یا بغیر مال کے۔ اور بسا اوقات انسان کو حاجات، مصائبِ مرض، درماندگی، دوسرے کے حقوق اور ضرورتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ بغیر ابنائے جنس کی دستگیری کے اپنی حالت کی اصلاح بدقت ہوتی ہے اور ایسے ایسے عوارض پیش آنے میں سب لوگوں کی حالت یکساں ہے تو لاچار آپس میں الفت ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنے میں محتاج ہوئے۔ اور یہ بھی ضروری ہوا کہ حاجتمند کی اعانت اور مظلوم کی دادرسی کا ایک قاعدہ مقرر ہونا چاہئے جس کا ہر ایک سے مطالبہ کیا جائے اور بصورت ترک ملامت کی جائے اور چونکہ حاجت کی دو حدیں تھیں ایک حد وہ ہے جو اس درجہ پر ہو کہ ہر ایک شخص دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا نفع ونقصان سمجھے اور یہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا کہ ہر ایک دوسرے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کرے اس کے اخراجات اور وراثت کا ذمہ دار بنے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایسی باتیں جانبین سے ہونی چاہئیں، تاکہ جو نقصان برداشت کرے وہی فائدہ بھی حاصل کرے۔ اور لوگوں میں اس حد کے لائق قریبی رشتہ دار ہی ہیں کیونکہ ان کی دوستی اور محبت ایک قدرتی امر ہے اور دوسری حد اس سے کم درجہ پر ہے پس اہل مصائب کی ہمدردی لوگوں کا ایک طریق مسلم ہوگیا ہے اور صلۂ رحمی ان سب سے زیادہ مؤکد اور مضبوط ہے اور اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں۔ ان اسباب کا دریافت کرنا جو نکاح یا طلاق کے مقتضی ہوتے ہیں۔ طریقۂ نکاح اور میاں بیوی کی صفت کو جاننا حسن معاشرت، فحش اور عار سے اس کی آبرو محفوظ رکھنے کے زوج پر کیا کیا حقوق ہیں، اور عفت، اطاعت زوج اور گھر کے کاموں میں طاقت صرف کرنا بیوی پر کس حد تک واجب ہے اور باہم میاں بیوی کی ناراضی کو کس طرح سے دور کیا جائے، اور طلاق کا کیا طریق ہے، خاوند کے مرنے کے بعد سوگ کا کیا طریقہ ہے اور اولاد کی پرورش کا کیا طریق ہے، ماں، باپ کے ساتھ نیک سلوک کس طرح کرتے ہیں، غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ کیا کیا احسان کئے جاتے ہیں، غلام اپنے مالکوں کی کس طرح خدمت گزاری کریں اور ان کو آزاد کرنے کا کیا طریق ہے، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کرنا چاہئے۔ شہر کے بیکسوں کے ساتھ ہمدردی کا کیا طریقہ ہے اور ان کے مصائب کے دور کرنے میں کیا کیا کوششیں ہونی چاہئیں، رئیس قوم کے کیا کیا آداب ہیں اور اس کو قوم کی نگرانی کس طرح کرنی چاہئے اور

باہم کس طرح تقسیم ترکہ ہونا چاہئے اور انساب واحساب کی کس طرح حفاظت کرنی چاہئے۔ پس لوگوں میں کوئی ایسی قوم آپ کو نہیں ملے گی جو ان اصولوں کی پابندی اور حتی الامکان بجا آوری نہ کرتی ہو حالانکہ ان کے مذاہب میں اختلاف ہے اور ان کے وطن جدا جدا ہیں۔

پانچواں باب: معاملات کے فن کا بیان

یہ وہ علم ہے جس میں ارتفاق ثانی کے طور پر مبادلہ معاونت اور کسب کے احوال سے بحث کی جاتی ہے اور اس باب میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب انسان کی ضروریات بہت زیادہ ہو گئیں اور ان میں ہر ایک اپنی حاجت کو ایسے عمدہ طور پر پورا کرنا چاہتا تھا کہ جس سے آنکھوں کو تازگی اور دل کو سرور حاصل ہو تو ہر ایک کو تنہا ان کی انجام دہی مشکل ہوگئی کیونکہ بعض کے پاس ضرورت سے زاید کھانا تھا لیکن پانی نہ تھا اور بعض کے پاس ضرورت سے زائد پانی تھا لیکن کھانا نہ تھا تو ہر ایک دوسرے کا محتاج ہو گیا۔ اور سوائے مبادلہ کے کوئی اور صورت نہ بن پڑی پس یہ مبادلہ ان کی رفع حاجت کے لئے اچھا قرار پایا اور ضرورتاً یہ قرار پایا کہ ہر شخص ایک حاجت کے سرانجام کی طرف متوجہ ہو اس کو خوب مستحکم کرے اور اسی کے تمام وسائل مہیا کرنے کی کوشش کرے اور بہ واسطہ مبادلہ اپنی تمام حاجات کا ان کو ذریعہ بنائے۔ پس یہ لوگوں کی نظر میں ایک مسلم قانون بن گیا اور جبکہ بعض لوگ ایسے تھے کہ ان کو ایک چیز پسند تھی جو دوسروں کو ناپسند تھی اور ان کو ایسا شخص نہ ملتا تھا جس سے وہ معاملہ کرتے تو لامحالہ ان کو تقدمہ اور تہیہ کرنا پڑا اور انھوں نے معدنی جوہروں کو جو مدت طویلہ تک باقی رہتے ہیں معاملات میں ثمن قرار دیا اور یہ سب کے نزدیک امر مسلم ہو گیا اور ان جواہرات میں سے سونا اور چاندی زیادہ موزوں تھے کیونکہ انکا حجم چھوٹا، افراد مساوی اور بدن انسانی کے لئے نافع تھے اور ان سے زینت حاصل ہوتی تھی اس لئے یہی دونوں چیزیں قدرتی طور پر نقد قرار پائیں اور ان کے ماسوا دوسری چیزیں مقرر کرنے سے ثمن بن سکتی ہیں۔

اور کسبی پیشوں کے اصول زراعت، چار پایوں کو چرانا اور خشکی وتری سے مباح چیزیں لانا جیسے معدنیات، نباتات اور حیوانات ہیں اور نجاری، آہنگری اور کپڑہ بافی اور دیگر دستکاریاں ہیں جو قدرتی جوہروں کو کارآمد کر سکتی ہیں پھر تجارت بھی ایک پیشہ ہو گیا اور شہر کے مصالح کا سرانجام دینا بھی پیشہ ہو گیا اس کے بعد ہر وہ کام جس کی طرف لوگ محتاج ہوئے پیشہ ہوتا گیا۔ پھر جوں

جوں لوگوں نے ترقی کی اور عیش و عشرت میں غرق ہوتے گئے اسی قدر مکاسب کے متعلقات پھیلتے گئے اور ہر ایک شخص ایک ایک پیشے کے ساتھ مخصوص ہو گیا جس کی دو وجہیں ہیں۔

وجہ اول مناسبت قوی ہے پس بہادر آدمی جنگ کے لئے مناسب ہے زیرک اور قوی الحافظہ حساب و کتاب کے لئے اور نہایت توانا بار برداری اور محنت کے کاموں کے لئے مناسب ہے۔ اور وجہ دوم ارتفاقات ہیں۔ پس لوہار کے بیٹے اور اس کے ہمسایہ کے لئے جس قدر یہ کام آسان ہوگا کسی دوسرے کو نہیں ہوسکتا اور نہ ان کو ہی کوئی دوسرا کام ایسا آسان ہوگا اسی طرح دریا کے ساحل پر بسنے والوں کے لئے مچھلی کا شکار کرنا جتنا آسان ہوسکتا ہے کسی دوسرے کے لئے اتنا سہل نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی دوسرا کام اس قدر سہل ہوسکتا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جن کو کوئی اچھا پیشہ نہیں آتا تو انھوں نے شہر کے لئے ضرر رساں پیشے اختیار کئے جیسے چوری، جوا، گداگری، مبادلہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ مبادلہ کبھی شئے کا شئے کے ساتھ ہوتا ہے اس کو بیع یعنی خرید و فروخت کہتے ہیں۔ اور کبھی شئے دیکر منفعت حاصل کی جاتی ہے اس کو "اجارہ" یعنی مزدوری کہتے ہیں۔ اور جبکہ شہری انتظام بغیر الفت اور محنت کے نہیں ہوسکتا تھا اور الفت موقوف یا مقتضی تھی کہ ضرورت کی چیزیں بلا معاوضہ دی جائیں تو ہبہ اور عاریت کی صورتیں پیدا ہوگئیں۔ اور یہ ہمدردی فقرا کی حاجت براری کے بغیر ناتمام تھی اس لئے صدقہ دینے کی ضرورت پڑی اور اس باہمی انتظام اور اعانت کی یہ بات بھی مقتضی ہے کہ بعض لوگ احمق بعض کارگزار، بعض مفلس، بعض تونگر، بعض ادنی کاموں سے عار کرنے والے اور بعض عار نہ کرنے والے، بعض پر ضرورتوں کا ہجوم اور بعض فارغ البال ہیں۔ پس ہر شخص کی معیشت دوسرے کی اعانت کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی تھی اور معاونت بغیر عقد، شروط اور مصالحت کے نہیں ہوسکتی تھی اس لئے مزارعت، مضاربت، اجارہ، شرکت اور وکالت کی صورتیں پیدا ہوئیں اور حاجات کی وجہ سے قرض کا لین دین اور امانت رکھنے کی ضرورت پیش آئی اور اس میں لوگوں کو خیانت، انکار، اور سستی کا تجربہ ہوا تو شہادت، تحریر، دستاویزات، رہن، کفالت اور حوالہ کی ضرورت پڑی اور جوں جوں لوگ آسودہ حال ہوتے گئے اسی قدر معاونات کے اقسام پھیلتے گئے اور آپ ہر قوم میں ان معاملات پر عمل کرنے والا پائیں گے اور آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان معاملات میں ہر قوم عدل و ظلم کا امتیاز کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: شہری سیاست کا بیان

یہ وہ علم ہے جس میں ان تعلقات کے حفظان کی کیفیت بیان کی جاتی ہے جو اہل شہر میں ہوا کرتے ہیں اور شہر سے مراد وہ جماعت ہے جو مساوی الحال ہو جن میں باہم معاملات ہوتے ہوں اور وہ جدا جدا مکانوں میں بود و باش رکھتے ہوں اور اس بارے میں اصل یہ ہے کہ شہر باعتبار اس باہمی ربط کے ایک شخص کے مانند ہے جو چند اجزا اور مجموعی ہیئت سے مرکب ہے اور ہر مرکب چیز میں ممکن ہے کہ اس کے مادہ یا صورت میں نقصان واقع ہو جائے اور اس کو کوئی مرض ہو جائے یعنی اس میں ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ اس کی نوع کے لئے کوئی دوسری حالت زیادہ مناسب ہو۔ اور باصحت رہے یعنی ایسی حالت جس سے وہ حسین و جمیل معلوم ہو، اور شہر میں چوں کہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن کا ایک قانون عادل پر متفق الرائے ہونا مشکل ہے اور بغیر کسی ممتاز منصب کے ایک دوسرے کی روک ٹوک بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے جنگ و جدل کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پس شہر کا پورا انتظام بغیر ایسے شخص کے ناممکن ہے جس کی اطاعت تمام اہل حل وعقد تسلیم کریں، وہ پر شوکت ہو اور فوج کا مالک ہو اور جو شخص نہایت تنگدل، تیز مزاج خونریزی اور غصہ میں بیباک ہے اس کو سیاست کی ضرورت اوروں سے زیادہ ہے اور خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ چند شریر جن کو قوت اور شوکت حاصل ہو نفسانی خواہشات کے اتباع پر اور قانون عادلہ کے ترک پر متفق ہو جائیں یا لوگوں کے مال لوٹنے کے لئے جمع ہو جائیں جن کو قطاع الطریق کہتے ہیں یا محض دشمنی، حسد، یا ملک کی طمع سے لوگوں کو ایذا پہنچائیں تو ایسی حالت میں لوگوں کو جمع کرنے اور ان سے جنگ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور من جملہ ان خرابیوں کے ایک یہ ہے کہ کوئی ظالم کسی شخص کو قتل کر دے یا زخمی کر دے یا زدوکوب کرے یا کسی گھر میں اس کی بیوی کے معاملہ میں مزاحمت کرے یا اس کی بیٹیوں اور بہنوں کی ناحق طمع کرے۔ یا اس کے مال کو زبردستی چھین لے یا چھپکے سے چوری کرے یا اس کی آبروریزی کرے ایسی بات منسوب کر کے جو قابل ملامت ہو یا اس کے ساتھ بدکلامی کرے اور ان خرابیوں میں ایسے اعمال بھی داخل ہیں جو پوشیدہ طریقہ پر شہر کو نقصان پہنچاتے ہیں جیسے سحر، زہر خوانی اور لوگوں کو مفسد باتوں کی تعلیم دینا، رعایا کو بادشاہ سے غلام کو مالک سے اور اہلیہ کو شوہر سے برگشتہ کرنا اور ان خرابیوں میں سے عادات فاسدہ ہیں جن سے

فطری منفعت تلف ہو جاتی ہیں جیسے لواطت، جلق، چار پایوں سے مجامعت کرنا۔ کیونکہ یہ سب امور نکاح سے باز رکھتے ہیں، یا ایسے عادات جو فطرت سلیمہ کے خلاف ہیں جیسے مرد ہو کر زنانہ پن اختیار کرنا اور عورت کو مردانہ روش اختیار کرنا۔ یا ان عادات سے بڑے بڑے نزاع پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے چند اشخاص کا باہم مزاحمت کرنا۔ ایسی عورت کے لئے جو ان میں سے کسی کے لئے خاص نہیں ہے اور جیسے ہمیشہ شراب پینا۔ وہ معاملات بھی ہیں جن سے شہری زندگی کو نقصان پہنچتا ہے جیسے قمار بازی، سود در سود کا حصول، رشوت کا لین دین، پیمانہ اور وزن میں کمی کرنا، سامان تجارت میں عیب کو مخفی رکھنا، اونچ نرخ سے بیچنے کے لئے شہر سے باہر ہی تاجروں سے مال خرید لینا، بوقت ضرورت غلہ کو بند کر کے رکھنا اور بغیر ارادۂ خریداری دوسرے کو پھنسانے کے لئے زیادہ دام لگانا اور انہی خرابیوں میں سے مشکل مقدمات ہیں جن میں ہر فریق مشتبہ دلیل پیش کرتا ہے اور اصلیت کا پتہ نہیں چلتا۔

پس ایسی حالت میں شہادت، حلف، دستاویزات، قرائن حال وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے اور ان مقدمات میں کبھی قانون مسلم کی، حق کی وجہ ترجیح ظاہر کرنے کی اور فریقین کے مکاید معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ان خرابیوں میں سے یہ ہے کہ شہر کے رہنے والے بادیہ نشینی اختیار کر لیں اور ارتفاق اوّل پر اکتفا کر لیں یا کسی دوسرے شہر میں جا بسیں یا مکاسب پر اس طرز سے جھک پڑیں جس سے شہر کو ضرر پہنچے مثلاً اکثر لوگ زراعت چھوڑ کر تجارت پیشہ ہو جائیں یا ان کی اکثریت فوجی پیشہ اختیار کر لے۔ اور مناسب یہی ہے کہ زراعت پیشہ لوگ بمنزلہ غذا کے قرار دیئے جائیں اور دستکار، تاجر، محافظین ملک بجائے نمک کے سمجھے جائیں جس سے غذا کی اصلاح ہوتی ہے۔ ان خرابیوں میں سے حملہ آور درندوں اور موذی حشرات الارض کا پھیلنا ہے سو ان کے فنا کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ اور شہر کی پوری پوری حفاظت کرنے والے چیزوں میں سے ان عمارتوں کا بنانا ہے جن کے نفع میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں مثلاً شہر پناہیں، سرائیں، قلعہ جات، سرحدیں، بازار، پل اور ایسے ہی کنوؤں کا کھدوانا، چشموں کا نکالنا اور کشتیوں کا ساحل دریا پر فراہم کرنا اور تیز سوداگروں کو مانوس و مالوف کر کے اس پر آمادہ کرنا کہ باہر سے اجناس وغیرہ لائیں، شہر والوں کو سمجھا دینا کہ مسافروں سے خوش معاملگی کریں کیونکہ اس کی وجہ سے سوداگروں

کی آمد ورفت زیادہ ہوتی ہے اور زراعت پیشہ لوگوں کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ زمین کو بیکار نہ چھوڑیں۔ دستکاروں کی تاکید کرنا کہ چیزوں کو عمدہ اور مضبوط بنائیں اہل شہر کو عمدہ فضائل حاصل کرنے کی تاکید کرنا کہ وہ لکھنا، حساب، علم تاریخ، وطب اور پیش بینی کے عمدہ عمدہ طریقے سیکھیں اور اسی طرح شہر کے حالات کا علم رکھنا تاکہ اچھے برے کا امتیاز رہے اور تاکہ محتاج کا حال معلوم ہو تو اس کی مدد کی جائے اور کوئی عمدہ دست کار معلوم ہو جائے تاکہ اس سے مدد لیا جائے۔ اور اس زمانہ میں شہروں کی ویرانی کے دو بڑے سبب ہیں ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ بیت المال پر بوجھ ہیں، اس طرح کہ غازیوں اور علما نے جن کا بیت المال میں حق ہے، شعرا اور زہاد وغیرہ نے جن کے ساتھ سلاطین سلوک کرتے ہیں۔

بیت المال سے حاصل کرنا پیشہ بنالیا ہے یہ لوگ کوئی خدمت نہیں کرتے اور ان کا گزارہ بیت المال سے ہوتا ہے۔ پس ایسے لوگ یکے بعد دیگرے آتے ہیں ایک دوسرے کی زندگی مکدر کرتے ہیں اور شہر پر ایک بار سا ہو جاتے ہیں۔ دوسری وجہ کاشتکاروں، تاجروں اور اہل حرفت پر بھاری ٹیکس لگا دینا اور پھر ان پر سختی کرنا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرماں بردار لوگ چلے جاتے ہیں اور ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کو قوت ہوتی ہے وہ درپے بغاوت ہو جاتے ہیں۔ البتہ شہر کی اصلاح خفیف لگان سے اور بقدر ضرورت محافظین ملک کے قائم کرنے سے ہوتی ہے۔ اہل زمانہ کو اس نکتہ سے واقف رہنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب: بادشاہوں کی سیرت کا بیان

بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں پسندیدہ اخلاق ہوں ورنہ وہ شہر پر بار ہو جائے گا اگر وہ شجاع نہیں ہے تو اپنے مخالفوں سے پورا مقابلہ نہ کر سکے گا، رعیت اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گی اگر وہ بردبار نہیں ہے تو اپنی سطوت سے لوگوں کو برباد ہی کر ڈالے گا اور اگر صاحب حکمت نہیں ہے تو نفع بخش تدبیر کو عمل میں لانے سے عاجز رہے گا اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ عقلمند، بالغ آزاد مرد ہو، صاحب رائے، بینا، شنوا اور گویا ہو۔ لوگ اس کے شرف اور اس کے خاندان کے اعزاز کو تسلیم کرتے ہوں، اس کے اور اس کے آبا و اجداد کے فضائل کو لوگ دیکھ چکے ہوں اور خوب جانتے ہوں کہ۔ بادشاہ مصالح ملکی کی پاسبانی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا۔ یہ سب امور عقل کے

ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں اور تمام بنی آدم اس پر متفق ہیں خواہ ان کے شہروں میں کیسا ہی بعد کیوں نہ ہو اور وہ کسی ہی مذہب کے کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ بادشاہ کے مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے وہ بغیر امور بالا کے مکمل نہیں ہوسکتی اگر بادشاہ ان امور میں فروگزاشت کرے گا تو لوگ اس کو خلاف مقصود جانیں گے اور ان کے دل اس سے بیزار ہو جائیں گے اور اگر خاموش بھی رہیں گے تو درپردہ غصہ میں رہیں گے اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنی رعایا کے دلوں میں وقار پیدا کرے اور پھر اس وقار کو محفوظ رکھے اور مناسب تدابیر سے ان امور کا تدارک کرتا رہے جو اس کی شان کے منافی ہوں۔ اور جو بادشاہ اپنے مرتبہ کو قائم رکھنا چاہے تو وہ ان اعلیٰ ترین اخلاق سے اپنے آپ کو پیراستہ کرے جو اس کی ریاست کے شایاں ہوں۔ مثلاً شجاعت وحکمت، فیاضی، ظالم سے (حسب مصلحت) درگزر کرنا اور سب کا بھلا چاہنا۔ اور وہ لوگوں سے ایسا معاملہ کرے جو صیاد، شکار سے برتتا ہے۔

پس جس طرح شکاری جنگل میں جا کر ہرنوں کو دیکھتا ہے اور ان کی طبیعت و عادت کے مناسب صورتوں کو سوچتا ہے پس وہ اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے وہ دور سے ظاہر ہوتا ہے ان کی آنکھوں اور کانوں کی طرف سے نگاہ کو نیچی کر لیتا ہے پس ہرنوں کی جانب سے جونہی اس کو کھٹکا معلوم ہوتا ہے تو وہیں بے حس وحرکت پتھر کے مانند کھڑا ہو جاتا ہے اور جب ذرا انہیں غافل پاتا ہے تو آگے کو لپکتا ہے، کبھی ان کو نغمہ سے خوش کرتا ہے اور ان کے سامنے ان کی مرغوب چیز چارہ اس طرح سے ڈالتا ہے گویا یہ شخص اپنی کریمانہ عادت سے یہ سلوک کر رہا ہے اور اس سے شکار کرنا مقصود نہیں ہے۔ اور نعمت سے منعم کی محبت بڑھ جاتی ہے کیونکہ محبت کی زنجیر آہنی زنجیر سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ ایسے ہی جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ ایسا لباس، گفتگو ادب اختیار کرے جو لوگوں کو پسند ہو۔

پھر آہستہ آہستہ ان کے قریب ہوتا جائے اور اخلاص ومحبت کو بغیر لاف وگزاف کے ان پر ظاہر کرے اور کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جس سے وہ سمجھ جائیں کہ یہ مہربانیاں صرف ان کے شکار کرنے کو ہیں۔ پھر یہ بات ان کے دلوں میں دل نشین کر دے کہ اس جیسا اس کے حق میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ معلوم کر لے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی فضیلت اور بزرگی راسخ ہوگئی، ان کے دل

اس کی محبت اور تعظیم سے پر ہو گئے اور ان کے اعضا میں عاجزی وانکساری سرایت کر گئی۔ پھر بادشاہ کو ان سب امور کی نگرانی چاہئے اس کی طرف سے کوئی امر ایسا پیش نہ آئے جس کی وجہ سے ان کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا ہو اگر کوئی کوتاہی بھی ہو جائے تو لطف و احسان کر کے فوراً اس کا تدارک کر دے اور ظاہر کر دے کہ جو کچھ عمل میں آیا ہے۔ مصلحت اسی کی مقتضی تھی اور یہ ان کے فائدے کے لئے ہوا ہے نہ مضرت کے لئے۔ ان سے باتوں کے باوجود بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنی فرمانبرداری ثابت کرنے کے لئے سرکشوں سے انتقام لے۔ پس جس شخص کے متعلق معلوم ہو کہ اس نے جنگ میں یا خراج وصول کرنے یا کسی اور کام میں سرگرمی کی ہے تو اس کی تنخواہ بڑھادے اس کی قدردانی کرے اور اس کے حال پر مہربانی کرے اور جس کو خیانت کرتے یا اطاعت سے منحرف ہوتا دیکھے تو اس کی تنخواہ میں کمی کر دے، اس کے مرتبہ کو کم کر دے اور اس سے اعراض کرے اور بادشاہ کو بہ نسبت عام لوگوں کے زیادہ سہولت پہنچانے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ لوگوں کو تنگ نہ کرے کہ کسی خراب زمین کے آباد کرنے کا حکم دے یا کوئی دور دراز جگہ جا کر بسے، وغیرہ۔ اور بادشاہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جب کسی کو سزا دے تو پہلے ارباب شوریٰ پر ثابت کر دے کہ یہ اسی کا مستحق ہے اور درحقیقت مصلحت اسی میں ہے اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں فراست کا مادہ ہو جس سے وہ لوگوں کے دلی ارادے سمجھ لے اس میں ایسی زیرکی ہو کہ اس کے گمان ایسے درست ہوں جیسا کہ کسی چیز کو دیکھ رہا ہے اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ ضروری امر کو کل پر نہ چھوڑے۔ اور جب کسی کو پوشیدہ طور پر عداوت کرتا پائے تو جب تک اس کی طاقت کو پراگندہ اور کمزور نہ کر دے اس کو تسلی نہ ہو۔

آٹھواں باب: اعوان و انصاف کی سیاست کا بیان

جبکہ بادشاہ تنہا تمدن کی تمام مصلحتوں کو سرانجام نہیں دے سکتا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ہر کام کے معاون ہوں، معاونین کے لئے یہ شرط ہے کہ ان میں امانت کی صفت ہو جو خدمت ان کے متعلق ہے اس کی بجا آوری کی قدرت ہو، بادشاہ کے فرمانبردار اور ظاہر و باطن میں خیر خواہ ہوں اور جس معاون میں یہ صفت نہ ہو وہ معزول کرنے کے لائق ہے اگر بادشاہ نے اس کو معزول کرنے میں سستی کی تو گویا اس نے شہر کے ساتھ بددیانتی کی اور اپنی حالت کو خراب کیا

اور یہ بھی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنا معاون نہ بنائے جن کا معزول کرنا دشوار ہو اور نہ ایسے لوگوں کو جن کا قرابت وغیرہ کے سبب بادشاہ پر استحقاق ہو جس کی وجہ سے ان کو معزول کرنا نازیبا سمجھا جائے۔ اور بادشاہ اپنے مخلصین کی تمیز رکھے کیونکہ ان میں سے بعض کی دوستی خوف کی وجہ سے اور بعض کی لالچ کی وجہ سے ہوتی ہے ایسے لوگوں کو کسی حیلہ اور ذریعہ سے اپنی طرف مائل رکھنا چاہئے۔ اور بعض بے غرضانہ بادشاہ کے مخلص ہوا کرتے ہیں کہ اس کے نفع کو اپنا نفع اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتے ہیں البتہ یہ لوگ محب خالص ہیں۔ اور ہر شخص کی ایک پیدائشی حالت ہوتی ہے اور ایک خاص عادت ہوتی ہے جس کا وہ عادی ہوتا ہے۔ اور بادشاہ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ کسی سے اس کی حیثیت سے زاید کی طمع رکھے اور معاونین کے چند اقسام ہیں، بعض محافظ ہیں جو شریروں کے شر سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ بدن انسان کے ان ہاتھوں کے مانند ہیں جو ہتھیار تھامے ہوئے ہوں اور بعض شہر کے مدبر لوگ ہیں۔ جیسے بدن انسان میں مدبر قوتیں اور بعض لوگ مشیر ہیں جس طرح انسان کے لئے عقل وحواس۔ اور بادشاہ کا فرض ہے کہ روزانہ ان کی خبروں کا علم رکھے اور اصلاح وفساد سے خبردار رہے اور جبکہ خود بادشاہ اور اس کے معاونین شہری امور میں مصروف رہتے ہیں تو ان کے اخراجات بھی شہر کے ذمے ہیں اور ضروری ہے کہ عشر اور خراج جمع کرنے میں راہ راست اختیار کیا جائے جس میں لوگوں کو ضرر نہ پہنچے اور حاجت روائی بھی ہو جائے اور یہ مناسب نہیں ہے کہ ٹیکس ہر شخص پر اور ہر مال پر مقرر کیا جائے۔ اور ایک خاص وجہ سے مشرقی اور مغربی قوموں کے سلاطین اس بات پر متفق ہیں کہ محاصل خوشحال لوگوں سے لیا جائے۔ سونا، چاندی اور ترقی پذیر مال جیسے نسل والے چار پائے، زراعت اور تجارت میں سے وصول کیا جائے۔ پس اگر اس سے زیادہ کی ضرورت پڑے تو پیشہ وروں سے وصول کیا جائے اور بادشاہ کا یہ بھی فرض ہے کہ لشکروں کی سیاست اس طرح کرے جیسے ایک ماہر شہسوار گھوڑے کی درستی کرتا ہے۔ پس وہ گھوڑے کی چال پویا، دلکی اور دوڑنے وغیرہ کو، اس کی بری عاوات بدرکابی وغیرہ کو خوب جانتا ہے جن پر کبھی ایڑ سے، کبھی چابک سے گھوڑے کی بخوبی تنبیہ کرنے کو ضروری سمجھتا ہے اوران امور کا خوب لحاظ رکھتا ہے۔ جب کوئی ناپسندیدہ حرکت وہ کرتا ہے یا پسندیدہ حرکت کو ترک کرتا ہے تو اس طرح اس کو تنبیہ کرتا ہے کہ اس کی طبیعت اس کو قبول کرلے اور اس کی تندی جاتی

رہے اور اس تنبیہ میں وہ اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ اس کی طبیعت پریشان نہ ہو اور جس وجہ سے اس کو مارا ہے اس کو (بچ) کر سکے اور جس بات کی اس کو تعلیم دینا چاہتا ہے اس کی صورت اس کے سامنے متمثل کر دیتا ہے اور اس کے دل میں خوب بٹھا دیتا ہے کہ اس کی طبیعت میں سزا کا خوف دیتا ہے اور جب وہ مرضی کے موافق کام کرنے لگتا ہے اور ناموافق باتوں سے باز لگتا ہے تو وہ اس کی مشاق کو اس وقت تک ترک نہیں کرتا جب تک یہ نہیں دیکھ لیتا کہ مطلوبہ اس کی طبیعت اور عادت ہوگئی ہیں اور اس کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اگر روک ٹوک نہ کی جائے گی تو بھی خلاف اغراض کی طرف میلان نہ کرے گا پس اسی طرح فوج کے منتظم پر ضروری ہے کہ وہ ان امور کو خوب جان لے جو کہ کرنے کے لائق ہیں۔ اور ان سے بھی واقف ہو جن سے لشکریوں کو تنبیہ کرتے ہیں۔ اور منتظم کو ایسا ہونا چاہئے کہ ان امور کو کبھی ترک نہ کرے اور معاونین کی تعداد محدود نہیں ہے بلکہ شہر کی ضرورتوں پر موقوف ہے کیونکہ کبھی ایک کام کے لئے دو دو معاون کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی دو خدمتوں کے لئے ایک ہی معاون کافی ہوتا ہے لیکن اصل معاون پانچ ہیں۔

اوّل قاضی، پس یہ شخص آزاد، مرد، بالغ، عاقل، کام کے لائق ہو معاملات کے طریقے اور متخاصمین [illegible] یب کو خوب جانتا ہو، طبیعت سخت اور حلیم بھی ہو کہ دونوں باتیں اس میں پائی جائیں، اس کو چاہئے کہ مقدمہ میں دو بات پر نظر کرے۔ اوّل یہ کہ صورت حال دیکھے آیا یہ کوئی معاملہ ہے یا کوئی ظلم و زیادتی ہے یا کوئی آپس کا سابقہ ہے۔ دوم یہ کہ ہر شخص اپنے مقابل سے کیا چاہتا ہے آیا وہ صحیح ہے کہ نہیں، اور وجہ معرفت کو بھی دیکھنا چاہئے کیونکہ ایک کے پاس ایسی صریح حجت ہوتی ہے جس میں لوگوں کو کچھ شک نہیں ہوتا اور وہ صریح [illegible] دینا چاہتی ہے اور دوسرے کے پاس اس سے کم درجہ کی دلیل ہوتی ہے جو اس حکم کے علاوہ حکم دینا چاہتی ہے۔ دوم امیر لشکر کو اس شان کا ہونا چاہئے کہ وہ سامان حرب سے خوب واقف ہو، فوج میں جوانمرد اور دلیر لوگوں کو بھرتی کرے اور ہر شخص کے مبلغ منفعت کو معلوم کرے، فوج کی تربیت، جاسوس و مقرر کرنے کی کیفیت اس کو خوب معلوم ہو اور دشمنوں کے داؤں گھات سے بخوبی آگاہ ہو۔ سوم، منتظم شہر (یعنی کوتوال شہر) ایسا شخص ہونا چاہئے جو دلیر ہو شہر کی اصلاح و فساد کی باتوں سے خوب واقف ہو، اس میں سختی اور حلم بھی ہو اور ایسے لوگوں میں سے ہو جو ناپسندیدہ بات کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکتے ہوں اور اس کو چاہئے کہ

ہر قوم کے لئے انہی میں سے ایک سرغنہ مقرر کرلے جو ان کے حالات سے پورا واقف ہو۔ اس کے ذریعہ ان کا انتظام کیا کرے اور ان کے افعال کا اس سے مواخذہ کیا کرے۔ چہارم عامل (یعنی تحصیل دار جو تحصیل مال پر متعین ہو) سو یہ ایسا شخص ہونا چاہئے جو اموال پر محصول لینے اور آمدنی کو مستحقین میں تقسیم کرنے کی کیفیت سے بخوبی واقف ہو، پنجم وکیل جو بادشاہ کے معاشی امور کا متکفل ہو کیونکہ بادشاہ احوال ملکی کی وجہ سے اپنی اصلاح معاش کی طرف توجہ نہیں کرسکتا۔

نواں باب: ارتفاق رابع کا بیان

یہ وہ علم ہے جس میں شہروں کے حکام وسلاطین کی سیاست پر بحث ہوتی ہے اور ان تعلقات کے محفوظ رکھنے کی کیفیت بیان کی جاتی ہے جو مختلف اقالیم کے باشندوں کے مابین ہوتے ہیں اور یہ اس لئے کہ جب ہر رئیس اپنے اپنے شہر کا مستقل مالک ہو جاتا ہے اس کے پاس اموال آنے لگتے ہیں اور دلیر طبع لوگوں کی جماعتیں اس سے آملتی ہیں تو ان میں اختلاف مزاج اور اختلاف استعداد کی وجہ سے جور و ظلم ہونے لگتا ہے قانون عدل کو چھوڑ دیتے ہیں ایک دوسرے کے شہر لینے کی طمع کرتے ہیں، باہم حسد کرتے ہیں اور جزئی رجحانات مثلاً اموال و آراضی کی خواہش، یا حسد و کینہ کی وجہ سے باہم جنگ وجدال کرنے لگتے ہیں۔ جب بادشاہوں میں یہ خرخشے بڑھتے ہیں تو خلیفہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ خلیفہ سے ایسا شخص مراد ہے جس کے پاس اتنا لشکر اور سامان ہو کہ دوسرے شخص کا اس سے ملک لینا عادتاً ناممکن ہو کیونکہ ایسے شخص سے ملک لینا نہایت درجہ کوشش اور محنت کے بعد بہت سی جماعتوں کے اتفاق اور کثیر اموال صرف کرنے کے بعد ہی متصور ہوسکتا ہے جس کے اہتمام سے لوگ قاصر ہیں اور عادتاً محال ہے جب خلیفہ مقرر ہو جاتا ہے اور ملک میں اپنی عمدہ سیرت کا عملدرآمد کرتا ہے، سرکش لوگ اس کے فرمانبردار اور بادشاہ اس کے مطیع ہو جاتے ہیں تو خدا کی نعمت کامل ہو جاتی ہے شہر میں سکون اور لوگوں کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے خلیفہ کو ایسے درندہ طبیعت لوگوں سے جنگ کرنے کی ضرورت پڑا کرتی ہے جو لوگوں کے مال لوٹتے ہیں ان کی اولادوں کو اسیر کرتے ہیں ان کے ننگ و ناموس کی پردہ دری کرتے ہیں، تاکہ ان سب مضرتوں کو لوگوں سے دور کردیا جائے۔ اسی ضرورت کی وجہ سے بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا تھا (ہمارے لئے ایک بادشاہ کو بھیجو تاکہ ہم خدا راہ میں لڑیں) جب شہوت پرست اور درندہ سیرت

لوگ اپنی عادت خراب کر لیتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں تو بلا واسطہ یا بالواسطہ انبیا اللہ تعالیٰ الہام فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کا رعب وداب اٹھا دیا جائے اور ان میں جو بالکل قابل اصلاح نہ ہو وہ قتل کر دیا جائے اس قسم کے لوگ نوع انسانی میں اس عضو کے مانند ہیں جو گل کر بیکار ہو جاتا ہے پس خلیفہ سب سے پہلے ان سے جنگ پر آمادہ ہوتا ہے اور یہ وہ حاجت ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے (اگر خدا تعالیٰ لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرے تو تمام کلیسا اور عبادت خانے منہدم کر دیئے جائیں) اور اسی لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے (ان سے لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے) اور خلیفہ بغیر مال اور فوج کے سرکش بادشاہوں سے لڑ کر ان کے رعب داب کو ختم نہیں کر سکتا اور ضروری ہے کہ خلیفہ ان اسباب سے واقف ہو جو جنگ و صلح کے مقتضی ہوتے ہیں اور خراج و جزیہ مقرر کرنے کے مقتضی ہوتے ہیں۔ اس کو پہلے سوچ لینا چاہئے کہ مقابلہ سے کیا مقصود ہے۔ کسی ظلم کا دفع کرنا ہے یا ان ناپاک درندہ طبیعت لوگوں کو ہلاک کرنا جن کی اصلاح کی امید نہیں، یا ان سے کم درجہ کے برے لوگوں کو ان کی شوکت ختم کر کے سرزنش کرنا، یا مفسد لوگوں کے ان کے سرداروں کو قتل کر کے جو ان کو تدبیر بتلاتے ہیں تہدید کرنا، یا ان کو قید کرنا، یا ان کے املاک و اموال ضبط کرنا، یا رعیت کا ان سے رُخ پھیر دینا۔

اور خلیفہ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ کسی غرض کے حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ سخت اور مشکل امر میں پھنس جائے۔ پس موافقین کی ایک عمدہ جماعت فنا کر کے اموال جمع کرنے میں لگ جائے۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ قوم کی دلجوئی کرے، ہر ایک نفع رسانی کا اندازہ رکھے، ہر شخص کی جو حالت ہے اس سے زیادہ کسی پر اعتماد نہ کرے۔ سرداروں اور دانشمند لوگوں کی عزت کرے، ترغیب اور تخویف سے ان کو جنگ پر آمادہ کرے اور اس کی اول نظر اس بات کی طرف ہو کہ ماتحت بادشاہوں کی جماعت متفرق رہے ان کی طاقت کمزور پڑ جائے اور ان کے دل خائف رہیں حتیٰ کہ وہ اس کے روبرو ایسے لاچار ہو جائیں کہ اپنے لئے کچھ منصوبہ نہ کر سکیں جب ایسا بنانے میں کامیابی ہو جائے ان میں وہ بات جاری کرے جس کا جنگ سے پہلے ارادہ کیا تھا پس اگر ان سے دوبارہ فساد کا خوف ہو تو گراں، گراں خراج اور جزیہ ان پر مقرر کر دے ان کے قلعے گرا کر ایسا کر دے کہ پھر بغاوت نہ کر سکیں۔ چونکہ خلیفہ ایسے مزاج کا محافظ ہوتا ہے جو نہایت مخالف خلطوں سے حاصل ہوا ہے اس

لئے ضروری ہے کہ بیدار مغز ہو ہر طرف جاسوس بھیجے اور اپنی فراست کاملہ سے کام لے۔ اور جب اپنی فوج میں کسی جماعت کے اتفاق کر لینے کو پائے تو فوراً ان کے مقابلہ میں دوسری جماعت متعین کرے جوان سے موافقت نہ کر سکیں۔ اور جب کسی کو خلافت کا خواہاں دیکھے تو فوراً اس کی شوکت کو زائل کردے اور اس کی قوت کو کمزور کردے۔ اور خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے حکم کے منوانے کی اور خیر خواہی پر متفق رہنے کی لوگوں میں عادت ڈالے اور اس بارے میں محض قبول کرنا کافی نہ سمجھے بلکہ قبول کی کوئی علامت ظاہرہ ہو جس سے رعایا پر دار و گیر کر سکے، مثلاً اس کے لئے دعا کرنا، بڑے بڑے مجمعوں میں اس کی تعظیم کرنا اور لوگوں کا ایک روش اور ہیئت پر جس کا خلیفہ نے حکم دیا ہے پابند رہنا، جیسے ہمارے زمانہ میں اشرفیوں پر خلیفہ کا نام کندہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دسواں باب: اصول ارتفاقات پر لوگوں کے اتفاق کا بیان

واضح ہو کہ اقالیم معمورہ کے ہر شہر اور اخلاق حمیدہ اور معتدل مزاج اقوام میں سے ہر قوم آدم علیہ السلام کے عہد سے لے کر آج تک اصول تدابیر سے خالی نہیں رہی اور یہ اصول ہر زمانہ میں سب کے نزدیک مسلم رہتے آئے ہیں جن کی مخالفت کرنے والوں کو لوگ بہت برا سمجھتے ہیں اور بوجہ شہرت کے ان اصول کو بدیہی سمجھتے ہیں اور بعض فروعات تدابیر اور ان کی بعض صورتوں میں اختلاف ہونے سے آپ ہمارے بیان میں شک نہ کریں۔ مثلاً سب کا اتفاق ہے کہ مردوں کی عفونت دور کی جائے اور ان کا ستر چھپا رہے لیکن اس کی صورتوں میں اختلاف ہے بعض نے زمین میں دفن کرنا پسند کیا اور بعض نے آگ میں جلانا اچھا سمجھا۔ سب اس پر متفق ہیں کہ نکاح کی شہرت کی جائے اور حاضرین کے سامنے اس میں اور زنا میں تمیز ہو جائے لیکن اس کی صورتوں میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ بعض نے گواہوں، ایجاب وقبول اور ولیمہ کو بہتر سمجھا اور بعض نے دف، گانا باجہ اور لباس فاخرہ کو جو صرف بڑی بڑی دعوتوں میں ہی پہنا جاتا ہے اختیار کر لیا۔ زانی اور چور کو سزا دینے میں سب کا اتفاق ہے لیکن اس کی صورت میں اختلاف ہے پس بعض نے سنگسار اور ہاتھ کاٹنا پسند کیا اور بعض نے سخت مار پیٹ اور با مشقت قید، بھاری جرمانوں کی سزا اختیار کی۔ اور نیز ان اصولوں سے دو فریقوں کی مخالفت ہمارے قول سابق سے آپ کو نہ روکے۔

ایک فریق ان احمق لوگوں کا ہے جن کی حالت چار پایوں سے ملتی جلتی ہے۔ لوگوں کی بڑی

اکثریت، ان کے ناقص العقل اور ناقص المزاج ہونے میں کچھ شبہ نہیں کرتی اور ان کی حماقت کی یہی دلیل ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان قیود کا پابند نہیں سمجھتے۔ دوسرا فریق فاسق لوگوں کا ہے اگر ان کے دلوں سے فسق نکال دیا جائے تو وہ ان تدابیر کے معتقد ہو جائیں لیکن ان پر نفسانی خواہشات غالب ہیں جس کی وجہ سے خود کو گنہگار سمجھتے ہوئے نافرمانی کرتے ہیں، لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں سے زنا کرتے ہیں اور اگر کوئی ان کی بیٹیوں اور بہنوں سے زنا کرے تو غصہ سے پھٹ پڑیں اور قطعاً جان لیں کہ لوگوں پر ان برائیوں کا وہی اثر ہوتا ہے جو ان پر ہوا ہے اور ان باتوں سے شہر کے انتظام کو ضرر پہنچتا ہے۔ لیکن خواہش نے ان کو اندھا کر رکھا اور یہی حال چوری اور غصب وغیرہ کا ہے۔ اور کوئی یہ خیال نہ کرے کہ لوگوں نے بلا وجہ ان تدابیر پر اس طرح اتفاق کر لیا جس طرح تمام اہل مشرق و مغرب کا کھانے کی نسبت غذا بنانے میں اتفاق ہو جائے۔ کیا ایسا خیال کرنے سے بڑھ کر کوئی دھوکہ ہو سکتا ہے؟ بلکہ فطرت سلیمہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تمام لوگ باوجودیکہ ان کے مزاج مختلف، ان کے شہر دور دراز ان کے مذہب جدا جدا ہیں ان اصول پر ضرور کسی مناسبت فطریہ کی وجہ سے متفق ہیں۔ یہ ایسی مناسبت فطریہ ہے جو نوعی صورت کی وجہ سے اور ان حاجات کثیرۃ الوقوع کی وجہ سے جن کو نوع کے افراد نے اختیار کیا ہے اور ان اخلاق کی وجہ سے جن کو صحت نوعی نے افراد کے مزاجوں میں قائم کر دیا ہے پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی آدمی شہر سے دور دراز جنگل میں پرورش پائے اور کسی کی رسم و عادات سے واقف نہ ہو تو ضرور ہے کہ اس کو بھوک، پیاس اور خواہش نفسانی کی حاجتیں پیش آئیں گی اور بلاشک عورت کی طرف رغبت پیدا ہوگی اور ان دونوں کے صحت مزاج سے اولاد بھی پیدا ہوں گی اور گھر والے باہم مل کر رہنے لگیں گے اور ان میں معاملات پیش آئیں گے پس ارتفاق اوّل منتظم ہوگا اور پھر جب ان کی اور بھی کثرت ہوگی تو پھر ضرور ان میں صاحب اخلاق حمیدہ بھی پیدا ہوں گے اور ان میں وہ معاملات پیش آئیں گے جس سے تمام تدابیر عمل میں لانے کی ضرورت پڑے گی۔ واللہ اعلم۔

گیارھواں باب: لوگوں کی باہمی رسوم کا بیان

واضح ہو کہ رسوم کو تدابیر سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن انسانی سے ہے، مذاہب کا مقصود اوّل یہی ہیں اور شرائع الہیہ میں انہی کے مباحث اور اشارات ہیں اور ان رسوم کے چند اسباب

ہیں جن سے یہ پیدا ہوتی ہیں مثلاً حکما کا ان کو مستنبط کرنا اور ان لوگوں کے دلوں میں جو نور ملکی سے موئید ہیں الہام الٰہی کا ہونا، اور چند اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ رسوم لوگوں میں پھیلتی ہیں جیسے کسی بڑے بادشاہ کے طریقہ کا رسم ہو جانا جس کے لوگ مطیع ہوں، یا ان رسوم کا لوگوں کے دلی خیالات کے مطابق ہونا جن کو لوگ اپنی دلی شہادت سے قبول کر لیتے ہیں اور ان کی سخت پابندی کرنے کے یہی اسباب ہوتے ہیں کہ ان کے ترک کرنے میں غیبی سزا ملنے کا یا سستی کرنے میں فساد واقع ہونے کا تجربہ ہوتا ہے۔ یا صاحب رائے سلیم ان کے ترک کرنے پر ملامت کرتے ہیں وغیرہ ذالک۔ اور دانا آدمی ان نظائر سے جن کو ہم نے ذکر کیا، ان رسوم کے بعض شہروں میں جاری اور بعض شہروں میں فوت ہونے سے ہماری بات کی خوب تصدیق کر سکے گا۔ اور رسوم مرجبہ نفس الامر میں صحیح ہیں کیونکہ تدابیر مناسبہ کی یہی محافظ ہیں۔ اور افراد انسانی کو انہی کے ذریعہ سے کمال نظری یا عملی حاصل ہوتا ہے اور ان کے نہ ہونے سے اکثر لوگ بہائم طبع ہو جائیں۔ بہت سے آدمی نکاح و دیگر معاملات ٹھیک ٹھیک طریقہ سے کرتے ہیں اور جب ان سے ان قیود کی پابندی کا سبب پوچھا جائے تو موافقت قوم کے سوا کوئی جواب نہ ملے گا۔ زیادہ سے زیادہ ان کو ان رسوم کا علم اجمالی ہوتا ہے جس کو صاف طور پر ان کی زبان بیان نہیں کر سکتی چہ جائیکہ ان تدابیر کے فوائد کی تمہید بیان کر سکیں۔

ایسا شخص اگر ان رسوم کی پابندی نہ کرے تو بہائم صفت شمار کیا جائے گا۔ لیکن ان رسوم میں بری رسوم بھی داخل ہو جایا کرتی ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کو اپنے اچھے طریقے کی تمیز میں اشتباہ پڑ جاتا ہے اور برے رسوم کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی وہ لوگ سردار ہو جاتے ہیں جن پر جزئی رائیں غالب ہوتی ہیں اور مصالح کلیہ سے بعید ہوتے ہیں تو وہ درندوں کے سے کام کرنے لگتے ہیں جیسے رہزنی اور غصب وغیرہ۔ یا ان سے شہوت پرستی کے کام سرزد ہوتے ہیں۔ جیسے لواطت اور مردوں کا زنا پن، یا ضرر رساں پیشے اختیار کرتے ہیں جیسے سود خوری اور ناپ تول میں کمی۔ یا لباس اور ولیموں میں ایسی عادات اختیار کرتے ہیں جن کا انجام اسراف ہوتا ہے اور ان کے مہیا کرنے میں بڑے اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے یا تفریح کے لئے اپنے شوق بڑھاتے ہیں جن کے سبب سے امور معاش و معاد معطل ہو جاتے ہیں جیسے گانا بجانا، شطرنج، شکار، کبوتر بازی وغیرہ یا مسافروں پر پر مشقت محصول مقرر کرتے ہیں اور رعیت سے ایسے خراج وصول کرتے ہیں

جس سے وہ تباہ ہو جاتی ہے یا باہم حرص و بغض زیادہ کر لیتے ہیں پس ان کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں سے ایسا برتاؤ کریں اور اس کو ناپسند کرتے ہیں کہ اور لوگ ان سے ایسا معاملہ کریں۔ ان کی وجاہت اور دبدبہ کی وجہ سے کوئی ان کو برا نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد فاسق، فاجر لوگ پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور ان اعمال کے پھیلانے میں بڑی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر ایک قوم ایسی آتی ہے جن کے دلوں میں نہ اعمال صالحہ کا قوی میلان ہوتا ہے نہ اعمال فاسدہ کا۔ پس اپنے رؤسا کی حالت دیکھ دیکھ کر ان میں بھی انہی امور کی آمادگی پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی ان کو نیک باتوں کا پتہ ہی نہیں چلتا اور ایسے خاندانوں کے آخر میں ایسے لوگ باقی رہا کرتے ہیں جن کی فطرتیں درست ہوتی ہیں وہ ان سے میل جول نہیں رکھتے اور غصہ کی حالت میں خاموش رہتے ہیں پس ان کی خاموشی سے بری رسمیں قائم اور مستحکم ہو جاتی ہیں۔

کامل العقل لوگوں کا فرض ہے کہ حق کے پھیلانے و جاری کرنے میں اور باطل کے نابود کرنے میں پوری کوشش کریں اور بسا اوقات یہ بات بغیر جھگڑے اور لڑائیوں کے ممکن نہیں ہوتی۔ پس یہ لڑائی جھگڑے تمام نیک کاموں میں افضل شمار ہوں گے اور جب دنیا میں نیک روی کا طریقہ قائم ہو جائے پس ہر زمانہ میں لوگ اس کو تسلیم کریں کہ اس پر ان کی زندگی اور موت ہونے لگے اور اسی پر ان کے نفوس اور خیالات جم جائیں اور وہ اس طریقہ کو وجوداً و عدماً اصول کا متلازم سمجھ لیں تو پھر کوئی اس سے باہر نہ ہو سکے گا سوائے اس شخص کے جس کا نفس ناپاک ہو، کم عقل ہو شہوت اس پر غالب ہو اور اس کی گردن پر نفس پرستی سوار ہو۔ پس جب وہ اس طریقہ سے باہر قدم رکھے گا تو اپنے دل میں گنہگار ہونے کی شہادت کو پائے گا۔ مصلحت کلی اور اس کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جائے گی۔ اور جب وہ کام بے باکانہ طور پر کرے گا تو اس کے مرض نفسانی کی یہی شرح ہو جائے گا (یعنی اس کے نفسانی مرض کی کیفیت صاف صاف معلوم ہو جائے گی) اور یہ اس کے دین پر دھبہ ہوگا پس یہ طریقہ نیک جب پورا پورا کامل اور مقرر ہو جاتا ہے تو ملأ اعلیٰ سے اس طریقہ کے موافقین کے لئے دعا اور مخالفین کے لئے بد دعا صادر ہوتی ہے۔ اور حظیرۃ القدس میں موافق کے لئے رضامندی اور مخالف کے لئے ناراضی ظاہر ہوتی ہے۔ جب ان طریقوں کی یہ حالت ہوتی ہے تو وہ اس فطرت سے شمار کیے جاتے ہیں جن پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مبحث چہارم

سعادت کا بیان

پہلا باب: سعادت کی حقیقت کا بیان

واضح ہو کہ انسان کے کچھ کمالات ایسے ہیں جو باقتضائے صورت نوعی ہوتے ہیں اور بعض کمالات ایسے ہیں جو باقتضائے موضوع نوع یعنی جنس قریب وبعید کے اقتضا سے ہوتے ہیں۔ انسانی سعادت جس کے مفقود ہونے سے مضرت ہوتی ہے اور درست عقل کے لوگ اس کا نہایت اہتمام اور قصد کرتے ہیں وہ نوعی کمالات ہیں اس لئے کہ عادۃً کبھی انسان کی مدح ان صفات کی وجہ سے ہوتی ہیں جن میں معدنی اجسام بھی شریک ہیں مثلاً طول اور عظیم القامہ کا ہونا۔ پس اگر اسی کو سعادت قرار دیں تو پہاڑوں کو یہ سعادت بدرجہ اتم حاصل ہے اور کبھی انسان کی مدح ایسی صفات کی وجہ سے جن میں نباتات شریک ہیں۔ مثلاً مناسب نشوونما عمدہ عمدہ نقش ونگار اور تروتازہ صورتیں۔ پس اگر یہی سعادت ہے تو گل لالہ اور گلاب کو کامل سعادت حاصل ہے۔ اور کبھی ایسی صفات کی وجہ سے مدح ہوتی ہے جن میں حیوانات شریک ہیں جیسے زور آوری، بلند آوازی، جفتی کی طاقت، زیادہ کھانا پینا، غضب اور کینہ کا زیادہ ہونا، پس اگر اسی کا نام سعادت ہے۔ تو گدھے میں کامل درجہ کی سعادت پائی جاتی ہے اور کبھی ان صفات کی وجہ سے انسان کی مدح کی جاتی ہے جو صرف انسان ہی میں پائی جاتی ہیں جیسے مہذب اخلاق، عمدہ تدابیر، اعلیٰ قسم کی صفتیں، بلندی مرتبہ، پس بادی الرائے میں انہی امور کا نام سعادت انسانی ہے اور اسی لئے ہر قوم جس کو آپ بڑا عاقل اور دانشمند پاتے ہیں انہی اوصاف کے حاصل کرنے کا قصد کرتی ہے اور ان کے سوا دوسری صفات کو صفات مدح ہی نہیں سمجھتی۔ لیکن ابھی تک پوری تنقیح نہیں کیونکہ ان صفات کی اصل ہر ہر حیوان

میں موجود ہے مثلاً شجاعت کی اصل غصہ، انتقام لینا، شدائد میں ثابت قدمی، خطرناک کاموں میں پیش قدمی کرنا ہے اور یہ سب امور بہائم کے نروں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں لیکن ان کو شجاعت اسی وقت کہا جاتا ہے کہ وہ نفس ناطقہ کے فیضان سے اس طرح مہذب ہو جائیں کہ مصلحت کلیہ کے مطیع اور عقلی خواہش سے پیدا ہونے والے ہوں اور اسی طرح اور صنعتوں کی اصل بھی حیوانات میں موجود ہے۔ چڑیا اپنے آشیانہ کو بناتی ہے بلکہ بعض صنعتیں ایسی ہیں جن کو حیوانات بالطبع بناتے ہیں اور انسان بہ تکلف بھی ویسی نہیں بنا سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ امور حقیقی سعادت نہیں بلکہ بالطبع سعادت شمار کی جاتی ہیں اور سعادت حقیقی یہ ہے کہ قوت بہیمیہ نفس ناطقہ کی مطیع ہو اور خواہش عقل کے تابع ہو اور نفس ناطقہ قوت بہیمیہ پر، اور عقل ہوس پر غالب ہو۔ باقی اور خصوصیات لغو ہیں۔

واضح ہو کہ حقیقی سعادت سے جن امور کا تعلق ہے وہ دو قسم کے ہیں ایک قسم ایسی ہے جس میں پیدائشی طور پر نفس ناطقہ کا فیضان امور معاش میں ہوتا ہے لیکن اس قسم سے مقصد اصلی حاصل ہونا ممکن نہیں بلکہ بسا اوقات ان افعال کی زیبائش ہی میں غرق ہونا پڑتا ہے بالخصوص فکر جزئی کی صورت میں جیسا کہ یہ اس کمال ناقص کی شان ہے جو کمال مطلوب کی ضد ہے جیسے کہ کوئی شخص غصہ پیدا کر کے اور کشتی لڑ کر شجاعت حاصل کرنا چاہے یا عرب کے اشعار اور خطبوں کی واقفیت سے فصیح بننا چاہے۔ اور اخلاق اپنے ہم جنسوں کی مزاحمتوں سے ظاہر ہوتے ہیں اور ضرورتوں کے پیش آنے سے تدابیر حاصل ہوتی ہیں اور آلات و مادہ سے صنعتوں کی تکمیل ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں زندگی کے تمام ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

پس جو شخص ان حالات میں ناقص رہ کر مرا اور ان امور سے کچھ بیزار بھی تھا تو وہ صرف اصلی کمال سے ہی محروم رہے گا۔ اور اگر ان تعلقات کی صورتیں نفس کو لپٹی ہوں گی تو نفع سے زیادہ اس کو مضرت ہوگی اور دوسری قسم وہ ہے جس کا اثر یہ ہے کہ قوت بہیمیہ ملکیہ کی فرمانبردار ہو جائے اس کے حکم بموجب کام کرے اور اس کے رنگ سے رنگین ہو جائے۔ اور قوت ملکی ایسی ہو کہ بہیمیت کے ادنیٰ اثر کو قبول نہ کرے، اس کے کمینہ نقوش اس میں نہ جم سکیں جیسے موم میں انگشتری کے نقوش جم جاتے ہیں۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب ملکی طاقت کسی چیز کا تقاضہ کرے اور قوت بہیمیہ کو حکم کر کے اس کا مطالبہ کرے تو بہیمیت اس کی اطاعت کرے کسی قسم کی بغاوت نہ کرے اور اس کی

تعمیل سے باز نہ رہے اور ایسے ہی ملکی طاقت اس کو حکم کرتی ہے اور بہیمیت اس کو قبول کرتی رہے اور اس کا امضا ہوتا رہے حتیٰ کہ وہ اس کی عادی ہو کر مشاق ہو جائے اور یہ امور جن کو قوت ملکیہ چاہے اور بہیمیہ مجبوراً قبول کرے، انہی میں حاصل ہوتی ہے جن میں ملکیت کو خوشی اور بہیمیت کو تنگ دلی حاصل ہو جیسے ملکوت کے ساتھ مشابہ ہونا اور جبروت کا ملاحظہ کرنا کیونکہ یہ حالتیں قوت ملکی کا خاصہ ہیں اور قوت بہیمی کو ان حالات سے نہایت بعد ہے۔ یا یہ بات جب حاصل ہو گی کہ قوت بہیمیہ کی خواہشات، لذائذ اور مرغوبات کو ترک کر دیا جائے، اس حصہ کا نام عبادات اور ریاضت ہے یہ ان مقصود اخلاق کو حاصل کرنے کے ذریعے ہیں جو موجود نہیں ہوتے۔

پس اس مقام کی تحقیق کا مرجع یہ ہوا کہ سعادت حقیقی بغیر عبادات کے حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے مصلحت کلی افراد انسان کو صورت نوعیہ کے روشندان سے ندا کرتی ہے اور نہایت تاکیدی حکم کرتی ہے کہ بقدر ضرورت ان صفات کی اصلاح کی جائے جو انسان کے لئے کمال ثانی ہیں اور اپنا مقصد اصلی اور بڑی مہم اس بات کو ٹھہرائے کہ نفس کو مہذب کرے اور ایسی ہیئت سے مزین کرے جن کی وجہ سے وہ ملأ اعلیٰ سے مشابہ ہو جائے اس میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ عالم جبروت و ملکوت کے اثر اس میں پیدا ہو سکیں۔ قوت بہیمی، ملکی کے زیر فرمان اور نہایت مطیع رہے اور وہ ملکی احکام کا مظہر بن جائے۔ افراد انسانی میں جب نوعی تندرستی ہوتی ہے اور ان کا مادہ احکام نوع کے پوری طرح ظاہر ہونے کے قابل ہوتا ہے تو وہ اس سعادت کے نہایت مشتاق ہوتے ہیں اور جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے اسی طرح یہ سعادت کی طرف کھنچتے ہیں یہ ایک جبلی فطری امر ہے جس پر خدا نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا ہے اور اسی لئے جب بنی آدم میں کوئی قوم معتدل مزاج ہوئی تو ان میں وہ عظما بھی ضرور ہوئے جو ان اخلاق حمیدہ کے تکمیل کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو اعلیٰ ترین سعادت سمجھتے ہیں۔ سلاطین اور حکما انہی کی طرف دیکھتے ہیں کم درجہ کے لوگ انہی سے فیضیاب ہوتے ہیں ان کو تمام دنیا کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور یہ لوگ ملائکہ کی جماعت میں داخل ہوتے ہیں۔ انہی کی جماعت میں منسلک ہوتے ہیں حتیٰ کہ لوگ ان سے برکت حاصل کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ پاؤں پر بوسہ دیتے ہیں کیا عرب و عجم باوجود اختلاف عادات و ادیان اور دوری بلدان و اوطان بغیر کسی مناسبت فطریہ کے شئے واحد پر متفق ہو سکتے ہیں اور یہ وحدت

نوعی سب ایک سی حالت کا اقرار کر سکتے ہیں حالانکہ آپ ہر آدمی کی فطرت میں قوت ملکیہ کا موجود ہونا اور ان کے افاضل اور عمدہ لوگوں کے مراتب بھی پہچان چکے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ واللہ اعلم۔

دوسرا باب: لوگوں کا سعادت میں مختلف ہونے کا بیان

واضح ہو کہ شجاعت اور تمام اخلاق، جس طرح افراد انسانی ان اوصاف میں مختلف ہیں یعنی بعض ایسے ہیں جن میں وصف شجاعت بالکل مفقود ہے اور کسی ایسی مخالف حالت کی وجہ سے جو ان کے نفس طبیعت میں ہوتی ہے، شجاعت کے حاصل ہونے کی امید ہی نہیں ہوتی جیسے مخنث اور نہایت ضعیف القلب، شجاعت سے محروم ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ ان میں شجاعت بالفعل نہیں ہوتی لیکن شجاعت کے مناسب افعال، اقوال اور مناسب ہیتوں کی مشاقی کے بعد شجاع ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ جبکہ شجاع لوگوں سے وہ ان افعال و اقوال کو حاصل کرتے ہیں، پیشوایان شجاعت کے واقعات یاد کرتے ہیں جو سختیوں میں ثابت قدم رہے اور ہلاکت کے موقعوں پر اقدام کیا۔ اور بعض ایسے ہیں جن میں اصل ملکہ پیدا کیا گیا ہے اور ان سے ہمیشہ لغزشیں ہوتی رہتی ہیں پس اگر ان کو اس سے رکنے کا حکم دیا جائے تو ان کی زیست تنگ ہو جائے اور ناگواری سے خاموش رہیں اور اگر ان کی پیدائشی حالت کے مناسب کوئی حکم دیا جائے تو ان کی حالت گندھک کے مانند ہے جس کو آگ لگتے ہی جلنے میں کچھ دیر نہیں ہوتی۔ اور بعض ایسا ہے جس میں یہ ملکہ نہایت وافر اور کامل پیدا کیا گیا ہے وہ اپنے مقتضیات طبع کی طرف خود بخود دوڑتا ہے اگر اس کو بزدلی کی طرف بزور بلائیں تو وہ بالطبع اس کو قبول نہیں کرتا اور بغیر کسی رسم ورواج اور بغیر کسی دوسرے کی خواہش کے اس کو اس ملک کے کاموں اور ہیتوں کا کرنا آسان ہوتا ہے ایسا آدمی اس ملکہ کا امام ہوا کرتا ہے اس کو کسی پیش رواو علم کی ضرورت نہیں ہوتی اور جو لوگ اس ملکہ میں اس سے کم درجہ کے ہوتے ہیں ان کو اس کے طرز کا اختیار کرنا اس کے رسوم کا اختیار کرنا اور بہ تکلف اس کی روش اختیار کرنا اور اس کے واقعات یاد کرنا ضروری ہے تاکہ ان کو وہ کمال جو ان کے حق میں مقدر اور ممکن ہے حاصل ہو جائے۔ اسی طرح لوگ اس حالت پر مختلف ہیں جس پر ان کی سعادت کا مدار ہے پس بعض ایسے ہیں جن میں سعادت کی صلاحیت ہی نہیں جیسے وہ لڑکا جس کو خضر نے مار ڈالا تھا بالطبع کافر تھا اسی طرف اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ ہے (بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب

رجوع نہ ہوں گے)‘‘اور بعض ایسے ہیں جو فاقد السعادت تو ہیں لیکن ان میں اصلاح کی امید ہے جبکہ وہ سخت ریاضتیں کریں، اعمال پر مداومت کریں، نفس ان اعمال سے متاثر ہوتا رہے۔ ایسے لوگ انبیا علیہم السلام کی جوش دہندہ دعوت اور ان کے طریقوں کے محتاج ہوتے ہیں اس قسم کے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بعثت انبیا کے لئے اولا بالذات یہی لوگ مقصود ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جن میں اخلاق اجمالا رکھے گئے ہیں اور ان سے لغزشیں بھی ہوتی ہیں لیکن وہ تفصیلی امور میں اور اس خلق کو مناسب ہیئتوں کے درست کرتے ہیں بسا اوقات رہبر کے محتاج ہوتے ہیں اس آیت میں اسی مرتبہ کی طرف اشارہ ہے’’(قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس کو آگ بھی نہ لگے)‘‘ان لوگوں کو سباق کہتے ہیں۔ لوگوں میں ایک طبقہ انبیا کا ہے جن کو یہ سعادت کامل نصیب ہوتی ہے اس کے مناسب ہیئتوں کے اختیار کرنے، غیر حاصل کمال کے حاصل کرنے، موجود کو باقی رکھنے اور ناقص کی تعلیم کرنے میں ان کو نہ رہبر کی حاجت ہوتی ہے اور نہ کسی کے کہنے کی ضرورت۔ اور وہ طریقہ جس پر وہ اپنے فطری مقتضیٰ سے عمل کرتے ہیں، لوگوں کی ہدایت کے لئے قانون اور سنن بن جاتا ہے جس کو لوگ یاد رکھتے ہیں اور اپنا دستور العمل کر لیتے ہیں اور جبکہ آہنگری اور نجاری وغیرہ عام لوگوں کو بغیر اپنے بزرگوں کے منقول شدہ طریقوں کی پیروی کے حاصل نہیں ہوتی تو ان اعلیٰ مقاصد کی نسبت تم کیا خیال کر سکتے ہو جو سوائے اہل توفیق کے کسی اور کو نصیب نہیں ہوتے۔ اس مقام سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ انبیا کی طرف متوجہ ہونے کی شدید ضرورت ہے ان کا اتباع واجب ہے اور ان کی احادیث سے شغل رکھنا نہایت ضروری امر ہے۔ واللہ اعلم۔

تیسرا باب: اس سعادت کے حاصل کرنے کی کیفیت میں لوگوں کے مختلف طور طریقے

واضح ہو کہ یہ سعادت دو طریقہ سے حاصل ہوتی ہے ایک وہ طریقہ ہے جس میں قوت بہیمیہ سے گویا بالکل الگ ہو جانا ہے اور یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے طبیعت کے احکام رک جائیں، اس کی تیزی ختم ہو جائے، اس کے علوم اور حالات کا شعلہ بجھ جائے اور ہمہ تن عالم جبروت کی طرف متوجہ ہو جائے۔ نفس ان علوم کو قبول کرنے لگے جو مکان اور

زمان سے بالکل بری ہیں اور ان لذتوں کی خواہش اس میں پیدا ہو جائے جو مالوف لذتوں سے بالکل علیحدہ ہیں یہاں تک کہ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دے، ان کی مرغوب چیزوں میں رغبت نہ کرے، ان کے خوف کرنے کی چیزوں سے بے خوف ہو جائے اور تمام لوگوں سے دور، علیحدگی اختیار کر لے یہ وہ سعادت ہے جس کی حکما اشراقین اور صوفیہ میں مجاذیب طالب رہتے ہیں۔ پس ان میں سے بعض اپنے مقصود کو پہنچ جاتے ہیں اور وہ بہت ہی کم ہیں۔ اور باقی لوگ ہمیشہ اس کے مشتاق اور اس کی طرف آنکھیں لگائے رکھتے ہیں اور بہ تکلف اس کی ہیئات کی نقل کرتے ہیں۔ اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں بہیمیت کی اصلاح ہو جایا کرتی ہے، اس کی کجی دور کر دی جاتی ہے لیکن اس کی اصل حالت باقی رہتی ہے۔ یہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ نفس ناطقہ کے افعال، ہیئتیں اور اذکار وغیرہ کی قوت بہیمی ایسی ہی نقل کرتی رہے جیسے گونگا آدمی لوگوں کے اقوال کو اپنے اشاروں سے نقل کرتا ہے اور کوئی مصور نفسانی حالات، خوف اور شرمندگی وغیرہ کی ایسی صورتوں سے نقل کرتا ہے جو ان حالات کے ساتھ ساتھ نظر آیا کرتی ہیں اور جس عورت کا بچہ مر جاتا ہے وہ اس کا غم ایسے کلموں اور دردمندی سے ظاہر کرتی ہے کہ اس کو جو سنتا ہے اس پر غم طاری ہو جاتا ہے اور غم کی صورت اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور جبکہ تدبیر الٰہی کی بنیاد اس بات پر ٹھہری کہ عالم کی تدابیر میں اقرب سے اقرب اور اسہل سے اسہل کو اختیار کیا جائے اور جملہ افراد کے امور کی اصلاح پر نظر کی جائے نہ یہ کہ شاذ و نادر کی طرف توجہ کی جائے۔ اور مصالح دارین کے قائم کرنے میں انتظام ملحوظ رہے تو یہ لطف الٰہی اور رحمت خدا کا یہ تقاضہ ہوا کہ اولا و بالذات طریقہ ثانیہ کے قائم کرنے، اس کی طرف دعوت، اور آمادہ کرنے کے لیے رسولوں کو دنیا میں بھیجے اور پہلے طریقہ کی طرف صرف ضروری اشارات اور ضمنی اظہارات سے رہبری کرے، وللہ الحجۃ اللہ البالغہ۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا طریقہ ان لوگوں سے بن پڑتا ہے جن میں لاہوتی کشش زیادہ ہو اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اس طریقہ کے لئے سخت ریاضتوں کی نہایت درجہ فراغ خاطر کی ضرورت ہے۔ اور ایسی مشقتیں جھیلنے والے بہت ہی کم ہیں۔ اس طریقہ کے پیشوا وہ لوگ ہیں جنھوں نے امور معاش کو ترک کر دیا اور دنیا میں ان کو دعوت دین کا منصب حاصل نہیں ہے۔ اور

نیز اس طریقہ کی تکمیل بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ دوسرے طریقہ کا معقول مجموعہ بھی پیش نظر رکھا جائے اور نیز اس طریقہ سے ایک نہ ایک سعادت سے محرومی ہوگی، یا دنیوی تدابیر کی اصلاح نہ ہوگی یا آخرت کے لئے نفس کی اصلاح نہ ہوگی۔ اگر سب لوگ اسی طریقہ کو اختیار کر لیں تو دنیا ویران ہوجائے گی اور اگر لوگوں کو اس کا حکم دیا جائے تو گویا تکلیف بالمحال ہوگی کیونکہ تدابیر نافعہ ایک فطری شیٔ ہو گئے ہیں اور دوسرے طریقہ کے مقتداذو فہم اور صاحب اصلاح لوگ ہوتے ہیں دین ودنیا کی ریاست ان کو حاصل ہوتی ہے انہی کی دعوت مقبول اور انہی کا طریقہ قابل اتباع ہے اور ان کے طریقہ میں صالحین سابقین اور اصحاب الیمین کے کمالات منحصر ہیں اور دنیا میں یہی لوگ بہ کثرت ہیں اور اس طریقہ پر ذکی، غبی، مشغول اور فارغ البال سب چل سکتے ہیں اور اس میں کچھ تنگی بھی نہیں اور بندہ کے لئے یہ طریقہ اس کے نفس کی اصلاح، آراستگی اور ان تکالیف سے بچنے کے لئے جن کا آخرت میں اندیشہ ہے کافی بھی ہے اس لئے کہ ہر شخص کے لئے ملکی افعال مقرر ہیں جنکے ہونے سے اس کو آخرت میں آرام ملے گا اور ان کے نہ ہونے سے اس کو تکلیف ہوگی۔ اب رہے احکام تجرد، تو وہ اس کو عالم قبر میں حاصل ہوجائیں گے گو وہ ان کی جبلت سے بالفعل واقف نہیں اگرچہ وہ ایک زمانہ کے بعد ہوں گے (شعر) تجھ پر زمانہ عنقریب وہ حالات ظاہر کردے گا جن کی تجھ کو خبر بھی نہ تھی اور تیرے پاس خبروں کو وہ شخص لائے گا جس کے لئے تو نے توشہ تیار نہ کیا تھا۔ اور حاصل کلام یہ ہے کہ خیر وسعادت کے تمام طریقوں کا پورے طور پر احاطہ کرنا اکثر لوگوں کے لئے محال سا ہے اور جہل بسیط سے کچھ نقصان بھی نہیں۔ واللہ اعلم۔

چوتھا باب: ان اصول کا بیان جو طریقۂ ثانیہ کی تحصیل کا مرجع ہیں

واضح ہو کہ دوسری قسم کی سعادت حاصل کرنے کے بیشمار طریقے ہیں لیکن خدا نے اپنے فضل سے مجھ کو سمجھایا ہے کہ ان کی انتہا چار خصلتوں پر ہوتی ہے جن کو قوت بہیمیہ قبول کر لیتی ہے جبکہ نفس ناطقہ کا قوت بہیمی پر فیضان ہوتا ہے اور نفس ناطقہ اس کو اپنی مناسب حالتوں پر مجبور کرتا ہے۔ انسان کے تمام حالات میں سے ان اوصاف کو ملأ اعلیٰ سے زیادہ ہمرنگی ہے انہی اوصاف کی وجہ سے انسان ملأ اعلیٰ میں ملنے اور ان کی جماعت میں داخل ہونے کے قابل ہوجاتا ہے۔ خدا نے ہم کو سمجھایا ہے کہ انبیا انہی باتوں کی تعلیم اور ترغیب کے لئے بھیجے گئے تھے اور تمام شریعتیں انہی کی

تفصیل اورانہی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ان میں سے ایک وصف طہارت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کی فطرت سلیم ہوتی ہے اس کا مزاج صحیح ہوتا ہے اس کا دل تمام سفلی مشاغل سے جو تدبیر کے مانع ہوتے ہیں، خالی ہوتا ہے تو ایسی حالت میں جب اس کو پلید چیزوں سے آلودگی ہو جاتی ہے اور اس کو بول و براز کی ضرورت ہوتی ہے اور ان سے فارغ نہیں ہوتا اور وہ مجامعت اور اس کی ودائی کو ابھی ابھی کر چکا ہوتا ہے تو اس کا دل منقبض ہوتا ہے، اس پر تنگی اور غم طاری ہوتا ہے اپنے آپ کو نہایت گھٹن میں پاتا ہے پھر جب دونوں قسم کی نجاستیں دور ہو جاتی ہیں اور اپنے بدن کو ملتا ہے اور غسل کرتا ہے اور اچھے کپڑے پہن کر خوشبو لگاتا ہے تو اس کا انقباض دور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دل میں کشادگی سرور اور انبساط پاتا ہے یہ لوگوں کے دکھلانے کے لئے یا ان کی رسموں کی پابندی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ محض نفس ناطقہ کے حکم کی وجہ سے ہوتا ہے پس پہلی حالت کو حدث اور دوسری حالت کو طہارت کہتے ہیں اور جو شخص ذکی ہے اس سے احکام نوع کی سلامتی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا مادہ صورت نوعیہ کے احکام بجا لانے پر قادر ہے، تو وہ دونوں حالتوں میں تمیز کرے گا ایک کو پسند کرے گا اور دوسرے کو ناپسند اور غبی آدمی جب اس کی قوت بہیمیہ ذرا کمزور ہوتی ہے، یکسوئی اور طہارت کو اختیار کرتا ہے، ان کے پہچاننے کے لئے فرصت پاتا ہے تو وہ بھی ضرور ان دونوں کو پہچانتا ہے اور ایک کو دوسرے سے تمیز کر لیتا ہے اور صفات جسمانیہ میں سے طہارت کو نجس آلودگیوں سے علیحدہ ہونے میں اور اپنی نورانی کیفیت سے خوش ہونے میں ملأ اعلیٰ سے نہایت مشابہت ہے اور اسی وجہ سے یہ طہارت قوت عملی کے اعتبار سے کمالات حاصل کرنے میں نفس کو خوب مدد دیتی ہے۔

اور حدث جب انسان میں جم جاتا ہے اور ہر طرف سے احاطہ کر لیتا ہے تو آدمی میں شیطانی وسواس قبول کرنے کی شیاطین کو حس مشترک کے سامنے دیکھنے کی، پریشان خوابوں کے دیکھنے کی، نفس ناطقہ کے قرب میں تاریکی کے غلبہ کی اور ملعون و کمینہ حیوانات کی صورتیں نظر آنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔اور جب طہارت آدمی میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کا احاطہ کر لیتی ہے آدمی اس کا خیال رکھتا ہے اور اس کی طرف میلان کرتا ہے تو اس سے فرشتوں کے الہامات قبول کرنے کی، ان کو دیکھنے کی، عمدہ عمدہ خوابوں کی، انوار ظاہر ہونے کی، اچھی چیزوں کے عمدہ شکل میں نظر آنے کی،

اور بڑی مبارک اور معظم چیزیں دکھائی دینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری صفت خدا کے حضور میں عاجزی کرنا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کو خدا کی آیات اور صفات کے ذریعہ سمجھایا جاتا ہے تو نفس ناطقہ متنبہ ہو جاتا ہے اور حواس و بدن اس کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور وہ حیرت زدہ سا ہو جاتا ہے اور عالم قدس کی جانب اپنا میلان پاتا ہے اور اس کو ایک ایسی حالت پیش آتی ہے جو بازاری لوگوں کو بادشاہوں کے دربار میں اپنی عاجزی، ان کی عظمت اور بخشش دیکھ کر پیش آتی ہے۔

انسان کی حالتوں میں سے یہ حالت خدا کی طرف رجوع ہونے میں، اس کے جلال اور تقدس میں سراپا حیرت اور مستغرق ہونے میں ملأ اعلیٰ کے ساتھ بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اسی لئے علمی کمال حاصل کرنے میں یعنی ذہن میں معرفت خداوندی منقش ہو جانے میں اور اس کی بارگاہ میں اس طرح سے جا ملنے میں جس کو بیان نہیں کر سکتے، یہ حالت انسان کی خوب مدد کرتی ہے، تیسری صفت، سماحت یعنی جوانمردی اور سخاوت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس ایسا ہو جائے کہ قوت بہیمی کی خواہشوں کی اطاعت نہ کرے اس کے نقش اس میں نہ جم سکیں اور اس کی آلائش اس میں نہ اثر کرے، یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نفس امور معاش میں مصروف ہوتا ہے، عورتوں کی اس میں خواہش ہوتی ہے، لذات کا عادی اور اچھے کھانوں کا شوق ہوتا ہے۔ اور ان کے حاصل کرنے میں اتنی کوشش کرتا ہے کہ اچھی طرح حاجت روائی کر لیتا ہے اور اسی طرح جب غصہ ہوتا ہے یا کسی چیز کا لالچ کرتا ہے تو اس حالت میں کسی قدر مستغرق رہتا ہے اور دوسری چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ پھر جب یہ حالت زائل ہو جاتی ہے، پس اگر وہ جواں مرد ہے تو اس حالت سے ایسا الگ ہو جاتا ہے گویا اس میں کبھی تھا ہی نہیں۔ اور اگر اس میں قوت سماحت نہیں ہے تو وہ کیفیتیں اس میں اپنا جال پھیلا دیتی ہیں اور اس طرح جم جاتی ہیں جس طرح مہر کے نقش موم میں جم جاتے ہیں۔ اور وہ کشادہ دل اور صاحب سماعت جب اپنے بدن سے جدا ہوگا اور تمام تاریک اور مجتمع تعلقات سے اس کو سبکدوشی ہوگی اور اپنی اصل حالت کی طرف رجوع کرے گا تو وہاں دنیا کی ان کیفیات میں سے جو ملکی قوت کی مخالف تھیں کچھ بھی نہ پائے گا اسی واسطے اس کو وہاں انس اور فراخ عیش حاصل ہوگا۔

اور حریص طمع شخص میں ان تعلقات کے نقوش جمع رہتے ہیں اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی کا کوئی نفیس مال چوری ہو جائے، پس اگر وہ سخی ہے تو کچھ پرواہ نہیں کرتا اور اگر وہ تنگدل ہے تو دیوانہ سا ہو جاتا ہے اور اس مال کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے اور سماحت اور اس کی مخالف کیفیت کے ان چیزوں کے لحاظ سے جن میں وہ ہوا کرتی ہیں بہت سے لقب ہیں۔ اگر وہ مال میں ہوں تو سخاوت اور بخل کہتے ہیں۔ اگر شرمگاہ اور شکم کی خواہشوں میں ہوں تو اس کو پارسائی اور حرص کہتے ہیں۔ اور اگر آرام اور مشقتوں سے دور رہنے کی بابت ہو تو اس کو صبر اور ناصبری کہتے ہیں۔ اور اگر ان معاصی کے بارے میں ہے جن کو شرع نے ممنوع قرار دیا ہے تو اس کو تقوی اور بدکاری کہتے ہیں۔ اور جب انسان میں یہ سماحت خوب گھر لیتی ہے تو اس کا نفس دنیوی خواہشوں سے الگ ہو جاتا ہے اور اس میں بلندترین لذات مجردہ حاصل کرنے کی استعداد ہو جاتی ہے۔ اور سماحت ایک حالت ہے جو کمال مطلوب علمی یا عملی کی مخالف باتوں سے انسان کو روکتی ہے۔

چوتھی صفت عدالت ہے اور وہ ایسا نفسانی ملکہ ہے جس کے افعال کی وجہ سے شہر اور قوم کا انتظام بہ سہولت قائم ہو جاتا ہے اور نفس ان افعال پر گویا مجبور ہو جاتا ہے اس میں راز یہ ہے کہ ملائکہ میں اور ان نفوس میں جو تعلقات جسمانی سے دور ہیں، ارادہ کو خداوندی منقش ہو جاتا ہے جس کو اللہ تعالی انتظام عالم اور اس کی پیدائش وغیرہ امور کی نسبت چاہتا ہے۔ پس ملائکہ اور نفوس بھی انہی باتوں کو پسند کرتے ہیں جو اس انتظام کے مناسب ہیں۔ پس یہ طبیعت روح مجردہ کی ہے جب نفس، جسم سے جدا ہو جاتا ہے اور اس میں اس صفت کا اثر باقی رہتا ہے تو اس کو نہایت درجہ خوشی ہوتی ہے اور وہ اس لذت کی طرف راہ پالیتا ہے جو خسیس لذتوں سے جدا ہے اور اگر بدن سے جدا ہوتے وقت اس صفت کی ضد اس میں ہے تو اس کی حالت نہایت تنگ ہوتی ہے وہ متجسس اور ملول ہوتی ہے پس خدا تعالی جب نبی کو دین قائم کرنے کے لئے اور لوگوں کو تاریکی سے نور کی طرف لانے کے لئے مبعوث فرماتا ہے تاکہ تمام لوگ متصف بہ عدالت ہو جائیں تو جو شخص اس نور کے پھیلانے میں کوشش کرتا ہے اور لوگوں میں اس کی اشاعت کرتا ہے وہ قابل رحمت ہو جاتا ہے اور جو اس کے رد کرنے میں، اس کے معدوم کرنے میں کوشش کرتا ہے وہ قابل ملامت وسنگساری ہو جاتا ہے پس جب انسان میں صفت عدالت متمکن ہو جاتی ہے تو اس میں اور حاملین عرش

ومقربین بارگاہ فرشتوں میں جو جود الٰہی اور برکات کے لئے ذریعہ ہیں، اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں اور ان فرشتوں میں فیضان کا دروازہ کھل جاتا ہے اور یہ صفت اس پر ان کے رنگ اور اثر نازل کرتے ہیں، مددگار بن جاتی ہے۔ اس طور پر کہ نفس میں الہام ملائکہ سے مستفیض ہونے کی صلاحیت ہو جاتی ہے اور وہ ان کے علوم کے لئے آمادہ رہتا ہے پس اگر ان چاروں اوصاف اور خصائل کی تو حقیقت معلوم کر لے گا اور اس کیفیت کو سمجھ لے گا جس سے کمالات علمی و عملی حاصل ہوتے ہیں اور یہ اوصاف کیونکر آدمی کو فرشتوں میں منسلک کر دیتے ہیں اور یہ بھی بخوبی سمجھ لے گا کہ ان اوصاف سے ہر زمانہ کے موافق شرائع الٰہیہ کا کیونکر استخراج ہوتا ہے تو تجھ کو بڑی خیر اور بھلائی عطا ہوگی اور تو دین کا فقیہ بن جائے گا۔ ان لوگوں میں سے تیرا شمار ہوگا جن کی بہتری خدا کو منظور ہے۔

ان چاروں اوصاف سے جو حالت مرکب ہوتی ہے اس کو فطرت کہتے ہیں۔ فطرت حاصل کرنے کے چند اسباب ہیں، بعض ان میں سے علمی ہیں اور بعض عملی، اور بعض حجابات ایسے ہیں جو انسان کو مقاصد فطری سے روکتے ہیں اور ان حجابات کے زائل کرنے کے واسطے حیلے بھی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ تم کو ان سب امور پر مطلع کر دیں اس لئے بتوفیق الٰہی جو ہم کہیں غور سے سنو! واللہ اعلم۔

پانچواں باب: ان خصائل کے حاصل کرنے کا اور ناقص کی تکمیل اور رزائل کی تحصیل کا بیان

واضح ہو کہ ان خصائل کے حاصل کرنے کی دو تدبیریں ہیں، تدبیر علمی اور تدبیر عملی، تدبیر علمی کی اس واسطے ضرورت ہے کہ طبیعت علمی قوتوں کے تابع اور مطیع ہے اس لئے آپ دیکھتے ہیں کہ جب انسان کے دل میں حیا اور خوف پیدا کرنے والی باتیں آتی ہیں تو خواہش نفسانی اور جماع کی رغبت جاتی رہتی ہے۔ پس جب اس کا دل فطرت کے مناسب امور کے علم سے پر ہو جاتا ہے تو یہ ہم ان امور کے نفس میں راسخ ہونے کی طرف کھینچتا ہے اور یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا اعتقاد کرے کہ میرا خدا تمام بشری عیوب سے پاک ہے۔ اس پر آسمان اور زمین کا ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں۔ جب تین آدمی سرگوشی کرتے ہیں تو وہاں وہ چوتھا ہوتا ہے۔ اور جہاں پانچ مل کر پوشیدہ باتیں کرتے ہیں تو چھٹا وہ بھی ہوتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے حکم کرتا

ہے اس کے حکم کو کوئی نہ روک سکتا ہے نہ پھیر سکتا ہے۔ ہر چیز کو اپنے انعام سے موجود کرنے والا ہے اور اس کے متعلق جسمانی اور نفسانی نعمتیں وہی بخشتا ہے، عمل کے بموجب بندے کو جزا دینا ہے اگر عمل اچھے تو جزا بھی اچھی اور اگر عمل برے، تو جزا بھی بری، خدا تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے (یہ میرا بندہ جس نے گناہ کیا ہے یہ جانتا ہے کہ میرا رب بھی ہے، گناہ پر مواخذہ بھی کرتا ہے اور معاف بھی کر دیتا ہے، اچھا میں نے اس کو معاف کیا)

حاصل کلام یہ ہے کہ وہ ایسا اعتقاد رکھے جو دل میں ہیبت اور نہایت تعظیم پیدا کرے اور اس کے دل میں خدا کے سوا کسی دوسرے کا ذرہ بھر بھی خوف اور عاجزی نہ ہو اور خوب اعتقاد کرے کہ انسان کا اصلی کمال خدا کی طرف متوجہ ہو کر اس کی عبادت کرنے میں ہے اور انسان کی سب سے عمدہ حالت یہ ہے کہ فرشتوں کے مشابہ ہو جائے اور ان سے قرب ہو۔ یہی امور ہیں جن سے قرب ربانی حاصل ہوتا ہے اور انہی امور کو خدا، لوگوں سے پسند کرتا ہے بندہ پر خدا کے یہ حقوق ہیں ان کا پابند اوقات رہنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا خوب یقین کرے کہ انسانی سعادت ان امور کے کرنے میں ہے اور ان کے ترک کرنے میں اس کی بدبختی ہے اور قوت بہیمیہ کے متنبہ کرنے کے واسطے ایک سخت تازیانہ بھی ضروری ہے جو اس کو خوب متنبہ کر دے اور اس کے برے ارادوں سے بزور روکے۔ انبیا کے طریقے اس علمی اور اعتقادی حالت کے پختہ کرنے کے لئے مختلف رہے ہیں۔ پس سب سے عمدہ بات جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ پر نازل فرمائی یہ تھی کہ لوگوں کو خدا کی واضح نشانیوں سے اس کی برتر صفات اور تمام آفاقی و نفسانی نعمتوں کے ذریعہ سمجھائے یہاں تک کہ بہت عمدہ طور پر یہ بات صحیح اور محقق ہو جائے کہ خدا تعالیٰ اس لائق ہے کہ تمام لذائذ کو اس کے لئے صرف کر دیں اس کے ذکر کو تمام ماسوائے الٰہی پر مقدم رکھیں، نہایت درجہ کی اس سے محبت رکھیں اور انتہائی کوشش سے اس کی عبادت میں مصروف ہوں، موسیٰ علیہ السلام نے ان امور کے ساتھ خدا کے شدائد سے بھی ڈرایا۔ اس طرح سے کرامات واضح کر دی کہ وہ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کو دنیا میں سزا و جزا دیتا ہے اور نعمتوں کو تکالیف سے بدل دیتا ہے یہاں تک کہ لوگوں کے دلوں میں گناہوں کا خوف اور اطاعت کی رغبت ذہن نشین ہو گئی اور ان علوم بالا کے ساتھ ہمارے نبی علیہ السلام نے حوادث

قبر وحشر کی خوش خبری سنائی اور خوف دلایا، نیکی اور گناہ کے خواص بیان فرما دیئے۔

ان امور کا محض معلوم کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ ہمیشہ ان کی تکرار کا دور اور ملاحظہ بھی ضروری ہے یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے رہیں تاکہ قوی علمیہ ان سے پر ہو جائیں پھر تمام اعضا ان کی بجا آوری کریں یہ تینوں علوم (تذکیر بآیات اللہ تذکیر بایام اللہ، وقائع حشر یہ وغیرہا) مع دو علوم کے جن میں سے ایک میں حلال وحرام کے احکام کا بیان اور دوسرے میں کفار سے مخاصمہ کا بیان ہے پانچ فنون ہوتے ہیں جو قرآن مجید کے عمدہ علوم میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور تدبیر عملی پس اس میں عمدہ یہ ہے کہ انسان ایسی ہیئت، افعال اور امور اختیار کرے جو نفس کو خصلت مطلوبہ یاد دلائیں (اس میں اوصاف مطلوبہ کی یاد پیدا ہو) وہ نفس کو تنبیہ کرتے رہیں اور ان اوصاف کی طرف برانگیختہ کریں، یا تو اس لئے کہ ان اوصاف اور افعال میں عادۃً تلازم ہے یا اس لئے کہ یہ افعال مناسب فطری کی وجہ سے ان اوصاف کے حاصل ہونے کا گمان غالب پیدا کر دیتے ہیں۔ پس جب انسان یہ چاہتا ہے کہ نفس کو غصہ پر آمادہ کرے اور اپنے سامنے غصہ کی صورت پیش کرے تو وہ ان گالیوں کا خیال کرتا ہے جو اس کے مخالف نے اس کو بکی تھیں اور دشنام سے شرم و عار پیدا ہوتی ہے اس کو سوچتا ہے اور نوحہ کرنے والی جب رونا چاہتی ہے تو مردہ کی خوبیوں کو یاد کرتی ہے اور اپنے خیال کے سوار اور پیادے ان کی طرف دوڑاتی ہے اور جو ہم بستری کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کی دواعی کو خیال میں لاتا ہے اور اس بات کی نظریں بکثرت ہیں جو کلام کے ہر پہلو کا احاطہ کرنا چاہے گا وہ اس پر مخفی نہ رہیں گی اسی طرح ان اوصاف کے اسباب ہیں جن کے ذریعہ وہ حاصل کئے جا سکتے ہیں اور ان امور کی معرفت اور پہچان میں ذوق سلیم رکھنے والوں کے ذوق کا اعتبار ہے مثلاً حدث کے اسباب یہ ہیں، سفلی باتوں سے دل کا پر ہو جانا جیسے جماع اور مباشرت کے ذریعہ سے عورتوں سے نفسانی رغبت کو پورا کرنا۔ بری باتوں کا دل میں پوشیدہ رکھنا اور ملأ اعلیٰ کی لعنت کا دل کو گھیر لینا، بول و براز کو روکنا، بول و براز اور ریح سرزد ہو جانا اور یہ تینوں معدہ کے فضلات ہیں، بدن کا میلا ہونا، گندہ دہنی، تھوک اور ناک بہنا، زیر ناف اور بغل کے بالوں کا بڑھنا، کپڑے اور بدن کا ناپاکی سے آلودہ ہونا، خیال میں ایسی صورتوں کا رکھنا جس سے حالت سفلیہ پیدا ہو جائے، مثلاً قارورات اور شرمگاہ کو دیکھنا، حیوانوں کی جفتی اور مجامعت کو خوب غور سے دیکھنا، فرشتوں اور

نیک لوگوں کی شان میں طعن وتشنیع کرنا، لوگوں کو ایذا دینے میں کوشش کرنا، اور طہارت کے اسباب ان چیزوں کو دور کرنا ہے۔ ان کے مخالف کام کرنا ہے، ان چیزوں کا استعمال میں لانا ہے، جو عادتاً پاکیزگی کا باعث ہے، جیسے غسل کرنا، وضو کرنا، اچھے کپڑے پہننا اور خوشبو کا استعمال کرنا، کیونکہ ان چیزوں کے استعمال سے نفس پاکیزگی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور رجوع الی اللہ کا سبب تعظیم کے اعلیٰ حالات کا التزام کرنا ہے، مثلاً اس کے سامنے سرنگوں ہو کر کھڑے رہنا، سجدہ کرنا، ایسے لفظوں کو ادا کرنا جن سے مناجات عاجزی اور طلب حاجات پائی جائے، کیونکہ یہ وہ امور ہیں جن سے نفس کو عاجزی اور رجوع الی اللہ کی کمال درجہ تنبیہ ہو جاتی ہے اور سماحت کے اسباب سخاوت کا خوگر ہونا، داد و دہش، درگزر کرنا، سختیوں میں صبر اختیار کرنا ہے، وغیرہ ذالک اور عدالت کے اسباب سنت راشدہ کی اس کی تمام تفصیل کے ساتھ محافظت کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: ان حجابات کا بیان جو فطری امور کے ظاہر ہونے میں مانع ہیں

واضح ہو کہ بڑے حجابات تین ہیں، طبیعت کا حجاب، رسم کا حجاب، اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی سرشت میں کھانے پینے اور نکاح کی خواہشیں پیدا کی گئی ہیں اور اس کا دل طبعی حالات کے لئے سواری ہے جیسے خوشی اور رنج وغصہ اور خوف وغیرہ پس وہ ہمیشہ ان میں مصروف رہتا ہے۔ ہر حالت کے حاصل ہونے سے پہلے نفس اس کے اسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کے مناسب امور کے لئے قوی حامیہ کو فرمانبرداری بھی کرنی پڑتی ہے اور نفس اس میں مستغرق رہتا ہے اور اس کے علاوہ تمام سے غافل ہو جاتا ہے۔ پس وہ رات دن انہی باتوں میں مصروف رہ کر کمال سے بے خبر رہتا ہے بہت سے آدمی ایسے ہیں جن کے قدم اس دلدل میں دھنس گئے ہیں اور پھر تمام عمر نکلنا نصیب نہیں ہوتا اور بہت سے آدمیوں پر طبیعت کا حکم غالب ہے۔ وہ تمام رسمی اور عقلی امور کو خیرباد کہہ کر ملامت سے بے خوف ہو جاتے ہیں اسی حجاب کو حجاب نفس کہتے ہیں۔ لیکن وہ شخص جس میں عقل کامل اور بیداری کافی ہوتی ہے وہ اپنے اوقات میں فرصت تلاش کرتا ہے طبعی حالات میں خاموشی پیدا کرتا ہے وہ اپنے نفس میں ان حالات کے علاوہ اور امور کی گنجائش پیدا کرتا ہے اور مقتضیات طبع کے علاوہ دوسرے علوم کے فیضان کے قابل ہو جاتا ہے اور اپنی عقلی اور عملی قوت کی وجہ سے کمال نوعی کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ پس جب وہ اپنی چشم بصیرت کھولتا ہے تو فوراً وہ اپنی قوم کی

تدابیر، لباس اور فخر و مباحات، فضائل، فصاحت و صناعت کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے دل پر ان امور کا بڑا اثر پڑتا ہے اور ان کے حاصل کرنے میں عزم کامل اور قوی ہمت صرف کرتا ہے یہ حجاب رسم ہے اور اس کو دنیا کہتے ہیں اور بعض لوگ ہمیشہ اسی میں مستغرق رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کو موت آجاتی ہے اور یہ فضائل سب کے سب زائل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان خوبیوں کا تعلق بدن اور آلات سے ہے اس لئے مرنے کے بعد نفس ان سے بالکل عاری رہ جاتا ہے اور اس کا حال اس باغ والے کا سا ہو جاتا ہے جس کے باغ کو لو نے جھلس دیا۔ یا جس طرح کہ سخت آندھی راکھ کو اڑا لے گئی۔ اور اگر وہ شخص نہایت بیدار مغز اور زیرک ہے تو کسی دلیل عقلی یا ظنی یا شریعت کی پیروی سے یقین کرتا ہے کہ اس کا کوئی پروردگار ہے تمام بندوں پر غالب، ان کے تمام ساز و سامان کا مدبر، تمام نعمتوں کی بخشش کرنے والا ہے پھر اس کے دل میں خدا کی طرف رغبت و میلان اور محبت پیدا ہوتی ہے پھر وہ اسی کے قرب کو چاہتا ہے ان حاجتوں کا اس سے طالب ہوتا ہے اور اسی کے آگے گرنا چاہتا ہے بعض اس مراد کو پاتے ہیں بعض محروم رہ جاتے ہیں اور اس محرومی کے دو سبب ہیں۔ ایک یہ کہ خالق میں مخلوق کی صفات خیال کی جائیں۔ دوسری یہ کہ مخلوق میں خالق کی صفات کا اعتقاد کیا جائے۔ اول کو تشبیہ کہتے ہیں۔ اس کا منشا ہوتا ہے غائب کی حالت کا حاضر پر قیاس کرنا اور دوسرے کو شرک کہتے ہیں اس کا منشا ہوتا ہے کہ مخلوق میں خلاف عادت باتیں دیکھ کر ان کی طرف منسوب کرنا اور ان کے ذاتی افعال سمجھنا، اور تم کو تمام افراد انسان کا تجسس کرنا چاہئے۔ تم ہمارے بیان میں کیا کہیں کچھ تفاوت پاتے ہو۔

میں نہیں گمان کرتا کہ تم کو تفاوت معلوم ہو بلکہ ہر انسان کے واسطے خواہ وہ کسی شریعت کا پابند ہو مختلف حالات ضرور ہوں گے ایک وقت ایسا ہوگا کہ وہ حجاب طبع میں مستغرق ہوگا خواہ وہ حجاب کم ہوں یا زیادہ اور یہ کہ وہ ہمیشہ رسمی افعال کا پابند ہوگا اور ایک وقت ایسا ہوگا کہ وہ حجاب رسم میں مستغرق ہوگا۔ اس وقت وہ قصد کرے گا کہ کلام لباس عادت اور معاشرت میں اپنے زمانہ کے عقلا کے ساتھ مشابہت حاصل کرلے اور ایک وقت اس کے لئے ایسا ہوگا کہ عام باتوں کو کان لگا کر سنے گا اور اس کو اس وقت احادیث جبروت اور عالم میں تدبیر غیبی کی طرف خیال بھی نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب: ان حجابوں کے دور کرنے کا بیان

واضح ہو کہ حجاب طبع کی دو تدبیریں ہیں ایک یہ کہ اس پر حکم کریں، ترغیب دلائیں، اس میں آمادگی پیدا کی جائے دوسرے ان امور پر زدوکوب کیا جائے وہ چاہے یا نہ چاہے لیکن اس سے مواخذ کیا جائے پس پہلا طریقہ وہ ریاضات شاقہ ہیں جو بہیمی قوت کو کمزور کردیتی ہیں مثلاً روزہ رکھنا، شب بیداری کرنا، بعض لوگوں نے اس امر میں بڑی زیادتی کی کہ پیدائش الٰہی میں تبدیلی کردی کسی نے آلات تناسل کاٹ ڈالے، کسی نے عمدہ اعضا مثلاً دست و پا سکھا دیئے، ایسے لوگ جاہل ہیں، درمیانہ حالت بہت عمدہ ہے روزہ اور شب بیداری ایک رسمی علاج کے مانند ہیں اس کو بقدر ضرورت کرنی چاہئے، دوسرا طریقہ ان لوگوں کو ملامت کرنا ہے جنھوں نے طبیعت کا اتباع کرکے صحیح راستہ ترک کردیا۔ ان کو وہ طریقہ بتلانا چاہئے جس کی وجہ سے وہ غلبہ طبیعت سے چھٹکارا پائیں لیکن لوگوں پر بالکل سختی کرنا بھی مناسب نہیں۔ اور سب حالتوں میں صرف زبانی انکار بھی کافی نہیں بلکہ بعض امور میں خوب مارنا اور سخت جرمانہ کرنا بھی ضروری ہے اور یہ مار پیٹ ایسے امور میں زیادہ مناسب ہے جن کا ضرر متعدی جیسے زنا اور قتل اور حجاب رسمی سے بچنے کی بھی دو تدبیریں ہیں ایک یہ کہ ہر کار میں ذکر الٰہی کی رعایت کی جائے کبھی ان الفاظ سے جن کی محافظت کا حکم ہے اور کبھی ان حدود و قیود کی رعایت سے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں دوسری یہ کہ ہر قسم کی طاعت کو رسم بنادیا جائے اور اس کی محافظت کا نہایت اہتمام کیا جائے۔ خواہ دل مانے یا نہ مانے اس کے ترک پر ملامت کی جائے۔ اور اگر کبھی ترک ہوجائے تو اس کے بدلہ میں نفس کو جاہ و منزل وغیرہ سے باز رکھا جائے۔ پس ان تدبیروں سے رسم کی کدورتیں زائل ہوجاتی ہیں اور عبادت الٰہی میں نفس کو بڑی تائید حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ ہمہ تن زبان بن کر لوگوں کو حق کی ہدایت کرتا ہے سوا معرفت کی دونوں قسمیں (اشراک اور تشبیہ) دو وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو باوجودیکہ وہ صفات بشری سے پاک اور صاف محدثات و محسوسات سے بری ہے خوب اچھی طرح سے نہ پہچانے۔ اس کی تدبیر یہی ہے کہ لوگوں سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں جو ان کے اذہان میں نہ آسکیں۔

اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی موجود یا معدوم مجسم یا مجرد ایسا نہیں ہے جن کے ساتھ

انسان کے علم کا تعلق نہ ہو یا تو اس کی صورت کو اپنے سامنے پیش کر کے جان لیتا ہے یا کسی مشابہت اور قیاس سے جان لیتا ہے حتی کہ عدم مطلق اور مجہول مطلق کو بھی جان لیتا ہے۔ پس وہ وجود کے معنی سمجھ کر اور اس بات کا لحاظ کر کے کہ عدم وجود سے موصوف نہیں ہوتا عدم کے معنی کا علم حاصل کر لیتا ہے اور وہ جہل سے مشتق صیغۂ مفعول کے معنی سمجھتا ہے پھر مطلق کا مفہوم سمجھتا ہے، پھر ان امور کو باہم ملا کر ایسی صورت ترکیبی درست کر لیتا ہے جس سے امر بسیط کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے جس کا خیال میں لانا مقصود ہے اور نہ وہ خارج میں موجود ہے نہ ذہن میں، جس طرح انسان کسی مفہوم نظری کی طرف توجہ کرتا ہے اور اپنی سمجھ کے موافق اس کی جنس اور فصل کو سوچ کر ترکیب دیتا ہے اور ایسی صورت ترکیبی پیدا کر لیتا ہے جس سے وہ چیز معلوم ہو جاتی ہے جس کا تصور کرنا مقصود، ہم اسی طرح پر لوگوں کو بتانا چاہئے کہ اللہ موجود ہے، زندہ ہے لیکن اس کا وجود اور زندہ ہونا ہمارے وجود اور ہمارا سا زندہ ہونا نہیں ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کے لئے ایسی صفات کا قصد کرنا چاہئے جو موجود اشیا میں باعث خوبی اور تعریف ہیں اور تین مفہوموں کا لحاظ رکھنا چاہئے جن کو ہم مشاہدات میں دیکھتے ہیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں صفات مدح موجود ہیں اور صفات کے آثار بھی ان سے سرزد ہوتے ہیں اور بعض چیزوں میں نہ وہ صفات موجود ہیں اور نہ ان کی شان ہے کہ ان میں صفات پیدا ہوں۔ اور بعض چیزوں میں صفات موجود تو نہیں لیکن وہ قابل صفات ہیں جیسے زندہ جماد اور مردہ۔ پس اللہ تعالیٰ کے حق میں صفات کا ثبوت ان کے آثار کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اور اس تشبیہ کا تدارک اس طرح کر دیا جاتا ہے کہ وہ ہمارے مانند نہیں۔ دوسری وجہ نافہمی اور سوء معرفت کی ہے کہ محسوس صورتوں کا اپنے حسن ولذائذ کے ساتھ پیش نظر رہنا اور قوی عامیہ کا ان حسی صورتوں سے پر رہنا اور پھر دل کا ان کے تابع ہو جانا اور خدا کی جانب خالص توجہ نہ کرنا اس کی تدبیر یہ ہے کہ ریاضت شاقہ کی جائے اور ایسے اعمال کی پابندی کی جائے جن سے انسان میں تجلیات عالیہ کی استعداد پیدا ہو جائے اگرچہ اس کا ظہور عالم آخرت ہی میں ہو، اعتکاف کیا جائے اور بقدر امکان مشاغل کو دور کیا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر دار پردہ کو پارہ کر دیا تھا اور بیل بوٹے والی چادر کو اتار پھینکا تھا۔ واللہ اعلم۔

مبحث پنجم

نیکی اور بدی کا بیان

(مقدمہ نیکی اور بدی کی حقیقت کا بیان)

جب کہ ہم جزا اور سزا کے دلائل کو بیان کر چکے اور ان ارتفاقات کا ذکر کیا جن پر انسان کی جبلت ہے اور جو آدمیوں میں ہمیشہ پائی جاتی ہیں اور کبھی ان سے جدا نہیں ہوتیں۔ اس کے بعد ہم نے سعادت اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بیان کیا تو اب ہم نیکی اور بدی کے معنی کی تحقیق میں مشغول ہوتے ہیں پس نیکی وہ عمل ہے جس کو انسان ملأ اعلیٰ کی اطاعت بجالانے کے واسطے اور الہام الٰہی کے قبول کرنے میں ہمہ تن محو ہو کر اور مراد الٰہی میں فانی ہو کر کرتا ہے اور ہر وہ عمل ہے جس پر دنیا یا آخرت میں جزا خیر دی جائے اور ہر وہ عمل ہے جو انسان کی ان تدبیرات مناسبہ کے موافق ہو جن پر اس کا انتظام مبنی ہے اور ہر وہ عمل ہے جو حالت انقیاد پیدا کرے اور حجاب کو دور کرے اور بدی وہ عمل ہے جو شیطان کی تابعداری بجالانے کی وجہ سے اور اس کی مراد براری کی وجہ سے کیا جائے اور ہر وہ عمل ہے جس پر دنیا یا آخرت میں بری جزا دی جائے۔ اور ہر وہ عمل ہے جو تدابیر مناسبہ میں فساد پیدا کرے اور ہر وہ عمل ہے جو اطاعت کے مخالف ہیئت کو پیدا کرے اور حجاب کو مستحکم کرے اور جس طرح اہل عقل نے تدابیر حسیہ کو مستنبط کیا اور پھر لوگوں نے دلی شہادت سے ان کی پیروی کی اور تمام اہل زمین یا جو معتبر ہیں ان پر متفق ہو جائے اسی طرح نیکی کے بھی طریقے ہیں۔ جن کو خدائے تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں میں الہام کیا جو ملکی نور سے مؤید ہیں اور فطری حالت ان پر غالب ہے جیسے شہد کی مکھی کے دل میں ایسے امور کا الہام کیا جو اس کی معاش کی اصلاح کرنے والے ہیں سو وہ ان الہام امور پر چلے۔ ان کو مضبوطی سے پکڑا اور لوگوں کو ان کی

تعلیم فرمائی اور ترغیب دلائی پھر لوگوں نے ان کا اقتدا کیا اور تمام اہل مذاہب فطری مناسبت اور نوعی اقتضا کی وجہ سے ان کے اصول پر متفق ہو گئے۔ حالانکہ ان کے وطنوں میں بعد تھا اور ان کے مذاہب مختلف تھے اور اصول پر اتفاق کر لینے کے بعد ان طریقوں کی صورتوں کا اختلاف اس اتفاق کو مانع نہیں ہو سکتا اور نہ یہ بات مانع ہو سکتی ہے کہ ایک گروہ ان طریقوں پر نہیں چلتا جن کی حالت کو اہل بصیرت غور سے دیکھیں تو اس میں شک نہ کریں کہ اس گروہ کا مادہ صورت نوعیہ کے مخالف ہے اور صورت نوعیہ کے احکام قبول نہیں کر سکتا اور یہ لوگ عضو زائد کے مانند ہیں جس کا نہ رہنا اس کے رہنے سے بہتر اور زینت بخش ہے اور ان طریقوں کے شائع ہونے کے بڑے بڑے اسباب اور پختہ تدابیر ہیں جن کو ان لوگوں نے مستحکم کر دیا جو مؤیدین بالوحی ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں پس انھوں نے لوگوں پر اپنا احسان قائم کر دیا۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ان کے وہ اصول بتلائیں جن پر ممالک کی بڑی بڑی صالح جماعتیں اشراقین اور سلاطین اور صاحب الرائے حکما عرب اور عجم، یہود، ہنود اور مجوس سب متفق ہیں اور ہم ان اصول کے پیدا ہونے کی بھی شرح کریں گے جو قوت بہیمیہ کے قوت ملکیہ کی اطاعت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اور چند فوائد بھی بتلائیں گے جن کا بارہا ہم نے ذاتی تجربہ کیا ہے اور عقل سلیم نے بتلایا ہے۔ واللہ اعلم۔

پہلا باب: توحید کا بیان

سب نیکیوں کی اصل اور سب سے عمدہ توحید ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ رب العالمین کے لئے عاجزی وانکساری کرنا اسی پر موقوف ہے اور یہ عاجزی ہے سعادت کے تمام اسباب میں ایک بڑی چیز ہے یہ اس تدبیر علمی کی بنیاد ہے۔ جو دونوں تدبیروں میں زیادہ مفید ہے اور اسی کی وجہ سے آدمی کو غیب کی طرف کامل توجہ ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے نفس انسانی وجہ مقدس میں مل جانے کے قابل ہو جاتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عظمت پر تنبیہ کی ہے اور اس کو تمام اقسام نیکی میں بمنزلہ دل کے قرار دیا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ فاسد ہو جاتا ہے تو تمام بدن فاسد ہو جاتا ہے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص خدا کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ سمجھتا ہو اور وہ مر جائے تو خدائے تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا اس پر آگ حرام کر دے گا اور وہ جنت سے دور نہ رہے گا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ فرمائے اور آپ نے خدائے

تعالیٰ کی جانب سے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے ملے اور روئے زمین کے برابر اس کے گناہ ہوں تو میں اس کی اتنی ہی بخشش کروں گا بشرطیکہ وہ شرک نہ کرتا ہو۔

واضح ہو کہ توحید کے چار مرتبے ہیں پہلا یہ کہ صفت وجوب وجود کو باری تعالیٰ کے ساتھ خاص کر دے اور اس کے سوا کوئی واجب نہ ہو۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ عرش آسمان اور زمین میں تمام جوہروں کا خالق خدا تعالیٰ ہی کو سمجھے۔ یہ دونوں مرتبے ایسے ہیں جن سے کتب الٰہیہ میں بحث نہیں کی گئی اور نہ ہی مشرکین عرب یہود ونصاریٰ نے ان میں مخالفت کی ہے بلکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ دونوں مرتبے سب کے نزدیک مسلم ہیں تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا مدبر خدا تعالیٰ کو سمجھے۔ چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا عبادت کا مستحق نہیں ان دونوں مرتبوں میں قدرتی تعلق اور ربط ہے۔ اور ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

ان دونوں مرتبوں میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے ان میں تین فریق بڑے ہیں اوّل نجومی لوگ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ستارے عبادت کے مستحق ہیں اور ان کی پرستش سے دنیوی منفعت حاصل ہوتی ہے اور اپنی حاجتوں کو ان کے سامنے پیش کرنا بجا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس بات کی خوب تحقیق کر لی ہے کہ روزانہ حوادث میں انسان کی سعادت اور بدبختی میں اس کی تندرستی اور مرض میں ستاروں کا بڑا اثر اور دخل ہے ان کے نفوس مجردہ ہیں جو ان کی حرکت پر آمادہ رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے پجاریوں سے بے خبر نہیں پس ان لوگوں نے ان کے نام پر مورتیاں بنا کر پرستش کی دوسرا فرقہ مشرکین کا ہے وہ اہل اسلام سے اس بات میں تو متفق ہیں کہ تمام بڑے کاموں کی تدبیر خدا ہی کرتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہی کرتا ہے۔ اس میں کسی کو کچھ اختیار نہیں لیکن باقی امور میں مسلمانوں کے مخالف ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اچھے لوگ جو خدا کی خوب عبادت کرتے تھے اور بارگاہ الٰہی میں مقرب ہو گئے تھے۔ پس ان کو خدا تعالیٰ نے الوہیت عطا فرمائی جس کی وجہ سے وہ پرستش کے مستحق ہو گئے جیسے کوئی شخص کسی بادشاہ کی نہایت خدمت کرے جس کے صلہ میں بادشاہ اس کو کسی ملک کا خلعت عطا کرے اور اپنے کسی شہر کی حکومت سپرد کر دے پس وہ مستحق ہے کہ اس شہر کے لوگ اس کی خدمت اور اطاعت کریں اور اس کی بات سنیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت ان کی عبادت شامل کئے بغیر مقبول نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کا رتبہ نہایت بلند ہے پس اس کی عبادت

سے تقرب الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ ان لوگوں کی پرستش ضروری ہے تاکہ قرب الٰہی کے لئے ذریعہ بن جائیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ سنتے اور دیکھتے ہیں اور اپنے پجاریوں کی شفاعت کریں گے ان کے امور کی تدبیر کرتے ہیں۔ ان کی مدد اور نصرت کرتے ہیں۔ پس ان کے ناموں کے پتھر تراش لئے جب وہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان پتھروں کو اپنی توجہ کا قبلہ کرتے ہیں پھر ان مشرکین کے بعد اور لوگ پیدا ہوئے۔ انھوں نے ان پتھروں میں اور ان لوگوں میں جن کے لئے یہ پتھر تراشے گئے کوئی فرق نہیں کیا اور خود انہی پتھروں کو اصلی معبود قرار دے لیا اسی لئے خدا نے مشرکین کی رو میں کبھی اس طرح تنبیہ فرمائی کہ حکومت اور قدرت صرف خدا کا خاصہ ہے۔

اور کبھی بیان فرمایا یہ محض جمادات ہیں کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ہاتھ ہیں جن سے وہ کچھ پکڑ سکتے ہیں یا انکی آنکھیں ہیں جن سے دیکھ سکیں یا کان ہیں جن سے کچھ سن سکیں۔ تیسرا فرقہ نصاریٰ کا ہے وہ کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کو خدا سے خاص تقرب ہے اور تمام مخلوق سے ان کا مرتبہ بلند ہے اس لئے ان کو بندہ کہنا مناسب نہیں اور نہ وہ درجہ میں دوسروں کے برابر ہیں۔ اور یہ بات ان کی شان میں سوءِ ادبی ہے اور ان کے تقرب الٰہی کے لحاظ کو ترک کردینا ہے پھر بعض نصاریٰ نے اس خصوصیت کے اظہار کے لئے کہ باپ بیٹے پر رحم کرتا ہے اس کی تربیت اپنے سامنے کرتا ہے اور اس کا درجہ بندوں سے زیادہ ہے ان کا نام ابن اللہ رکھا اور بعض نے یہ سمجھ کر ان کا نام خدا نے رکھا تھا کہ خدا تعالیٰ نے ان میں حلول کیا تھا۔ اور اسی لئے ان سے ایسے کام سرزد ہوئے جو آج تک کسی بشر سے سرزد نہ ہوئے مثلاً مردوں کا زندہ کردینا پرندوں کو پیدا کرنا۔ پس عیسیٰ کا کلام بعینہ کلام الٰہی اور ان کی عبادت بالکل خدا کی عبادت ہے۔ ان کے بعد اور لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اس نام رکھنے کی وجہ کو نہ سمجھا اور وہ بیٹے کے لفظ سے اس کے حقیقی معنی ہی سمجھنے لگے یا ان کو من جمیع الوجوہ واجب الوجود سمجھنے لگے اسی واسطے خدا تعالیٰ نے ان کے اقوال کو کبھی اس طرح رد کیا کہ خدا تعالیٰ کی بیوی نہیں بیٹا کہاں سے ہوگیا۔ اور کبھی اس طرح تردید فرمائی کہ وہ آسمان وزمین کا پیدا کرنے والا ہے اس کے حکم کے ساتھ ہی ہر چیز موجود ہوجاتی ہے پھر اس کو بیٹا جتانے کی کیا ضرورت ہے ان تینوں فرقوں کے بڑے لمبے چوڑے دعوے ہیں ان میں بکثرت خرافات ہیں جو واقف لوگوں پر مخفی نہیں ہیں ان دونوں مرتبوں کو قرآن عظیم نے خوب بیان کیا ہے

اور کافروں کے شبہات کو خوب اچھی طرح رد کیا ہے۔

دوسرا باب: حقیقت شرک کا بیان

واضح ہو کہ عبادت نہایت درجہ عاجزی کا نام ہے اور کسی سے نہایت درجہ عاجزی کے ظاہر ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ یا صوری مثلاً ایک شخص کا کھڑا ہونا۔ ایک کا سجدہ کرنا، یا قصد اور نیت سے ہوتی ہے مثلاً سجدہ سے بندوں کی اپنے مولیٰ کے لئے تعظیم کرنا اور قیام سے رعیت کی بادشاہوں کے لئے۔ شاگردوں کی استاذ کے لئے تعظیم کرنا اور کوئی تیسری صورت تعظیم کی نہیں ہے۔ اور جب ثابت ہو چکا ہے کہ سجدہ سے فرشتوں نے حضرت آدم کی اور حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف کی تعظیم کی تھی حالانکہ سجدہ سے زیادہ اور تعظیم نہیں ہے تو ضروری ہو کہ نیت ہی سے فرق کیا جائے لیکن ابھی تک اس کی پوری تنقیح نہیں ہوئی کیونکہ مولیٰ کے لفظ کے کئی معنی مستعمل ہوتے ہیں اور یہاں ضرور معبود کے معنی مراد ہیں پس وہ عبادت کی تعریف میں ماخوذ ہے پس اس کی یوں تنقیح کی جائے گی کہ تذلل یہ چاہتا ہے کہ ذلیل میں ضعف اور قوی میں قوت کا لحاظ کیا جائے۔ ذلیل میں ذلت اور پستی اور دوسرے میں شرف اور رفعت کو ملحوظ رکھا جائے۔ ذلیل میں فرماں برداری اور اطاعت اور دوسرے میں نفاذ حکم اور تسخیر کا لحاظ رکھا جائے اور انسان جب مخلی بالطبع ہوتا ہے تو وہ ضرور یہ بات معلوم کر لیتا ہے کہ قوت، شرف اور تسخیر وغیرہ کے جن کو کمال کہتے ہیں، دو مرتبہ ہیں۔ ایک مرتبہ تو یہ ہے کہ انسان اس کو اپنی ذات میں اور اپنی مشابہ چیزوں میں پاتا ہے اور دوسرا مرتبہ ان چیزوں میں پایا جاتا ہے جو حدوث اور امکان کے داغ سے پاک ہیں یا جن میں ان پاک چیزوں کے بعض مخصوص اوصاف پائے جاتے ہیں پس علم غیب کے بھی دو مرتبے ہیں ایک وہ مرتبہ ہے جو غور و فکر اور مقدمات کے ترتیب دینے سے یا سرعت ذہن سے یا خواب سے یا الہام وغیرہ چیزوں سے جو بالکل اس کے مباین نہ ہوں، معلوم کیا جائے۔

دوسرا مرتبہ علم ذاتی ہے جو خاص عالم کی ذات کا مقتضی ہے۔ جس کو نہ وہ کسی دوسرے سے حاصل کرتا ہے اور نہ اس کو وہ استدلال سے حاصل کرتا ہے اور اسی طرح تدبیر یا تاثیر یا جس لفظ سے آپ تعبیر کریں، اس کے دو درجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ہاتھ، پاؤں و دیگر اعضا و قویٰ کو استعمال میں لایا جائے اور ... کیفیات حرارت و برودت وغیرہ سے اعانت لی جائے یا اس کے مشابہ

ان امور سے کام لیا جائے جن کی استعداد قریب یا بعید اس میں موجود ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ بغیر کیفیت جسمانیہ اور بغیر کسی امر کے استعمال کئے کسی چیز کو پیدا کر دیا جائے۔ اور اس قول الٰہی میں یہی مراد ہے کہ ''جس چیز کو خدا کرنا چاہتا ہے تو کن کہتے ہی کر دیتا ہے۔ اور اسی طرح عظمت، شرف اور قوت کے دو درجے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک وہ مرتبہ ہے جیسے بادشاہ کو رعیت پر اختیار کثرت اعوان اور زیادتی مال کے ہوتا ہے یا جیسے طاقت ور اور استاد کو ضعیف شاگرد پر ہوتا ہے۔ الغرض ایک قسم کی مشارکت اصل عظمت میں پائی جاتی ہے اور دوسرا درجہ عظمت کا وہ ہے کہ وہ صرف اس میں ہو جس کی رفعت و شان نہایت اعلیٰ درجہ کی ہو۔ اور آپ اس سرّ کی تفتیش میں بس نہ کریں جب تک اس بات کا یقین نہ کر لیں کہ جو شخص سلسلۂ ممکنات کو ایسے واجب کی طرف منتہی جانتا ہے جو کسی کا محتاج نہیں تو بالضرور ان صفات کو جن سے مدح کی جاتی ہے دو درجوں میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ درجہ جو شان خداوندی کے لائق ہو اور دوسرے وہ جو اپنی حالت اور شان کے مناسب ہے اور جبکہ وہ الفاظ جو دونوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں باہم معنی کے لحاظ سے قریب قریب تھے۔

پس بسا اوقات نصوص شرائع الٰہیہ غیر محمل پر محمول کئے جاتے ہیں اور اکثر اوقات انسان اپنے بعض افراد سے یا ملائکہ وغیرہ سے وہ اثر صادر ہوتے دیکھتا ہے جو اس کے ابنائے جنس سے نہایت مستبعد ہے اس لئے اس کی نظر میں اصل حالت مشتبہ ہو جاتی ہے تب اس کے لئے وہ قدسی مرتبہ اور تسخیر الٰہی ثابت کرتا ہے حالانکہ لوگ اس درجہ کے شناخت میں برابر نہیں۔ پس بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے انوار کی قوتوں کا احاطہ کر لیتے ہیں جن کے اثر تمام موالید پر غالب اور محیط ہوتے ہیں اور اس درجہ کو پہچان لیتے ہیں اور بعضوں کو اسے احاطہ کرنے کی طاقت نہیں ہوا کرتی۔ اور ہر انسان کو اس قدر تکلیف دی گئی ہے جتنی اس سے ممکن ہے۔ اس حکایت کے یہی معنی ہیں جس کو نبی علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ خدا نے اس شخص کو نجات دی تھی جس نے اپنے اہل کو حکم دیا تھا کہ مجھ کو جلا دینا اور میری راکھ کو ہوا میں اڑا دینا۔ اس کو خوف تھا کہ مبادا خدا مجھ کو پھر زندہ کرے اور مجھ پر قابو پالے۔ اس کو یہ یقین تھا کہ خدا میں بڑی قدرت ہے لیکن اس کو قدرت انہی چیزوں میں ہے جو کہ ممکن ہیں ممتنع چیزوں میں اس کو قدرت نہیں ہے وہ سمجھتا تھا کہ اس راکھ کا جمع کرنا محال

ہے۔ جس کا نصف حصہ آدمی دریا میں بہادے اور نصف ہوا میں اڑادے۔

پس اس خیال سے خدا کی ذات میں کچھ نقص نہیں ہوا جتنا اس کا علم تھا اتنا ہی ماخوذ ہوا اور کافروں میں اس کا شمار نہ ہوا۔ تو تشبیہ اور ستاروں اور نیک بندوں کے ساتھ شرک کرنا جن سے کشف وقبولیت دعا وغیرہ خلاف عادت امور ظاہر ہوتے ہیں لوگوں میں موروثی ہوگیا ہے اور جو نبی اپنی قوم میں بھیجا جاتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ شرک کی حقیقت سمجھائے اور دونوں درجوں کی حقیقت ممیّز کر کے دکھاوے اور مقدس درجہ کو خاص واجب تعالیٰ میں حصر کر دے اگر چہ دونوں درجوں کے الفاظ قریب المعنیٰ ہوں جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طبیب سے فرمایا تھا کہ تو صرف رفیق ہے طبیب درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے اور جیسے آپ نے فرمایا کہ سردار صرف خدا ہی ہے۔ ان حدیثوں میں طبیب اور سردار کے خاص معنی لئے ہیں اس کے بعد جب رسول اللہ کے حواری صحابہ اور حاملین دین کا زمانہ ختم ہوگیا اور ناخلف لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا اور خواہشوں کی پیروی کی اور مستعمل اور مشتبہ الفاظ کے بیجا معنی بنا لئے جیسے محبوبیت اور شفاعت کو خدا نے تمام شریعتوں میں بندگان خاص کیلئے ثابت کیا ہے لیکن لوگ اس کے بجا معنی مراد نہیں لیتے اور ایسے ہی خلاف عادت اور مکاشفات سے وہ لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ علم الٰہی اور غلبۂ الٰہی کی حالت اس شخص میں منتقل ہو آئی ہے۔ جو ایسے ایسے کام کرتا ہے حالانکہ یہ امور ناسوتی یا روحانی طاقتوں کا فیض ہیں جو تدبیر کے نزول کے لئے انسان کو آمادہ کر دیتی ہے اور درحقیقت ایجاد الٰہی نہیں ہیں اور نہ ہی خدا تعالیٰ کی خاص باتیں ہیں۔ اس مرض میں لوگ کئی طرح سے گرفتار ہوتے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی بزرگی کو بالکل بھول گئے اور صرف شرکا کی ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور اپنی حاجتوں کو انہی سے مانگتے ہیں اور خدا کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے اگر چہ یقینی دلیل سے خوب جانتے ہیں کہ سلسلۂ وجود خدا پر ہی ختم ہوتا ہے اور بعض لوگوں کا اعتقاد ہے کہ سردار اور مدبر تو خدا ہی ہے لیکن اپنے بعض بندوں کو بزرگی اور معبودیت کا خلعت پہنا دیتا ہے اور ان کو بعض امور کا اختیار دیتا ہے اور ان کی پرستش کرنے والوں کے حق میں ان کی سفارش قبول کرتا ہے جیسے کوئی شہنشاہ ہر ملک میں اپنی طرف سے اور بجز بڑے بڑے کاموں کے اس ملک کی پوری تدبیر اس کے سپرد کر دے پس ایسے شخص کے حق میں ان لوگوں کو بندگان خدا کہنے کی جرأت نہیں ہوتی

تا کہ کہیں وہ اوروں کے برابر نہ ہو جائیں۔ پس وہ اس کی بجائے ان کو ابن اللہ اور محبوب الٰہی کہتے ہیں اور اپنے نام میں ان کی عبودیت ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے عبد المسیح، عبد العزی۔ اور اس مرض میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عام ہیں۔ اور فی زمانہ اسلام میں بھی بعض ایسے غالی اور منافق موجود ہیں۔ اور جب کہ شریعت کی بنیاد اس پر ہے کہ ظن کی چیز کو بجائے اصل کے سمجھے اس لئے وہ محسوس امور جن میں شرک کا گمان تھا کفر شمار کئے گئے۔ جیسے بتوں کو سجدہ کرنا۔ ان کے لئے قربانی کرنا، اور ان کے نام کی قسم کھانا اور ایسے ہی اور امور۔ اوّل اوّل مجھ پر یہ علم اس طرح منکشف ہوا کہ میرے سامنے ایسی قوم پیش کی گئی جو ایک چھوٹی سی زہریلی مکھی کے لئے سجدہ کرتی تھی جو ہمیشہ اپنی دم اور ہاتھ پاؤں ہلاتی رہتی تھی تو میرے دل میں القا ہوا کہ کیا تو ان میں بھی شرک کی تاریکی پاتا ہے۔ اور ان کو ان کے گناہوں نے بھی اس طرح گھیر رکھا ہے جس طرح بت پرستوں کو؟ میں نے کہا نہیں کیونکہ انھوں نے مکھی کو اپنا قبلہ قرار دیا ہے اور ذلت کے درجہ کو عزت کے درجہ سے نہیں ملایا ہے تو آواز آئی کہ تجھے راز کی رہبری ہوگئی۔ پس اس دن سے میرا دل علم توحید سے بھر گیا اور اس میں مجھ کو بصیرت حاصل ہوگئی۔ اور توحید و شرک اور ان چیزوں کی حقیقت جن کو شرع نے توحید و شرک کا موقع قرار دیا ہے بخوبی مجھ کو معلوم ہوگئی اور تدبیر کے ساتھ عبادات کے تعلق کو میں خوب سمجھ گیا۔ واللہ اعلم۔

تیسرا باب: شرک کے اقسام کا بیان

شرک کی حقیقت یہ ہے کہ بعض بزرگوں کی نسبت کسی کا یہ اعتقاد ہو کہ عجیب عجیب اثر جو ان سے صادر ہوئے ہیں وہ محض ان صفات کی وجہ سے سرزد ہوئے ہیں جو انسان میں نہیں ہو سکتیں بلکہ صرف واجب تعالیٰ ہی میں پائی جا سکتی ہیں۔ دوسرے کسی شخص میں اس کا جب ہی امکان ہے کہ خدا تعالیٰ الوہیت کا خلعت اس کو پہنا دے یا اس کو فنا کر کے اپنی ذات میں ملا لے، یا ایسا ہی بیہودہ گمان کوئی اور ہو جس کا مشرکین اعتقاد کیا کرتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ مشرکین لبیک کہنے میں یہ الفاظ پڑھا کرتے تھے ہم حاضر ہیں ہم حضور میں ہیں تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ ہاں وہ شریک جس کا تو مالک ہے اور جس کی تمام ملکیت کا تو مالک ہے اسی لئے اس شخص معبود کے سامنے نہایت تذلل کیا جائے اور اس سے ویسا ہی معاملہ کیا جائے جیسا کہ بندۂ خدا کے ساتھ کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے معاملات کی مختلف صورتیں ہیں، شریعت انہی قوالب اور صورتوں سے بحث کرتی ہے جن کو انسان بہ نیت شرک عمل میں لاتا ہے یہاں تک کہ وہ عادتاً مشرک سمجھا گیا۔ جیسا کہ شریعت تمام ملل متلاز مہ اصلاح وفساد کو ان اصلاح وفساد کی جگہ قائم رکھتی ہے۔ اور ہم آپ کو وہ امور بتلاتے ہیں جن کو خدا نے شریعت محمدیہ میں علی صاحبہا السلام شرک کے مواقع سمجھ کر ان سے منع کر دیا ہے من جملہ ان کی یہ ہے کہ مشرکین اصنام اور ستاروں کو سجدہ کیا کرتے تھے اسی لئے شریعت نے غیر خدا کے سجدہ کو منع فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی ”چاند اور سورج کو سجدہ نہ کرو، بلکہ جس اللہ نے ان کو پیدا کیا اس کو سجدہ کرو“ اور سجدہ کرنے میں کسی کو شریک کرنا اس بات کو ضرور چاہتا ہے بلکہ لازم ہے کہ تدبیر الٰہی میں بھی اس کو شریک کرے گا جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور متکلمین کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ توحید عبادت احکام الٰہیہ میں سے ایک حکم ہے جو مذہبوں کے اختلاف سے مختلف ہوسکتا ہے اس کے لئے دلیل یقینی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر یہی بات ہوتی تو خدا تعالیٰ مشرکین کو الزام نہ دیتا کہ وہ پیدا کرنے اور تدبیر کرنے میں یگانہ ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور مقبول لوگوں پر سلام ہے، کیا خدا تعالیٰ بہتر ہے“ اخیر پانچ آیتوں تک۔ بلکہ حق یہ ہے کہ وہ یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ عبادت کا مدار انہیں دونوں باتوں پر ہے جیسا کہ ہم توحید کے معنی میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں پس اسی واسطے خدا تعالیٰ نے ان کو الزام دیا۔ وللہ الحجۃ البالغۃ

اور انہی امور شرکیہ میں سے یہ ہے کہ مشرکین اپنے اغراض کے لئے غیر خدا سے امداد طلب کیا کرتے تھے۔ بیماری شفا اور غریبوں کی تونگری کو ان طلب کرتے تھے اور ان کے نام کی نذریں مان کر اپنی حاجات اور مقاصد کے حاصل ہونے کے متوقع رہتے تھے اور ان کی برکات کی امید میں ان کے نام جپا کرتے تھے اسی واسطے خدا تعالیٰ نے لوگوں پر واجب کیا کہ یہ پڑھا کریں ”ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے یاوری کے خواہاں ہیں“۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”خدا تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کو مت پکارو“ اور یہاں دعا کے معنی عبادت کے نہیں ہیں جیسے بعض مفسروں کا قول ہے، بلکہ استعانت کے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے کہ ”خدا ہی سے مدد طلب کرو تا کہ وہ حاجت پوری ہو جائے جس میں تم مدد کے خواہاں ہو“ اور ان ہی امور شرکیہ میں

سے یہ ہے کہ مشرکین بعض شرکا الٰہی کو خدا کی بیٹیاں اور بعض کو بیٹے کہتے تھے پس اس سے سختی کے ساتھ منع کر دیا اور اس کا راز ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ اور نیز امور شرکیہ میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنے احبار اور رہبان کو خدا کے سوائے معبود اور مطاع سمجھتے تھے بایں معنی کہ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ جس چیز کو یہ حلال کہیں تو حلال ہے نفس الامر میں اس میں کوئی حرج نہیں اور جس کو وہ حرام کہیں وہ حرام ہے جو نفس الامر میں مواخذہ کے قابل ہے اور جب یہ آیت نازل ہوئی ''**اتخذوا احبارھم ورھبانھم الایۃ** ''(کافروں نے علما اور زاہدوں کو دوسرا خدا بنا رکھا ہے) تو عدی بن حاتمؓ نے نبی علیہ السلام سے اس کا مطلب پوچھا، آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جس چیز کو حلال کہہ دیتے تھے۔ یہ لوگ اس کو حلال سمجھتے تھے اور جس کو حرام کہہ دیتے تھے اس کو حرام جانتے تھے۔ اس کا راز یہ ہے کہ تحلیل اور تحریم کے معنی ملکوت میں ایک حکم نافذ کر دینا ہے کہ فلاں شئے پر مواخذہ ہے اور فلاں پر نہیں اور یہ کہہ دینا ہی مواخذہ اور عدم مواخذہ کا سبب ہوتا ہے اور یہ خدا کی صفات میں سے ہے لیکن وہ تحلیل وتحریم جس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت کا قول اس کی تحلیل وتحریم کے لئے علامت ہے اور اس تحلیل وتحریم کو مجتہدین امت کی طرف منسوب کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اشخاص اس حکم کو شارع سے روایت کرتے ہیں یا اس کے کلام سے استنباط کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ جب خدا تعالیٰ نے رسول بھیجے اور اس کی رسالت معجزات سے ثابت ہوگئی اور اس کی زبان سے بعض امور کا حلال وحرام ہونا معلوم ہوگیا پھر بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ ان کے مذہب میں یہ چیز حرام تھی اس سے باز رہیں اور دل میں کراہت کریں تو یہ توقف دو طرح کا ہوتا ہے اوّل یہ کہ اس شخص کو اس شریعت کے ثبوت ہی میں شک ہو، تو ایسا شخص نبی کا منکر ہے اور کافر ہے۔ دوم یہ کہ اس کو پہلی تحریم کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ وہ منسوخ ہونے کے قابل ہی نہیں ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے بندے کو الوہیت کا خلعت پہنا دیا تھا۔ اور وہ شخص فنا فی اللہ اور باقی باللہ ہوگیا پس کسی امر سے اس کا منع کرنا یا کسی امر کو اس کا مکروہ سمجھنا مال اور اہل میں باعث محرومی ہے پس ایسا شخص مشرک ہے وہ غصہ اور ناراض ہونے میں، حلال اور حرام کرنے میں دو مقدس ہستیوں کا اعتقاد کرتا ہے اور نیز امور شرکیہ میں سے یہ بھی ہے کہ وہ لوگ بتوں اور ستاروں سے تقرب، ان

کے لئے قربانیاں کر کے چاہا کرتے تھے، یا تو اس طرح سے کہ ذبح کے وقت ان کا نام لیتے تھے یا اپنے خاص ستاروں پر ذبیحہ کرتے تھے پس ایسا کرنے سے ان کو روکا گیا۔ نیز ان امور شرکیہ میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے شرکا کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ما جعل اللہ من بحیرۃ و لا سائبۃ الایۃ" (اللہ تعالیٰ نے نہ کان پھٹے کو مشروع کیا ہے اور نہ سانڈ) نیز انہی امور میں سے یہ ہے کہ وہ بعض لوگوں کے ناموں کو نہایت متبرک جانتے تھے اور یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کا نام لے کر جھوٹی قسم کھانے سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے اہم معاملات میں اپنے شرکا کے نام کی قسم کھایا کرتے تھے سو، اس سے ان کو منع کیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے غیر اللہ کے نام کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

بعض محدثین نے اس کو تہدید اور تغلیظ پر محمول کیا ہے اور میں محدثین کی اس تفسیر کا قائل نہیں ہوں بلکہ میرے نزدیک اس حلف سے مراد یمین منعقدہ اور یمین غموس ہے جو اس اعتقاد کی بنا پر ہو جس کا ہم نے ذکر کیا۔ نیز ان امور شرکیہ میں سے غیر اللہ کی زیارت کرنا ہے اور وہ اس طرح سے ہوتا تھا کہ بعض مواضع کو یہ سمجھتے تھے کہ وہ نہایت متبرک اور شرکا کے ساتھ مخصوص ہیں وہاں جانے سے ان کا تقرب نصیب ہوتا ہے۔ پس شریعت نے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین مقامات کے سوا اور کسی جگہ کے لئے سواریاں نہ کسیں۔ نیز ان امور شرکیہ میں سے یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام عبدالعزیٰ و عبدالشمس وغیرہ رکھتے تھے سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ ذات ایسی ہے جس نے تمہاری تخلیق نفس واحد سے کی اور اس کی جنس سے اس کی زوجہ کی تخلیق فرمائی تاکہ اس کو اس سے آرام ملے۔ فلما تغشها الایہ اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت حوا نے شیطان کے بہکانے پر اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا تھا اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ جن لوگوں کے نام عبدالعزیٰ اور عبدالشمس وغیرہ تھے آنحضرت نے ان کو بدل کر عبداللہ و عبدالرحمٰن وغیرہ رکھ دیئے تھے۔ یہ سب مذکورہ بالا امور شرک کے قالب تھے اس واسطے شارع نے ان سب سے لوگوں کو روک دیا۔ واللہ اعلم۔

چوتھا باب: خدا کی صفات پر ایمان لانے کا بیان

واضح ہو کہ نیکی کی تمام قسموں سے سب سے زیادہ پر عظمت قسم خدا تعالیٰ کی صفات پر ایمان

لانا، ان کے ساتھ خدا کے متصف ہونے کا اعتقاد کرنا ہے اس کی وجہ سے بندے اور خدا تعالیٰ میں تعلق کا دروازہ کھل جاتا ہے جس سے وہاں کی بزرگی اور کبریائی کے منکشف ہونے میں مدد ملتی ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ کسی عقلی یا حسی چیز پر اس کو قیاس کرسکیں یا اس میں صفات ایسے حلول کریں جیسے اپنے اپنے محل میں اعراض حلول کرتے ہیں، یا عام عقلیں ان کا اندازہ کرسکیں یا معمولی الفاظ ان کو ادا کرسکیں۔ لیکن لوگوں کے واسطے ان کی تعریف بھی ضروری ہے تاکہ حتی الامکان وہ اپنے کمال کو پورا کرسکیں اس لئے ضرور ہے کہ صفات سے نتیجے اور غایتیں مراد لی جائیں نہ کہ ان کی ابتدائی حالتیں، مثلاً رحمت کے معنی نعمتوں کا دینا مراد ہے نہ کہ دل کا میلان اور نرم ہونا۔ اور اسی طرح جمیع موجودات کو خدا تعالیٰ کا مسخر بیان کرنے میں ایسے الفاظ مستعار لئے جائیں جن کے معنی بادشاہ کا شہر کو مسخر کرنا ہے کیونکہ اس غرض کے لئے کوئی اور عبارت زیادہ خوش ادا نہیں ہے اور تشبیہات کا اس طرح استعمال ہو کہ ان کے اصلی معنی مراد نہ ہوں بلکہ ایسے معنی مقصود ہوں جو عرفاً اصلی معنی کے مناسب ہوں مثلاً ہاتھ کی کشائش سے فیاضی مراد ہو۔ اور ان تشبیہات میں یہ بھی ضروری ہے کہ مخاطبین کو نئی آلودگیوں کا خدا کی ذات میں ہونے کا صریح شبہ نہ ہو اور یہ حالت مخاطبین کی فہم پر مختلف ہوتی ہے اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ خدا سنتا ہے دیکھتا ہے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ وہ چکھتا ہے یا چھوتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ چند معانی جن کا ایک ہی اثر ہے، ان کے فیضان کو ایک ہی نام سے تعبیر کریں جیسے کہیں رزاق یا مصور، اور ان اوصاف کی خدا سے نفی کی جائے جو اس کی شان کے شایان نہ ہوں بالخصوص وہ اوصاف جن کو ظالمین نے خدا کے حق میں بیان کیا ہے۔ پس یوں کہیں گے کہ خدا کے کوئی فرزند نہیں اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔

تمام آسمانی مذاہب نے اتفاق کیا ہے کہ خدا کی صفات اس طرح بیان کی جائیں اور اس پر متفق ہیں کہ ان عبارات کو اسی طرح استعمال کرنا چاہئے اور معنی مستعمل سے زیادہ ان پر بحث نہیں کرنی چاہئے اور اسی حالت پر وہ قرون گزر گئے جن کے لئے حضرت نے خیر کی شہادت دی تھی (یعنی قرون ثلاثہ) پھر ان کے بعد اہل اسلام میں سے ایک گروہ بغیر نص اور دلیل قطعی کے ان کے

معانی کی تحقیق اور بحث کرنے لگا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مخلوق میں غور کرو خالق میں غور نہ کرو۔ اور آیت (وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی) کی تفسیر میں آنحضرت نے فرمایا کہ پروردگار کی ذات میں غور نہیں کیا جا سکتا اس کی صفات مخلوق اور نو پیدا نہیں ہیں اور ان میں غور کرنے کے معنی یہی ہیں کہ حق تعالیٰ ان سے کیوں کر متصف ہے۔ پس ان میں غور کرنا خالق میں غور کرنا ہے۔

امام ترمذی نے حدیث ''ید اللہ ملائی'' (خدا کا ہاتھ بھرا ہوا ہے) کے متعلق بیان کیا کہ ائمہ حدیث فرماتے ہیں کہ ہم اس پر اسی طرح سے ایمان رکھتے ہیں جس طرح یہ حدیث وارد ہے بغیر اس بات کے کہ کچھ اس کی تفسیر کریں یا اس میں وہم پیدا کریں، اکثر ائمہ کا یہی قول ہے، ان میں حضرت سفیان ثوریؒ، مالک ابن انس، ابن عیینہ اور عبداللہ بن مبارک ہیں، یہ سب کہتے ہیں کہ یہ امور روایت سے ثابت ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا کیونکر ہے اور دوسرے موقع پر ترمذی ہی نے کہا ہے کہ ان صفات کو جیسا کا تیسا رکھنا تشبیہ نہیں ہے البتہ تشبیہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس کی سماعت ہماری سماعت کے مانند ہے اور اس کی بینائی ہماری بینائی کے مانند ہے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کسی صحابی سے بہ سند صحیح اس بات کی تصریح منقول نہیں ہے کہ متشابہات میں تاویل کرنا ضروری ہے یا تاویل کرنا بالکل منع ہے۔ اور یہ امر محال ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے نبی کو ما انزل الیہ کی تبلیغ کا حکم دے اور یہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل فرمائے پھر متشابہات کے باب میں کچھ نہ فرمائے اور اس کی کچھ تمیز نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کی جانب کس امر کو منسوب کر سکتے ہیں اور کس کو منسوب نہیں کر سکتے حالانکہ آنحضرت نے تبلیغ کے بارے میں بڑی تاکید فرمائی ہے اور حکم دیا ہے کہ حاضر شخص غائب کو سب خبر دیدے حتیٰ کہ لوگوں نے آپ کے اقوال، افعال اور حالات کو اور ان امور کو جو آپ کے سامنے پیش آئے بخوبی نقل کر دیا۔ پس معلوم ہوا کہ سب مسلمانوں کا اتفاق رہا کہ جو خدا کی ان متشابہات سے مراد ہے اسی پر ایمان رکھنا چاہئے۔ مخلوقات کی مشابہات سے خدا تعالیٰ نے اس طرح تنزیہ ذکر کر دی ہے کہ ''اس کی مثل کوئی نہیں ہے'' جس شخص نے ان کے بعد اس قول کی مخالفت کی تو اس نے ان کے

طریقہ کی مخالفت کی۔ انتہیٰ

میں کہتا ہوں کہ سمع اور بصر، قدرت اور ضحک، کلام اور استوا میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اہل زبان کی نظر میں ان تمام اوصاف سے وہی معنی مفہوم ہوتے ہیں جو خدا کی بارگاہ قدس کے لائق نہیں ہیں ضحک کو اسی لئے محال کہتے ہیں کہ اس کے لئے منہ چاہئے۔ اور اسی طرح سے صفت کلام ہے۔ اور بطش اور نزول میں بھی یہی استحالہ ہے کہ وہ ہاتھ اور پاؤں چاہتے ہیں اور اسی طرح سمع اور بصر، کان اور آنکھ چاہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ان غور و خوض کرنے والوں نے اہل حدیث پر بڑی زبان درازی کی ہے کہ ان کا نام مشبہ اور مجسمہ رکھا ہے مجھ پر خوب ظاہر ہو گیا ہے کہ ان کی زبان درازی محض بے معنی ہے عقلاً اور نقلاً یہی لوگ غلطی پر ہیں اور ائمہ ہدایت کی نسبت ان کا طعن بیجا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ متشابہات میں دو مقام ہیں ایک یہ کہ خدا تعالیٰ ان صفات کے ساتھ کس طرح متصف ہے آیا یہ صفات ذات خداوندی پر زاید ہیں یا اس کی عین ذات ہیں۔ اور سمع، بصر اور کلام وغیرہ کی حقیقت کیا ہے۔ بادی الرائے میں جو معنی ان الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں وہ خدا کی شان کے مناسب نہیں ہیں اس مقام کے متعلق حق بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کچھ نہیں فرمایا بلکہ اس میں بحث و گفتگو کرنے سے اپنی امت کو روک دیا ہے اس لئے کسی کی تاب نہیں ہے کہ جس چیز کو آپ نے منع فرمادیا ہے اس کا اقدام کرے اور دوسرا مقام یہ ہے کہ ایسی صفات کونسی ہیں جن سے خدا تعالیٰ کو متصف ماننا شرعاً جائز ہے اور کن کن صفات کا اطلاق خدا کے لئے ناجائز ہے اس کے متعلق حق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات اور اسماء توفیقی ہیں بایں معنی کہ ہم اگرچہ ان قواعد کو جانتے ہیں جن کو شرع نے صفات الٰہی کے بیان کرنے کے لئے معیار قرار دیا ہے جیسا کہ ہم شروع باب میں لکھ چکے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو اگر صفاتیہ میں غور و خوض کرنے کی اجازت دے دی جائے تو خود بھی گمراہ ہو جائیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کر دیں۔ اور بہت ہی ایسی صفات ہیں جن کے ساتھ خدا کو موصوف کرنا اصل میں جائز ہے لیکن کفار کے بعض فرقوں نے ان کا بے جا استعمال کیا ہے اور استعمال ہو گیا اس لئے اس فساد کے دور کرنے کو شرع نے ان صفات کے استعمال سے منع کر دیا ہے۔ اور بہت سی صفات ایسی ہیں جن کو ظاہری معنی میں استعمال کرنے سے

خلاف مقصود کا وہم ہوتا ہے اس واسطے ان صفات کے استعمال سے بھی احتراز ضروری ہوا پس ان مصلحتوں سے شرع نے اسماوصفات کو توقیفی قرار دیا اور کسی کے لئے اپنی رائے سے ان میں خوض کرنے کو مباح نہ رکھا۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ ضحک، فرحت، شادمانی، غضب اور رضا کا استعمال کرنا خدا کی شان میں جائز ہے اور گریہ، خوف وغیرہ کا استعمال درست نہیں ہے اگرچہ ان دونوں قسموں کا ماخذ قریب قریب ہے۔ اور یہ مسئلہ جس کی ہم نے تحقیق کی، عقل اور نقل سے ثابت ہے اس کے آگے اور پیچھے سے باطل کا گزر نہیں ہے لوگوں کے اقوال اور مذاہب کے زیادہ ابطال کا موقع اور ہے۔ اب ہم ان الفاظ متشابہ کی تفسیر اور دوسرے معانی سے کرتے ہیں جو بہ نسبت ان علما کے معنی کے زیادہ قریب الفہم اور مناسب ہیں، تاکہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ جو معنی انھوں نے ذکر کیے ہیں ابھی تک بالکل متعین نہیں ہوئے ہیں اور دلیل عقل میں نظر کرنے والا انہی معنی کی طرف مجبور نہیں ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے کچھ ان کو ترجیح اور فضیلت بھی نہیں ہے، نہ ان کے لئے یہ حکم ہے کہ یہی اقوال مراد الٰہی کے موافق ہیں نہ ان کے اعتقاد پر اجماع واتفاق ہو گیا ہے۔ یہ بات ابھی بہت دور ہے اس لئے ہم کہتے ہیں، مثلاً تمہارے سامنے تین قسم کی چیزیں ہیں، زندہ، مردہ اور پتھر، زندہ کو خدا کے ساتھ عالم اور موثر ہونے میں بہت مشابہت ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم خدا کا نام حی رکھیں۔ اور جبکہ علم ہمارے نزدیک انکشاف کا نام ہے اور خدا تعالیٰ پر تمام اشیا منکشف ہیں۔ پہلے وہ سب اس کی ذات میں مندرج تھیں اس کے بعد ان کا وجود تفصیلی ہوا تو ضرور ہم اس کو علیم کہہ سکتے ہیں۔ اور جبکہ بینائی اور شنوائی سے نظر آنے والی اور سنی گئی چیزوں کا پورا انکشاف ہوتا ہے اور خدا کو یہ انکشاف نہایت کامل درجہ کا ہے تو ضرور ہم اس کو سمیع اور علیم کہیں گے اور جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے ارادہ کیا تو ہم اس کے یہی معنی مراد لیتے ہیں کہ وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا قصد کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے افعال کسی شرط کے پیدا ہونے سے، یا عالم میں استعداد کی وجہ سے کرتا ہے۔ پس جو چیزیں پہلے ضروری نہ تھیں، شرط اور استعداد ان کو ضروری کر دیتی ہے اور بعض جگہ میں اس کے اذن اور حکم سے اجماع پایا جاتا ہے حالانکہ پہلے سے وہ اتفاق نہیں ہوا کرتا اس وجہ سے خدا تعالیٰ کو مرید کہا جاتا ہے اور نیز جب اس کا ایک ارادۂ ازلیہ جس

کی تفسیر اقتضا ذات کے ساتھ کرتے ہیں ایک مرتبہ تمام عالم کے ساتھ متعلق ہو چکا اور پھر یوما بعد یوم نئی نئی چیزیں پیدا ہوتی رہیں تو ہر حادث کی طرف یہ نسبت کرنا صحیح ہو گیا کہ ہر حادث علیحدہ پیدا ہوا ہے اور کہا گیا کہ خدا نے ایسا ارادہ کیا اور ایسا ارادہ کیا۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص قادر ہے تو ہم اس کے یہی معنی مراد لیتے ہیں کہ اس کے لئے وہ فعل ممکن ہو گیا ہے اور کوئی خارجی سبب اس کو نہیں روک سکتا اور دو مقدور چیزوں میں سے اگر قادر ایک ہی کو اختیار کر لے تو اس سے نفی قدرت نہیں ہو سکتی۔ اور رحمٰن ہر چیز پر قادر ہے وہ محض اپنی عنایت اور اقتضا ذاتی سے بعض افعال کو اختیار کرتا ہے اور ان کے مخالف امروں کو ترک کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام قادر ہے اور جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے کلام کیا تو ہم اس کے یہی معنی مراد لیتے ہیں کہ اس نے اپنے معانی مقصودہ ان الفاظ سے ادا کر دیئے جن سے وہ معانی معلوم ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ اپنے بندے کو علمی فیض پہنچاتا ہے اور ان کے ساتھ ہی الفاظ کا بھی افاضہ کرتا ہے جن کی صورت اس بندہ کے خیال میں منعقد ہو جاتی ہے وہی الفاظ ان معانی پر دلالت کرتے ہیں اسی کی وجہ سے تعلیم خوب صاف اور صریح ہوتی ہے اس وجہ سے خدا کو متکلم کہتے ہیں، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''آدمی کا مرتبہ نہیں ہے کہ خدا اس سے ہم کلام ہو، ہاں وحی ہے یا پردہ کی آڑ میں وہ کلام کرتا ہے یا کسی پیغمبر کو بھیج دیتا ہے وہ خدا کی اجازت سے جو چاہتا ہے وحی کرتا ہے، بیشک خدا بڑا اور حکمت والا ہے''۔ پس وحی دل میں القا ہونے کا نام ہے خواہ خواب میں خواہ اس طرح سے کہ غیب کی طرف توجہ کرنے کے بعد خدا علم بدیہی پیدا کر دے اور پردہ کی آڑ کے معنی یہ ہیں کہ خارج سے کلام منظوم سنائی دے اور اس کا قائل نظر نہ آئے، یا رسول کو بھیجے اور اس کے سامنے فرشتہ متشکل ہو کر نظر آئے اور کبھی توجہ غیب اور ضعف حواس کے وقت ایک آواز جرس کی سی سنائی دیا کرتی ہے جیسا کہ غشی ارض ہوتے وقت سرخ و سیاہ رنگ دکھائی دیا کرتے ہیں۔

اور جبکہ حظیرہ القدس میں یہ مطلوب ہے کہ لوگوں میں نظام قائم کیا جائے اگر ان کی طبائع اس نظام کے موافق ہوتی ہیں تو وہ ملأ اعلیٰ میں شامل ہو کر تاریکیوں سے نور الٰہی میں آ جاتے ہیں ان کو نفسانی بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتوں اور لوگوں پر الہام ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ نیکی سے پیش آئیں اور اگر ان کی طبائع اس نظام کے مخالف ہوتی ہیں تو ملأ اعلیٰ سے ان کی علیحدگی ہو جاتی

ہے اور ملأ اعلیٰ کی بیزاری سے ان پر مصیبت ہوتی ہے اور جیسا پہلے ذکر ہوا ہے کہ ان کو تکالیف وعذاب ہوتا ہے اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ خدا خوشنود ہے شکر کی جزا دیتا ہے یا خدا ناخوش ہوا، اس کی لعنت ہوتی اور ان سب کا مرجع مقتضی مصلحت کے موافق عالم کا چلنا ہے اور جبکہ من جملہ نظام عالم کے اس امر کا پیدا کرنا بھی ہے جس کی بندہ دعا کرتا ہے تو اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ خدا نے دعا قبول کر لی اور جبکہ ہمارے استعمال میں رویۃ نظر آنے والی چیز کے پورے طور پر منکشف ہونے کا نام ہے اور لوگ جب آخرت میں ان چیزوں کے پاس پہنچیں گے جن کا وعدہ کیا گیا ہے ان کو تجلی حاصل ہوگی جو عالم مثال کے وسط میں قائم ہے تمام لوگ اس وقت خدا کو آنکھ سے دیکھیں گے پس کہہ سکتے ہیں کہ مومن اس کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

پانچواں باب: تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

تقدیر پر ایمان لانا بڑی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہے اور وہ اس طرح سے کہ مسلمان اس پر ایمان لانے کی وجہ سے اس تدبیر کو نظر میں رکھتا ہے جو تمام عالم کے سمیٹے ہوئے ہے۔ جو شخص اس پر ٹھیک ٹھیک اعتقاد رکھتا ہے تو وہ ان چیزوں پر نظر رکھتا ہے جو خدا کے قبضے میں ہیں اور دنیا و مافیہا کو اس کے عکس کی طرح سمجھتا ہے اور قضا الٰہی کی وجہ سے بندوں کے اختیارات کو ایسا سمجھتا ہے جیسے آئینہ میں صورت کا عکس ہوتا ہے اور اس سے یہاں کی تدبیر وحدانی کے انکشاف میں بڑی مدد پہنچتی ہے اگرچہ کامل انکشاف عالم معاد ہی میں ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عظمت پر لوگوں کو تنبیہ فرما دی جبکہ یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص نیکی و بدی کی تقدیر پر ایمان نہ لائے تو میں اس سے جدا ہوں اور نیز آپ نے فرمایا کہ آدمی مومن نہیں ہوتا جب تک کہ نیکی اور برائی کی تقدیر پر ایمان نہیں لاتا اور جب تک کہ اس کا یقین نہیں کرتا کہ جو اس کو پیش آنا ہے وہ ٹلنے والا نہیں اور جو نہیں پیش آنا ہے وہ ہرگز پیش نہیں آنے گا۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ذاتی ہر اس چیز کو محیط ہے جو پیدا ہو چکی یا جو پیدا ہوگی اور یہ محال ہے کہ کسی چیز کی اس کو خبر نہ ہو یا کوئی ایسی چیز پیدا ہو جائے جس کو وہ نہ جانتا ہو۔ اگر ایسا ہو تو وہ جہل ہوگا علم نہ ہوگا یہ مسئلہ شمول علم کا ہے قدر کا مسئلہ نہیں ہے اس میں کسی اسلامی فرقہ نے مخالفت

نہیں کی ہے اور یہ تقدیر جس کا حال احادیث مذکورہ سے معلوم ہوا ہے، جس پر سلف صالحین کا اعتقاد رہا اور جس کے سمجھنے کی محققین ہی کو توفیق عطا ہوئی۔ جس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وہ مکلّف کرنے کے مخالف ہے اور جب یہ حالت ہے تو عمل کی کیا ضرورت ہے، تقدیر ملزم کہلاتی ہے جو حوادثات کے وجود کو ان کے موجود ہونے سے پہلے ضروری قرار دیتی ہے پس اس کے لازم کرنے کی وجہ سے وہ شئے موجود ہوتی ہے جس سے نہ انسان بھاگ سکتا ہے اور نہ کوئی تدبیر اس کو روک سکتی ہے اور یہ تقدیر پانچ مرتبہ واقع ہوئی ہے۔ اوّل یہ کہ خدا تعالیٰ نے ازل میں ارادہ کر لیا تھا کہ عالم کو عمدہ طور سے پیدا کرے گا جس میں سب مصلحتوں کی رعایت ہوگی اور موجود ہونے کے وقت اضافی خوبیوں میں وہ موثر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جملہ صورتوں میں سے ہر ایک صورت کو اپنے علم میں اس طرح سے متعین کر لیا تھا کہ کوئی دوسری صورت اس میں شریک نہ ہو سکے پس حوادثات کا سلسلہ اس طرح سے مرتب تھا اور ان کا وجود اس طرح سے یکجا تھا کہ ان کے مصداق میں کثرت نہ تھی۔ پس خدا تعالیٰ کا جس پر کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ ارادہ کرنا کہ عالم کو موجود کرے بعینہ عالم کے وجود کی صورت کو نہایت الامر تک خاص کر دیتا ہے۔

دوم یہ کہ اس نے ہر چیز کا اندازہ کیا۔ اور یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے مقداروں کو آسمان و زمین کے پیدا ہونے سے پچاس ہزار برس پیشتر لکھ لیا تھا یہ اس طرح ہوا کہ اس نے عرش کے وجود میں عنایت ازلیہ کے موافق تمام مخلوقات کو پیدا کیا پس اس جگہ تمام صورتیں بنائیں جس کو شریعت میں ذکر کہتے ہیں۔ مثلاً اس نے وہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت موجود کی۔ وہ مقرر کر دیا کہ فلاں وقت میں لوگوں کی طرف مبعوث ہوں گے، لوگوں کو احکام الٰہیہ پر مطلع کریں گے۔ ابولہب ان کا انکار کرے گا دنیا میں خطا اور گناہ اس کے دل کو احاطہ کرے گا اور آخرت میں آتش دوزخ سے اس پر عذاب ہوگا۔ پس یہ صورت ازلیہ یہاں اس کے موافق حوادث پیدا ہونے کا سبب ہے جس طرح ہمارے خیال میں دیواروں پر رکھی ہوئی لکڑی پر سے گرنے کی صورت پاؤں پھسلنے کا سبب ہے اور اگر وہ لکڑی زمین پر ہوتی تو کبھی پاؤں نہ پھسلتا۔

سوم یہ کہ اس نے جب آدم کو اس لئے پیدا کیا کہ ابوالبشر بنائے اور نوع انسانی کو اس سے ظاہر فرمائے تو اس نے ان کی اولاد کی صورتیں عالم مثال میں پیدا کر دیں اور ان کی سعادت

شقاوت کونور یا تاریکی کی شکل میں ظاہر کیا اوران کو مکلّف ہونے کے قابل بنایا۔ ان میں اپنی عبادت اور معرفت کا مادہ پیدا کیا اوراس عہد کی اصل جو بنی آدم کی فطرت میں مخفی رکھا گیا ہے یہی ہے اسی وجہ سے مواخذہ ہے اگر چہ وہ واقعہ ان کو یاد نہ رہا ہواس لئے جونفوس اب زمین پر مخلوق ہیں یہ اس دن کی صور موجودہ کا عکس ہیں۔ پس ان میں وہ چیزیں مخفی ہیں جو اس روز ان میں مخفی رکھی جا چکی ہیں۔

چہارم یہ کہ جن جنین میں روح ڈالی جاتی ہے اور جس طرح سے تخم کو وقت مخصوص پر زمین میں ڈالتے ہیں اوراس کے ساتھ تدابیر مخصوصہ عمل میں لائی جاتی ہے تو جو شخص درخت کے نوع کی خاصیت اوراس زمین پانی اور ہوا کی خاصیت پر مطلع ہے وہ جانتا ہے کہ یہ کیسا عمدہ درخت اُگے گا اور وہ اس کے بعض بعض حالات کا پتہ لگالیتا ہے تو اسی طرح سے ملائکہ مدبرین کو اس روز اس کی عمر، رزق اور عمل کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے عمل کرے گا جن میں ملکیت کا غلبہ ہوگا یا ایسے عمل کرے گا جن میں بہیمیت کا غلبہ ہوگا اوراس کی سعادت اور شقاوت کے سب ڈھنگ ان کو معلوم ہو جاتے ہیں۔

پنجم یہ کہ کسی حادثہ کے پیدا ہونے سے پہلے حکم حظیرہ قدس سے زمین کی طرف آ کر شئے مثالی میں منتقل ہو جاتا ہے۔ پس اس کے احکام زمین میں پھیل جاتے ہیں اور میں نے بار ہا اس کا مشاہدہ کیا ہے [illegible] ان میں سے یہ ہے کہ ایک مرتبہ چند آدمی باہم جھگڑے اوران میں رنجش پیدا ہوگئی پس میں نے خدا [illegible] طرف رجوع کیا تو مجھ کو ایک نقطہ مثالیہ نورانیہ حظیرۂ قدس سے زمین پر اترتا دکھائی دیا پس وہ آہستہ آہستہ پھیلنے لگا اور جس [illegible] پھیلتا جاتا تھا اسی قدر ان کا رنج وکینہ دور ہوتا جاتا تھا۔ ابھی ہم مجلس ہی میں تھے کہ ہر شخص [illegible] ے پر مہربانی کرنے لگا اور الفت اور محبت کی طرف آ گیا جیسا پہلے تھا یہ بات میرے نزدیک خدا [illegible] عجیب نشانیوں میں سے تھی۔

ایسے ہی میری بعض اولاد بیمار تھی اور میرا دل اس کی طرف لگا ہوا تھا بس ایک بار میں ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی موت کو میں نے نازل ہوتے ہوئے [illegible] ا پس اس کا اسی رات میں انتقال ہو گیا۔ اور حدیث نے یہ بات خوب واضح کردی ہے کہ خدا تعالیٰ حوادث کو زمین پر پیدا ہونے سے پہلے پیدا کرتا ہے اس کے بعد اس عالم میں اسی طرح پیدا ہو کر ظاہر ہوتے ہیں جس

طرح عالم مثال میں پیدا ہو چکے تھے، خدا کا قانون ایسا ہی ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس وجود کے اعتبار سے جو چیزیں وہاں موجود ہو چکی تھیں وہ مٹ جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''خدا جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے'' مثلاً خدا تعالیٰ کسی بلا کو پیدا کرتا ہے وہ مصیبت زدہ پر نازل ہونے کو ہوتی ہے کہ دعا اوپر کو چڑھتی ہے اور اس کو روک لیتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ یہ نازل ہونے والی شئے اسباب عادیہ میں سے ایک ایسا ہی سبب ہے جیسے بقائے زندگی کے لئے کھانا اور پینا اور موت کے لئے زہر کھالینا یا تلوار مارنا۔ اکثر احادیث سے معلوم ہو گیا ہے کہ ایک عالم ایسا ہے جس میں تمام قائم بالغیر چیزیں مجسم ہوتی ہیں اور معانی اس میں منتقل ہوتے ہیں اور زمین پر پیدا ہونے سے پہلے یہاں ہر شئے پیدا ہوتی ہے جیسے رحم کا عرش سے متعلق ہونا اور بارش کے قطروں کی طرح فتنے نازل ہونا، نیل اور فرات کا سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکلنا، پھر ان کا زمین پر اتارنا، لوہے اور انعام کا نازل کرنا، مجموعہ قرآن کا آسمان دنیا کی طرف نازل کرنا، آنحضرت اور دیوار مسجد کے بیچ میں جنت اور دوزخ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح ہو جانا کہ خوشہ انگور کو توڑ سکیں اور دوزخ کی حرارت کو محسوس کر سکیں۔ بلا اور دعا کا باہم لڑنا ذریت آدم اور عقل کا پیدا کرنا، پھر عقل کا آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا، سورۂ بقرہ اور آل عمران کا پرندوں کی دو صفوں کی صورت میں ظاہر ہونا، اعمال کا وزن ہونا جنت کا ناگوار چیزوں سے اور دوزخ کا خواہشات سے بھرا ہوا ہونا اور ان کے مثل بہت سی چیزیں ہیں جو ادنیٰ ماہر حدیث پر مخفی نہیں۔

واضح ہو کہ تقدیر عالم اسباب کو مزاحم نہیں (یعنی سبب کی سببیت میں کچھ خلل انداز نہیں) کیونکہ اس کا تعلق اس سلسلہ سے ہے جو مجموعی طور پر ایک ہی مرتبہ مرتب ہو گیا ہے اور آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول کے یہی معنی ہیں جبکہ کسی شخص نے پوچھا تھا کہ منتر، دوا اور پرہیز کیا قضا الٰہی سے بچا سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا یہ چیزیں بھی تقدیر الٰہی سے ہیں اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے بھی یہی معنی ہیں جو انھوں نے سرغ (ایک گاؤں کا نام ہے) کے قصہ میں فرمایا تھا'' کیا یہ بات نہیں ہے کہ اگر تم ناقہ کو شاداب جگہ میں چراتے تو تقدیر الٰہی سے ہی چراتے'' بندوں کے اپنے افعال کا اختیار ہے لیکن اس اختیار میں ان کا کچھ اختیار نہیں کہ مطلوب کی صورت اور اس کا نفع دل

میں آنے اور اس کی طرف عزم کرنے سے یہ اختیار پیدا ہوتا ہے جن کی بندہ کو کچھ خبر بھی نہیں ہوتی چہ جائیکہ اختیار ہو۔ آنحضرت کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ بنی آدم کے دل خدا کی دو انگلیوں میں ہیں جس طرح چاہتا ہے ان کو پھیر دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: اس بات پر ایمان لانا کہ خدا کی عبادت کرنا بندوں پر اللہ کا حق ہے کیونکہ وہ ان کو نعمت اور جزا بالارادہ دیتا ہے

واضح ہو کہ نیکیوں کے تمام اقسام میں بڑی نیکیوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ انسان خالص دل سے اس طرح یقینی اعتقاد کرے کہ دوسرے کسی خلاف اعتقاد کا اس میں احتمال بھی نہ ہو کہ عبادت کرنا بندوں پر خدا تعالیٰ کا حق ہے اور خدا کی طرف سے ان سے عبادت کے بارے میں اس طرح سے مطالبہ کیا جائے گا جس طرح اور اہل حق اپنے حقداروں سے مطالبہ کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ سے فرمایا تھا کہ اے معاذؓ تم جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر اور بندوں کا اللہ پر کیا حق؟ حضرت معاذ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے، آپ نے فرمایا اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ خالص اسی کی عبادت کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق خدا پر یہ ہے کہ جو شریک نہ کرتا ہو، اللہ تعالیٰ اس کو عذاب نہ دے، اس لئے کہ جس شخص کا اس امر پر کہ عبادت خدا کا حق ہے، یقینی اعتقاد نہ ہوگا اور یہ خیال کرے گا کہ انسان بیکار اور مہمل ہے اس سے نہ عبادت مطلوب ہے نہ پروردگار مرید و مختار کی طرف سے عبادت کا اس سے کچھ مواخذہ ہے تو وہ شخص دہریہ ہوگا اس کی عبادت دل سے نہ ہوگی گو اعضاء ظاہری سے عبادت بھی کرے اور نہ اس کے لئے خدا تک رسائی کا دروازہ کھلے گا اور اس کی یہ عبادت بھی دیگر عادات کی طرح ہوگی اس میں اصل امر یہ ہے کہ انبیا اور ان کے وارثین کے معارف میں (صلوات اللہ علیہم والتسلیمات) یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ عالم جبروت کے موقعوں میں ایک ایسا موقع ہے جہاں قصد و ارادہ قرار پاتا ہے یعنی کسی کام کے کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس موقع کے لحاظ سے اس کام کا کرنا یا اس کو ترک کر دینا دونوں صحیح ہوتے ہیں اگرچہ مصلحت فوقانی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے سوائے اس کے کہ یا اس کا کرنا ضروری ہوگا۔ یا نہ کرنا ضروری ہوگا اس اعتبار سے وہاں کوئی حالت منتظرہ نہیں ہوتی ان لوگوں کا کچھ اعتبار نہیں ہے جن کو حکما کہتے ہیں کہ ارادہ میں کسی شئے کے ہونے یا نہ ہونے

کا فیصلہ ہوا کرتا ہے ایسے لوگوں نے بعض چیزیں محفوظ رکھیں اور بہت سی چیزیں ان کی نظر سے غائب رہیں وہ جبروت کے اس موقع کے مشاہدہ کرنے سے محجوب ہیں اور آفاقی و انفسی دلائل ان پر قائم ہو سکتے ہیں ان کے محجوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اس مقام کی رہبری نہیں ہوئی جو تجلی اعظم اور ملاء اعلیٰ کے بین بین ہے اس مقام کی حالت ایسی ہے جیسے شعاع کی جو جوہر میں قائم ہوتی ہے وللہ المثل الاعلیٰ۔

اس مقام میں کسی امر کے ہونے کی صورت قرار پا جاتی ہے جس کے تقرر کے باعث ملاء اعلیٰ کے علوم اور ان کے حالات ہوتے ہیں۔ لیکن اس شئے کا کرنا یا نہ کرنا امر اختیاری ہوتا ہے۔ اور ان حکما کے مقابلہ میں دلیل اس طرح پر قائم ہو سکتی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص بالبداہۃ یہ جانتا ہے کہ وہ مثلاً ہاتھ بڑھا کر قلم لیتا ہے اور وہ شخص ایک شئے کا قصد کرنے والا ہی ہوتا ہے اس قصد کے اعتبار سے اس شئے کا کرنا نہ کرنا یکساں ہوتا ہے اور اس قوت کے لحاظ سے جو اس شخص کے نفس میں ہے۔ فعل یا ترک فعل میں ترجیح نہیں ہوتی اگرچہ مصلحت بالا کے اعتبار سے ہر چیز یا واجب الفعل ہے یا واجب الترک ہے۔ یہی حالت ان سب امور کی سمجھ لینی چاہئے کہ خاص خاص استعدادیں ان کی باعث ہوا کرتی ہیں پس خالق صور کی جانب سے مادوں پر ان صورتوں کا نزول ہوتا ہے جن کے لئے مادے قابل اور مستعد ہوتے ہیں جیسے دعا کے بعد قبولیت مرتب ہوتی ہے کہ اس جدید شئے کے پیدا ہونے میں دعا کو ایک قسم کا دخل ہے شاید آپ یہ کہیں گے کہ یہ (یعنی ایک چیز کو مساوی الطرفین کہنا) بہ لحاظ مصلحت فوقانیہ کے وجوب شئے سے ناواقفیت ہے پس ایسا کہنا صحیح اور حق کیسے ہو سکتا ہے میں کہتا ہوں کہ ماشاء اللہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ عین علم اور اس مقام کا حق پورا کرنا ہے، جہل جب ہوتا کہ یوں کہا جاتا کہ یہ شئے واجب نہیں ہے تمام شرائع الٰہیہ نے اس جہل کی نفی کی ہے اس لئے کہ انھوں نے ایمان بالقدر کو ثابت کیا ہے اور یہ سنا دیا کہ جو چیز تم کو پہنچی ہے اس میں چوک ہونے والی نہ تھی اور جس چیز میں چوک ہو گئی وہ تم کو پیش آنے والی نہ تھی جب یہ کہا جائے گا کہ اس موقعہ کے لحاظ سے اس شئی کا کرنا یا نہ کرنا برابر ہے تو یہ بھی علم حق ہے۔ یقیناً جب آپ بہائم میں سے کسی نر کو نرینہ کام کرتے ہوئے اور مادین کو مادینہ کام کرتے ہوئے دیکھو گے تو اس وقت اگر یہ حکم کرو گے کہ یہ کام مجبوری سے ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے پتھر دوسرے کے

لڑکا نے سے لڑ کتا ہے، تو تم خلاف واقع حکم کرو گے اور اگر یہ کہو گے کہ بلا سبب یہ کام صادر ہوئے ہیں نہ نر کا مزاج ان کا باعث ہے نہ مادین کا، تب بھی تمہارا حکم خلاف واقع ہوگا۔ اور اگر یہ کہو گے کہ ان کا ارادہ جوان کی طبیعت میں منقش ہے صرف فوقانی ضرورت کا ناقل ہے اس پر اس کا سہارا ہے خود ان میں کوئی مستقل جوش اور ہیجان کسی امر کا نہیں ہے، اس فوقانی حالت کے علاوہ کوئی اور آماجگاہ نہیں ہے، تب بھی یہ حکم خلاف واقع ہوگا بلکہ امر حق اور یقینی بین بین حالت ہے۔

وہ یہ کہ اختیار ایک امر معلول ہے جو اپنے علل واسباب سے مختلف نہیں کرتا اور فعل مقصود کو علل واجب کرتے ہیں اور علل کے بعد یہ ممکن نہیں کہ فعل نہ پایا جائے۔ لیکن اس اختیار کی شان اور حالت یہ ہے کہ اس کی اپنی حالت کی وجہ سے اس میں بہجت اور سرور حاصل ہو اور اس میں کسی امر فوقانی کا لحاظ نہ ہو۔ اگر آپ اس مقام کا حق ادا کریں اور یہ کہیں کہ میری ذات میں اس کا علم ہے کہ فعل کا کرنا یا نہ کرنا مساوی تھا لیکن میں نے اس کا کرنا اختیار کر لیا پس میرا یہ اختیار ہی اس کام کی علت ہے تو البتہ آپ اپنے قول میں سچے اور نیک ہیں۔ شرائع الٰہیہ نے اسی ارادہ کی خبر دی ہے جو اس مقام میں منقش ہوا کرتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایسے ارادہ کا ثبوت ہے جس کا تعلق وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا ہے اور اس کے لحاظ سے دنیا و آخرت میں اعمال پر جزا بھی ثابت اور مرتب ہوتی ہے اور یہ امر بھی ثابت ہوا کہ مدبر عالم نے احکام شریعت کے واجب کرنے سے عالم میں تدابیر کو قائم کیا تا کہ لوگ اس شریعت پر عمل کریں اور نفع اٹھائیں۔ پس شریعت سے لوگوں کو مامور کرنا ایسا ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلاموں سے کوئی خدمت لینا چاہتا ہے وہ اپنے ان غلاموں سے خوش ہوتا ہے جو ان کی خدمت کریں اور ان سے وہ ناخوش ہوتا ہے جو خدمت کرنے سے انکار کریں۔ یعنی اسی طرز و انداز پر شریعتوں کا نزول ہوا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا تھا کہ شرائع صفات الٰہیہ وغیرہا کے بیان میں سب سے زیادہ فصیح اور سب سے زیادہ حق ظاہر کرنے والی عبارت میں نازل ہوئی ہیں۔ شریعت کی تعبیر کبھی حقیقت لغوی کے طور پر ہوتی ہے اور کبھی متعارف مجاز کی صورت میں۔ پھر شریعت الٰہیہ نے اس امر کے دریافت کرنے پر کہ عبادت خداوند عالم کا حق ہے، لوگوں کو تین مقامات کی وجہ سے قدرت دی ہے یہ تینوں اصول سب کے نزدیک مسلم ہیں اور بمنزلہ امور مشہور اور بدیہی کے ان کی نظر میں ہو گئے ہیں۔

اوّل یہ کہ خدا تعالیٰ منعم ہے اور منعم کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور عبادت اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ دوم یہ کہ وہ خداوند تعالیٰ سے اعراض کرنے والوں اور دنیا میں عبادت کو ترک کرنے والوں کو سخت سزا دیگا۔ سوم یہ کہ خدا تعالیٰ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کو آخرت میں جزا وسزا دے گا پس اس مقام میں ان سے تین اور علوم کا اضافہ ہوا۔ اوّل انعامات الٰہی کے یاد دلانے کا علم، دوم خدا کے عذابوں سے یاد دلانے کا علم، سوم معاد کی باتوں سے سمجھانے کا علم۔ پس قرآن مجید ان تینوں علوم کی شرح کرنے کے لئے نازل ہوا ہے ان علوم کی تشریح کی طرف عنایت الٰہی اس لئے زیادہ متوجہ ہوئی کہ انسان کی اصل فطرت میں باری تعالیٰ جل جلالہ کی جانب ذاتی میلان پیدا کیا گیا ہے اور یہ میلان ایک امر دقیق ہے اس کی صورت آدمی کی خلقت میں ہی منقش ہے اور وجدان صحیح سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسانی خلقت میں یہ مندرج ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے کہ عبادت خدا کا بندوں پر حق ہے کیونکہ وہی تمام لوگوں کا منعم ہے، ان کے اعمال کی جزا دیتا ہے۔

پس جو شخص ارادہ کا منکر ہے یا عبادت کا بندوں پر حق الٰہی ہونے کا انکار کرے یا جزا کو نہ مانے تو وہ شخص دہریہ ہے اس کی فطرت سلیم نہیں کیونکہ اس نے اس میلان کو کھو دیا جو فطرۃً اس کی طبیعت میں ودیعت رکھا گیا تھا ایسا ہی شخص دہریہ کا نائب اور خلیفہ ہے جو اس کی جگہ پر ماخوذ ہوگا اور اگر اس میلان کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو سمجھو کہ روح انسانی میں ایک لطیفہ نورانی ہے جس کو بالطبع خداوند عالم کی جانب ایسی ہی کشش ہے جیسے لوہے کو مقناطیس کی طرف ہوتی ہے اور یہ بات وجدان سے معلوم ہوسکتی ہے پس جو شخص اپنے لطائف نفسانی معلوم کرنے کا نہایت خوض سے متلاشی ہوگا اور ہر لطیفہ کی کیفیت کو معلوم کرے گا تو وہ اس لطیفۂ نورانی کی کیفیت بھی معلوم کرسکے گا اور اس کا میلان بالطبع خدا تعالیٰ کی طرف بھی معلوم کرسکے گا۔ اہل وجدان کے نزدیک اس میلان کا نام محبت ذاتی ہے اور اس کا حال تمام وجدانی امور کا سا ہے جو دلائل سے حاصل نہیں ہوسکتے جیسے گرسنہ کی بھوک اور پیاسے کی پیاس۔

جب آدمی لطائف سفلی کے احکام کی وجہ سے پردہ اور تاریکی کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے اس نے اپنے بدن میں کسی مخدر چیز کا استعمال کیا ہو اور اس کی بالکل حس جاتی رہی ہو، اس پر گرمی اور سردی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پس جب انسان کے لطائف سفلی مزاحمت

سے تھک جاتے ہیں یہ خواہ اضطراری موت سے ہو جس سے نسمہ (۱) کے بہت سے اجزا منتشر ہو جاتے ہیں اور نسمہ کی اکثر خاصیتیں گھٹ جایا کرتی ہیں۔ یا اختیاری موت سے ہو کہ نفسانی اور بدنی ریاضتوں کے ذرائع عجیب عجیب اس نے استعمال کئے ہوں تب وہ بہ منزلہ اس شخص کے ہوتا ہے کہ مخدر چیز کا اثر اس میں سے دور ہو گیا ہو اس وقت وہ اپنے ذاتی اثروں کو معلوم کر سکتا ہے جن کی پہلے اس کو خبر بھی نہ تھی۔ پس جب آدمی کی وفات ہوتی ہے اور اس کو خدا کی طرف توجہ نہیں ہوا کرتی اس حالت میں اگر اس کا اعراض محض جہل بسیط اور سادہ لاعلمی سے ہے تو ایسا شخص کمال نوعی کے لحاظ سے شقی ہے اس کو برزخ کے بعض حالات کا انکشاف تو ہوگا لیکن ذاتی استعداد نہ ہونے سے کامل انکشاف نہ ہوگا اس لئے وہ حیران ہکا بکا رہ جائے گا۔ اور اگر اس اعراض کے ساتھ اس کی علمی اور عملی قوتوں میں کوئی مخالف صورت توجہ الی اللہ کی قائم تھی تو اس شخص میں کشاکشی پیدا ہوگی، اس کا نفس ناطقہ جبروت کی طرف اور نسمہ مخالف صورت حاصل کرنے کی وجہ سے عالم سفل کی طرف کھینچے گا۔ پس اس میں حشمت، نفس ناطقہ کے جوہر سے صعود کرے گی اور اس نسمہ کے جوہر پر پھیل جائے گی۔ اور بسا اوقات توحش کے ہمرنگ اس کو واقعات بھی پیش آئیں گے جیسے صفراوی مزاج والے کو خواب میں آگ کے شعلے نظر آیا کرتے ہیں اور معرفت نفس کی حکمت کی اصل توجیہ یہی ہے۔ اور نیز ملأ اعلیٰ کی جانب سے ایسے شخص پر غضب ناک تند نظری بھی ہوگی جس کی وجہ سے ملائکہ وغیرہ ذی اختیار نفوس کے دلوں پر الہامات ہوں گے کہ ایسے لوگوں کو ایذا اور تکلیف پہنچائیں اور وہ ارادے اور خواہشات جو بنی آدم کے دل میں پیدا ہوئے ہیں ان کی معرفت کی اصل یہی توجیہ ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کہ جبروت کی طرف میلان اور عمل کو واجب قرار دینا جس سے اس قید سے رہا ہو سکے جو لطائف سفلی کی مزاحمت سے پیدا ہوتی ہے اور اس واجب کردہ عمل کے ترک پر مواخذہ کرنا یہ صورت نوعیہ کے احکام اور اس کی قوتوں اور اثروں میں سے ہے جس کا خالق صور اور وجود کا فیضان عطا کرنے والے کی جانب سے افراد نوعی کے ہر فرد پر مصلحت کل کا لحاظ کر کے فیضان کیا گیا ہے لوگوں کے ذاتی التزام یا رسم ورواج کی پابندی سے نہیں ہے اور یہ تمام اعمال حقیقتاً اس لطیفہ نورانی کا ہی حق ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف کھینچتا ہے ان اعمال سے اسی لطیفہ کی

---

(۱) نسمہ روح حیوانی کو کہتے ہیں اور روح حقیقی کا اصلی مرکب ہے اور موت کے بعد بھی ساتھ رہتا ہے۔

خواہش کا پورا کرنا اور اس کی ہی کمی کا درست کرنا ہے۔ اور چونکہ یہ معنی نہایت دقیق تھے اور اس لطیفہ کو بخوبی سمجھنے والے بہت کم لوگ ہیں اس واسطے اس حق کی نسبت اس لطیفہ کی جانب نہیں کی جاتی ہے بلکہ اس کو ذات خداوندی کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کی طرف اس لطیفہ کا میلان اور وہی اس کا قبلہ مقصود ہے گویا کہ یہ نفسانی قوتوں میں سے ایک قوت کو معین کر لینا ہے جس کی وجہ سے یہ میلان کرتا ہے اور گویا کہ یہ ہمارے اس قول کا اختصار ہے کہ اس لطیفہ کا حق اس اعتبار سے ہے کہ اس کا خدا کی طرف میلان ہے پس شرع الٰہیہ اس راز کو ایسی سہل عبارت میں واضح کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں جس کو بشر اپنے علوم فطریہ کے موافق سمجھ جائے خدا کا یہی طریقہ ہے کہ وہ دقیق معانی کو ان صورتوں کے لباس میں نازل کیا کرتا ہے جو وجود مثالی کی مناسب ہوا کرتی ہیں جیسے کہ ہم کو خواب کے ضمن میں مجرد معانی کسی شئے کی ایسی صورت میں نظر آیا کرتے ہیں جو ان معانی کو عادۃً لازم یا اس کے ہم رنگ اور مشابہ ہوا کرتی ہے اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ عبادت بندوں پر خدا تعالیٰ کا حق ہے اور اسی طرح پر قرآن مجید کا حق اور پیغمبر کا حق، آقا کا، والدین کا اور رشتہ داروں کا حق قیاس کر لینا چاہئے۔ پس یہ سب انسان کے نفس کے حقوق اسی کے نفس پر ہیں تا کہ اس کو کمال حاصل ہو جائے اور وہ اپنے اوپر ظلم نہ کرے لیکن یہ حق اس کی طرف منسوب کر دیا گیا جس کی طرف سے یہ معاملہ اور جس کی جانب سے مطالبہ ہے۔ پس تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو ظاہر پر ٹھہر گئے، بلکہ ان میں سے ہو جو ہر بات کی اصل تحقیق کرتے ہیں۔ فقط۔

ساتواں باب: خدا کے نشانات اور شعائر کی تعظیم کا بیان

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''دلی تقوی میں سے خدا کے نشانات کی تعظیم بھی ہے'' واضح ہو کہ شریعتوں کی بنا شعائر الٰہی کی تعظیم اور ان کے ذریعہ سے خدا کے حضور میں تقرب حاصل کرنے پر ہے اس کی وجہ وہ ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طریقہ کو خدا نے مقرر کیا ہے وہ یہی ہے کہ عالم تجرد کے امور کو ان چیزوں کے ساتھ نقل کیا جائے جن کو قوت بہیمیہ آسانی سے حاصل کر سکے اور شعائر سے مراد وہ ظاہر محسوس چیزیں ہیں جن کی وجہ سے خدا کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ اس طرح سے مخصوص ہوں کہ ان شعائر کی تعظیم خدا کی تعظیم اور ان میں کوتاہی بارگاہ خداوندی میں کوتاہی سمجھی جائے یہ تعظیم لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے راسخ ہو جائے کہ ان کے

دلوں سے نہ نکل سکے اگر چہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اور شعائر کا وجود قدرتی طور پر ہو جایا کرتا ہے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی عادت یا خصلت لوگوں کے دلوں میں اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ وہ ان میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پس اس وقت رحمت الٰہی ایسی چیزوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جن کو ان کی طبیعتیں اور مشہور عالم ضروری قرار دیتے ہیں وہ سب ان کو قبول کرتے ہیں اور ان کی حقیقت پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے قریب اور بعید دونوں کو برابر دعوت الٰہی پہنچتی ہے پس اس وقت ان پر شعائر کی تعظیم فرض ہو جاتی ہے اور ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے جیسے خدا کے نام کی قسم کھانے والا اپنی قسم توڑنے سے خدا کے حق میں گویا کمی اور کوتاہی دل میں رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اسی اندرونی دلی بات پر مواخذہ کیا جاتا ہے پس اسی طرح ان لوگوں میں بہت سی ایسی چیزیں مشہور ہو جاتی ہیں جن کی اطاعت ان کے علوم کرتے ہیں۔ پس ان کے علوم میں ان چیزوں کی پابندی یہ بات واجب کرتی ہے کہ ان لوگوں پر رحمت الٰہی اسی چیز میں ظاہر ہو جس کے وہ مطیع ہوں۔ تدبیر کی بنا اسی پر ہے کہ پہلے سب سے زیادہ آسان امر کیا جائے اس کے بعد اور آسان، اور یہ بھی ضرور ہے کہ اپنے دل میں ان شعائر کی نہایت درجہ تعظیم کریں کیونکہ ان کا کمال ایسی تعظیم کرنا ہے۔ جس میں اہمال اور سستی نہ ہو۔ اور خدا تعالیٰ نے اپنے فائدے کے لئے بندوں پر کوئی چیز واجب نہیں کی، خدا کی شان اس سے برتر ہے بلکہ جو کیا ہے محض بندوں کے فائدے کے لئے کیا ہے اور چونکہ یہ فائدہ بغیر نہایت درجہ کی تعظیم کے حاصل نہ ہو سکتا تھا اس لئے جو امور ان کے نزدیک تعظیمی تھے انہیں کا مواخذہ کیا گیا اور یہ حکم ہوا کہ خدا کی شان میں کوتاہی نہ کریں اور تشریعی امور میں مقصود بالذات جماعت کا حال ہے نہ کہ فرد واحد کا۔ گویا کہ یہ جماعت ہی تمام لوگ ہیں۔ وللہ الحجۃ البالغۃ۔

خدا تعالیٰ کے بڑے شعائر چار ہیں۔ قرآن، کعبہ، نبی، نماز، قرآن کا نشان الٰہی ہونا اس طرح پر ہے کہ لوگوں میں سلاطین کی طرف سے فرامین کا رعایا کی طرف بھیجنا رائج تھا اور بادشاہوں کی تعظیم کے تابع فرامین شاہی کی بھی تعظیم ہوتی ہے اور انبیا کے صحیفے اور لوگوں کی تصانیف بھی شائع اور رائج ہو گئی تھیں۔ لوگوں کا ان کے مذہب کی پیروی کرنا ان کتابوں کی تعظیم اور تلاوت پر موقوف تھا اور عرصہ دراز تک ان کے علوم کا پابند ہونا بغیر ایسی کتاب کے جس کو وہ

پڑھیں یا روایت کریں بادی الرائے میں محال بھی تھا اس واسطے لوگوں کا منشا ہوا کہ ایک کتاب کی صورت میں رحمت الٰہی کا ظہور ہو جو رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا اور اس کی تعظیم کی جائے۔ من جملہ تعظیم کے یہ (معنی) ہے کہ مصحف کو بغیر وضو کے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ جب اس کتاب کو پڑھا جائے تو سب خاموش ہو کر سنیں، اس کے اوامر کی فوراً تعمیل کریں سجدہ تلاوت کریں، جہاں تسبیح کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں تسبیح کریں اور کعبہ کا شعار میں سے ہونا اس لئے قرار پایا کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لوگوں نے آفتاب اور ستاروں کے نام پر بہ کثرت عبادت خانے اور کنیسے بنائے تھے ان کی نظر میں کسی ذات مجرد غیر محسوس کی طرف متوجہ ہونا بغیر اس کے محال تھا کہ اس کے نام کی ہیکل بنائی جائے اور اس میں حلول سمجھا جائے اور اس کی پرستش کرنا باعث تقرب سمجھا جائے، بادی الرائے میں ان کی عقلوں میں اور کوئی بات نہیں آتی تھی کہ اس واسطے اس زمانہ کے لوگوں نے چاہا کہ خدا کی رحمت کا ظہور ایک گھر کے ذریعہ سے ہو، لوگ اس کا طواف کریں، اس کی وجہ سے تقرب الی اللہ حاصل کریں اس لئے خدا نے ان کو خانہ کعبہ کی طرف بلایا اور اس کی تعظیم کا حکم دیا۔ اس کے بعد قرناً بعد قرن یہ علم پیدا ہوتا گیا کہ خانہ کعبہ کی تعظیم خدا کی تعظیم ہے اور اس میں کمی کرنا خدا کی عبادت میں کمی کرنا ہے اس لئے خانہ کعبہ کا حج فرض ہو گیا اور اس کی تعظیم کا اس طرح حکم دیا گیا کہ بغیر صفائی اور طہارت کے اس کا طواف نہ کیا جائے، نماز میں اس کی طرف رخ کریں اور بول و براز کے وقت اس کی طرف منہ کرنا یا پشت کرنا مکروہ سمجھیں۔

اور نبی کا شعائر الٰہیہ میں سے ہونا، پس ان کا نام رسول اس واسطے ہے کہ ان کو بادشاہوں کے ایلچیوں سے مشابہت دی گئی ہے جن کو بادشاہ امر و نہی کی اطلاع دینے کے لئے رعایا کی طرف بھیجا کرتے ہیں اور رسولوں کی تعظیم کرنا بھیجنے والے کی تعظیم قرار دی گئی ہے۔ پیغمبر کی تعظیم یہ ہے کہ اس کی اطاعت کو واجب سمجھیں اور اس پر درود بھیجیں، اس سے بلند آواز سے گفتگو نہ کریں۔ اور نماز کا شعائر سے ہونا اس واسطے ہے کہ اس سے مقصود غلاموں کے حال کے ساتھ تشبیہ دینا ہے کہ جب وہ بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر درخواست اور عاجزی کرتے ہیں اور اس لئے دعا کرنے سے پہلے حمد و ثنا ضروری ہوئی اور آدمی کو ایسی ایسی ہیئتیں اختیار کرنا ضروری ہوئیں جو مناجات کے وقت بادشاہوں کے سامنے اختیار کی جاتی ہیں یعنی ہاتھ باندھنا اور ادھر ادھر التفات نہ کرنا۔ اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے ہوتا ہے"۔ واللہ اعلم۔

آٹھواں باب: وضو اور غسل کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ کبھی کبھی انسان طبعی تاریکیوں سے حظیرہ قدس کی روشنیوں میں لایا جاتا ہے۔ اس پر یہ انوار غالب آتے ہیں۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے کسی نہ کسی طرح طبیعت کے احکام سے بری ہو جاتا ہے پس یہ ملائکہ کے مسلک میں منسلک ہو جاتا ہے اور باعتبار تجرید نفس کے گویا انہی میں سے ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر اس کی وہی اصلی حالت ہو جاتی ہے اس کے بعد پہلی حالت کے مناسب چیزوں کا وہ مشتاق ہوتا ہے تاکہ اس کی عدم موجودگی میں ان امور کو غنیمت جانے اور ان امور کے ذریعہ اس فوت شدہ حالت کو حاصل کرے۔ پس اس وقت بھی اس کو ایک حالت من جملہ احوال کے پیش آتی ہے جس کو سرور اور انشراح کہتے ہیں یہ کیفیت میل کچیل دور کرنے اور مطہرات کے استعمال کرنے سے حاصل ہوتی ہے پس وہ ان امور کا پختگی سے پابند ہوتا ہے اور اس کے بعد اس شخص کا مرتبہ ہے کہ اس نے مخبر صادق کو یہ تعلیم دیتے سنا کہ یہ حالت آدمی کے لئے موجب کمال ہے اور اس کا پروردگار اس سے ایسی حالت کو پسند کرتا ہے اور اس میں بے شمار فوائد ہیں، یہ سنکر اس نے دلی شہادت سے اس کو سچ جانا اور جیسا اس کو حکم دیا تھا ایسے ہی اس نے تعمیل کی۔ جتنا وہ اس پر کاربند ہوتا گیا اتنا ہی اس کی خبروں کو حق پاتا گیا اور اس پر رحمت کے دروازے کھلتے گئے اور فرشتوں کی سی حالت اس کی ہوتی گئی۔ اس کے بعد اس شخص کا رتبہ ہے جو کہ خود اس حالت کو کچھ نہ سمجھ سکتا تھا لیکن انبیا نے اس کو ایسی چیزوں کی طرف زبردستی کھینچا اور مجبور کیا جو معاد میں آدمی کو فرشتوں کے ساتھ ملحق کر دیتی ہیں یہی لوگ وہ ہیں جو جنت کی طرف زنجیروں کے ذریعہ سے کھینچے جاتے ہیں اور وہ ناپاکی جس کا اثر بادی الرائے میں نفس پر محسوس ہوتا ہے اور وہ ناپاکی جس کے انضباط مواقع کے لئے تمام آدمی مخاطب ہو سکتے ہیں اور وہ ناپاکی جو کثیر الوقوع ہے اور اس کی تعلیم میں کمی کرنے سے لوگوں کو بڑا ضرر پہنچ سکتا ہے، تلاش سے دو قسموں میں منحصر ہیں۔

اوّل یہ کہ انسان کے معدہ میں فضلات، پیشاب، پاخانہ، ریح پیدا ہوتے ہیں اور ان سے اس کا دل رک جاتا ہے پس ہر شخص اپنے نفس میں یہ بات پاتا ہے کہ جب اس کے پیٹ میں ریح یا

پیشاب، پاخانہ رکا ہوا ہوتا ہے تو اس کا دل برا ہو جاتا ہے پس وہ زمین کی طرف رجوع کرتا ہے اور حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کے اور بشاشی کے درمیان پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ پس جب وہ پیشاب یا پاخانہ اور ریح سے فارغ ہو جاتا ہے اور غسل و وضو وغیرہ کا استعمال کرتا ہے جس سے نفس کی پاکیزگی پر تنبیہ ہوتی ہے تو اس وقت دل میں بشاشت اور سرور پاتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے کہ گویا کوئی گم شدہ چیز مل گئی۔

دوم شہوت جماع سے نفس کا مشغول ہونا اور اس میں غرق ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ چیز نفس کو طبیعت بہیمیہ کی طرف بالکل متوجہ کر دیتی ہے جب بہائم کو ریاضت کے ذریعہ مقصود آداب کی مشق کرائی جاتی ہے اور شکاری جانوروں کو بھوکا اور بیدار رکھ کر مطیع بنایا جاتا ہے اور شکار پکڑنا سکھایا جاتا ہے اور پرندوں کو آدمیوں کی بولیاں سکھائی جاتی ہیں حاصل یہ ہے کہ جب ہر جانور کی خواہش اور مقتضائے طبیعت کے کھو دینے کی بخوبی کوشش کی جاتی ہے اور خلاف طبع باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے پھر یہ جانور مادنیوں میں رل مل کر اپنی خواہش ان سے پوری کرتا ہے اور چند روز انہیں لذائذ میں ڈوبا رہتا ہے تو سب سیکھے سکھائے امور بھول جاتا ہے اور ویسا ہی جاہل، اندھا اور بے خبر ہو جاتا ہے اور جو ان امور میں غور کرے گا تو اس کو ضرور معلوم ہو جائے گا کہ شہوت، نفس کی آلودگی جس قدر اثر کرتی ہے کوئی دوسری چیز (جو نفس کو بہیمیت کی طرف مائل کرتی ہے جیسے کثرت طعام اور نشہ وغیرہ) اس قدر اثر نہیں کرتی، آدمی کو اس کا تجربہ اپنی نفسانی حالت سے ہی کر لینا چاہئے اور ان تدابیر کو یاد کرنا چاہئے جن کا ذکر اطبا نے تارک دنیا راہبوں کی طبیعتوں کو نفس بہیمی کی طرف پھیر دینے کے لئے کیا ہے اور طہارت جس کا اثر ظاہراً محسوس ہوتا ہے اور جو عام لوگوں کو سمجھائی جا سکتی ہے کیونکہ اس طہارت کا ذریعہ یعنی پانی آباد ملکوں میں بکثرت موجود ہے اور اس کے اوقات منضبط ہیں اور جو نفس بشر میں ہر طہارت سے زیادہ دل نشین ہے اور جو باوجود قدرتی طریقہ ہونے کے تمام لوگوں میں مسلم اور مشہور بھی ہے ایسی طہارت تلاش کرنے سے دو قسموں میں پائی جاتی ہے (۱) طہارت صغریٰ (۲) طہارت کبریٰ۔ طہارت کبریٰ سے یہ مراد ہے کہ تمام بدن دھویا جائے اس لئے کہ پانی خود ایک پاک چیز ہے۔ سب نجاستوں کو دور کر دیتا ہے تمام طبیعتوں نے اس کے اثر کو تسلیم کر لیا ہے یہ نہایت عمدہ ذریعہ ہے کہ اس کی وجہ سے صفت طہارت پر نفس متنبہ کیا جائے اور

اکثر آدمی شراب پیتے ہیں اور نشہ میں چور ہو جاتے ہیں اسی مدہوشی میں وہ ناحق خون کر ڈالتے ہیں یا نہایت نفیس مال کو ضائع کر دیتے ہیں تو دفعتہً ان کا نفس متنبہ ہو جاتا ہے وہ ہوش میں آجاتے ہیں اور ان کا نشہ دور ہو جاتا ہے اور اکثر ناتواں لوگوں کو نشست و برخاست کی طاقت نہیں ہوتی اور وہ کوئی کام نہیں کر سکتے پس اتفاقاً کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس سے نفس متنبہ اور قوی ہو جاتا ہے جیسے غصہ یا حمیت یا رغبت، پس اس وقت وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتے ہیں یا کوئی بڑی خونریزی کر بیٹھتے ہیں۔ بہر حال نفس کی حالت بعض امور سے دفعتاً بدل جایا کرتی ہے اور ایک عادت سے دوسری عادت کے لئے بیداری اس میں آجاتی ہے اور نفسانی علاجوں میں اس قسم کی تبدیلیاں مفید اور عمدہ ہیں اس قسم کی بیداری اس چیز سے ہوتی ہے جس کا کامل طہارت ہونا طبیعتوں اور دلوں میں پیوست ہو گیا ہے اور ایسی چیز صرف پانی ہی ہے۔ اور طہارت صغری، صرف ہاتھ، پاؤں اور منہ کے دھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ تمام آباد ملکوں میں یہ معمول جاری ہے کہ یہ اعضا قدرتی طور سے کھلے رہتے ہیں اور لباس بدنی سے باہر رہتے ہیں اور اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپ نے چادر میں لپٹنے سے منع فرمایا۔ تو ان اعضا کے کھلا رہنے سے ان کے دھونے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اور یہ غسل تمام اعضا کا نہیں ہے۔

تمام شہروں والوں کا معمول ہے کہ ان اعضا کو روزانہ دھوتے ہیں اور بادشاہوں اور امرا کے دربار میں جاتے وقت پاک وصاف کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعضا ظاہر اور کھلے رہتے ہیں، بہت جلد میلے ہو جاتے ہیں اور باہم ملاقات کے وقت بھی یہی اعضا نظر پڑتے ہیں اور نیز تجربہ سے شہادت ملتی ہے کہ ہاتھ، پاؤں کے دھونے سے، منہ اور سر پر پانی چھڑکنے سے نفس پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ خواب یا نہایت بیہوشی اس سے دور ہو جاتی ہے اور انسان اس کا تجربہ کر سکتا ہے اس تجربہ اور علم کی تصدیق اطبا کی تجویز سے بھی ہوتی ہے وہ اس شخص کے لئے جس کو غشی ہو یا اس کو زیادہ اسہال آتے ہوں یا کسی کی فصد زیادہ لی گئی ہو، یہی پانی چھڑکنا تجویز کرتے ہیں۔ تدابیر ثانیہ کے ابواب سے جن پر انسانی کمال کا مدار ہے اور لوگوں کے لئے وہ بہ منزلہ فطرت کے ہو گئے ہیں، طہارت بھی ایک باب ہے اور اس کی وجہ سے فرشتوں سے قرب اور شیاطین سے بعد حاصل ہوتا ہے اور عذاب قبر بھی اس سے دور ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "پیشاب

سے بچو کیونکہ عام عذاب قبر اس سے ہوتا ہے" اور طہارت کو اس میں بڑا دخل ہے کہ اس کے ذریعہ سے نفس، احسان کا درجہ حاصل کر سکتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے "پاکیزہ رہنے والوں کو خدا دوست رکھتا ہے"۔ جب طہارت کی کیفیت نفس میں خوب راسخ ہو جاتی ہے تو نور ملکی کا ایک شعبہ اس میں ٹھہر جاتا ہے اور بہیمیت کی تاریکی کا حصہ مغلوب ہو جاتا ہے۔ نیکیوں کے لکھے جانے اور خطاؤں کے دور ہونے کے یہی معنی ہیں۔ اور اگر رسمی طور سے بھی عمل میں لائی جائے تو رسمی بلاؤں میں مفید ثابت ہوتی ہے اور جب کوئی پاک آدمی اس کی ان ہیئتوں کی پابندی کرتا ہے جن کا لوگ سلاطین کے حضور میں لحاظ رکھا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اذکار اور نیت کی بھی پابندی کرتا ہے تو سوء معرفت سے نجات پا جاتا ہے اور جب انسان خوب سمجھ جاتا ہے کہ طہارت اس کا کمال ہے تو بغیر کسی داعیہ حسیہ کے اس کے اعضا عقل کے تابع ہو جاتے ہیں اور سب سے زیادہ نفع کی بات یہ ہوتی ہے کہ طبیعت عقل کی مطیع ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

نواں باب: نماز کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ کبھی آدمی حظیرۃ القدس کی سی حالت کو اخذ کر لیتا ہے پس جناب باری سے اس کو نہایت قرب ہو جاتا ہے پھر اس پر وہاں سے مقدس تجلیات کا نزول ہوتا ہے اور یہ شخص اپنے نفس پر غالب آ کر ایسی حالت کا مشاہدہ کرتا ہے جس کو زبان نہیں بیان کر سکتی جہاں تھا وہاں کا وہیں آ جاتا ہے اور وہ بے قرار ہو جاتا ہے لہٰذا اپنے نفس کو ایسی حالت میں تسکین دیتا ہے جو حالات سفلیہ میں سب سے عمدہ ہے۔ یعنی اپنے پروردگار کی معرفت میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ پس وہ اسی کو پہلی حالت کے حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور یہ حالت خدا کی عظمت اور اپنی عاجزی کے اظہار سے اور ان افعال واقوال کے ذریعہ سے جو خدا کی حضور میں مناجات کرنے کے لئے مقرر ہیں، ہوا کرتی ہے اس کے بعد اس شخص کا درجہ ہے جو کسی مخبر صادق کو اس حالت کی طرف بلاتے اور رغبت دلاتے سنتا ہے پھر دلی شہادت سے اس کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور اس کے تمام وعدوں کو سچا پاتا ہے اور مراد کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا مرتبہ ہے جس کو انبیا نے نمازوں پر مجبور کیا لیکن اس کو نماز کی خوبیوں کا ذاتی علم نہ تھا اس کی مجبوری ایسی ہی تھی جیسے

باپ اپنے بیٹے کو مفید صنعتوں کی تعلیم دے اور وہ ان کو پسند نہ کرتا ہو۔ کبھی آدمی خدا تعالیٰ سے مصیبت کے دور ہونے یا کسی نعمت کے ملنے کی درخواست کرتا ہے اس وقت زیادہ مناسب یہی ہوتا ہے کہ وہ تعلیمی افعال واقوال میں ہمہ تن مستغرق ہو جائے تا کہ اس کی ہمت کا جو دعا کی روح ہے کچھ اثر پڑ سکے۔ اور اسی وجہ سے نماز استسقا مسنون ہوئی ہے۔ نماز میں اصلی امور تین ہیں (۱) خدا تعالیٰ کی بزرگی اور جلال دیکھ کر نہایت خشوع اور خضوع کرنا (۲) خدا کی بزرگی اور اپنی عاجزی کو خوش بیانی سے ظاہر کرنا (۳) اس عاجزی کی حالت کے موافق اعضا میں آداب کا استعمال (شعر) تیری نعمتوں نے مجھ سے تین چیزیں خدمت میں لیں، میرے ہاتھ اور زبان اور پوشیدہ دل، میں اب ان تینوں سے تیری جناب میں شکرگزاری کرتا ہوں۔

افعال تعظیمی میں سے یہ ہے کہ اس کے روبرو کھڑا ہو کر مناجات کرے اور ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو اور کھڑے ہونے سے بھی زیادہ تعظیم اس میں ہے کہ اپنی عاجزی اور خدا کی برتری کا خیال کر کے اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے کیونکہ تمام بنی آدم اور بہائم میں یہ فطری امر ہے کہ گردن بلند کرنا تکبر اور خود پسندی کی علامت، اور سرنگوں ہونا عاجزی اور تعظیم کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں'' اور اس سے بھی زیادہ تعظیم کی بات یہ ہے کہ اپنے چہرے کو جو تمام اعضا میں زیادہ بزرگ اور حواس انسانی کے جمع ہونے کی جگہ ہے، اس کے سامنے رکھ دے یہی تینوں قسم کی فعلی تعظیمیں تمام لوگوں میں رائج ہیں۔ جن کو اپنی نمازوں میں اپنے سلاطین اور امرا کے درباروں میں عمل میں لاتے ہیں اور سب صورتوں میں نماز کی وہ صورت عمدہ ہے جس میں یہ تینوں امر جمع ہوں اور اس کے ساتھ ہی ادنیٰ تعظیمی حالت سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو جو کہ خشوع اور خضوع میں ترقی ہوتی جائے اور جو فائدہ اس ترقی کی حالت میں ہو سکتا ہے وہ تنہا اعلیٰ درجہ کی تعظیم میں یا اعلیٰ حالت سے ادنیٰ کی طرف منتقل ہونے میں معلوم نہیں ہو سکتا۔ نماز میں اعمال مخصوصہ ہی کو اصل قرار دیا گیا ہے عظمت الٰہی میں صرف غور کر لینا یا ہمیشہ خدا کا ذکر کرنا اس میں اصل نہیں ٹھہرائے گئے اس لئے کہ خدا کی عظمت کا صحیح خیال صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی طبیعتیں اعلیٰ درجہ کی ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں اور ایسے لوگوں کے علاوہ اور عام لوگ اگر غور وخوض کرنے لگیں تو کند ذہن ہو جائیں اور فائدہ کے بجائے اصل مال کو

بھی کھو بیٹھیں اور محض ذکر بغیر شرح کے اور بغیر اس کے کہ کوئی عمل تعظیمی بھی اس کے ساتھ لگایا جائے اور جوارح میں آداب کا لحاظ رکھا جائے، اکثر لوگوں کے حق میں ایک بیکار دردسری ہے البتہ ''نماز'' سو وہ ایسا معجون ہے جس کی ترکیب میں ایک تو تفکر ہے جو خدا کی عظمت کی طرف ثانوی ارادہ کے ساتھ پھیرا جاتا ہے۔

اور دوسری وہ توجہ ہے جو ہر شخص سے تبعاً پیدا ہوتی ہے اور جس کو گرداب شہود میں خوض کرنے کی استعداد حاصل ہو اس کو بھی کوئی مانع نہیں ہے وہ بخوبی اس میں غور کر سکتا ہے بلکہ نماز اس امر میں اس کے خوب اعانت کرے گی۔ اور نماز میں وہ دعائیں بھی ہیں جو اخلاص عمل پر، اسی طرح متوجہ ہونے پر اور اسی سے مدد مانگنے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور تعظیمی افعال رکوع و سجود بھی ہیں جو ایک دوسرے کے معین، مکمل اور تنبیہ کرنے والے ہیں اس لئے نماز ہر خاص و عام کے حق میں نافع اور تریاق قوی الاثر ہوگئی تاکہ ہر انسان اس سے اپنی استعداد کے موافق فائدہ اٹھائے۔

نماز، ایمان والے کے لئے معراج ہے اور اس کو اخروی تجلیات کے لئے تیار کرتی ہے اور آنحضرت علیہ السلام کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''تم عنقریب اپنے پروردگار کو دیکھوں گے پس تم فجر اور عصر کی نماز سے غافل نہ ہو جایا کرو، ان کو پڑھا کرو، اور یہ نماز خدا کی محبت اور رحمت کا بڑا سبب ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے، جنت میں لے جانے کے لئے، کہ میں شفاعت کر کے لے جاؤں گا تو بھی میری اعانت کر کہ اکثر نماز پڑھا کر'' اور خدا تعالیٰ کا اہل جہنم کے اس قول کے نقل کرنے میں بھی اسی طرف اشارہ ہے ''ولم نک من المصلّین '' (ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے) اور جب نماز کا شوق مومن کے دل میں جم جاتا ہے تو وہ نور الٰہی میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کے گناہ دور ہو جاتے ہیں (نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں) معرفت الٰہی کے لئے کوئی چیز نماز سے زیادہ مفید نہیں ہے بالخصوص جب نماز کے تمام افعال و اقوال حضور قلب اور پاک نیت سے ادا کئے جائیں اور اگر کوئی نماز کو رسماً ادا کرے گا تو بھی رسمی برائیوں سے بچانے میں اس کا بھی نفع ہوگا۔ اور مسلمانوں کے لئے ایسی علامت قرار دی جائے گی جو کافر سے تمیز کر دے گی چنانچہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اہل اسلام اور کفار کے درمیان نماز عید ہے پس جس نے نماز

ترک کردی وہ کافر ہو گیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ نفس کو عقل کے ماتحت رہنے کا اور اس کے احکام پر چلانے کا عادی بنانے میں نماز کے برابر کوئی چیز نہیں۔ واللہ اعلم۔

دسواں باب: زکوۃ کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ جب کسی مسکین کو کوئی حاجت پیش آتی ہے اور وہ زبان حال یا قول سے خدا کے حضور میں گریہ وزاری کرتا ہے تو اس کے لئے خدا کی بخشش کا دروازہ کھلتا ہے اور کبھی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ کسی نیک بندے کے دل میں یہ الہام ہوتا ہے کہ مسکین کی حاجت روائی کردے۔ پس جب اس پر الہام چھا جاتا ہے اور اس کے موافق عمل کرتا ہے تو اس سے خدا خوش ہوتا ہے اور اوپر سے نیچے، دائیں سے بائیں سے اس پر برکتیں نازل ہوتی ہیں اور اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ ایک روز ایک مسکین نے اپنی انتہائی حاجت کے وقت مجھ سے سوال کیا تب میں نے اپنے دل میں الہام کی آہٹ پائی کہ وہ اس کو کچھ دینے کا مجھے حکم کرتا ہے اور وہ دنیا و آخرت میں بڑے اجر کی بشارت دیتا تھا، میں نے اس مسکین کی حاجت براری کرائی اور میں نے اپنے پروردگار کے وعدہ کو سچا دیکھ لیا اس غریب کا جود الٰہی کے دروازہ کو کھٹکھٹانا اور اس کو دینے کے لئے مجھ پر اس روز الہام ہونا اور اجر کا ظاہر ہونا یہ سب امور آنکھ کے سامنے محسوس ہوئے اور کبھی کسی موقع پر خرچ کرنا رحمت الٰہی کا باعث ہوتا ہے مثلاً جب ملأ اعلیٰ کی خواہش کسی مذہب کے مشہور اور معزز کرنے کے لئے طے ہو جاتی ہے تو جو اس کی اعانت کے درپے ہوتا ہے اس پر رحمت ہوتی ہے اور اس روز اس کا اس امر میں صرف کرنا غزوۃ العسرت (۱) کے مانند ہے۔ یا مثلاً جب کوئی قوم ایام قحط میں نہایت محتاج ہو اور خدا کو انہیں زندہ رکھنا منظور ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان وجوہات سے مخبر صادق ایک کلیہ بنا کر یوں فرماتا ہے کہ جو اس طرح کے فقیر کو ایسی حالت میں کچھ دیگا تو اس کا عمل مقبول ہوگا۔ پس ان امور کو کوئی شخص سنتا ہے۔ اس پر عمل کرتا ہے اور وعدہ الٰہی کو حق پاتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ مال کی محبت اور حرص زر کو اپنے مقصود اصلی کے لئے سد راہ اور مانع پاتے ہیں اس لئے اس سے ان

---

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جہاد کا نام ہے جو آپ نے سخت گرمی اور تنگدستی کے وقت تبوک کے لئے چڑھائی کی تھی۔

کو تکلیف ہوتی ہے اس تکلیف کو وہ اس طرح دفع کر سکتے ہیں کہ وہ اس مال محبوب اور زر مرغوب کے صرف کرنے پر دل کو عادی کریں اس لئے خرچ کرنا ہی اس کے حق میں سب چیزوں سے زیادہ نافع ہوتا ہے اگر وہ صرف نہ کرے تو محبت اور بخیلی ویسی کی ویسی ہی اس میں باقی رہ جائے اور آخرت میں وہ بخل اور حرص سانپ بن کر نظر آئے یا یہ اموال کسی مضر چیز کی شکل میں ظاہر ہو کر ایذا پہنچائیں اور اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ قیامت کے دن وہ اموال جن کی زکوۃ ادا نہیں کی گئی صاحب مال کو روند دیں گے اور اس کو اس کے روبرو چٹیل میدان میں لٹا دیا جائے گا اور اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے "جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور زکوۃ نہیں دیتے تو اس سے ان کی پیشانی، پہلو اور پشت پر داغ لگائے جائیں گے" اور کبھی انسان کو بلا گھیر لیتی ہے اور اس کی ہلاکت کا عالم مثال میں حکم ہو چکتا ہے اتنے میں وہ عمدہ عمدہ مال صرف کرتا ہے، وہ خود اور اس کے ساتھ اچھے لوگ دعا کرتے ہیں، تو مال کے صرف سے اس کی ہلاکی محو ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قضا کو دعا ہی ہٹا سکتی ہے اور عمر کو سوائے نیکی کے کوئی چیز نہیں زیادہ کرتی"۔ اور آدمی کبھی طبیعت کے غلبہ سے کوئی برا کام کر لیتا ہے پھر اس کی برائی معلوم کر کے نہایت شرمندہ ہوتا ہے لیکن طبیعت پھر غالب آ جاتی ہے اور اسی کام کو پھر کرتا ہے، ایسے نفس کا علاج یہی ہے کہ اپنے فعل کے تاوان کے لئے بہت سا مال صرف کرے تاکہ یہ نقصان اس کے پیش نظر رہے اور پھر آئندہ ایسے قصد سے اس کو باز رکھے۔ اور کبھی حسن خلق اور انتظام خاندانی کا حفظان اس طرح سے ہوتا ہے کہ خوب کھانا کھلایا جائے۔ سلام میں تقدیم کی جائے اور طرح طرح کے سلوک کئے جائیں، ان امور کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ امور اس کے لئے صدقہ شمار کئے جاتے ہیں۔

اور زکوۃ سے برکت زیادہ ہوتی ہے اس سے غضب الٰہی بجھ جاتا ہے اور فیضان رحمت ہونے لگتا ہے اور عذاب آخرت کو جو بخل پر مرتب ہوتا ہے، زکوۃ دور کر دیتی ہے اور ان ملأ اعلیٰ کی دعا کو جو زمین میں مصلح اور مدبر ہیں اس بندہ کے حق میں لوٹا لاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

گیارھواں باب: روزہ کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ کبھی انسان الہام الٰہی کے ذریعہ یہ بات معلوم کرتا ہے کہ طبیعت بہیمی کا جوش اس کو کمال ذاتی سے باز رکھتا ہے اور وہ کمال قوت ملکیہ کا مطیع ہونا ہے اس لئے وہ بہیمیت کو برا سمجھتا

ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے جوش کو مار دے۔ کوئی چیز اس کو اس کے تدارک کے لئے بجز اس کے نہیں ملتی کہ بھوکا، پیاسا رہے، مجامعت ترک کر دے، اپنی زبان، دل اور اعضا کو روکے رہے، ان امور سے وہ مرض نفس انسانی کا علاج کرتا ہے اس کے بعد اس شخص کا درجہ ہے جس نے سچی خبر دینے والے سے ان تدابیر کو دلی شہادت سے اخذ کیا ہو۔ اس کے بعد وہ شخص ہے جس کو انبیا شفقت اور مہربانی سے اس حالت کی طرف لاتے ہیں اور اس کو ان خوبیوں کا ذاتی علم نہیں ہوتا پس اس کسر شہوت کا فائدہ وہ آخرت میں پائے گا۔ اور کبھی انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ طبیعت کا مطیع عقل ہونا کمال ہے اور اس کی طبیعت باغی ہے کبھی اطاعت کرتی ہے اور کبھی نہیں کرتی تو لامحالہ محنت کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے محنت کے کام روزہ جیسے اختیار کرنے پڑتے ہیں وہ اپنی طبیعت کو ایسے کاموں پر مجبور کرتا ہے اور اطاعت کے عہد کو طبیعت سے پورا کرتا ہے وہ اس طرح انہیں امور کے اہتمام میں رہتا ہے حتی کہ اس کا مقصود اصلی حاصل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی شخص سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو وہ مدتوں تک روزے رکھے چلا جاتا ہے جن میں بہ نسبت گناہ کے زیادہ محنت ہوتی ہے تاکہ دوبارہ اس سے ایسا کام نہ ہو۔ اور نیز کبھی دل میں عورتوں کی رغبت پیدا ہوتی ہے لیکن نکاح کرنے کی قدرت نہیں ہوتی اس لئے زنا کے خوف سے وہ اپنی رغبت کو روزہ سے مار دیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جس شخص کو شادی کرنے کی طاقت نہ ہو تو وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ شہوت کے زور کو ختم کر دیتا ہے" اور روزہ ایک بڑی نیکی ہے اس سے ملکی قوت بڑھتی ہے اور بہیمی طاقت کمزور ہو جاتی ہے روح کی صفائی اور طبیعت کے دبانے کے لئے روزہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے "روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا"۔ روزہ سے بہیمیت کا جوش جس قدر کمزور ہوتا ہے اسی قدر گناہ دور ہوتے ہیں اور اس سے انسان کو فرشتوں کی حالت کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے پس وہ روزہ دار سے محبت کرنے لگتے ہیں یہ محبت کا تعلق بہیمیت کے ضعیف ہونے کا اثر ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "روزہ دار کے منہ کی بدبو خدا تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے" اگر روزہ رسمی طور پر ہو، تاہم رسمی امور کے لحاظ سے مفید ہے۔ جب کوئی امت اس کی پابندی

کرتی ہے تو ان کے شیاطین زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں ان کے لئے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور جب کوئی انسان نفس کو مغلوب کرنے کی اور اس کی برائی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو عالم مثال میں اس کے عمل کی ایک مقدس صورت پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اذکیا عارفین اس صورت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو عالم غیب سے ان کو علمی مدد ملتی ہے اور تنزیہ و تقدیس کے ذریعہ سے ذات باری تعالیٰ سے اس شخص کو قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے یہی معنی ہیں "روزہ میرا ہے اور میں ہی اس کی جزا ہوں"۔ بسا اوقات انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ امور معاش میں مصروف ہونا اور خارجی باتوں سے خواہش کا پر ہونا اس کے لئے مضر ہے۔ اور ایک مسجد میں جو عبادت کے لئے ہی ہے یکسو ہو کر عبادت کرنا بہتر اور نافع ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے تو علیحدگی نہیں ہو سکتی لیکن اگر تمام کا تمام نہ ہو سکے تو بالکل ترک بھی نہ کرنا چاہئے۔

اس لئے اپنے اوقات میں کسی قدر فرصت نکال کر جتنا میسر ہے اعتکاف میں وقت گزارنا ہے۔ اس کے بعد اس شخص کی حالت ہے جس نے دلی شہادت سے مخبر صادق کے ذریعہ سے اعتکاف کی خوبی کو قبول کر لیا ہو، اس کے بعد وہ شخص ہے جس کو زبردستی اعتکاف کی طرف بلایا جاتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص روزہ تو رکھتا ہے لیکن زبان کو بغیر اعتکاف کے پاک وصاف نہیں رکھ سکتا۔ کبھی لیلۃ القدر اور اس میں فرشتوں کی ملاقات کا طالب ہوتا ہے یہ بھی بغیر اعتکاف کے میسر نہیں ہو سکتا۔ لیلۃ القدر کے معنی آپ کو عنقریب معلوم ہوں گے۔ واللہ اعلم

بارھواں باب: حج کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ حج کی حقیقت یہ ہے کہ صالحین کی ایک بڑی جماعت ایک وقت خاص میں جمع ہو کر انبیا اور صدیقین، شہدا اور صالحین کے حالات کو جن پر خدا نے اپنا انعام کیا ہے یاد کرے اور ایسی جگہ میں جمع ہوں جہاں خدا کی ظاہر نشانیاں موجود ہوں۔ ائمہ دین کی بڑی بڑی جماعتیں حج کے لئے گئی ہیں جن کا مقصود خدا کے شعائر کی تعظیم، خاکساری اور رغبت، خدا سے گناہوں کی معافی اور خیر کی امید تھی جب اس کیفیت سے لوگوں کی ہمتیں جمع ہوتی ہیں تو لازمی طور پر خدا کی رحمت اور

مغفرت ان پر نازل ہوتی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے ''کہ شیطان جیسا کہ عرفہ کے روز نہایت ذلیل، صغیر اور حقیر اور غصہ میں نظر آتا ہے ایسا کسی روز نظر نہیں آتا۔ حج کی اصل ہر قوم میں موجود ہے کیونکہ ہر قوم کے لئے ایک ایسی جگہ ضرور ہوتی ہے جس میں خدا کی آیات ظاہرہ دیکھ کر لوگ اس کو تبرک سمجھتے ہیں اور ہر امت میں نذر و قربانی اور ایک ہیئت خاص بھی ہے جو ان کے بزرگوں سے چلی آتی ہے اور وہ اس کا التزام کرتے ہیں کیونکہ یہ ہیئت (احرام و تلبیہ و ہدی وغیرہ) مقربین کو ان کا وہ کام جس میں وہ لگے ہوئے ہیں ہر وقت یاد دلاتی رہتی ہے اور بیت اللہ ہی حج کرنے کے قابل ہے، اس میں آیات بینات ہیں اس کو خدا کے حکم اور وحی سے صاف اور پاک زمین میں حضرت ابراہیمؑ نے بنایا ہے اس کی مدح اکثر اقوام کی زبان پر چلی آتی ہے کیونکہ سوائے اس جگہ کے اور کوئی ایسی جگہ جہاں لوگ جاتے ہیں، شرک سے یا بے اصل من گھڑت چیزوں سے خالی نہیں۔ طہارت نفسانی میں سے یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ رہنا اور ٹھیرنا اختیار کیا جائے جس کی صلحا ہمیشہ تعظیم کرتے رہے ہوں ذکر الٰہی سے اس کو معمور رکھا ہو کیونکہ اس مقام پر ملائکہ ارضیہ کی توجہات ہوتی ہیں اور اہل خیر کے حق میں ملأ اعلیٰ کی دعا نازل ہوتی رہتی ہے پس جب کوئی شخص اس جگہ میں ٹھیرتا ہے تو ان کے رنگ اس پر غالب آجاتے ہیں اور میں نے اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہے اور ذکر الٰہی کے قسم میں خدا کے نشانات کا دیکھنا اور ان کی تعظیم کرنا بھی داخل ہے پس ان چیزوں کے دیکھنے سے خدا اس طرح یاد آتا ہے جیسے ملزوم کے دیکھنے سے کوئی لازم چیز یاد آتی ہے بالخصوص ایسے وقت پر جبکہ تعظیمی حالتوں اور حدود کی پابندی کی جائے جن سے نفس کو کمال درجہ تنبیہ حاصل ہوتی ہے۔ اور کبھی انسان کو اپنے پروردگار کے دیدار کا شوق ہوتا ہے پس اس شوق کو پورا کرنے والی حج کے سوا اور کوئی چیز نہیں جس طرح پر ہر سلطنت کو ایک مدت کے بعد دربار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ سرکش اور فرمانبردار میں تمیز ہو، بادشاہت کی شہرت اور سلطنت کا بول بالا ہو اور اس کو ہر شخص جان جائے ایسے ہی مذہب کو حج کی ضرورت ہے تاکہ موافق اور مخالف میں تمیز ہو جائے اور دین الٰہی میں لوگوں کا گروہ ہو کر داخل ہونا عیاں ہو جائے۔ اور تاکہ ایک دوسرے سے مل کر ان فوائد کو حاصل کرے جو اس کو حاصل نہیں ہیں اس لئے کہ باہمی مقاصد ایک دوسرے کے ملنے ہی سے حاصل ہوتے ہیں اور رسمی حج بھی بہت سے رسمی فوائد کا

اضافہ کرتا ہے۔ائمہ دین کی حالت یاد کرنے اوراس کی پابند ہونے میں حج سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں ہےاور چونکہ حج میں دوردراز سفر کرنا پڑتا ہے وہ نہایت دشوار عمل ہے، جو بغیر مشقت کے پورا نہیں ہوتا ہے اس لئے اس کا ادا کرنا خالص اللہ کی عبادت ہے جس سے خطائیں معاف ہوتی ہیں وہ پچھلے گناہوں کوایسادور کرتا ہے جیسا کہ ایمان

تیرھواں باب: اقسام نیکی کے اسرار کا بیان

نیکی کے اقسام میں سے ذکر الہٰی ہے کیونکہ ذکر الہٰی اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے سو معرفت کی اصلاح کے لئے اور خدا کی حضوری حاصل کرنے کے لئے اور دل کی قساوت دور کرنے کے لئے کوئی چیز ذکر سے زیادہ مفید نہیں ہے چنانچہ اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے'' کیا تم کو سب اعمال میں افضل عمل نہ بتاؤں؟ ''الحدیث'' خصوصاً اس شخص کے لئے جس کی قوت بہیمی فطری طور پر یا عملاً ضعیف ہوتی ہے یا اس شخص کے لئے بھی جو فطرتاً اپنے خیال میں محسوس چیزوں کے احکام مجرد میں خلط ملط کر دیتا ہے۔اور انہیں اقسام میں سے دعا بھی ہے کیونکہ اس سے حضوری کا بڑادروازہ کھل جاتا ہے اور نہایت درجہ اطاعت اور پروردگار عالم کی طرف احتیاج کو داعی کے سامنے کر دیتی ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ'' دعا عبادت کا مغز ہے'' یہ دعا مبدا کی جانب متوجہ ہونے کی ظاہری صورت ہے جو درخواست کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اوراس چیز کے حاصل ہونے کی، جس کے لئے دعا مانگی گئی ہے، روح ہے۔ نیز بڑی نیکی تلاوت قرآن اوراس کی نصائح کا سننا ہے جو شخص توجہ سے اس کو سنے گا اوراس کو دل میں جگہ دے گا تو بیم وامید کی حالتیں، خدا کی عظمت میں حیرانی، اس کے احسانات میں استغراق کے اثرات پیدا ہو جائیں گے اور طبیعت کی پژمردگی سے نہایت درجہ نفع محسوس کرے گا اور عالم بالا کے اثرات حاصل کرنے کی استعداد پیدا کرلے گا اور اسی لئے آخرت میں وہ نہایت نافع ہے اور ملائکہ قبر کے اس قول سے یہی مراد ہے'' تو نے نہ حق کو جانا، نہ قرآن کی تلاوت کی'' قرآن کی تلاوت سے نفس کو سفلی کیفیتوں سے پاکی حاصل ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے'' ہر چیز کے لئے ایک خاص صیقل ہوتی ہے اور دل کی صیقل قرآن کا تلاوت کرنا ہے''۔اور نیز نیکیوں میں سے قرابت والوں اور ہمسایوں کے حقوق ادا

کرنا ہے۔ اہل شہر اور اہل مذہب کے ساتھ سلوک سے پیش آنا ہے اور غلاموں کو آزادی دینا ہے، ان امور سے رحمت اور اطمینان نازل ہوتا ہے، تدابیر دوم اور سوم کے انتظامات ان سے مکمل ہوتے ہیں اور ان ہی امور کی وجہ سے فرشتوں کی نیک دعا لگتی ہے۔ نیز نیکیوں میں سے جہاد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی برے آدمی سے جس کا نہ ہونا مصلحت کلیہ کے موافق ہے اور وہ جمہور کو ضرر پہنچاتا ہے ناراض ہو کر کسی نیک آدمی کے دل میں اس کے قتل کرنے کا الہام کرتا ہے اس کی طبیعت سے محض خدا کے لئے بغیر کسی سبب طبعی کے غصہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنے تمام ذاتی امور سے اس کام کے لئے علیحدہ ہو کر خدا کی مرضی میں ہمہ تن مصروف ہو کر خدا کی رحمت اور نور میں غرق ہو جاتا ہے اور اس موذی کو قتل کر کے تمام آدمیوں اور شہروں کو نفع پہنچاتا ہے اسی کے قریب یہ حالت بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی ایسی قوم کا برباد کرنا منظور ہوتا ہے جو ظالم، خدا کی منکر اور نہایت بدکار ہوتی ہے اس لئے کسی نبی کو جہاد کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس کی قوم کے دل میں جہاد کی خواہش پیدا کی جاتی ہے تاکہ سب قوموں میں اچھی قوم ہو جائے اور ان پر رحمت الٰہی ہو۔ اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ رائے کلی سے کسی قوم کو معلوم ہوتا ہے کہ مظلوموں کو درندہ خصلت لوگوں سے بچایا جائے اور نافرمانوں کو سزا دی جائے اور بری باتوں سے منع کیا جائے، ان کوششوں سے لوگوں میں امن واطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔

اور خدا اس قوم کو اس خدمت کا بدلہ دیتا ہے اور انہی میں سے تقریبات ہیں جو بلا قصد پیش آجاتے ہیں جیسے مصائب اور امراض، پس یہ امور چند وجوہ سے نیکی میں شمار ہوتے ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جب رحمت الٰہی انسان کی اصلاح عمل چاہتی ہے اور اسباب عالم کا مقتضی ہوتا ہے کہ اس کی حالت تنگ ہو جائے تو وہی رحمت اس کے تکمیل نفس کی باعث ہو کر اس کی خطاؤں کو مٹاتی ہے اور اس کے لئے حسنات لکھے جاتے ہیں جیسے کہ جب پانی کے جاری ہونے کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے اور پانی اس کے اوپر اور نیچے سے بہنے لگتا ہے تو یہ بہنا اس تنگی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور سر (راز) اس میں خیر نسبی پر مجازات رکھنا ہے اور ان امور میں کبھی اس وجہ سے نیکی آجاتی کہ جب مومن پر ایسی مصیبتیں پڑتی ہیں کہ زمین بھی اس پر تنگ ہو جاتی ہے تو اس وقت میں طبیعت اور رسم کا حجاب اٹھ جاتا ہے اور اس کا دل خدا کے سوا سب سے ہٹ جاتا ہے لیکن

کافر اپنی گم شدہ چیز کو ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہے اور اسی زندگی میں ڈوبا رہتا ہے حتیٰ کہ یہ مصیبت پڑنے سے اور بھی خبیث تر ہو جاتا ہے۔ اور کبھی وہ سختیاں نیکی کا باعث اس لئے ہوتی ہیں کہ تمام روکنے والی برائیاں غلیظ اور کثیف قوت طبعی میں جمع ہوتی ہیں پس جب یہ شخص بیمار ہوتا ہے اور کمزور ہو جاتا ہے اور جتنا کہ بدن کو پہنچتا ہے اس سے زیادہ مادہ تحلیل ہو جاتا ہے تو برائیوں کی قوت حاملہ بھی تحلیل ہو جاتی ہے اور بقدر قوت حاملہ کی تحلیل کے گناہ بھی کم ہو جاتے ہیں جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ مریض کی خواہش نفسانی، غصہ وغیرہ سب دور ہو جاتے ہیں اس کے اخلاق بدل جاتے ہیں اور وہ پچھلے امور کو ایسا بھول جاتا ہے کہ گویا اس میں وہ موجود ہی نہ تھے اور ایک صورت یہ ہے کہ جب مسلمان کی قوت بہیمی اس کی قوت ملکی سے آزاد ہوتی ہے تو دنیا ہی میں اس کے اکثر گناہوں پر مواخذہ ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ دنیا کی مصیبت مومن کے لئے عذاب ہے۔ واللہ اعلم۔

چودھواں باب: مراتب گناہ کا بیان

واضح ہو کہ جس طرح بہت سے عمل ہیں جو اطاعت کا جسم ہیں اور بہت سے طریقے ہیں جن سے اطاعت حاصل ہوتی ہے، جن سے قوت بہیمی کا قوت ملکی کے تابع ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایسے بھی اعمال، مواقع اور طریقے ہیں جن سے نافرمانی کی حالت معلوم ہوتی ہے، انہی امور کو گناہ کہتے ہیں ان گناہوں کے مختلف مرتبے ہیں۔ اول وہ گناہ ہیں جو انسانی کمال اور ترقی کا راستہ بالکل مسدود کریں، ایسے بڑے گناہ دو قسم کے ہیں۔ اول قسم خدا تعالیٰ سے متعلق ہے وہ یہ کہ اپنے رب کو ہی نہ پہچانتا ہو یا اس کا علم تو رکھتا ہو لیکن مخلوقین کے اوصاف اس میں ثابت کرتا ہو یا خدا کی صفات مخلوقین میں ثابت کرتا ہو۔ دوسری صورت تشبیہ کی ہے اور تیسری شرک کی، کیونکہ نفس اس وقت مقدس ہوتا ہے جب تجرد فوقانی کا اور تدبیر عام کا جو تمام عالم کو محیط ہو رہی ہے بصیرت کی آنکھ سے مطالعہ کرتا رہے جب اس قسم کا غور ضائع کر دے گا تو نفس اپنی ہی حالت میں مشغول رہے گا یا اپنی ہی جیسی حالت میں مقید رہے گا اور بیگانگی کا پردہ ذرا سا بھی نہ ہٹا سکے گا پس یہ سب سے بڑی بلا ہے اور دوسری قسم بڑے گناہ کی اس امر کا اعتقاد کرنا ہے کہ بجز اس بدنی زندگی کے اور کوئی زندگی نہیں ہے اور بدن کے لئے اور کوئی کمال دوسرا نہیں ہے جس کا طلب کرنا اس کے لئے ضروری ہو۔ پس جب دل میں یہ برا اعتقاد قائم ہوگا تو کمال کی طرف نظر نہ کرے گا اور جب کہ اس بات کا

ثبوت کہ نفس کے لئے کمال جسمانی کے علاوہ اور بھی کمال ہے، عام لوگوں کے لئے بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ وہ ایک ایسی حالت کا تصور کریں جو حالت موجودہ کے بالکل مخالف ہو کیونکہ اگر ایسی حالت کا تصور نہ کیا جائے گا تو انسان معقول کو چھوڑ کر محسوس ہی میں مشغول ہو جائے گا پس اس لئے ایک یاد دلانے والی چیز مقرر کی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے اور روز قیامت کے آنے پر ایمان لانا ہے چنانچہ اس آیت میں یہی مراد ہے اور جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ متکبر ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب انسان اس درجہ کے گناہ میں رہ کر مر جاتا ہے اور اس کی قوت بہیمی مضمحل ہو جاتی ہے تو نہایت درجہ کی نفرت آسمانی جانب سے اس کو لپٹتی ہے جس سے وہ کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اور دوسرا مرتبہ گناہ کا یہ ہے کہ قوت بہیمی کے غرور سے آدمی ان فضائل سے تکبر کرتا ہے جو خدا تعالیٰ نے لوگوں کے لئے اپنے کمالات تک پہنچنے کے لئے قرار دیئے ہیں۔ اور ملأ اعلیٰ نہایت اہتمام سے پیغمبروں اور شریعتوں کے ذریعہ سے ان کے شائع کرنے اور ان کی شان بلند کرنے کا قصد کرتے ہیں لیکن ایسا شخص ان امور کا انکار کر کے ان سے دشمنی کرتا ہے اور جب یہ مر جاتا ہے تو ملأ اعلیٰ کی تمام ہیئتیں اس سے نفرت کرتی ہیں اور اس کو عذاب دینے کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اس کے گناہ اس کو اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ پھر اس کو نکلنے کا موقع نہیں ملتا اور چونکہ وہ اپنے کمال کو نہیں پہنچتا اور اگر پہنچتا بھی ہے تو وہ پہنچنا قابل لحاظ نہیں ہوتا اس واسطے یہ حالت اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہ مرتبہ آدمی کو تمام مذاہب میں اپنے نبی کے طریقے سے باہر کر دیتا ہے۔

اور تیسرا مرتبہ گناہ کا یہ ہے کہ آدمی نجات کے کاموں کو ترک کر دے اور ایسے ایسے کام کرے جن کے کرنے والے پر لعنت مقرر ہے۔ یا تو ان کاموں کی وجہ سے زمین میں کسی بڑے فساد کا گمان غالب ہوتا ہے یا اس کی صورت تہذیب نفس کے بالکل خلاف ہوتی ہے اس کی چند صورتیں ہیں یا وہ شریعت کے ان احکام کی تعمیل نہ کرے جن سے فرمانبرداری حاصل ہوتی ہے یا فرمانبرداری کی کچھ نہ کچھ اس میں آمادگی پیدا ہوتی ہے شرائع کی تعمیل لوگوں کے لئے جداگانہ اور مختلف طور پر ہے جو لوگ بہیمیت میں ڈوبے ہوئے ہوں اور یہ قوت ان میں کمزور ہو ان کو تو احکام شرعیہ کی کثرت کی ضرورت ہوتی ہے اور جن میں یہ قوت شدید اور غلیظ ہوتی ہے ان کو اعمال شاقہ

کی کثرت کی ضرورت ہوا کرتی ہے ان اعمال میں سے بعض اعمال درندوں کے سے ہوتے ہیں جو بڑی لعنت کے مستحق ہوتے ہیں مثلاً قتل بعض اعمال شہوانی ہیں، بعض ضرر پہنچانے والے پیش رہیں جیسے جوا اور سود اور ان تینوں قسم کے گناہوں سے نفس میں بڑا رخنہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ ان امور میں راہ راست کے خلاف اقدام ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور ان گناہوں کے سبب سے ملأ اعلیٰ کی جانب سے ایسی لعنت پڑتی ہے جو انسان کا ہر طرف سے احاطہ کر لیتی ہے اس لئے ان دونوں کے ملنے سے عذاب حاصل ہوتا ہے یہ تیسرا مرتبہ سب گناہوں سے بڑا ہے۔ حظیرۃ القدس میں اس کی حرمت اور اس کے مرتکب پر لعنت قرار پا چکی ہے تمام انبیا ہمیشہ اس کو بیان کرتے آئے ہیں ان میں سے اکثر تمام شرائع میں متفق علیہ ہیں۔

چوتھا مرتبہ ان شرائع اور طریقوں کی نافرمانی کرنا ہے جو زمانہ اور اقوام کے بدلنے سے بدلتے جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف کوئی نبی مبعوث کرتا ہے تاکہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائے، ان کے نقص کی اصلاح کرے اور ان میں اچھے طور پر سیاست جاری کرے تو اس کے مبعوث ہونے میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ نہایت اہم امور جن کے بغیر ان کی اصلاح اور سیاست نہیں ہوسکتی واجب قرار پاتے ہیں اس لئے ہر ایک مقصد کے لئے ایک معیار دائی یا اکثری ضرور ہوتی ہے اس کے لحاظ سے ان سے مواخذہ اور خطاب کیا جاتا ہے۔ ہر ایک امر کے لئے اوقات متعین کرنے کے لئے ضروری قاعدے ہوا کرتے ہیں اور بعض امور کسی مصلحت یا فساد کی طرف داعی ہوتے ہیں تو ان کے بموجب حکم کیا جاتا ہے اور ان میں سے بعض امور کا مامور بہ اور منہی عنہ ہونا قطعی ہے اور بعض کا قطعی نہیں ہے۔ ان میں سے قلیل کے بارے میں وحی ظاہر نازل ہوئی ہے اور ان میں سے اکثر نبی کے اجتہاد سے ثابت ہوئے ہیں۔

پانچواں مرتبہ وہ ہے جس کی نسبت نہ تو شارع نے کچھ تصریح کی اور نہ ملأ اعلیٰ میں اس کا کوئی حکم ثابت ہوا لیکن بندہ جب خدا کی طرف اپنی پوری ہمت سے متوجہ ہوتا ہے تو اس کو قیاس یا تخریج وغیرہ سے کسی چیز کے مامور یا ممنوع ہونے کا گمان ہوتا ہے جس طرح بعض عوام کو ناقص تجربہ سے یا حکیم کے کسی علت پر حکم لگا دینے سے بعض دواؤں کی تاثیر معلوم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ نہ ان کو تاثیر

کی وجہ معلوم ہے نہ طبیب نے تصریح فرمائی ہے اس قسم کی چیزوں سے بھی انسان بغیر احتیاط برتے بری الذمہ نہیں ہوسکتا ورنہ اس کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان اس کے گمان کی وجہ سے ایک پردہ حائل ہوجائے گا اور وہ اس کی وجہ سے ماخوذ ہوگا۔ اس مرتبہ میں اصل خوشنودی کے قابل یہ ہے کہ ان چیزوں کو چھوڑ دے اور ان کی طرف بالکل توجہ نہ کرے لیکن بعض لوگ ایسی چیزوں کو از خود اپنے اوپر واجب کر لیتے ہیں پھر اس کے بموجب خدا تعالیٰ ان سے مطالبہ کرتا ہے چنانچہ اس بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں بندہ کے گمان کے موافق پیش آتا ہوں''۔ اور یہ آیت بھی اسی بارے میں وارد ہے ''رہبانیت جس کو انھوں نے خود ایجاد کرلیا ہے ہم نے ان پر اس کو اس لئے واجب کیا تھا کہ خدا کی رضامندی کی تلاش میں رہیں''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ خدا تم پر سختی کرے گا۔ اور فرمایا کہ گناہ وہی ہے جو تیرے دل میں برا اثر پیدا کرے، یہی حال اس حکم کی نافرمانی کا ہے جو کسی مجتہد کے اجتہاد سے ثابت ہوا ہو اور اسی مجتہد کا جس نے یہ حکم دیا ہے نافرمانی کرنے والا پیرو اور مقلد ہو۔ واللہ اعلم۔

پندرھواں باب: گناہوں کی خرابیوں کا بیان

واضح ہو کہ گناہ صغیرہ اور کبیرہ کا اطلاق دو لحاظ سے کیا جاتا ہے اوّل نیکی اور گناہ کی حکمت کے لحاظ سے دوم شریعتوں اور طریقوں کے لحاظ سے جو ہر زمانہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ نیکی اور گناہ کی حکمت کی نظر سے گناہ کبیرہ ایسے گناہ کو کہتے ہیں جس کے سبب سے قبر یا قیامت میں عذاب واجب یا ضروری ہوجائے اور تدابیر نافعہ میں بڑی خرابی پیدا کردے اور فطرت کے بالکل خلاف ہو اور صغیرہ گناہ وہ ہے جس میں امور بالا میں سے کسی امر کے ہونے کا شبہ ہو یا اکثر اوقات ان امور کی طرف مفضی ہو، یا ایک وجہ سے اس میں اس قسم کی کوئی خرابی پیدا ہوتی ہو اور دوسری وجہ سے وہ خرابی نہ پیدا ہوتی ہو، مثلاً کوئی شخص خدا کی راہ میں خرچ کرے اور گھر کے لوگ بھوکے رہ جائیں، تو اس نے بخل کا عیب تو دفع کیا لیکن خانہ داری کی تدبیر کو کھودیا۔ اور گناہ کبیرہ باعتبار شریعت کے وہ گناہ ہے جس کے حرام ہونے کی شارع نے تصریح کردی ہو یا اس کے مرتکب کے لئے دوزخی ہونے کی وعید کی گئی ہو یا اس پر کوئی حد مقرر کی ہو، یا اس فعل کی برائی کی شدت بیان کرنے کے لئے س کے مرتکب کو کافر، دائرۂ اسلام سے خارج کہا ہو، کبھی بعض امور نیکی اور گناہ کے لحاظ سے صغیرہ

ہوتے ہیں لیکن شریعت کے لحاظ سے وہی کبیرہ قرار پاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض گناہ صغیرہ یہاں تک رواج پا جاتے ہیں کہ وہ رسم ہو کر ان میں پھیل جاتے ہیں، ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں جب بھی وہ ان کے دلوں سے نہیں نکلتے، اس کے بعد زمانہ شریعت میں ان کی ممانعت ہوتی ہے لیکن وہ لوگ اس کام پر اڑ جاتے ہیں اس کے کرنے پر اصرار کرتے ہیں، شرع سے ان کے اصرار پر تہدید اور سختی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کا مرتکب شریعت کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ ایسے فعل کو وہی شخص کرتا ہے جو مردود اور سرکش ہو جس کو خدا سے اور لوگوں سے کسی قسم کی حیا نہ ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم ان گناہوں کی تفصیل جو شریعت کے لحاظ سے کبیرہ قرار دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی دوسری قسم میں بیان کریں گے، وہیں ان کے بیان کا موقع ہے لیکن ان گناہوں کی خرابیاں جو بر و اثم کی حکمت سے کبیرہ قرار دی گئی ہیں ہم یہیں بیان کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے انواع بر میں اس طور پر کلام کیا تھا۔

لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ کوئی شخص جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے بغیر توبہ کے مر جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں کہ خدا اس گناہ کو معاف کر دے، ہر فریق نے کتاب وسنت سے اپنے اپنے دلائل بیان کئے ہیں لیکن میرے نزدیک اس اختلاف کا حل یہ ہے کہ خدا کے افعال دو طرح پر ہیں اول وہ افعال جو بعادت استمراری ہوتے رہتے ہیں۔ دوم وہ جو خلاف عادت ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جو مسائل لوگوں کے سامنے ذکر کئے جاتے ہیں وہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک موافق عادت اور دوسری مطلق۔ اور تناقض کی شرط جہت کا ایک ہونا ہے جیسا کہ منطقیوں نے قضایا موجہ میں ذکر کیا ہے اور کبھی جب جہت کو ذکر نہیں کرتے تو وہاں قرائن کو دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے سو جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جو زہر کھائے گا مر جائے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عادت کے موافق زہر کا یہ اثر ضرور ہوگا اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ جو زہر کھائے وہ مر ہی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسا ہوگا تو خلاف عادت ہوگا پس ان دونوں قولوں میں جہت و اعتبار کے مختلف ہونے کی وجہ سے کوئی تناقض نہیں۔ اور جس طرح خدا تعالیٰ کے افعال دنیا میں عادت کے موافق اور عادت کے خلاف ہیں اسی طرح آخرت میں اس کے افعال عادت کے موافق اور عادت کے خلاف ہیں۔

پس عادت مستمرہ تو یہی ہے کہ وہ اس گنہ گار کو جو بغیر توبہ کے مر جائے ایک مدت دراز تک عذاب میں رکھے اور کبھی خلاف عادت بھی کر گزرتا ہے ایسے ہی حقوق العباد کا حال ہے اور صاحب کبیرہ کا ہمیشہ عذاب میں رہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بات خدا کی حکمت سے بہت بعید ہے کہ وہ صاحب کبیرہ سے ایسا ہی معاملہ کرے جو کافر کے ساتھ کرے گا یعنی دونوں کو مساوی کردے۔ واللہ اعلم۔

سولھواں باب: ان گناہوں کا بیان جو بندے کے نفس سے متعلق ہیں

واضح ہو کہ انسان کی قوت ملکیہ کا قوت بہیمیہ نے ہر طرف سے احاطہ کر رکھا ہے اس کی حالت اس پرندہ کے مانند ہے جو قفس میں بند ہے اس پرند کی خوش نصیبی اسی میں ہے کہ اس قفس سے نکل کر اپنے اصلی مکان کے چمن میں پہنچ جائے اور وہاں بیٹھ کر اچھے اچھے دانے اور عمدہ عمدہ پھل کھائے اور اپنے ہم جنس پرندوں میں مل کر خوشیاں منائے اسی طرح انسان کی حد درجہ بدنصیبی اس میں ہے کہ وہ دہریہ بن جائے۔ دہریہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ ان علوم فطریہ کا مخالف ہو جائے جو خدا تعالیٰ نے اس میں پیدا کئے ہیں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت میں مبدأ جل جلالہ کی جانب ذاتی میلان ہے اور نہایت درجہ اس کی تعظیم کرنے کی خواہش ہے، اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے "اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو اپنی جانوں پر گواہ کیا" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں کہ "سب کی پیدائش فطرت اسلام پر ہوئی ہے" اسی طرف اشارہ ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی بے انتہا تعظیم دل میں جب ہی راسخ ہوتی ہے کہ خدا کی نسبت اعتقاد کیا جائے کہ وہ اپنے قصد اور اختیار سے ہر قسم کا تصرف کرتا ہے اعمال کی جزا دیتا ہے ان کے لئے شریعت مقرر کرتا ہے جو شخص اس کا منکر ہو کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جس پر تمام ہستی کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، یا ایسا اعتقاد کرے کہ خدا تعالیٰ معطل ہے عالم میں کوئی تصرف نہیں کرتا یا تصرف کرتا ہے تو بلا قصد اور مجبورانہ کرتا ہے، یا وہ اپنے بندوں کے اچھے برے افعال کی جزا نہیں دیتا، یا وہ خدا تعالیٰ کو دیگر مخلوقات جیسا اعتقاد کرے یا اس کے سے صفات کا مخلوق میں اعتقاد کرے یا یہ اعتقاد کرے کہ خدا بندوں پر کسی نبی کی معرفت شریعت فرض نہیں کرتا پس ایسا ہی شخص دہریہ ہے جس کے دل میں نہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اور نہ اس کے فہم کو حظیرۃ القدس تک رسائی ہے وہ بمنزلہ ایک پرندے کے ہے جو اپنے قفس میں بند ہے جس میں سوئی

کے برابر بھی سوراخ نہیں مرنے کے بعد اس پر سب چیزیں ظاہر ہو جائیں گی اور کسی قدر قوت ملکی ظاہر ہوگی اور اس کے فطری میلان میں حرکت پیدا ہوگی لیکن پروردگار کے علم اور حظیرۃ القدس کی رسائی سے عوائق مانع ہوگے اور اس سے اس کے نفس میں نہایت وحشت کا جوش ہوگا اور اس ناپاک حالت پر باری تعالیٰ اور ملأ اعلیٰ کی نظر پڑے گی تو ناخوش اور حقارت کی نگاہ تند سے وہ دیکھا جائے اور ملائکہ کی طرف اس کو عذاب دینے کا الہام ہوگا اور وہ عالم مثال اور عالم خارجی میں عذاب پائے گا۔ اور اس میں بھی انسان کی بڑی بدبختی ہے کہ وہ کافر ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی اس شان سے تکبر کرے۔ جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ ''کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ'' اور شان سے مراد یہ ہے کہ عالم کے لئے حکمت الٰہی کے موافق دور اور طریقے معین ہوتے ہیں پس جب کوئی دور شروع ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ ہر آسمان میں اس کے احکام جاری کرتا ہے اور ملأ اعلیٰ کو مناسب تدابیر پر لگاتا ہے اور لوگوں کے لئے ایک شریعت اور مصلحت مقرر کرتا ہے۔

پھر خدا تعالیٰ ملأ اعلیٰ کو الہام کرتا ہے کہ عالم میں اس طریقہ کے پھیلانے پر متفق ہو جائیں پس ان کے اتفاق سے لوگوں کے دلوں پر الہام ہوتا ہے یہ مرتبہ شان کا، اسی قدیم مرتبہ کا پرتو ہے جس میں حدوث کا شائبہ بھی نہیں اور یہ بھی اس پہلے مرتبہ کی طرح باری تعالیٰ کے کمالات کو ظاہر کرنے والا ہے سو جو شخص اس شان کے خلاف ہو، اس سے بیزاری ظاہر کی اور لوگوں کو روکا تو اس پر ملأ اعلیٰ سے ایسی لعنت پڑتی ہے جو ہر طرف سے اس کا احاطہ کر لیتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کے عمل ضائع ہو جاتے ہیں، دل سخت ہو جاتا ہے اور اچھی باتوں کو جو اس کے لئے نفع بخش ہوں حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے ''جو لوگ ہماری کھلی نشانیوں اور ہدایت کو اس کے بعد بھی چھپاتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کے لئے کتاب میں صاف صاف بیان کر دیا ہے ان پر خدا اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں''۔ اور اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے ''خدا نے ان کے دلوں اور کانوں میں مہر لگا دی ہے پس یہ شخص اس پرندہ کے مانند ہے جو ایسے قفس میں بند ہے جس میں سوراخ ہیں لیکن اس کے اوپر بڑا غلاف پڑا ہوا ہے۔ اس دہریہ اور کافر سے کم مرتبہ میں وہ شخص ہے جو توحید اور تعظیم الٰہی کا اعتقاد تو ٹھیک رکھتا ہے لیکن نیکی اور گناہ کی حکمت کے لحاظ سے جن احکام کا حکم دیا گیا تھا اس نے ان کی تعمیل نہیں کی، اس کی مثال ایسے

شخص کی سی ہے جو شجاعت کو اور اس کے فائدہ کو تو جانتا ہے لیکن یہ صفت شجاعت اس میں حاصل نہیں ہے کیونکہ شجاعت کا جاننا اور ہے اور صفت شجاعت کا حاصل ہونا اور ہے یہ شخص اس سے اچھا ہے جو شجاعت کے معنی بھی نہیں جانتا۔ اس کی حالت اس پرندہ کی سی ہے جو ایسے قفص میں ہے جس میں سوراخ ہیں وہ سبزہ زار اور میوہ جات کو دیکھتا ہے، مدتوں وہاں رہ چکا تھا لیکن اب آ پھنسا پس اسی کے شوق میں بازو پھڑ پھڑاتا ہے اور سوراخوں میں چونچ ڈال دیتا ہے لیکن باہر نکلنے کا راستہ نہیں پاتا، نیکی اور گناہ کی حکمت کے لحاظ سے کبائر یہی ہیں۔ اور اس شخص سے بھی کمتر درجہ اس شخص کا ہے جس نے تمام احکام کی بجا آوری تو کی لیکن ان شرائط کے ساتھ نہیں کی جو ان کے لئے ضروری ہیں، پس اس کی مثال اس پرندہ کی ہے جو ایک شکستہ قفص میں بند ہے جس میں سے بدقت نکل سکتا ہے جب تک جلد میں خراش نہ ہو اور پر نچ نہ جائیں وہاں سے نکلنا متصور نہیں۔ پس وہ بڑی جدوجہد سے باہر نکل سکتا ہے لیکن چونکہ اس کے پروں میں اور بازو میں نکلتے وقت خراش پہنچی ہے اس لئے اپنا ابنا جنس کے ساتھ نہ باغ کے پھل کھا سکتا ہے نہ ان کے ساتھ مل کر خوشیاں منا سکتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اعمال صالحہ کے ساتھ برے اعمال بھی کئے ہیں ان کے لئے عوائق اور مانع وہ گناہ ہیں جو نیکی اور گناہ کی حکمت کے اعتبار سے صغیرہ گناہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پل صراط کی حدیث میں ان تین کی طرف اشارہ کیا ہے، آپ نے فرمایا بعض لوگ پل صراط سے گر کر جہنم میں چلے جائیں گے، بعض زخمی ہو کر نجات پالیں گے اور بعض کو آگ کی لپیٹ کے بعد نجات مل جائے گی۔ واللہ اعلم۔

سترھواں باب: ان گناہوں کا بیان جن کا تعلق لوگوں سے ہوتا ہے

واضح ہو کہ حیوانات کی قسمیں مختلف ہیں بعض تو ایسے ہیں جو کیڑوں کی طرح زمین میں پیدا ہوتے ہیں ان کا حق یہ ہے کہ پروردگار صور کی طرف سے یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ کیسے اپنی غذا حاصل کریں ان کو تدبیر منازل کا الہام نہیں ہوتا۔ اور بعض حیوانات ایسے ہیں کہ ان میں توالد و تناسل ہوتا ہے بچوں کی پرورش میں نر و مادہ مل کر باہم ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں ان کے لئے حکمت الٰہی سے تدبیر المنزل کی نسبت بھی الہام ہوتا ہے۔ پس پرندوں کو یہ الہام ہوتا ہے کہ کس طرح سے غذا حاصل کریں، کس طرح سے پرواز کریں اور یہ کہ کیسے وہ جفتی کریں، کیسے اپنا آشیانہ

بنائیں اور اپنے بچوں کو کیسے پرورش کریں۔ ان سب حیوانات میں انسان مدنی الطبع ہے وہ اپنی بنی نوع کی دستگیری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ نہ وہ گھاس کھا سکتا ہے، نہ کچے پھل کھا کر جی سکتا ہے اور نہ پشم سے اپنے اندر گرمی پیدا کر سکتا ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے امور ہیں جن کو ہم بیان کر چکے ہیں، انسان کا حق ہے کہ خانہ داری کی تدابیر اور آداب معاش کے ساتھ سیاست مدن کا بھی الہام کیا جائے۔ انسان اور حیوانات میں فرق اس قدر ہے کہ اور حیوانات کو ضرورت کے وقت طبعی الہام ہوتا ہے اور انسان پر علوم معیشت کے ایک مختصر حصہ کا الہام ہوتا ہے مثلاً یہ الہام ہوتا ہے کہ دودھ پیتے وقت پستان کو کیسے چوستے ہیں، آواز کی تنگی کے وقت کیسے کی سنتے ہیں، دیکھنے کے وقت پلکوں کو کیسے کھولتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا خیال خود ہر ایک چیز کو بنانا اور اہتمام کرتا ہے۔ وہ تدبیر منزل اور سیاست مدن کے علوم و رسوم و رواج سے اور ان لوگوں کی پیروی سے حاصل کرتا ہے جن کی ملکی روشنی سے خدا تائید کرتا ہے۔ یہ روشنی ان علوم میں ظاہر ہوتی ہے جو وحی کے ذریعہ سے ان کو معلوم ہوتے ہیں، نیز تجربہ اور تدابیر غیبی سے وہ ان علوم کو حاصل کرتا ہے۔ نیز وہ خود غور کر کے قیاس اور برہان سے ان کو معلوم کرتا ہے اور اس کی مثال اس امر کے حاصل کرنے میں جس کا فیضان باوجود اختلاف استعداد کے باری الصور کی جانب سے ضروری ہوتا ہے۔ خواب کی سی ہے۔ جیسے خواب میں انسان کو علوم فوقانی حاصل ہوتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مناسب چیزوں کی صورتوں میں متشکل ہو کر نظر آتے ہیں۔ ان کی صورتیں مفیض کی وجہ سے نہیں بلکہ لوگوں کی حالت کی وجہ سے مختلف ہوتی ہیں۔

ان علوم میں سے جو تمام افراد انسانی کو عطا ہوتے ہیں خواہ وہ عرب ہوں یا عجم، شہری ہوں یا بدوی گو ان کے حاصل ہونے کا طریقہ مختلف ہو، چند خصائل کا حرام ہونا ہے جن کی وجہ سے تمام انتظام بلاد درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے خصائل تین قسم کے ہیں۔ شہوانی اعمال، درندوں کے سے اعمال، باہمی بدمعاملگی۔ ان کے حرام ہونے کی دلیل یہ ہے کہ انسان اپنے بنی نوع کے ساتھ شہوت، غیرت اور حرص کے اوصاف میں شریک ہے اور جیسے قوی بہائم کو مادہ کی طرف میلان ہوتا ہے وہ دوسرے کی مداخلت کو اپنے جوڑے میں گوارہ نہیں کرتے، ایسے ہی قوی انسانوں کی طبیعت ہوتی ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ نر بہائم باہم لڑنے لگتے ہیں جو زور آور تیز ہوتا ہے وہ کمزور پر غالب

ہو جاتا ہے دوسرا اس کے سامنے سے بھاگ جاتا ہے، یا جفتی کرتے ہوئے نہ دیکھنے کی وجہ سے اس کو مزاحمت کرنے کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ اور انسان نہایت زیرک پیدا کیا گیا ہے اٹکل سے چیزوں کو ایسا معلوم کر لیتا ہے گویا ان کو دیکھ رہا ہے یا سن رہا ہے اور اس کو الہام سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایسے امور میں لڑنے جھگڑنے سے شہر ویران ہو جائیں گے کیونکہ شہروں کی آبادگی بغیر باہمی تعاون کے نہیں ہو سکتی اور اس تعاون اور مدد میں بہ نسبت عورتوں کے زیادہ دخل قوی مردوں کو ہے اس لئے یہ الہام الٰہی ان میں یہ خیال پیدا کیا گیا کہ ہر شخص اپنی ہی بیوی سے کام رکھے اور اپنے بھائی کی بیوی سے مزاحمت نہ کرے۔ حرمت زنا کی وجہ یہی ہے۔ اور زوجات کے مخصوص ہونے کی صورت رسوم اور شرائع سے تعلق رکھتی ہے نیز انسانوں میں مرد، نر بہائم سے اس بات میں بھی مشابہ ہیں کہ فطرت سلیمہ کی حالت میں مرد کی رغبت عورت کی جانب رہتی ہے جس طرح بہائم میں سے نر سوائے مادینوں کے کسی سے مانوس نہیں ہوتا البتہ جن لوگوں پر ناپاک خواہش نفسانی غالب ہوتی ہے ان کا مزاج ایسا فاسد ہو جاتا ہے جیسے کسی کو مٹی یا کوئلہ کھانے میں مزا معلوم ہوتا ہے وہ سلامتی فطرت سے بالکل نکل جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی خواہش نفسانی مردوں سے پوری کرتے ہیں اور یہ مغتلم ایسی لذت حاصل کرتا ہے جو سلیم الطبع لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی۔

پس ان عادات کی وجہ سے ان کا مزاج بدل جاتا ہے ان کے دل روگی ہو جاتے ہیں اور نیز ان عادات سے نسل انسانی کی بیخ کنی ہوتی ہے کیونکہ جب اس نے اپنی اس حاجت کو جس کو خدا نے نسل پھیلانے کے لئے پیدا کیا ہے مخالف طریقہ سے پورا کیا تو خدائی انتظام میں خلل انداز کی اس لئے ان افعال کا مذموم ہونا لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو گیا ہے اسی وجہ سے فاسق، فاجر اس کام کو خاموشی سے کرتے ہیں اور اس میں اپنی شہرت نہیں چاہتے اور اگر ان کی طرف ایسے افعال کی نسبت کی جائے تو شرم کے مارے مر جائیں، ہاں انسانیت سے جب وہ بالکل نکل گئے ہوں تو برملا ایسے افعال عمل میں لاتے ہیں۔ جب یہاں تک نوبت پہنچ جائے تو غضب الٰہی نازل ہونے میں کچھ بھی دیر نہ ہوگی جیسا کہ سیدنا لوط علیہ السلام کے وقت میں ہوا اور یہی وجہ حرمت لواطت کی ہے اور چونکہ لوگوں کی معاش، خانگی تدبیر اور سیاست مدن بغیر عقل اور تمیز کے مکمل نہیں ہو سکتیں اور ہر وقت کی شراب خوری انتظام کے لئے سخت مخل ہے، جنگ و جدل اور کینہ پیدا کرتی

ہے لیکن بعض لوگوں پر بیہودہ خواہش غالب آئیں انھوں نے اس رذالت کو اختیار کیا اور انتظامی تدابیر کو تلف کیا۔ اگر ان کو اس فعل بد سے روکنے کا قانون نہ ہوتا تو سب لوگ ہلاک ہو جاتے یہی وجہ دائم الخمری کے حرام ہونے کی ہے لیکن اس کے کم وزیادہ حرام ہونے کو، پس وہ ہم شرائع کی بحث میں بیان کریں گے۔

اور جس طرح نر بہائم میں اس چیز پر غصہ کرنیکا مادہ ہوتا ہے جو ان کو اپنے مقصود سے باز رکھے یا کوئی نفسانی یا بدنی تکلیف ان کو پہنچائے اسی طرح لوگوں میں بھی اس قسم کا مادہ ہوتا ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ بہائم محسوس یا موہوم مقصود کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انسان محسوس اور معقول دونوں کی جستجو کرتا ہے اور بہ نسبت بہائم کے آدمی میں حرص کا مادہ زیادہ ہے اور بہائم آپس میں لڑتے ہیں جب ان میں سے کوئی بھاگ جاتا ہے تو ان کی طبیعت میں کینہ باقی نہیں رہتا۔ ہاں بعض بہائم ایسے ہیں جن میں کینہ کا اثر بعد کو بھی رہتا ہے۔ جیسے اونٹ، بیل، گھوڑا، لیکن آدمی اپنی عداوت کو نہیں بھولتا پس اگر انسانوں میں باہم جنگ جاری رہے تو تمام شہر برباد ہو جائیں اور تمام امور معاش مختل ہو جائیں۔ اس واسطے قتل اور زدوکوب کے حرام ہونے کا ان کو الہام ہوا ہاں کسی مصلحت عظیمہ کی وجہ سے جائز ہے جیسا کہ قصاص وغیرہ میں ہوتا ہے اور کبھی لوگوں کے دلوں میں قاتلین کی طرح کینہ کا جوش پیدا ہوتا ہے اور قصاص کا ان کو اندیشہ ہوتا ہے پس ایسے لوگ کھانے میں زہر دیکر یا سحر سے مارنے کی فکر کرتے ہیں اس کا حال بھی قتل کا سا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے قتل تو برملا ہوتا ہے اس سے انسان بچ سکتا ہے لیکن اس سے بچنا مشکل ہے اور کبھی متہم کر کے قتل کروا دینے کی غرض سے بادشاہ کے پاس چغل خوری کی جاتی ہے اور معاش کے طریقے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے یہی قرار دیئے ہیں کہ مباح زمین میں سے کوئی چیز حاصل کریں اس میں مویشی چرائیں یا زراعت وتجارت وغیرہ سے معاش پیدا کریں۔ شہر اور مذہب کا انتظام کریں جو پیشے ان کے علاوہ ہیں ان کے لئے تمدن میں کوئی جگہ نہیں لیکن بعض لوگ برے پیشے اختیار کر لیتے ہیں جن سے ضرر پہنچتا ہے مثلاً چوری اور غصب، ان سے شہر تباہ ہو جاتے ہیں، اس واسطے خدا نے لوگوں کو اپنے الہام سے ان سب مضر پیشوں کو حرام ہونا تلقین کیا ہے تمام بنی آدم انکی حرمت پر متفق ہیں گو سرکش لوگ ان کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن انصاف پسند سلاطین ان کو مٹانے اور دور کرنے

کی کوشش کرتے ہیں اور جب بعض نے یہ سمجھا کہ سلاطین ان کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو انھوں نے جھوٹے دعاوی، جھوٹی قسمیں، جھوٹے گواہوں کا پیشہ اختیار کر لیا۔

ناپ تول میں کمی کی، جوا کھیلنا اختیار کیا، دو چند، سہ چند سود کھانے لگے ان سب امور کا حکم بھی انہی مضر پیشوں کا سا ہے اور خراج زیادہ لینا بھی بمنزلہ رہزنی کے ہے بلکہ اس سے بدتر ہے بہر حال انہیں اسباب سے لوگوں کے دلوں میں ایسے امور کی حرمت آ گئی ہے۔ جو لوگ زیادہ عقل مند، سلیم الرائے، مصالح عامہ کے زیادہ واقف ہوتے ہیں وہ ہمیشہ قرناً بعد قرن ان سے منع کرتے آئے ہیں یہاں تک کہ یہ عام رواج ہو کر بدیہیات اولیہ میں بمنزلہ دیگر مشہورات کے شامل ہوگئیں۔ پس اس وقت ان کا اثر ملأ اعلیٰ کی طرف پہنچتا ہے جس طرح سے ملأ اعلیٰ کی طرف سے اولاً یہ الہام ہوا تھا کہ یہ چیزیں حرام ہیں اور یہ نہایت مضر ہیں اس لئے جب کوئی شخص ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے تو ملأ اعلیٰ کو سخت اذیب ہوتی ہے جس طرح کہ کوئی شخص انگارے پر پاؤں رکھتا ہے تو فوراً اسی لمحہ میں قوائے ادراکیہ تک اس کا اثر منتقل ہو جاتا ہے، اور اس سے تکلیف پاتا ہے۔

پھر ملأ اعلیٰ کے ایذا پانے سے خطوط شعاعیہ پیدا ہوتے ہیں جو اس عاصی کو گھیر لیتے ہیں، اور ملائکہ وغیرہ مستعدین کے دلوں میں یہ الہام ہوتا ہے کہ اس کو ایذا پہنچائیں اور وہ مصلحت جو اس کے حق میں مقرر ہو چکی ہے جس کو شرع میں الہام ملائکہ کہتے ہیں کہ اس قدر اس کا رزق ہے اور اس قدر عمر ہے اور فلاں وقت تک زندگی ہے اور وہ نیک ہے یا برا ہے اور جس کو نجوم میں احکام طالع کہتے ہیں اس کے حق میں وسیع کر دی جاتی ہے پس جب مر جاتا ہے اور وہ مصلحت پوری ہو جاتی ہے تو اس کے لئے خدا تعالیٰ فارغ ہوتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے ''اے انس و جن! میں تمہارے لئے عنقریب فارغ ہونے والا ہوں''۔ اور اس کو پوری پوری جزا دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا مبحث

سیاست مذہبی کا بیان

پہلا باب: مذہبی رہنماؤں اور مذہب کے قائم کرنے والوں کی ضرورت کا بیان

خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''بیشک تو ڈرانے والا ہے اور ہر ایک قوم کے لئے کوئی نہ کوئی رہبر ہوا کرتا ہے''۔ واضح ہو کہ وہ طریقے جن سے قوت بہیمیت، قوت ملکی کی مطیع ہو جاتی ہے اور وہ گناہ جو قوت ملکی کے بالکل مخالف ہیں اگر چہ عقل سلیم ان کو جان سکتی ہے اور ان طریقوں کے فوائد اور ان گناہوں کی مضرتوں کو پہچان سکتی ہے لیکن اکثر لوگ ان سے غافل ہیں کیونکہ ان کی سمجھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اس لئے ان کی وجدانی قوت صفراوی آدمی کی طرح بگڑ جاتی ہے پس مقصود حالت اور اس کی منفعت اور اندیشناک حالت اور اس کی مضرت ان کے خیال میں نہیں آتی اس لئے تمام لوگوں کو ایک ایسے واقف کی ضرورت ہے جو رہنمائی کے قوانین کو خوب جانتا ہو، لوگوں کا انتظام کرے ان کو اچھی باتوں کا حکم کردے، ان کو ہدایت کر کے آمادہ کرے اور ان قوانین کی مخالفت سے باز رکھے۔ بعض لوگوں کی رائے ایسی فاسد ہوتی ہے کہ وہ طریقہ مطلوب کے خلاف ہی قصد کرتے ہیں اس لئے وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں پس قوم کی اصلاح ایسے خیالات کے مٹائے بغیر نہیں ہوتی۔ اور بعض لوگ ایسے ہی کہ ان کی رائے کسی قدر ٹھیک ہوتی ہے، ان کو ہدایت کا بہت مختصر سا حصہ حاصل ہوتا ہے اس لئے چند امور ان کی یاد میں رہتے ہیں اور بہت سے امور ان کی نظر سے چوک جاتے ہیں یا ان کو خیال ہوتا ہے کہ وہ فی نفسہ بڑے کامل ہیں، ان کو کسی مکمل کی حاجت نہیں ہے اس لئے ان کی اصلاح کے واسطے ایسے ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے ان کو جہل پر مطلع کردے، الختصر لوگوں کو ایسے کامل اور عالم کی ضرورت

ہے جو غلطیوں سے محفوظ ہو اور جب کہ شہر، باوجودیکہ اس کے اکثر باشندے عقل معاش رکھتے ہیں جو تمدن کی اصلاحات اور انتظامات مستقل طور پر معلوم کر سکتے ہیں ایک ایسے شخص کا ضرورتمند ہے جو تمدن کی مصلحتوں سے بخوبی واقف ہو۔ لوگوں کی سیاست شائستگی سے کر سکتا ہو۔ تو پھر جب ایسا فرقہ ہو جن میں مختلف استعدادیں ہوں اور ایسے طریقے کے بارے میں ہو کہ اس کو دلی شہادت سے وہی لوگ قبول کر سکیں جو نہایت زیرک ہوں۔ ان کی فطرت علائق سے صاف ہو، کامل تجربہ ان کو حاصل ہو، اس طریقہ کی رہبری صرف انہی کو ہو سکتی ہے جو انسانی طبقہ میں اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں، حالانکہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔ تو ایسی حالت میں کیونکر کامل کی حاجت نہ ہوگی اور اسی طرح جبکہ آہنگری اور نجاری وغیرہ پیشے عامل لوگوں کو بغیر سلف کے طریقوں کی پیروی کے اور بغیر اساتذہ کی رہبری کے حاصل نہیں ہو سکتے تو آپ ان عمدہ مطالب کے متعلق کیا گمان کر سکتے ہیں جن کو سوائے اہل توفیق کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا اور جن کی طرف سوائے مخلصین کے اور کوئی رغبت نہیں کرتا۔

پھر ایسے عالم کے لئے ضروری ہے کہ برملا لوگوں کے سامنے یہ ثابت کر دے کہ وہ راہِ راست کا عالم ہے، اپنے اقوال میں خطا اور گمراہی سے معصوم اور محفوظ ہے اور وہ اس سے بھی محفوظ ہے کہ اصلاح کے ایک حصہ کو اختیار کرے اور دوسرے ضروری حصہ کو ترک کر دے، اس کی دو صورتیں ہیں (۱) یہ کہ یہ کسی ایسے شخص سے کلام کو نقل کرے جس پر سلسلۂ کلام کا ختم ہوتا ہے کیونکہ لوگ اس کے کمالات اور عصمت پر متفق ہوتے ہیں اور لوگوں میں اس کی روایت محفوظ ہوتی ہے پس وہ انہی کے اعتقاد کے موافق لوگوں سے مواخذہ کرتا ہے اور ان ہی کی دلیل پیش کر کے ان کو ساکت کر دیتا ہے۔ یہ کہ خود یہ وہ شخص ہو جس پر بات ختم ہو جائے اور وہ سب کا متفق علیہ ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لوگوں کے واسطے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو معصوم ہو اور اس کی عصمت پر سب کا اتفاق ہو یا اس سے روایت محفوظ ہو۔ اب رہا اس بات کا معلوم کرنا کہ اس شخص کو اطاعت کے علوم حاصل ہیں اور ان سے اچھے طریقے پیدا ہوتے ہیں اور یہ شخص ان طریقوں کی بھلائی، برائی کی وجوہات سے واقف ہے، سو یہ بات نہ تو دلیل سے معلوم ہوتی ہے نہ اس عقل سے جو معاش سے تصرف کرتی ہے اور نہ حس سے بلکہ یہ وہ امور ہیں جن کو خاص وجدان ہی جانتا ہے۔ پس جس طرح بھوک، پیاس اور دوا حار یا بارد کی تاثیر بغیر وجدان کے معلوم نہیں ہوتی اسی

طرح سے کسی شئے کا روح کے موافق یا مخالف ہونا بغیر ذوق سلیم کے دریافت نہیں ہوسکتا اور اس شخص کے خطا سے محفوظ ہونے کی صورت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی ذات میں علم بدیہی پیدا کرتا ہے کہ وہ چیزیں جن کا اس نے ادراک کیا ہے بالکل حق اور واقع کے مطابق ہیں جیسے کہ دیکھنے والوں کو دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کو کچھ احتمال نہیں ہوتا کہ میری بینائی میں کچھ فرق ہے، یا خلاف واقع چیزوں کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اور جیسے زبان کے موضوع الفاظ کا علم ہوتا ہے مثلاً عربی داں کو اس میں شک نہیں ہوتا کہ 'ماء' (پانی) اس عنصر کے لئے موضوع ہے اور 'ارض' (زمین) کا لفظ اس عنصر کے لئے موضوع ہے حالانکہ اس علم کے لئے نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ اس لفظ اور معنی میں کوئی لزوم عقلی ہے تاہم خدا تعالیٰ ان امور کا بدیہی علم طبیعتوں میں پیدا کرتا ہے۔ اور اکثر لوگوں میں یہ علم اس طرح سے پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نفوس میں ایک ملکۂ جبلیہ ہوتا ہے جس سے ان کو صحیح صحیح طریقہ پر ہمیشہ علم وجدانی حاصل ہوتا رہتا ہے اور وہ تجربہ سے اپنے وجدان کو صحیح اور سچا پاتے اور عام لوگوں کو اس رہبر کے معصوم ہونے کا اس طرح سے علم ہوتا ہے کہ ان کو بہت سی یقینی یا مشہور دلائل سے خوب ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جن امور کی طرف ہم کو بلاتا ہے وہ سب حق ہیں اور اس کی عادت حمیدہ سے جھوٹ بولنا بعید ہے۔ اور کبھی اس کے معصوم ہونے کا اس طرح علم ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں تقرب کے آثار دیکھتے ہیں، معجزات اس سے صادر ہوتے ہیں، اس کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں جن سے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جن امور کی طرف ہم کو بلاتا ہے وہ سب حق ہیں اور اس کی عادت حمیدہ سے جھوٹ بولنا بعید ہے۔

اور کبھی اس کے معصوم ہونے کا اس طرح علم ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں تقرب کے آثار دیکھتے ہیں، معجزات اس سے صادر ہوتے ہیں، اس کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں جن سے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ سماوی تدابیر میں اس کا بڑا مرتبہ ہے اور اس کا نفس ان نفوس قدسیہ میں سے ہے جو ملائکہ سے ملحق ہیں، ایسے شخص سے کبھی یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا کی طرف جھوٹی بات منسوب کرے اور کسی گناہ کو عمل میں لائے۔ اس کے بعد اس شخص سے ایسے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ باہم مجتمع ہو کر اس شخص کو اپنے مال سے، اولاد سے اور سرد پانی سے جس کو پیاس کے وقت دوست رکھتے ہیں، زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ بغیر ایسے شخص کے کسی فرقہ اور قوم میں حالت مقصودہ کا

رنگ نہیں چڑھ سکتا ہے اسی وجہ سے لوگ اس قسم کی عبادت میں مصروف رہا کرتے ہیں اور اپنے تمام امور کی ایسے شخص کی طرف نسبت کرتے ہیں جس میں ایسے امور کے ہونے کا ان کو اعتقاد ہوا کرتا ہے خواہ اس اعتقاد میں وہ صحیح ہوں یا غلط۔ واللہ اعلم۔

دوسرا باب: نبوت کی حقیقت اور اس کے خواص کا بیان

واضح ہو کہ انسانی طبقوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کے لوگ اہل فہم ہیں یہ لوگ اہل اصطلاح ہوتے ہیں ان کی ملکی قوت نہایت بلند ہوتی ہے یہ لوگ حقانی خواہش سے انتظام مقصود کے قائم کرنے پر آمادہ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ملأ اعلیٰ سے ان پر علوم اور احوال الٰہیہ نازل ہوتے ہیں۔ مفہم کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مزاج خلقت اور خلق میں اعتدال اور تناسب ہو نہ اس میں جزئی رایوں کے اعتبار سے بیتابی ہو اور نہ ایسے پرلے درجہ کی ذکاوت ہو کہ کلی سے جزئی کو اور روح سے صورت کو معلوم نہ کر سکے اور نہ ایسا غبی ہو کہ جزئی سے کلی کی طرف اور صورت سے روح کی جانب منتقل نہ ہو سکے۔ اور سب لوگوں میں راہ راست کا زیادہ التزام رکھنے والا ہو، عبادت میں ہمیشہ مصروف ہو، لوگوں کے ساتھ معاملات میں انصاف کو پسند کرتا ہو، منفعت عام میں راغب رہتا ہو، کسی شخص کو ایذا نہ دیتا ہو، ہاں اگر تکلیف اور ایذا پر عام نفع موقوف ہو یا نفع عام کو ایذا لازم ہو تو البتہ اس سے ایذا پہنچ سکتی ہے عالم غیب کی جانب ہمیشہ اس کا میلان رہتا ہو، اس میلان کا اثر اس کی بات میں، چہرہ میں اور ہر کام میں محسوس ہوتا ہو اس کے ہر پہلو سے معلوم ہوتا ہو کہ عالم غیب سے اس کو تائید پہنچتی ہے، ادنیٰ ریاضت سے اس کو ایسا قرب اور تسکین حاصل ہو جو دوسروں کو بڑی ریاضت اور عبادت سے حاصل نہ ہو، مفہمین کی چند قسمیں ہیں اور ان کی استعدادیں مختلف ہیں۔ پس جس کی اکثر یہ حالت ہو کہ خدا کی جانب سے ان علوم کو اخذ کرتا رہے۔ جن سے عبادتوں کے ذریعہ سے نفس میں تہذیب پیدا ہوتی ہے اس کو کامل کہتے ہیں۔ اور جس کا اکثر حال یہ ہو کہ اخلاق حمیدہ اور تدبیر منزل وغیرہ چیزوں کے علوم حاصل کرتا ہو تو وہ حکیم ہے اور جس کے اکثر احوال یہ ہوں کہ وہ سیاست کلیہ کو حاصل کرے پھر اس کو لوگوں میں عدل کرنے اور ظلم کے مٹانے کی توفیق ہو تو وہ خلیفہ ہے اور جس کو ملأ اعلیٰ کی حضوری ہو، یہ فرشتے اس کو تعلیم دیں، اس سے خطاب کریں اور اس کو آنکھوں سے نظر آئیں اور مختلف قسم کی کرامتیں اس سے ظاہر ہوں اس کا نام مؤید بروح

القدس ہے۔ اور جس کی زبان اور دل پرنور ہوں، جس کی صحبت اور نصیحت سے لوگ نفع حاصل کریں اور پھر وہی تسلی اور نور اس کے خاص صحابہ اور حواریئں میں منتقل ہو، وہ اس کے ذریعہ سے کمال درجات تک پہنچ جائیں، اس کو ان کی ہدایت اور رہبری کی نہایت ہی حرص ہو تو اس کو ہادی مزکی کہتے ہیں۔ اور جس کا بڑا حصہ علمی مذہب کے قواعد اور مصالح ہوں وہ اس کا زیادہ مشتاق ہو کہ ان علوم کو قائم کرے جو محو ہو گئے ہیں تو اس کو امام کہتے ہیں۔ اور جس کے دل میں القا کیا گیا ہو کہ لوگوں کو ان مصائب کا حال بتادے جو دنیا میں ان کے لئے مقدر ہیں، یا کسی قوم کے ملعون ہونے کو معلوم کر کے ان کو اس کی اطلاع دے، یا بعض اوقات تجرید نفس کی حالت میں ان واقعات کو اس نے معلوم کیا جو قبر اور حشر میں لوگوں کو پیش آنے والے ہیں اور یہ اس قسم کے حالات لوگوں کو بتائے تو اس کو منذر کہتے ہیں۔

جب حکمت الٰہی کا اقتضا ہوتا ہے کہ کسی مفہم کو لوگوں کی طرف بھیجے تو خدا تعالیٰ اس شخص کے باعث سے لوگوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ بندوں پر خدا کا فرض ہوتا ہے کہ اپنی زبانوں اور دلوں سے اس کے آگے سر بہ تسلیم ہوں، ملأ اعلیٰ کو اس کی تاکید ہوتی ہے کہ اس کے فرمانبرداروں سے خوشنود ہو کر ان کے شریک رہیں اور جو اس کی مخالفت کرے اور عداوت سے پیش آئے اس پر لعنت کریں اور اس سے علیحدگی کریں، خدا لوگوں کو اس کی اطلاع کرتا ہے، ان پر اس کی اطاعت واجب کرتا ہے، ایسا شخص نبی ہوتا ہے اور سب میں معظم الشان وہ نبی ہے جس کے لئے بعثت کی کوئی اور نوع بھی ہو اور وہ یہ کہ خدا کو یہ منظور ہو کہ اس کو لوگوں کے لئے ظلمات سے نکل کر نور میں آنے کا سبب بنائے اور اس کی قوم عام لوگوں کے لئے رہبر بنے، اس طرح پر اس نبی کی بعثت میں ایک دوسرے قسم کی بعثت ہوا کرتی ہے، پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ ''خدا ہی نے ان پڑھوں میں ان میں سے ایک نبی بھیجا''۔ اور دوسری کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے''۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''تم لوگوں میں آسانی کے لئے بھیجے گئے ہو نہ کہ دشواری کے لئے''۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مفہمین کے جمیع فنون پائے جاتے تھے اور آپ کے لئے دونوں بعثتیں حاصل تھیں اور گزشتہ انبیا میں کسی کو ایک فن کسی کو دو فن حاصل تھے۔

واضح ہو کہ حکمت الٰہیہ انبیا کی بعثت کی اس لئے مقتضی ہوتی ہے کہ لوگوں کی اضافی اور قابل اعتبار بہتری تدابیر بعثت میں ہی منحصر ہوتی ہے اور اس بہتری کی اصلی حقیقت کا علم سوائے علام الغیوب کے اور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ہم اس قدر جانتے ہیں کہ چند ایسے ایسے اسباب ہیں جو بعثت کے لئے ضروری ہیں اور ان سے بعثت جدا نہیں ہو سکتی اور یہ بھی جانتے ہیں کہ طاعت جب ہی فرض ہوتی ہے جب خدا تعالیٰ کسی قوم کی اصلاح اور بہبودی اس بات میں پائے کہ یہ لوگ خدا کی عبادت کریں۔ اور ان لوگوں کے نفوس اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ خود علوم الٰہی کو اخذ کریں۔ اور ان کے حال کی درستی اس میں ہوتی ہے کہ وہ نبی کی اطاعت کریں اس لئے خدا حظیرۃ القدس میں مقرر فرماتا ہے کہ نبی کی اطاعت واجب ہے وہاں اس امر کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ایک قوم کی ترقی اور دوسری قوم کے تنزل کا وقت آ گیا ہے۔ پس اس وقت خدا تعالیٰ اس با اقبال قوم میں نبی پیدا کرتا ہے تاکہ ان کے دین کی اصلاح فرمائے جیسا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا یا یہ کہ خدا کو منظور ہوتا ہے کہ کسی قوم کو باقی رکھے اور دوسروں پر اس کو فضیلت عطا کرے اس لئے ایسے شخص کو مبعوث کرتا ہے جو ان کی کجی کو درست کر دے اور ان کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے جیسے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت۔ یا جس قوم کی دولت اور دین کا استمرار مقدر ہوتا ہے اس کے انتظام کے واسطے کسی نبی مجدد کو بھیجتا ہے جیسے داؤد اور سلیمان اور انبیا بنی اسرائیل علیہم السلام کی ایک جماعت کی یہی حالت تھی۔ اور خدا تعالیٰ نے یہ بات مقرر کر دی تھی کہ ہم ان انبیا کو ان کے اعدا پر غالب کریں گے جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے "اپنے پیغمبر بندوں کے لئے ہمارا قول پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ ہمیشہ فتح مند رہیں گے اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا"۔ ان انبیا کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو اتمام حجت کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور جب کسی قوم کی طرف نبی بھیجا جائے تو ان پر اس کی پیروی واجب ہو جاتی ہے خواہ وہ راہ راست پر ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ ایسے بلند مرتبہ شخص کی مخالفت کرنے سے ملأ اعلیٰ کی لعنت پیدا ہوتی ہے اور مخالف کی ذلت پر اجماع ہو جاتا ہے جس سے تقرب الی اللہ کا راستہ ان پر بند ہو جاتا ہے اور ان کی سعی کچھ کام نہیں آتی، ان کے مرنے کے بعد چاروں طرف سے ان کے دلوں کو لعنت

گھیر لے گی۔ علاوہ اس کے یہ ایک فرضی صورت ہے واقع میں نہیں (۱) تم کو یہود کی حالت سے عبرت حاصل کرنی چاہئے، انھوں نے دین میں کیسی کیسی زیادتیاں اور کتاب الٰہی میں کیسی تحریف کی تھی اس لئے سب لوگوں سے زیادہ ان کے لئے پیغمبر کی بعثت کی ضرورت تھی۔ اور انبیا کی بعثت سے بندوں پر حجت الٰہی اس طرح قائم ہے کہ اکثر لوگوں کی پیدائش اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ بغیر کسی کے بتلائے مفید اور مضر امور کو حاصل کر سکیں بلکہ یا تو ان کی استعداد ضعیف ہوتی ہے جو انبیا کے خبر دینے اور بتلانے سے قوی ہو جاتی ہے۔ یا ایسے موانع اور مفاسد ہوتے ہیں جو بغیر جبر اور دلیل کے دفع نہیں ہو سکتے اور ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دنیا اور آخرت میں ان کو عذاب دیا جائے تب بعض اسباب علوی اور سفلی کے جمع ہونے کے بعد لطف خداوندی کا اقتضا رہوتا ہے کہ کسی قوم میں ہی نہایت ذکی شخص پر وحی کرے کہ لوگوں کو حق کی جانب رہنمائی کرے اور راہ راست کی جانب ان کو بلائے پس نبی کا حال رہبری کے بارے میں ایسا ہے جیسے کسی سردار کے کئی غلام بیمار ہو جائیں اور وہ کسی اپنے خاص رازداں کو ان کے لئے دوا پلانے پر متعین فرمائے کہ یہ کہنا مانتے ہیں یا نہیں، پس اگر وہ ان کو زبردستی پلائے گا تب بھی حق پر ہوگا لیکن اس کے لطف کامل نے تو یہ کیا کہ اولاً ان کو بتلایا کہ تم بیمار ہو یہ دوا تمہارے لئے نافع ہے، اور اپنے اقوال میں سچا ہونے کے لئے اس نے امور خارق عادت دکھلائے تاکہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں۔ اور نیز اس کو مناسبت کہ اس دوا میں کوئی شیریں، جز بھی ملا دے، پس اس وقت وہ اس کے احکام کی بجا آوری اپنی بصیرت اور رغبت سے کریں گے اسی وجہ سے معجزات اور قبولیت دعا وغیرہ امور اصل نبوت سے خارج ہیں (۲)۔ ہاں اکثر حالتوں میں لازم ضرور ہوا کرتے ہیں اور بڑے بڑے معجزات کا ظہور اکثر تین اسباب سے ہوا کرتا ہے۔ (۱) اس نبی کا مفہمین میں سے ہونا، اس وجہ سے بعض حوادث اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور یہ ظہور دعاؤں کی قبولیت، اور ان امور میں موجب برکات ہو جاتا ہے جس کے لئے برکت کی دعا کی جاتی ہے اور برکت کے ہونے کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کبھی کسی شئے کا نفع زیادہ ہو جاتا ہے مثلاً اعدا کے دلوں میں نبی کی طرف سے یہ خیال جما دیا جائے کہ

---

(۱) کیونکہ راہ راست پر چلنے والے نبی کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ (۲) اصل منصب نبوت تو ہدایت خلق ہے باقی معجزات وغیرہ امور محض لوگوں کے اطمینان کے لئے ہیں۔

اس کا لشکر بہت ہے، اس لئے وہ بزدل ہو جاتے ہیں۔ یا طبیعت غذا کو خلط صالح بنا دیتی تب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دو چند کھانے کھایا ہے۔ اور کبھی خود اصل شئے ہی بڑھ جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مادہ ہوائی قوت مثالی کے حلول کرنے کی وجہ سے اس صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان اسباب کے علاوہ اور بھی اسباب ظہور برکات کے ہوتے ہیں جن کا شمار کرنا دشوار ہے۔

دوسرا سبب ظہور معجزات کا یہ ہوتا ہے کہ ملأ اعلیٰ متفق ہو کر نبی کے احکام جاری کرنا چاہیں، اس وجہ سے الہامات، انتقالات اور تقریبات پیش آتے ہیں جو پہلے سے نہ ہوتے تھے پس نبی کے احباب فتح مند اور اعدا خوار وخراب ہوتے ہیں۔ اور حکم الٰہی کا ظہور ہوتا ہے اگر چہ کفار کو ناگوار معلوم ہو۔ تیسرا سبب معجزات کا یہ ہوتا ہے کہ اسباب خارجی کی وجہ سے بہت سے حوادث پیدا ہو جائیں جیسے نافرمانوں کو سزا دی جائے اور جو(۱) میں بڑے بڑے امور کا احداث ہو، پس ان امور کو خدا تعالیٰ کسی نہ کسی وجہ سے معجزہ بنا دیتا ہے یا تو نبی پہلے سے ان پر لوگوں کو مطلع کر دیتا ہے یا اس کی نافرمانی پر لوگوں کو سزا مل جاتی ہے یا جو طریقہ سزا کا نبی نے بتا دیا تھا، وہ حوادث اسی کے موافق ہوتے ہیں، یا اسی قسم کے اور امور ہوا کرتے ہیں۔

انبیا کے معصوم ہونے کے بھی تین اسباب ہیں (۱) یہ کہ خدا تعالیٰ انسان کو شہوات رذیلہ سے پاک اور آزاد پیدا کرے، بالخصوص ان امور میں جو محافظت حدود اور شریعت سے متعلق ہیں (۲) یہ کہ وحی کے ذریعہ نیکی کی بھلائی اور گناہ کی برائی اور اس کا انجام اس کو معلوم ہو جائے (۳) یہ کہ اس کے اور شہوات رذیلہ کے درمیان خود خدا تعالیٰ حائل ہو جائے۔ واضح ہو کہ انبیا علیہم السلام کی سیرت میں سے یہ ہے کہ وہ خدا کی ذات اور صفات میں غور اور فکر کرنے کا حکم نہ کریں کیونکہ عام لوگ اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" خدا کی ذات میں غور نہ کرو بلکہ اس کی مخلوق میں غور کرو"۔ اور اس آیت کی تفسیر میں " تیرے رب کی طرف نہایت ہے" فرمایا کہ خدا کی ذات میں کچھ غور نہ کرنا چاہئے۔ انبیا ہمیشہ خدا تعالیٰ کے نعائم اور عجائب قدرت میں فکر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ نیز انبیا علیہم السلام کی سیرت میں سے یہ بھی ہے کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے موافق اور ان کے علوم کے مناسب جو ان کے اندر پیدائشی طور پر

(۱) کائنات

پائے جاتے ہیں، کلام کیا کریں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نوع انسان کے لئے خواہ وہ کہیں ہو، ادراک کی ایک حد متعین ہے جس کا مرتبہ تمام حیوانی ادراک سے زیادہ ہے مگر جس کا مادہ اس قسم کے انسانی ادراک کے قابل نہ ہو تو وہ حیوانات سے زاید نہیں۔ اور اس نوع انسانی کے لئے اس ادراک کے علاوہ اور زاید علوم اور ادارک بھی ہیں جو اس میں عادت مستمرہ کے خلاف حاصل ہوتے ہیں، جیسا کہ انبیا اور اولیا کے قدسی نفوس کو حاصل ہوتے ہیں یا ان ریاضات شاقہ سے حاصل ہوتے ہیں جو نفس میں ان علوم کی صلاحیت بخشتے ہیں، جیسا کہ حساب سے یا ایک مدت تک قواعد حکمت اور کلام اور اصول وفقہ وغیرہا کی ممارست کرنے سے۔ پس انبیا علیہم السلام لوگوں سے اس سادہ ادراک کے موافق کلام کرتے ہیں جو بلحاظ اصلی پیدائش کے لوگوں کے طبائع میں موجود ہوتا ہے اور ان امور کی طرف التفات نہیں کرتے جن کے علوم کے اسباب نادر ہیں اور ان کے موجود ہونے کا کمتر اتفاق ہوتا ہے پس اسی لئے انبیا نے لوگوں سے یہ نہیں فرمایا کہ تم اپنے رب کو تجلیات اور مشاہدات سے پہچانو اور نہ یہ فرمایا کہ براہین اور قیاسات سے جانو اور نہ یہ فرمایا کہ اس کو جمیع جہات سے منزہ سمجھو، کیونکہ اس طرح پر معلوم کرنا ان لوگوں کے لئے محال سا ہے۔ جنھوں نے ایک مدت تک ریاضیات کا شغل نہیں رکھا اور نہ ایک مدت دراز تک معقولیت کے ساتھ صحبت رکھی جو ان کو استنباط اور استدلال کے طریقے بتلائے اور استحسانات کے طریقے اور ان مقدمات کے ذریعہ سے جن کے مأخذ پر وقت (۱) ہیں اشباہ اور نظائر میں فرق کرنا سکھاتے ہیں یا اور دیگر وہ امور سکھاتے جن کی وجہ سے اصحاب الرائے اہل حدیث پر فخر کیا کرتے ہیں۔ اور نیز انبیا کی سیرت میں یہ امر بھی داخل ہے کہ وہ ان امور کی جانب توجہ نہیں رکھتے جو تہذیب نفس اور سیاست امت سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ وہ ان اسباب کو بیان نہیں کرتے جو عالم جو میں پیدا ہوتے ہیں مثلاً بارش کسوف اور ہالہ کے اسباب۔ نباتات اور حیوان کے عجائب، چاند اور سورج کی چال کا اندازہ، روز مرہ حوادث کے اسباب، انبیا سلاطین اور شہروں وغیرہ کے حالات اور قصے۔ ہاں اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ آسان طریقہ پر چند باتیں جن سے ان کے کان آشنا اور دل خوگر ہوں، اس غرض سے بیان کی جائیں کہ ان کے سننے سے خوف اور رغبت پیدا ہو۔ لیکن ان کو بھی طبعاً اور اجمالاً اس

---

(۱) باریک، وعمیق ہے۔

طرح سے بیان کرنا چاہئے جس میں استعارات اور مجازات کا استعمال کرنا جائز رکھا جائے اور یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے کم اور زیادہ ہونے کا سبب پوچھا تو خدا تعالیٰ نے اس سے اعراض فرما کر مہینوں کا فائدہ بیان کر دیا۔ اور فرمادیا تجھ سے لوگ ہلالوں کا حال دریافت کرتے ہیں، ان سے کہہ دو! لوگوں کا اور حج کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کو تم دیکھو گے کہ ان فنون رسمی کی الفت سے یا اور وجوہ سے ان کا ذوق سلیم خراب ہو گیا ہے اس لئے انھوں نے رسول کے کلام کے بے موقع معنی لگا لئے۔ واللہ اعلم۔

تیسرا باب: اس بیان میں کہ مذہب کی اصل ایک ہی ہے اس کے طریقے اور راستے مختلف ہیں

خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے" خدا نے دین کا تم کو وہی راستہ بتایا ہے جس کی نوح کو وصیت کی تھی اور جو وحی ہم نے تم پر نازل کی، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی اسی کی وصیت کی تھی، وہ یہی بات تھی کہ دین حق کو ٹھیک رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا"۔

مجاہد اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ " اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھ کو اور نوح کو ایک ہی دین کی وصیت کی تھی۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے" تم سب کی امت ایک ہی ہے میں ہی تمہارا رب ہوں، مجھ سے ڈرتے رہو، پھر اپنے کام کو انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اپنی اپنی باتوں پر ہر ایک فریق خوش ہے، یعنی ملت اسلام تم سب کی ایک ملت ہے، پھر مشرکین، یہود، نصاریٰ اس میں مختلف ہو گئے اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے" ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک طریق اور راستہ مقرر کر دیا" ابن عباسؓ کہتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کے لئے ایک دستور اور طریقہ جدا بنا دیا۔ اور نیز خدا تعالیٰ فرماتا ہے، ہر ایک گروہ کے لئے ایک طریقہ ہم نے بنا دیا ہے جس پر وہ عمل کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ سب کا دین ایک ہی ہے جس پر انبیا علیہم السلام متفق ہیں محض شریعتوں اور دستوروں کا اختلاف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ استعانت اور عبادت میں خدا کا کوئی شریک نہیں اور جو امور اس کی بارگاہ کے مناسب نہیں ان سے پاک ہے اور اس کے اسما میں کجروی کرنا حرام ہے اور بندوں پر خدا کا یہ حق ہے کہ اس کی نہایت درجہ تعظیم کریں جس میں

ذرہ کوتاہی نہ ہو اور اپنے منہ اور دلوں کو اس کے آگے جھکا دیں اور اس کے شعائر کے ذریعہ سے قرب خداوندی حاصل کریں اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جمیع حوادث کے پیدا ہونے سے پیشتر ان کا اندازہ کر لیا تھا۔ اور فرشتے خدا کی مخلوق میں سے ہیں، جو خدا کی کسی امر میں نافرمانی نہیں کرتے اور اسی کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اور خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنی کتاب نازل فرما کر اپنی اطاعت کو بندوں پر فرض کر دیتا ہے اور قیامت کا ہونا حق ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنا حق ہے۔ جنت و دوزخ حق ہیں اور اسی طرح سے تمام انبیا نیکی کے تمام اقسام، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور عبادات نافلہ دعا، ذکر، کتاب الٰہی کی تلاوت کے ذریعہ سے خدا کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنے پر متفق ہیں۔ اور اسی طرح سے ان امور پر اتفاق ہے کہ نکاح جائز اور زنا حرام ہے، لوگوں میں عدل وانصاف کرنا فرض اور ظلم کرنا حرام ہے، نافرمانوں پر حدود مقرر کرنا اور دشمنان الٰہی سے جہاد کرنا، احکام الٰہی اور دین کی اشاعت میں کوشش کرنا واجب ہے۔ پس یہ امور دین کی بنیاد ہیں اور اسی لئے قرآن عظیم نے ان امور کی لمیت سے بحث نہیں کی مگر شاذ و نادر، اس لئے کہ یہ سب امور ان لوگوں کے نزدیک جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے مسلم اور متفق علیہ تھے البتہ ان امور کی صورتوں میں اختلاف ہے پس موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز کے وقت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا دستور تھا اور ہمارے پیغمبر علیہ السلام کی شریعت کعبہ کی طرف رخ کرنا چاہئے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کے لئے فقط رجم کی سزا تھی اور ہماری شریعت میں محصن کے لئے رجم ہے اور غیر محصن کے لئے تازیانہ مارنے کی سزا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں محض قصاص تھا ہماری شریعت میں قصاص اور دیت دونوں ہیں اور ایسے ہی طاعتوں کے اوقات اور ان آداب وارکان میں اختلاف ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نیکی اور تدابیر نافعہ کی جو خاص خاص صورتیں مقرر کی گئی ہیں ان کا نام شریعت اور منہاج ہے۔

واضح ہو کہ ہر مذہب اور ملت میں جس عبادت اور طاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے وہ انہی اعمال کا نام ہے جن کا اصل منشا اور مبدا انسان کی ایک دلی حالت ہے جو اس کو آخرت میں فائدہ یا نقصان پہنچائے گی۔ اصل طاعت اور عبادت یہ دلی حالت ہی ہے اور اعمال اور افعال اس کی صورت اور شرح ہیں۔ یہی دلی حالت عبادت کے لئے میزان اور مدار علیہ ہے جو اس امر کو

معلوم نہ کرے گا اس کو اعمال کے کرنے میں بصیرت حاصل نہ ہوگی اور اکثر ان اعمال پر اکتفا کرے گا جو غیر کافی ہوں گے بغیر قرأت اور دعا کے ہی نماز پڑھ لیا کرے گا اس لئے نماز کچھ مفید نہ ہوگی پس دین میں ایک ایسے کامل شناسا کی سیاست کی ضرورت ہے جو مخفی اور مشتبہ امور کو صاف صاف قرائن اور نشانات سے منضبط کردے، ان کو بہ منزلہ امر محسوس کے بنادے جن کو ادنی اور اعلی قسم کے لوگ تمیز کرسکیں اور لوگوں پر اعمال کے سمجھنے میں اشتباہ نہ رہے تاکہ خدا تعالی کی جانب سے حجت اور دلیل کے ساتھ مطالبہ کرنا درست ہو جائے۔

اور کبھی گناہ غیر گناہ سے مشابہ ہو جایا کرتا ہے جیسا کہ مشرکین نے کہا تھا کہ بیع بھی ربوا ہی کے مانند ہے، ایسا اشتباہ، یا علم کی کوتاہی سے ہوتا ہے یا دنیوی غرض کی وجہ سے جو اس کو اندھا کردیتی ہے پس اس لئے ایسے نشانات کی ضرورت پڑی جن کی وجہ سے گناہ غیر گناہ سے ممیز ہوسکے۔ اور اگر عبادات کے لئے اوقات معین نہ کئے جاتے تو بہت سے لوگ تھوڑے ہی سے نماز روزہ کو زیادہ خیال کرتے جو کہ ان کے کچھ کام نہ آتا اور ان کی حیلہ بازی اور بہانہ جوئی پر کوئی سرزنش نہ ہوسکتی اور اگر لوگوں کے لئے عبادتوں کے ارکان اور شروط معین نہ ہوتے تو وہ بے بصیرتی سے ہاتھ پاؤں مارتے اور اگر گناہوں پر سزائیں مقرر نہ ہوتیں تو سرکش لوگ کبھی باز نہ آتے۔

حاصل کلام، تمام لوگوں کے حق میں احکام الہیہ کی تکالیف جب ہی مکمل ہوسکتی ہے کہ ان کے لئے اوقات ارکان، شروط، سزائیں، احکام کلیہ وغیرہ قرار دے جائیں اور اگر آپ تشریع کا قاعدہ معلوم کرنا چاہئیں تو آپ طبیب حاذق کی حالت پر غور کرلیجئے جب وہ مریضوں کی درستی میں نہایت درجہ کوشش کرتا ہے جن چیزوں کو وہ نہیں جانتے ان کی خبر دیتا ہے، جن امور سے وہ واقف نہیں ہیں ان کا مریضوں کو حکم دیتا ہے، دیکھئے وہ کس طرح امور محسوسہ کو مخفی امور کے قائم مقام قرار دیتا ہے جیسا کہ چہرہ کی سرخی اور مسوڑوں سے خون جاری ہونے کو غلبہ خون کی علامت قرار دیتا ہے اور کس طرح سے مرض کی قوت، مریض کی عمر، اس کے شہر اور موسم کی حالت میں غور کرتا ہے، دوا کی قوت اور علاج کے تمام متعلقات میں غور کرتا ہے پس اپنے اندازہ سے دوا کی ایک مقدار مخصوص جس کو مریض کی حالت کے مناسب سمجھتا ہے مریض کو اس کے استعمال کا حکم دیتا ہے۔ اور کبھی علامت بجائے سبب مرض کے قرار دے کر اور دوا کی خاص مقدار کو جس کو اپنی فطانت سے مادہ

موذیہ کے ازالہ کی بجائے یا اس مادہ کے ہیئت فاسد کے بدل دینے کے قائم مقام جان کر ایک قاعدہ کلیہ بنالیتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ جس کا چہرہ سرخ ہو اس کے مسوڑوں سے خون نکلتا ہو تو اس کو طبی احکام کے لحاظ سے نہار منہ شربت عناب یا ماء العسل (۱) پینا چاہئے اور جو ایسا نہیں کرے گا یا وہ کہتا ہے جو شخص فلاں معجون کو اتنی مقدار میں فلاں مرض کے لئے کھائے گا تو اس کا مرض زائل ہو جائے گا اور اس مرض سے محفوظ رہے گا، پس اس طرح کا کلیہ طب سے اخذ کیا جاتا ہے۔

لوگ اس کے کلیہ پر عمل کرتے جس سے خدا تعالیٰ ان کو بڑا نفع پہنچاتا ہے یا اس تشریع کے قاعدہ کو سمجھنے کے لئے اس بادشاہ کی حالت میں غور کرنا چاہئے جو نہایت حکیم، ملکی اصلاحات اور انتظامات لشکر کا نگراں رہتا ہے، وہ کس طرح سے زمین، اس کی پیداوار، کاشتکاروں کے کام اور مشقت پر نظر رکھتا ہے اور کس طرح سے سپاہیوں، ان کی کارگزاری اور کفایت پر غور کرتا ہے پس اسی کے موافق عشر اور خراج مقرر کرتا ہے وہ کس طرح محسوس صورتوں اور قرائن کو ان اخلاق اور ملکات کے قائم مقام قرار دیتا ہے جن کا معاونین ملک میں پایا جانا ضروری ہے اسی قانون سے وہ ان کی گرفت کرتا ہے، وہ بادشاہ کس طرح سے ضرورتوں پر نظر رکھتا ہے جو ملک کے لئے کافی ہو سکیں، معاونین اور ان کی تعداد پر نظر رکھتا ہے پس ان کو ہر ہر کام پر اس طرح تقسیم کرتا ہے جس سے کار براری ہو جائے اور کسی پر تنگی نہ ہو۔ اور اسی طرح معلم اطفال کا حال اس کے شاگردوں کی نسبت اور مالک کا حال اس کے غلاموں کی نسبت دیکھئے۔ استاد لڑکوں کی تعلیم چاہتا ہے اور مالک، حاجت مقصودہ کو غلاموں کے ہاتھوں پورا کرانا چاہتا ہے حالانکہ شاگرد اور غلام نہ تو مصلحت کی حقیقت سمجھتے ہیں اور نہ اس کی پابندی کو دوست رکھتے ہیں، بلکہ حیلہ اور بہانہ کر کے اس سے الگ ہونا چاہتے ہیں لیکن معلم اور مالک خوب جانتے ہیں کہ اس امر سے یہ رخنہ پیدا ہوگا وہ پہلے ہی سے خلل کو روکتے ہیں اور ان کو اس طرح سے حکم دیتے ہیں کہ رات کو دن اور دن کو رات کہنا پڑتا ہے جس سے نہ ان کو حیلہ میسر ہوتا ہے اور نہ وہ کسی طرح سے عدول حکمی کر سکتے پس اس طرح سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے خواہ وہ اس سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو شخص بہت بڑے گروہ کی اصلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے جن کی

(۱) شہد

استعداد یں مختلف ہیں، جن کو نہ بصیرت ہے نہ اصلاح کی طرف رغبت ہے تو وہ مجبوراً ہر چیز کا اندازہ کرتا ہے، وقت معین کرتا ہے، اس کے طریقوں اور صورتوں کو مقرر کرتا ہے جو مطالبہ اور مواخذہ میں نہایت عمدہ قانون سمجھا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ جب خدا تعالی نے ارادہ کیا رسول بھیج کر لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالے تو اس کام کے لئے ان پر وحی بھیجی، اپنا نور، ان کے دلوں میں ڈالا اور ان میں اصلاح عالم کی رغبت پیدا کی۔ اس زمانہ میں ان لوگوں کے ہدایت یافتہ ہونے کے لئے خاص خاص امور اور مقدمات کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ حکمت الٰہی ضرور ہوا کہ تمام ان مصلح امور کو انبیا کے ارادۂ بعثت میں شامل کر دے۔ اور انبیا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی فرضیت میں ان مقدمات اصلاح کی فرضیت بھی شامل ہو اور ہر وہ امر شامل ہو جس کے بغیر اطاعت انبیا عقلاً یا عادۃً مکمل نہیں ہو سکتی۔ پس یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جس کا بعض، بعض کے ساتھ وابستہ ہے اور خدا تعالیٰ پر کوئی امر مخفی نہیں ہے، اور دین الٰہی میں بیہودگی نہیں ہے۔ پس کوئی شئے جب واجب کی جاتی ہے اور اس کے نظائر کا وہ حکم نہیں ہوتا تو اس میں حکمتیں اور اسباب ہوتے ہیں جن کو راسخین فی العلم ہی جانتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان حکمتوں اور اسباب کے ایک عمدہ مجموعہ پر لوگوں کو متنبہ کریں۔ واللہ اعلم!

چوتھا باب: خاص خاص شرائع کا ایک قوم اور ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص ہونے کے اسباب

اس کی دلیل خدا تعالیٰ کا یہ قول ہے "بنی اسرائیل کے لئے سب کھانے حلال تھے البتہ توریت کے نازل ہونے سے پہلے جو یعقوبؑ نے اپنے اوپر حرام کر لئے تھے وہ حلال نہ تھے۔ اگر تم سچے ہو تو توریت لاکر پڑھو" اسی آیت کی تفسیر یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک بار سخت بیمار ہوئے پس انھوں نے اپنے دل میں یہ نذر مانی کہ اگر خدا نے مجھ کو تندرست کر دیا تو میں اپنے اوپر سب چیزوں سے زیادہ مرغوب کھانے اور پینے کی چیز حرام کر لوں گا۔ چنانچہ جب تندرست ہوئے تو اونٹ کا گوشت اور دودھ اپنے اوپر حرام کر لیا اور ان کی پیروی کرتے ہوئے ان کی اولاد نے بھی ان چیزوں کو حرام ہی سمجھا، ان امور کی حرمت پر زمانے گزرتے گئے یہاں تک کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر کسی نے ان چیزوں کو کھا کر انبیا کی مخالفت کی تو اس نے ان کی

شان میں بے ادبی کی، پس اس لئے تورات میں ان چیزوں کی حرمت نازل ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیان فرمایا کہ میں ملت ابراہیمؑ پر ہوں تو یہود نے اعتراض کیا کہ آپ تو اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں اوران کا دودھ پیتے ہیں آپ کیسے ملت ابراہیمؑ پر ہو سکتے ہیں۔ اس واسطے خدا تعالیٰ نے ان کے قول کو رد کیا کہ اصل میں سب کھانے حلال تھے لیکن اونٹ، ایک عارضی وجہ سے جو یہودیوں کو لاحق ہوئی تھی حرام ہو گئے تھے اور جب کہ نبوت اولاد اسمٰعیل میں ظاہر ہوئی اور اس عارضی امر سے وہ بری ہیں تو اس کی رعایت ان پر واجب نہ رہی اور اس امر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی دلیل ہے جو آپ نے نماز تراویح کے بارے میں فرمایا تھا ''یہ تمہارا فعل یعنی تراویح پڑھنا میں ہمیشہ دیکھتا ہوں جس سے مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر فرض نہ ہو جائے اگر فرض ہوگئی تو تم سے ادا نہ ہو سکے گی اس لئے اے مسلمانوں اس کو جدا جدا اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو''۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تراویح کے شائع ذائع کرنے سے منع فرمایا۔ تا کہ شعائر دین نہ ہو جائے اور لوگ اس کے ترک کو خدا کی شان میں تقصیر کا اعتقاد نہ کرنے لگیں اور یہی فرضیت کا باعث نہ ہو جائے، اور نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ گنہ گار وہ شخص ہے جس نے کسی امر کا سوال کیا پس اس کی پوچھ گچھ ہی سے وہ شئے حرام ہوگئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا اس کے لئے انھوں نے دعا کی تھی۔ اور جیسے حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا، میں مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں اور اس کی مد (ایک پیمانہ ہے) اور صاع (ایک پیمانہ) میں برکت کی ایسی ہی دعا کرتا ہوں جیسی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لئے کی تھی اور ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کے متعلق سوال کیا کہ کیا حج ہر سال ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال ہی حج کرنا فرض ہو جائے اور پھر ادا نہ ہو سکتا اور جب ادا نہ ہو سکتا تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتے

واضح ہو کہ انبیا علیہم السلام کی شریعتیں چند مصالح اور اسباب کی وجہ سے مختلف ہوگئی ہیں اور یہ اختلاف اس طرح ہوا کہ شعائر خداوندی کا شعار قرار پانا معدات کی وجہ سے اوران کی مقداریں مقرر کرنے میں مکلفین کی عادات اور حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم نہایت قوی المزاج اور شہ زور تھی جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے، اس لئے وہ اسی قابل تھے کہ ان کو

ہمیشہ کے لئے روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے تا کہ ان کی قوت بہیمی کمزور ہو جائے۔ اور چونکہ اس امت کے مزاج ضعیف تھے اس لئے ہمیشہ روزہ رکھنے سے منع کر دیئے گئے۔ اور اسی طرح مال غنیمت کو خدا تعالیٰ نے اگلے لوگوں کے لئے حلال نہیں کیا تھا لیکن ہمارے نبی کی امت کا ضعف دیکھ کر ہمارے لئے اس کو حلال کر دیا اور یہ بھی ضروری ہے کہ انبیا علیہم السلام کا اصل مقصد لوگوں کے کاروبار اور معاملات کی اصلاح کرنا ہے اس لئے وہ امر مالوف سے تجاوز نہیں کرتے تھے، الا ماشاء اللہ اور اصلاح کے طریقے عادات اور زمانوں کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں اسی بنا پر نسخ کا ہونا صحیح ہے۔ نسخ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طبیب اس امر کا قصد کرے کہ سب حالتوں میں مزاج حالت اعتدال پر محفوظ رہے اسی لئے ہر زمانہ میں اور ہر شخص کے لئے اس کے جدا جدا احکام ہیں، وہ جوان کو ایسی باتیں بتائے گا کہ ان سے بوڑھے کو منع کر دے گا۔ وہ گرمی میں باہر سونے کا حکم کرے گا کیونکہ اس میں اعتدال کا احتمال ہے اور سردی میں اندر سونے کا حکم کرے گا، پس جو شخص اصلیت دین سے واقف ہے اور ان اسباب سے واقف ہے جن کی وجہ سے مذہبی طریقے مختلف ہوتے ہیں تو اس کی نظر میں نہ کوئی تغیر ہے اور نہ تبدیلی، اسی وجہ سے شریعتوں کی نسبت ہر قوم کی طرف جدا جدا کی گئی، اور چونکہ وہ قوم اپنی استعدادی حالت کی وجہ سے اس شریعت کی مستحق ہو گئی تھی اور انھوں نے بہ زبان حال نہایت اصرار سے گویا اس کی درخواست کی تھی اس لئے وہی ہدف ملامت ہوئی اور اسی واسطے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ جمعہ کا روز ان کے حق میں معین کیا گیا کیونکہ وہ ناواقف تھے اور تمام علوم کسبی سے بری تھے۔ اور یہود کے لئے ہفتہ کا دن قرار دیا گیا کیونکہ یہود کا اعتقاد تھا کہ ہفتہ ہی کے روز خدا تعالیٰ دنیا کے پیدا کرنے کے کام سے فارغ ہوا تھا اس لئے عبادت کے لئے یہی دن بہت اچھا ہے حالانکہ دونوں دنوں کا تقرر محض امر الٰہی اور وحی سے ہوا ہے۔ اور شریعتوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی امر مامور بہ کی حالت ہوتی ہے جس کا حکم دیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد عذر اور حرج پیش آجاتے ہیں اس لئے ان لوگوں کی ذاتی حالت کے لحاظ سے اجازتیں اور خصلتیں مشروع ہو جاتی ہیں، تو اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنی ذاتی حالت کی وجہ سے اس امر کے قابل اپنے آپ کو بنالیا تھا کبھی کبھی وہی لوگ قابل ملامت ہوتے ہیں، خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''جب تک لوگ اپنی ذاتی حالت کو نہ بدلیں، خدا تعالیٰ کسی قوم کو نہیں بدلا کرتا'' اور اسی ذاتی اور استعدادی اختلاف کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا ہے" اے عورتو! میں نے تم سے زیادہ کسی ناقص عقل اور ناقص دین کو بڑے دانشمند کی عقل خراب کرنے والا نہیں دیکھا"۔ پھر آپ نے ان کے دین کا نقصان بیان کیا کہ جب عورت حیض سے ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے۔

واضح ہو کہ مذہب کے ایک صورت خاصہ میں نازل ہونے کے بہت سے اسباب ہیں لیکن وہ دو نوع میں منحصر ہیں، اوّل قسم بہ منزلہ امر طبعی کے ہے جس کی وجہ سے لوگ احکام کے مکلف ہوتے ہیں، پس جس طرح تمام افراد انسانی کے لئے ایک خاص طبیعت اور حالات معین ہیں جو نوع انسانی کی طرف سے سب کو وراثتاً ملے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے لوگ احکام کے مکلّف ہوتے ہیں، اور جس طرح مادر زاد اندھے کے خزانہ خیال میں رنگتیں اور صورتیں نہیں ہوتیں بلکہ محض الفاظ اور وہ چیزیں ہوتی ہیں جو چھوئی جاسکتی ہیں اور اسی قسم کی اور چیزیں ہوتی ہیں، پس جب غیب سے اس کو کوئی علم یا واقعہ وغیرہ خواب میں حاصل ہوتا ہے تو صرف انہی چیزوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو اس کے خزانہ خیال میں جمع ہیں نہ کہ اور چیزوں کی صورت میں، اور جس طرح اس عربی کے لئے جو سوائے زبان عرب کے اور کوئی زبان نہیں جانتا۔ الفاظ کے ذریعہ سے کوئی بات معلوم کرائی جاتی ہے تو محض لغت عرب میں نہ کہ غیر عربی زبان میں۔ اور جس طرح کہ جن شہروں میں ہاتھی وغیرہ حیوانات ہیبت ناک ہوتے ہیں تو ان شہروں کے باشندوں کی نظر میں جنوں کا سامنے آجانا یا بھوتوں اور شیاطین کا ڈرانا انہی حیوانات کی صورت میں ہوتا ہے اور جن ملکوں میں جو چیزیں معظم ہوتی ہیں اور جو عمدہ کھانے اور لباس پائے جاتے ہیں تو ان کو ملائکہ کی خوشی اور نعمتیں انہی چیزوں میں دکھائی دیتی ہیں اور جیسے کوئی عربی شخص جب کسی کام کے کرنے کا قصد کرتا ہے یا کسی سفر کا ارادہ کرتا ہے اور وہ راشد یا نجیح (کامیاب) کے لفظ کو سنتا ہے تو آئندہ حالات کی عمدگی اور کامیابی کی دلیل اس کو قرار دیتا ہے، جو عربی نہیں ہے اس پر ان الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا، چنانچہ کسی قدر احادیث میں بھی اس کا ذکر آیا ہے، تو جیسے کہ امور بالا کے اثر، اپنا پرتو حالات پر ڈالتے ہیں ایسے ہی شرائع میں ان علوم کا جو کسی قوم میں مخزون اور جمع ہوتے ہیں اور ان اعتقادات کا جو ان میں مخفی ہوتے ہیں اور ان کی عادات کا جو کلب (۱) بیماری کی طرح انہیں ساری اور جاری ہوتی ہیں، لحاظ

(۱) کتے کے کاٹنے سے جو دیوانگی ہو جاتی ہے اس کو کلب کہتے ہیں۔

اور اعتبار رہا کرتا ہے۔

اسی واسطے اونٹوں کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل کے لئے حرام تھا، نہ بنی اسمٰعیل کے لئے اور اسی وجہ سے اچھے اور برے کھانوں کی تمیز عادات عرب پر تفویض کی گئی۔ اور اسی وجہ سے ہمشیرہ زادیاں ہمارے لئے حرام کی گئیں، یہودیوں میں وہ حرام نہ تھیں کیونکہ یہود ان کو ان کے باپ کی قوم سے شمار کرتے تھے، ان سے کسی قسم کا میل جول، ربط وصحبت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کو بہ منزلہ اجنبیہ کے سمجھتے تھے۔ بخلاف عرب کے کہ ان میں یہ رسم نہ تھی۔ اور ایسے ہی گائے کے بچے کا گوشت اس کی ماں کے دودھ میں پکانا یہودیوں میں حرام تھا، ہمارے یہاں حرام نہیں ہے کیونکہ یہودیوں کو معلوم تھا کہ اس سے خدا کی پیدائش اور تدبیر الٰہی کی مخالفت ہوتی ہے، جو چیز خدا تعالیٰ نے گائے کے بچہ کی پیدائش اور نشو ونما کے لئے پیدا کی ہے اس سے ہی اس صورت میں گویا اس کی بنیاد اکھاڑنا اور اس کے اجزا کو جدا جدا کر دینا ہوگی۔ اور عرب کے لوگ اس قسم کے علم وفہم سے نہایت درجہ دور تھے اگر ان کو اس قسم کے راز سمجھائے جاتے تاہم ان کی سمجھ میں نہ آتے، وہ اس امر کو بھی معلوم نہ کر سکتے جو حکم دینے کا مناسب مدار علیہ تھا اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ نزول شرائع میں صرف انہی علوم، حالات اور ان اعتقادات کا ہی اعتبار نہیں کیا جاتا ہے جو لوگوں کے سینہ میں متمثل ہوتے، بلکہ بڑا لحاظ اور اعتبار ان پیدائشی امور کا ہوتا ہے جن کی طرف ان کی عقلیں مائل ہوتی رہتی ہیں خواہ ان امور کا ان کو علم ہو یا نہ ہو تم اس نکتہ کو ان تعلقات میں دیکھ سکو گے کہ جب ایک شئے کسی دوسری شکل اور پیرایہ میں ظاہر ہوتی ہے جیسے موہنوں پر مہر لگانے کی صورت میں لوگوں کو سحری سے باز رکھنا ظاہر ہوا تھا۔ اس لئے کہ لوگوں کی نظر میں مہر لگانا، ایک شئے کے بند کرنے اور روکنے کی صورت ہوا کرتی ہے خواہ یہ امر لوگوں کے پیش نظر ہو یا نہ ہو۔ اور خدا تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق اور فرض ہے کہ غایت درجہ اس کی تعظیم کریں اور کسی طرح مخالفت نہ کریں اور لوگوں کا باہم یہ فرض ہے کہ ہمدردی اور باہمی الفت کی مصلحت کو ہمیشہ قائم رکھیں اور کوئی کسی کو نہ ستائے، ہاں جبکہ رائے کلی وغیرہ اس کا حکم کرے۔ اسی وجہ سے اگر کوئی شخص کسی عورت کو اجنبی خیال کر کے اس سے ہم بستر ہو جائے تو خدا تعالیٰ کے اور اس کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا، خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں یہ کام اس کی دلیری کا خیال کیا جائے گا اگرچہ یہ عورت واقع میں اس کی بیوی ہی کیوں

نہ ہو، کیونکہ اس نے حکم الٰہی کی مخالفت پر پیش قدمی کی۔

اور جس شخص نے کسی اجنبی عورت سے اپنی بیوی سمجھ کر ہم بستری کر لی تو بلاشک وہ خدا کے نزدیک معذور سمجھا جائے گا اور جو شخص روزہ کی نذر مانتا ہے وہی اس کے مطالبہ میں ماخوذ ہوتا ہے اور جس نے نذر نہ کی ہو وہ ماخوذ نہیں ہوتا۔ اور جو دین میں اپنے اوپر سختی کرتا ہے اس پر سختی کی جاتی ہے اور یتیم کو ادب سکھانے کے لئے طمانچہ مارنا نیکی ہے، اور ایذا دینے کے لئے مارنا گناہ ہے۔ خطا کار اور بھول چوک کرنے والا بہت سے احکام میں قابل معافی ہے، پس یہ وہ اصل ہے جس کے مطابق لوگوں کے علوم اور عادات ظاہرہ اور پوشیدہ ہیں، پس انہی کے موافق ان کے حق میں شریعتوں کی تعین ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ اکثر عادات اور مخفی علوم ایسے ہیں کہ ان پر تمام عرب وعجم اور تمام معتدل اقالیم کے باشندے اور ایسے لوگ جن کا مزاج عمدہ اور بزرگ ترین اخلاق کے قابل ہے، متفق ہیں جیسے اپنے مردہ پر غم کرنا، اس کے حق میں نرم دلی کو پسند کرنا، حسب ونسب پر فخر کرنا، چوتھائی یا تہائی شب کے گزرنے کے بعد سونا علی الصبح بیدار ہونا ان کے علاوہ اور اکثر امور ہیں جن کی طرف ہم نے ارتفاقات کے بیان میں اشارہ کیا ہے۔ تو اس قسم کے جتنے عادات اور علوم ہیں ان کا سب چیزوں سے زیادہ اعتبار اور لحاظ کیا جاتا ہے، ان کے بعد اکثر عادات اور عقائد ایسے ہوتے ہیں جو صرف انہی لوگوں میں خاص ہوتے ہیں جن میں نبی مبعوث کیا جاتا ہے اس لئے ان عادات کا اعتبار بھی ضروری ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ کر رکھا ہے۔

واضح ہو کہ نبوت بسا اوقات ملت کے تابع ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ملة ابیکم ابراهیم'' اور فرمایا اور نوح کے طریقہ والوں میں سے ابراہیم بھی تھے'' اس کا راز یہ ہے کہ سالہائے دراز تک لوگ ایک مذہب کی پابندی کرتے ہیں اور اس دین کے شعائر کی تعظیم کرتے ہیں، اس مذہب کے احکام نہایت مشہور اور شائع بہ منزلہ بدیہیات اولی کے ہو جاتے ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جب اس مذہب کے نبی کی روایتوں میں اختلاط ہو جاتا ہے تو اس کے بعد ایک دوسری نبوت کا زمانہ آتا ہے تاکہ پہلے مذہب کی کجی بالکل دور ہو جائے، اس کی بگڑی ہوئی باتیں درست ہو جائیں، یہ دوسری نبوت لوگوں میں مشہور اور معتبر احکام کی تفتیش کرتی ہے پس جو

صحیح سیاست مذہبی کے قواعد کے موافق ہوتے ہیں دوسری نبوت ان کو نہیں بدلتی بلکہ ان کی لوگوں کو رغبت دلاتی ہے اور ان پر عمل کرنے کی تاکید فرماتی ہے اور جو احکام کھوٹے ہوتے ہیں، جن میں تحریف ہوگئی ہے ان میں بقدر ضرورت تبدیلی کردیتی ہے اور جو احکام قابل اضافہ ہوتے ہیں تو ان میں کچھ اضافہ کردیتی ہے اور بسا اوقات یہ نبی آخر ان امور سے جو پہلی شریعت کے باقی رہ جاتے ہیں، اکثر اپنے مطالب اور دعاوی پر استدلال کرتا ہے پس اس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نبی، فلاں نبی کی ملت میں ہے یا اس کے گروہ میں سے ہے اور بسا اوقات یہ نبوتیں اختلاف ملل کے سبب سے مختلف بھی ہوجاتی ہیں۔ مذاہب کے ایک صورت خاصہ میں نازل ہونے کی دوسری قسم بہ منزلہ ایک امر عارضی طاری کے ہے اور یہ اس لئے ہے کہ خدا تعالیٰ گو زمانہ سے بلند و برتر ہے لیکن اس کو کسی نہ کسی وجہ سے زمانہ اور زمانہ کی چیزوں سے ربط اور تعلق ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ ہر ایک صدی کے بعد خدا تعالیٰ حوادثات عظیمہ میں سے ایک نہ ایک حادثہ کو پیدا کرتا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام اور دیگر انبیا نے بھی حدیث شفاعت میں کسی قدر اس بارے میں خبر دی ہے کہ ہر ایک نبی قیامت کے روز کہے گا کہ آج کے دن خدا تعالیٰ ایسا غضبناک ہے کہ ایسا کبھی غضبناک نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا پس جب عالم آمادہ اور تیار ہوتا ہے کہ شریعتوں کا اس پر فیضان کیا جائے اور امور دینی کے حدود معین کئے جائیں، اور اللہ تعالیٰ تجلی فرما کر دین کو لوگوں پر نازل کرتا ہے اور اسی کے موافق ملأ اعلیٰ بلند ہمتی سے لبریز ہوجاتے ہیں تو ایسے وقت میں عارضی اسباب میں سے ایک ادنی سبب بھی جود الٰہی کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے کافی ہوجاتا ہے اور جو کریم کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو وہ کھل ہی جاتا ہے، آپ موسم بہار پر ہی نظر ڈالئے کہ اس موسم میں بونے اور تخم ریزی کرنے کے لئے ادنی سبب اثر کرجاتا ہے کہ اور موسم میں اس سے کئی گنا اہتمام بھی اثر نہیں کرتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کسی شئے کے لئے اس کا انتظار کرنا اور اس شئے کے لئے اس کا دعا کرنا اور نہایت شوق کے ساتھ اس کو طلب کرنا، اس امر میں احکام کے نازل ہونے کا قوی سبب ہوتا ہے اور جب نبی کی دعا روشن طریقہ کو زندہ کرتی ہے اور دعا کی وجہ سے بڑی بڑی جماعتوں پر غلبہ حاصل ہوجاتا ہے اور اس سے نظر کے سامنے کھانے پینے کی زیادتی ہوجاتی ہے تو اس کی وجہ سے نزول حکم جو روح لطیف ہے اور اس کا تعین محض وجود مثالی میں ہے، کیا بعید

ہے اور اسی قاعدہ پر سمجھ لینا چاہئے کہ اس زمانہ کے وہ بڑے بڑے حوادث جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشویش ہوتی تھی، جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کا قصہ، یا جب کوئی سائل ایک امر دریافت کرتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس میں بار بار پوچھ گچھ کرتا تھا جس کی وجہ سے آپ کو فکر ہو جاتی تھی جیسے ظہار کا قصہ، تو یہ امور نزول احکام کے سبب بن جاتے تھے اور اس سے اصل حال کا انکشاف ہو جاتا تھا۔ اور اسی طرح سے کسی قوم کا طاعت میں سستی کرنا، فرمانبرداری میں پہلوتہی کرنا اور ہمیشہ گناہ میں مصروف رہنا اور ایسے ہی کسی چیز کی نہایت رغبت کرنا اور نہایت اہتمام اور قصد سے اس کی پابندی کرنا اور اس کے ترک کو خدا تعالیٰ کا گناہ سمجھنا بھی ان پر کسی چیز کے فرض اور حرام ہونے کا سبب ہوتا ہے اور باران جود برسوانے میں ان سب کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص صالح، قوی الہمت روحانیت کے منتشر ہونے اور سعادت کی کمالیت کے وقت قصد کر کے خدا کی بارگاہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ درخواست کرتا ہے تو اسی وقت وہ مقبول ہو جاتی ہے اور انہی معانی کی طرف خدا تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ ہے، مسلمانو! بہت سی چیزوں کا سوال مت کیا کرو اگر وہ تمہارے لئے کھل جائیں گی تو تم کو ناگوار معلوم ہوں گی اگر قرآن کے نازل ہوتے وقت پوچھو گے تو خود بخود تم کو معلوم ہو جائیں گی"۔ خداوند کریم کی اصل مرضی یہی ہے کہ نزول شرائع کے اس قسم کے سوالات کم ہوا کریں کیونکہ اس سے وہ امور نازل ہو جاتے ہیں جن میں مصلحت خاص کا حکم اور اثر غالب ہوتا ہے، پس اکثر اس میں آئندہ نسلوں کے لئے تنگی پیش آجاتی ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوال کرنے کو برا سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو کچھ میں تم کو بتلاؤں اسی پر بس کرو اور مجھ سے نہ پوچھو کیونکہ پہلی امتوں کی ہلاکی کا یہی سبب بنا ہے کہ انھوں نے بہت سوالات کئے اور انبیا کی مخالفت پر کمر باندھی اور فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص بڑا گنہگار ہے جس کے سوال کرنے سے کوئی چیز حرام کردی جائے اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ بنی اسرائیل جس گائے کو ذبح کر ڈالتے وہی کافی ہو جاتی، لیکن انھوں نے سختی کی اس لئے ان پر خدا نے بھی سختی کی۔ واللہ اعلم۔

پانچواں باب: شریعت کے طریقوں پر مواخذہ کرنے کے اسباب کا بیان

ہم اس امر کو بیان کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو شرائع اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمائی

ہیں ان پر عذاب وثواب ایسے ہی مرتب ہوتا ہے جیسے کہ نیکی اور گناہ کے اصول پر ہوتا ہے یا صرف انہیں امور پر مرتب ہوتا ہے جو نیکی اور گناہ کے مواقع صورت اور قالب قرار دیئے گئے ہیں، مثلاً کسی شخص نے ایک وقت کی نماز ترک کردی لیکن اس کے دل میں خشوع وخضوع ہے تو نماز ترک کرنے پر اس شخص کو عذاب ہوگا یا نہ ہوگا، اور ایک شخص نے نماز تو ادا کی اور اس کے ارکان وشروط اس طرح سے ادا کئے کہ وہ بری الذمہ ہوگیا لیکن نہ اس میں خشوع وخضوع تھا اور نہ حضور قلب تو اس نماز پر اس کو ثواب ملے گا یا نہ ملے گا۔ اس میں کچھ کلام نہیں ہے کہ شریعت کے طریقوں کی نافرمانی کرنے میں فساد عظیم ہے اس جہت سے کہ اس سے سنت راشدہ میں روک ہوتی ہے، معصیت کا دروازہ کھلتا ہے اور جماعت مسلمین میں تکدر آتا ہے، قوم، شہر اور ملک کو ضرر پہنچتا ہے، جیسے شہر کی مصلحت کے لئے سیلاب کی وجہ سے بند باندھا تھا، ایک شخص نے نقب دیکر اس بند کو توڑ دیا، وہ شخص خود تو بچ گیا لیکن اہل شہر کو اس نے ہلاک کردیا گفتگو اس میں ہے کہ گناہ یا نیکیاں خود اس شخص کا احاطہ کرتی ہیں یا نہیں۔

پس تمام اہل مذاہب کا یہ مسلک ہے کہ خود ان شرائع پر ثواب وعذاب ہوتا ہے۔ اور ان میں سے اہل تحقیق راسخین فی العلم اور انبیا علیہم السلام کے حواری لوگ اس کے ساتھ ان کے قوالب ارواح، اشباح اور اصول میں وجہ مناسبت بھی نکالتے ہیں اور جانتے ہیں اور عام عاملان دین اور حافظان شریعت پہلی بات پر اکتفا کرتے ہیں۔

فلاسفۂ اسلام یہ کہتے ہیں کہ ثواب وعذاب صفات نفسانیہ اور ان اخلاق کی وجہ سے ہوتے ہیں جو انسان کی روح کے ساتھ متعلق ہیں ان صفات کے قالبوں اور صورتوں کا شرائع میں مذکور ہونا محض سمجھانے کے لئے اور دقیق معانی کو لوگوں کے ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے ہے مذاق قوم کے موافق اس مقام کے متعلق یہ تحریر کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مذہبی محققین کا مذہب حق ہے اس کا بیان یہ ہے کہ شرعی امور کے لئے اسباب اور باعث ہوتے ہیں جن سے بعض شرعی امور کو بعض پر ترجیح ہوتی ہے اور ان کی تشخیص ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ بغیر ان شرعی احکام کے لوگ دین پر عمل نہ کرسکیں گے اور یہ بھی خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ یہی طریقے لوگوں پر واجب کردینے کے قابل ہیں، پس یہ طریقے خدا

کی اس توجہ میں مندرج ہوتے ہیں جو ازل میں لوگوں کے ساتھ تھی، پھر جب یہ عالم اس امر کے لئے مستعد اور تیار ہو گیا کہ اس پر شرعی صورتوں کا فیضان کیا جائے اور اس کے پیکر پیدا کئے جائیں تو اس وقت خدا تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا اور شرعی امور پیدا کر کے اپنا فیضان پورا کیا اور ازل سے اس کا تعین ہو گیا اس لئے یہی امور بہ منزلہ اصل کے ہو گئے اس کے بعد جب خدا تعالیٰ نے ملأ اعلیٰ کو اس سے مطلع کر دیا اور ان کو الہام سے بتا دیا کہ یہی موقع شرعی اصول کے قائم مقام ہیں اور یہی اصول کی صورتیں اور اشباح ہیں اور ان اشباح اور صورتوں کے بغیر لوگ مکلّف نہیں ہو سکتے تب حظیرۃ القدس میں اس پر اتفاق ہو گیا کہ ان صورتوں کو ایسی ہی نسبت ہے جو لفظ کو اپنے معنی موضوع لہ سے اور صور ذہنیہ کو حقیقت خارجیہ سے ہوا کرتی ہے جو اسی صورت خارجی سے حاصل کی جاتی ہے، یا جو تصویری صورت کو اس شئے سے نسبت ہوتی ہے جس کی یہ تصویر یا جو خطوط کو الفاظ موضوعہ سے ہوتی ہے کیونکہ جب ان سب امور میں دال اور مدلول میں نہایت قوی تعلق اور ان میں باہمی لزوم اور گرفت ثابت ہو گئی تو اپنے موقع پر یہ طے ہو گیا کہ یہ دال ہی مدلول ہے اور دونوں شئے واحد ہی ہیں، اس کے بعد اس علم کا پرتو یا اس علم کی خود حقیقت تمام بنی آدم عرب اور عجم کی عقلوں پر منکشف کر دی گئی اور سب نے اتفاق کر لیا کہ وہ شرائع اور اصول ایک ہی شئے ہیں، تم ایسا کوئی شخص نہ دیکھو گے جس کے دل میں اس علم کا ایک حصہ نہ ہو، اکثر ہم نے اس کا نام وجود شئے للمدلول رکھا ہے اور کبھی اس وجود کے آثار عجیبہ ہوتے ہیں جو غور کرنے والے پر مخفی نہیں ہیں۔ شرع میں اس کے بعض بعض آثار کا لحاظ کیا گیا ہے اسی وجہ سے صدقہ کو صدقہ دینے والوں کا میل کچیل قرار دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے کسی کام کی برائی مزدوری میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ اس کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، روح القدس سے آپ کی تقویت کی گئی، آپ کے دل میں قوی اصلاح کا الہام ہوا، اور آپ کی روح کے لئے ایک وسیع راستہ جو شریعت کے نازل ہونے اور صور مثالیہ کے صادر کرنے کی ہمت کی طرف جاتا ہے مفتوح ہو گیا تب آپ نے نہایت درجہ کی اولوالعزمی سے اس اصلاح کا اہتمام فرمایا اور موافقین کے لئے نہایت قصد اور ہمت سے دعائیں کیں، مخالفین پر لعنت کی اور انبیا علیہم السلام کی ہمتیں ساتوں آسمان کے طبقوں کو پھاڑ کر پار ہو جاتی ہیں۔ وہ جب پانی برسنے کی دعا کرتے ہیں اور آسمان پر ابر کا ذرا سا ٹکڑا بھی نہیں ہوتا تو ان کی دعا سے اسی

وقت پہاڑوں جیسے بادل پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کی دعا سے مردے زندہ ہو جاتے ہیں اس لئے حظیرۃ القدس میں ان کی وجہ سے خوشی اور ناخوشی پختگی سے قرار پا جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ ''ابراہیمؑ تیرے نبی اور بندے نے مکہ کے لئے دعا کی تھی اور مدینہ کے لئے میں دعا کرتا ہوں الحدیث۔ پھر جس بندہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا نے ایسا ایسا حکم کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ملأ اعلیٰ تمام اوامر اور نواہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کرتے ہیں اور اس بات کو خوب جان لے کہ مامور بہ کو ترک کرنا اور یہی عدم کو اقدام کرنا خدا کے مقابلہ میں دلیری اور خدا کی شان میں کوتاہی کرنا ہے پھر جان بوجھ کر قصداً وعمداً کسی کام کو کر بیٹھتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ حجابات کی گہری تاریکی میں مبتلا ہے اور اس کی ملکی قوت منکسر ہوگئی ہے اور اس فعل سے دل پر گناہ جم جاتا ہے اور وہ جب کوئی پر مشقت کام کرتا ہے جس سے اس کی طبیعت بھاگتی ہے اس کو وہ کسی کی نمائش کے لئے نہیں کرتا بلکہ تقرب الٰہی اور اس کی رضا مندی کی حفاظت کے لئے کرتا ہے تو اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ مرتبہ احسان کی فضیلت میں وہ لپٹا ہوا ہے، اس کی بہیمی قوت اچھی طرح کمزور ہوگئی ہے اور اس سے دل میں ایک نیکی جم جاتی ہے اب جو شخص کسی وقت کی نماز ترک کر دے تو اس سے اس امر کی تفتیش ضروری ہے کہ اس نے نماز کیوں ترک کیا اور کسی امر نے اس کو اس پر آمادہ کیا، پس اگر وہ بھول گیا تھا یا سو گیا تھا یا نماز کی فرضیت سے ناواقف تھا یا کسی ضروری کام نے اس کو روک لیا تھا تو شریعت نے تصریح کر دی کہ ایسا شخص گنہگار نہیں ہے اور اگر اس نے جان بوجھ کر اور یاد رکھتے ہوئے نماز کو ترک کر دیا اور اس کو ادا کرنے کی قدرت تھی تو بلاشک یہ فعل دین میں سستی اور شیطانی حجاب سے ہوا جس نے اس کی بصیرت کو ڈھانک لیا ہے اور اس کا اثر اس کے نفس پر ہی پڑتا ہے۔ اور جس شخص نے نماز پڑھ لی اور وہ اس سے فارغ الذمہ ہوگیا تو ہم کو اس کے حال میں بھی تفتیش کرنی چاہئے اگر اس نے نمائش کے لئے یا لوگوں کی تعریف سننے کے لئے یا قومی عادت کی پابندی کی وجہ سے یا عبث سمجھ کر نماز پڑھی ہے تو شریعت نے تصریح کر دی کہ یہ شخص مطیع نہیں ہے اور اس کی یہ نماز قابل اعتبار نہیں ہے اور اگر اس نے تقرب الی اللہ کی وجہ سے اور ایمان کی وجہ سے اور نیکی سمجھ کر اور خدائی وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے پڑھی ہے اور حضور نیت اور خدا کے دین میں خلوص کے

ساتھ یہ کام کیا ہے تو ضرور اس کے اور خدا کے درمیان ایک راستہ کھل جاتا ہے گو وہ سوئی کے ناکہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو، اور یہ جو کہا گیا تھا کہ اس شخص نے بند میں نقب لگانے سے شہر کو ہلاک کر دیا اور اپنے آپ کو بچا لیا اس کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس نے خود اپنے آپ کو بچا لیا، یہ کیسے ہوسکتا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کے ایسے فرشتہ مقرر ہیں جن کی کامل توجہ اس طرف مصروف رہتی ہے کہ جو شخص عالم کی اصلاح کرنے میں کوشش کرتا ہے اس کے لئے دعا کرتے ہیں اور جو فساد پھیلانے میں سعی کرتا ہے اس پر بددعا کرتے ہیں ان کی دعا کے اثر سے رحمت الٰہی کا دروازہ کھلتا ہے اور کسی نہ کسی طرح پر جزا نازل ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف خدا تعالیٰ کی توجہ جزا کے باعث ہوا کرتی ہے اس کا سمجھنا چونکہ مشکل تھا اس لئے فرشتوں کی دعا کو ہم نے اس کا عنوان قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: حکمتوں اور علتوں کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ بندوں کے بعض افعال ایسے ہیں جن سے پروردگار عالم خوش ہوتا ہے اور بعض افعال ایسے ہیں جن سے ناخوش ہوتا ہے اور بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جن سے خوش ہوتا ہے اور بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جن سے نہ وہ خوش ہوتا ہے اور نہ ناخوش، اس لئے حکمت بالغہ اور رحمت تامہ کا اقتضا ہوا کہ انبیا علیہم السلام کو مبعوث کرے اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کو ان افعال پر مطلع کر دے جن سے اس کی خوشی اور ناخوشی کا تعلق ہوتا ہے اور یہ کہ لوگوں سے قسم اول کا مطالبہ ہے اور دوسری قسم کے افعال ممنوع ہیں اور باقی امور میں ان کو اختیار ہے (تا کہ جو ہلاک ہو تو جان بوجھ کر ہلاک ہو اور جو حیات ابدی حاصل کرے تو جان بوجھ کر حاصل کرے) پس کسی فعل سے خدا تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا کا متعلق ہونا یا دونوں افعال سے افعال کا غیر متعلق ہونا اور لوگوں سے کسی فعل کا مطالبہ کرنا اور اس سے روکنا یا اس میں مختار ٹھیرانا جو چاہو سو کہو، اس کو 'حکم' کہتے ہیں۔ اور مطالبہ کبھی موکد ہوتا ہے جس سے فعل مطلوب کرنے پر رضا اور ثواب اور ترک کرنے پر ناراضی اور عذاب ہوتا ہے۔ اور کبھی غیر موکد ہوتا ہے جس کے کرنے پر رضا اور ثواب ہوتا ہے اور نہ کرنے پر ناراضی اور عذاب نہیں ہوتا۔

اور اسی طرح نہیں، کبھی موکد ہوتی ہے جس کی وجہ سے فعل کے نہ کرنے پر رضا اور ثواب ہوتا ہے اور اس کے کرنے سے ناراضی اور عذاب ہوتا ہے۔ اور نہی کبھی غیر موکد ہوتی ہے جس کی وجہ

سے نہ کرنے سے رضا اور ثواب ہوتا ہے اور اس کے کرنے پر ناراضی اور عذاب نہیں ہوتا۔ تم اس کا اندازہ اپنے اور لوگوں کے محاورات کے الفاظ طلب اور منع میں کر سکتے ہو کیونکہ جو بات اولاً کہی جاتی ہے اس کے خلاف میں رضامندی اور ناراضی کے اثر سے ہر قسم کی دو قسمیں تم پاؤ گے اور یہ بہ منزل امر طبعی کے ہے جس سے چارہ نہیں۔ اس وجہ سے احکام کی پانچ قسمیں ہیں۔ وجوب، استحباب اباحت، کراہت، حرمت۔ اور مکلفین کے احوال میں سے ہر فعل کی حالت علیحدہ علیحدہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا ناممکن ہے کیونکہ یہ افعال حصر میں نہیں آ سکتے اور نہ ہی لوگ پورے طور پر ان کو معلوم کر سکتے ہیں اس واسطے یہ ضروری ہوا کہ جس امر میں لوگوں سے خطاب کیا جائے وہ قواعد کلیہ ہوں جن میں ایک ایسی وحدت ہو جس میں بے شمار چیزیں مندرج ہوں تا کہ لوگ اس کو معلوم کر کے اپنے افعال کی حالت معلوم کر سکیں۔ تم فنون کلیہ ہی میں غور کر لو کہ ان میں خاص خاص امور کے لئے قواعد کلیہ مقرر ہیں، دیکھو نحوی کہتا ہے کہ فاعل مرفوع ہوتا ہے تو سامع اس کا یہ قول محفوظ کر کے ''قام زید'' میں زید کا حال اور ''قعد عمرو'' میں عمرو کا حال معلوم کر سکتا ہے، وعلیٰ ہذا القیاس

اور وہ وحدت جس میں کثرت معتبر ہوتی ہے اس کو علت کہتے ہیں جس پر حکم کا مدار ہوتا ہے اور اس علت کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اوّل وہ ہے جس میں اسی حالت کا اعتبار کیا جاتا ہے جو مکلفین میں موجود کا ہوا کرتی ہے اور وہ ہمیشہ نہیں پائی جاتی کیونکہ اگر کسی دائمی حالت کا اعتبار کیا جاتا تو احکام ہمیشہ اور ہمہ وقت ایسے نازل ہو جاتے کہ کبھی جدا نہ ہوتے اور یہ امر مکلفین کے قابو سے باہر ہے ایسی تکلیف صرف ایمان میں ہی ہو سکتی ہے پس اس وجہ سے ضروری ہو گیا کہ ایک ایسی حالت کا اعتبار کیا جائے جو دو شئے سے مرکب ہو، ایک مکلّف کی صفت لازمہ جس سے وہ مخاطب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور دوسرے ایک عارضی ہیئت کے کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی اور یہ قسم اکثر عبادات میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ ہیئت یا وقت ہے یا استطاعت میسرہ ہے یا مظنہ حرج ہے یا کسی شئے کا قصد کرنا ہے وغیرہ ذالک، مثلاً شارع کا قول ہے جس عاقل، بالغ شخص کو نماز کا وقت مل جائے تو اس پر نماز پڑھنا فرض ہے اور جو عاقل، بالغ، رمضان کو پا لے اور وہ روزہ رکھنے پر قادر بھی ہو تو روزہ رکھنا اس پر فرض ہے۔ اور جو شخص نصاب کا مالک ہو اور اس کے مال پر ایک سال گزر جائے تو ایسے شخص پر اس مال کی زکوٰۃ دینا فرض ہے اور جو شخص حالت سفر میں ہو تو اس کے

لئے نماز میں قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا جائز ہے اور جو شخص نماز پڑھنا چاہے اور وہ بے وضو ہے تو اس کو وضو کرنا ضروری ہے۔ اس قسم میں اکثر ان صفات کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے جو اکثر امور میں معتبر ہوتی ہیں اور صرف اس صفت کا اعتبار کیا جاتا ہے جس سے ایک حکم کو دوسرے سے امتیاز ہو گیا ہے اس لئے مسامحۃً اسی کو علت کہہ دیتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ نماز کی علت وقت کا آنا ہے۔ اور روزے کی علت ماہ رمضان کا آنا ہے اور کبھی شارع ان اوصاف میں سے بعض کو بالخصوص موثر قرار دیتا ہے جیسے مالک نصاب کے لئے ایک سال یا دو سال کی پیشگی زکوٰۃ دینا جائز قرار دیا ہے اور غیر مالک نصاب کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے اسی وجہ سے فقیہ ہر ایک امر کا ٹھیک اندازہ کرتا ہے کسی صفت کو سبب اور کسی کو شرط قرار دیتا ہے۔

اور علت کی دوسری قسم وہ ہے جس میں اس شئے کی حالت کا اعتبار ہوتا ہے جس پر کسی کام کا اثر ہوتا ہے یا کام کا اس سے کچھ تعلق ہوتا ہے اور یہ علت کبھی صفت لازمہ ہوتی ہے جیسے شارع کا قول ہے کہ شراب پینا حرام ہے، خنزیر کھانا حرام ہے اور درندوں اور پرندوں میں سے پنجہ دار جانوروں کا کھانا حرام ہے، ماؤں سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اور کبھی کوئی عارضی صفت ہوتی ہے جو اسی شئے کے قائم مقام ہوتی ہے جیسے خدا کا قول ہے ''چور مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو''۔ اور جیسے کلام الٰہی ''زنا کرنے والے اور زنا کرنے والی کے سو درے لگاؤ'' اور کبھی وہ شئے جس پر فعل واقع ہوتا ہے اس کے حالات میں سے دو یا زیادہ کا لحاظ کیا جاتا ہے جیسے شارع کا قول ہے، محصن زانی کو سنگسار کرنا چاہئے اور زانی غیر محصن کو درہ لگانا چاہئے۔ اور کبھی مکلّف کا اور جس پر کہ فعل واقع ہوتا ہے دونوں کے احوال کا لحاظ کیا جاتا ہے جیسے شارع کا قول ہے کہ اس امت کے مردوں پر سونا اور حریر حرام ہے لیکن عورتوں پر حرام نہیں ہے۔ دین الٰہی میں کسی قسم کی لغویت نہیں ہے پس ان افعال سے رضا یا عدم رضا کا جو تعلق ہوتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور یہ اس لئے کہ ان افعال کے ایسے امور معینہ ہیں جن سے فی الحقیقت رضا اور ناراضی متعلق ہوتی ہے، یہ امور دو قسم کے ہیں، اوّل نیکی اور گناہ، تدابیر نافع اور ان کا ضائع کرنا اور انہی کی مثل اور امور، دوم وہ امور ہیں جو احکام شریعت اور مذہب سے متعلق ہیں جیسے تحریف کا دروازہ بند کرنا، حیلہ جوئی وغیرہ سے باز رکھنا۔

اوران معین امور کے مواقع اور لوازم ہیں جن سے رضا اور عدم رضا کا بالغرض تعلق ہوتا ہے اوران مواقع اور لوازم کی طرف رضامندی اور ناراضی کو مجازاً منسوب کر دیتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ دوا کا کھانا آرام پانے کی علت ہے اور درحقیقت شفا کی علت، اخلاط کا نفع یا ان کا اخراج ہے۔ اور یہ نضج اور اخراج عادتاً دوا پینے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ خود علت نہیں ہے۔ اور جیسے کہا کرتے ہیں کہ تمازت آفتاب میں بیٹھنا یا محنت کا کام کرنا یا کسی گرم غذا کا کھانا بخار کی علت ہے اور بخار کی اصل علت اخلاط کا گرم ہو جانا ہے اور اخلاط کا گرم ہونا ایک ایسی چیز ہے جس کے بہت سے ذرائع ہیں اور متعدد صورتیں ہیں اور محض اصول پر اکتفا کرنا اوران کے متفرق وسائل اور مواقع کو ترک کر دینا ان لوگوں کا مذاق ہے جن کی نگاہ کلام نظری میں عمیق ہوا کرتی ہے اور عام لوگوں کی یہ شان نہیں ہے اور شرح عام لوگوں کے موافق نازل ہوئی ہے اور یہ ضروری ہے کہ حکم کی علت ایسی صفت ہونی چاہئے۔ جس کو عام لوگ بھی سمجھ سکیں ان پر اس علت کی حقیقت مخفی نہ رہے اور ہر شخص اس کے وجود اور عدم میں تمیز کرنا ان قاعدوں میں سے کسی نہ کسی قاعدہ سے ملتی جلتی ہو جن سے رضا یا عدم رضا متعلق ہوتی ہے یا اس وجہ سے کہ یہ علت اس قاعدہ کی طرف مخفی ہے یا اس کے قریب قریب ہے یا اس قسم کا کوئی اور علاقہ ہے مثلاً شراب خوری یہ بہت سی خرابیوں کا مظنہ ہے جن سے خدا تعالیٰ کی ناخوشی ہوتی ہے جیسے اچھے کاموں سے اعراض کرنا اور بری باتوں سے رغبت کرنا، تمدن اور خانہ داری کے انتظامات کا برہم ہو جانا اور چونکہ یہ خرابیاں اکثر شراب خوری کو لازم ہوتی ہے اس لئے شراب کی ہر قسم کو روک دینا پڑا اور جب ایک شئے کے چند لوازم اور وسائل ہوں تو ان میں سے خاص اسی کو علت قرار دیا جائے گا جس کا علت ہونا بہ نسبت اوروں کے زیادہ ظاہر ہوگا اور زیادہ منضبط ہوگا یا اصل سے اس کو زیادہ تعلق اور لزوم ہوگا یا اس طرح کی کوئی اور وجہ ہو مثلاً نماز قصر اور افطار روزہ کی رخصت، سفر اور مرض پر رکھی گئی ہے نہ کہ حرج کے دوسرے احتمالات پر اس لئے کہ سخت پیشے جیسے کاشتکاری اور آہنگری، اگرچہ ان میں بھی حرج ہوتا ہے لیکن ان کے اعتبار کرنے سے طاعت میں خلل آتا ہے کیونکہ ان پیشوں کے لوگ ہمیشہ ان میں مصروف رہتے ہیں ان کی معاش انہی پیشوں پر موقوف ہوتی ہے اور گرمی سردی کا ہونا تو ان کا ٹھیک اندازہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کے مراتب مختلف ہیں جن کی تعداد کا لحاظ کرنا مشکل ہے اور قرائن اور

علامات سے ان کی بخوبی تعیین نہیں ہوسکتی اس لئے وہ احتمالات معتبر کیے جاتے ہیں جو قرن اوّل میں اکثر اور مشہور تھے اور سفر اور مرض ایک ایسا امر ہے جس کا سمجھنا کسی پر مشتبہ نہیں ہوسکتا اگر چہ اس زمانہ میں کسی قدر انہیں اشتباہ اس وجہ سے پیدا ہوگیا ہے کہ عرب اوّل کا زمانہ ختم ہوگیا اور لوگوں نے احتمالات میں زیادہ چھان بین کرنا شروع کی یہاں تک کہ وہ ذوق سلیم جو خالص عرب کو حاصل تھا اب لوگوں میں نہ رہا۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب: ان مصلحتوں کا بیان جن سے فرائض اور ارکان اور آداب وغیرہ معین کئے گئے ہیں

واضح ہو کہ امت کی دوستی اور سیاست کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک قسم کی طاعت کی دو حدیں قرار دی جائیں ایک اعلیٰ اور دوسری ادنیٰ۔ پس اعلیٰ وہ ہے جس سے پوری طرح پر مقصود حاصل ہو جائے اور ادنیٰ کے یہ معنی ہیں کہ اس سے کسی قدر مقصود حاصل ہو کہ اس کے بعد کا درجہ لحاظ کے قابل بھی نہ ہو، یہ دو قسمیں اس واسطے قرار پائی ہیں کہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ لوگوں سے کوئی شئے طلب کی جائے اور ان کے لئے اس شئے کے اجزا اس کی صورت، اس شئے مطلوب کی مقدار نہ بیان کی جائے کیونکہ ایسا ابہام تو موضوع شرع کے خلاف ہے اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ تمام لوگ اس پر مکلّف کئے جائیں کہ ہر شئے کے آداب اور مہتم اشیا کی وہ تعمیل کریں ان لوگوں کو ایسی تکلیف بہ منزلہ تکلیف بالمحال کے ہے جو کاروبار میں مصروف رہتے ہیں یا تنگ حال رہتے ہیں۔ امت کی سیاست اور انتظام کی بنیاد میانہ روی پر ہے۔ نہایت درجہ پر ہر شئے کی حالت کو پہنچانا اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اعلیٰ حالت کو چھوڑ کر ادنیٰ حالت پر ہی اکتفا کیا جائے کیونکہ یہ اعلیٰ حالت سابقین امت کا مشرب اور مخلصین کا حصہ ہے ایسے درجہ کو بالکل ترک کرنا لطف الٰہی کے منافی ہے اس لئے یہ ضروری ہوا کہ ادنیٰ حالت کی بخوبی توضیح کر کے اس کے ساتھ لوگ مکان ترک کرنے کے درپے جائیں اور اس سے زاید اور اعلیٰ امور کی طرف بھی لوگ مائل کئے جائیں لیکن ہر شخص پر ان کو ضروری نہیں قرار دینا چاہئے۔ جن امور سے لوگ مکلّف کئے جاتے ہیں ان کے حصے مختلف ہیں، ایک حصہ تو عبادت کی مخصوص مقدار ہے جیسے پنج وقت نماز، رمضان کے روزے، اور بعض امور اس طاعت کے اجزا ہوتے ہیں جن کے بغیر وہ طاعت قابل اعتبار نہیں ہوتی جیسے تکبیر اور سورۂ فاتحہ کا

پڑھنا نماز کے لئے ، ایسے اجزا کا نام ارکان ہے اور بعض امور اس طاعت سے خارج ہوتے ہیں تین بدون ان امور کے طاعت غیر معتبر ہوتی ہے ان امور کا نام شروط ہے جیسے نماز کے لئے وضو۔

واضح ہو کہ کبھی تو کوئی شئے رکن امر طبعی کی وجہ سے قرار دی جاتی ہے اور کبھی کسی امر عارض کی وجہ سے پہلی صورت میں بغیر اس رکن کے عبادت پوری نہیں ہوتی اور نہ فائدہ مند ہوتی ہے جیسے نماز میں رکوع اور سجدہ اور روزہ میں کھانے پینے اور مجامعت سے باز رہنا، یا ایسے رکن کی وجہ سے کوئی امر مخفی اور مبہم جو نہایت ضروری ہوتا ہے منضبط ہو جاتا ہے جیسے تکبیر سے نیت کا انضباط، اور حضوری حاصل ہوتی ہے اور سورۂ فاتحہ سے دعا کا انضباط ہو جاتا ہے اور سلام کے ذریعہ سے نماز سے باہر آنے کی صورت ایسے عمدہ فعل سے منضبط ہو جاتی ہے جو وقار اور تعظیمی حالت کے منافی نہیں اور جو امر عارضی کی وجہ سے رکن قرار دیا جاتا ہے وہ کسی اور سبب کی وجہ سے واجب ہو جاتا ہے وہ نماز کا رکن اس لئے قرار دیا جاتا ہے کہ اس سے نماز کی تکمیل ہوتی ہے، اور پوری طرح سے نماز کی غرض اس سے حاصل ہو جاتی ہے اور اس سے پابندی وقت بھی نہایت عمدگی سے ظہور میں آتی ہے جیسے کہ اس شخص کے مسلک کے موافق جو کسی سورۂ قرآنی کے پڑھنے کو رکن قرار دیتا ہے تو اس کا رکن ہونا اس لئے ہے کہ قرآن شعائر الٰہی میں سے ہے اس کی تعظیم واجب ہے اور اس سے بے پروائی نہیں کرنی چاہئے اور اس کی پابندی وقت میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ اس کی تلاوت کا اس عبادت میں حکم دیا جائے جو سب عبادتوں میں زیادہ مؤکد، کثیر الوجود ہے اور لوگ بہ نسبت دوسری عبادتوں کے اس کے زیادہ مکلف ہیں یا اس کی وجہ سے دو مشتبہ چیزوں میں تمیز ہوتی ہے اس سے مقدمۃ الشئے اور اس شئے مستقل میں جو کسی شئے پر موقوف ہے تفریق ہوتی ہے ایسی شئے کو بھی رکن کر لیتے ہیں اور اس کی بجا آوری کا حکم کیا جاتا ہے جیسے رکوع اور سجود میں قومہ، اس کی وجہ سے سر جھکانے میں جو سجدہ کا مقدمہ ہے اور رکوع میں جو مستقل تعظیم ہے فرق ہو جاتا ہے، اور جیسے نکاح میں ایجاب وقبول اور گواہوں کا حاضر ہونا اور ولی کا موجود ہونا اور عورت کی رضامندی، کیونکہ بغیر ان امور کے نکاح اور زنا میں تمیز نہیں ہو سکتی اور ممکن ہے کہ تعیین ارکان میں دونوں وجہیں ذاتی اور عرضی جمع ہو جائیں اور جو کچھ ہم نے رکن میں گفتگو کی ہے اسی پر شرط کا حال قیاس کر لینا چاہئے اور کبھی کوئی شئے کسی وجہ سے واجب ہوتی ہے پس اس کو کسی شعائر دین کے لئے اس کی عظمت شان

کی وجہ سے شرط بنا دیا جاتا ہے۔ اور جو ہمارے ہی سے اس اطاعت کی کمالیت ہوتی ہے جیسے ہم سب کو جب کہ سب جگہ خانۂ کعبہ شعائرالٰہی میں سے ہے اس لئے اس کی تعظیم واجب ہے اور بڑی تعظیم کی صورت یہ ہے کہ عمدہ حالات اور افضل اوقات میں اس کی جانب اپنا رخ کریں اور نماز میں بھی ایک خاص جانب رخ کرنا شعائرالٰہی میں سے تھا کیونکہ اس سے نمازی کو خدا کی حضوری میں اظہار عاجزی وفرمانبرداری پر آگاہی ہوتی ہے اور اس سے اس کو وہ حالت یاد آتی ہے جو مالکوں کے سامنے غلاموں کے کھڑا رہنے سے ہوتی ہے، اس لئے نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا شرط قرار دیا گیا۔

اور بسا اوقات ایک شئے بغیر ایک خاص ہیئت کے معتد بہ فائدہ نہیں دیتی پس اس لئے اس کی صحت کے واسطے اس ہیئت کو شرط قرار دیا جاتا ہے جیسے نماز میں نیت کرنا کیونکہ اعمال کا اثر محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ دلی حالت کی تصویر اور صورت ہوتے ہیں۔ اور نماز خشوع اور خضوع کی تصویر ہے اور یہ خشوع بغیر نیت کے نہیں ہوسکتا، اور استقبال قبلہ بھی ایک دوسری وجہ سے شرط قرار دیا گیا کیونکہ دل کا باحضور اور متوجہ ہونا ایک مخفی امر تھا، اس لئے بیت اللہ کی طرف رخ کرنا جو کہ خداتعالیٰ کے شعائر میں سے ہے بجائے حضور دل کے قرار دیا گیا اور مثلاً وضو، ستر ڈھانکنا اور ناپاکی دور کرنا، کیونکہ دلی تعظیم ایک مخفی امر تھا اس لئے وہ حالتیں اس دلی تعظیم کو قائم مقام کی گئیں جن کا بادشاہوں اور امرا کی حضوری میں جاتے وقت انسان لحاظ کیا کرتا ہے اور جن کو لوگ آداب تعظیمی سے شمار کرتے ہیں یہ امور ان کے دل نشیں ہوگئے ہیں اور تمام عرب وعجم ان پر متفق ہیں اور جب کوئی عبادت فرض ہونے کے لئے معین کی جائے تو چند اصول کا لحاظ کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو صرف آسان امر کی تکلیف دینی چاہئے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ ''اگر میں اپنی امت پر گراں نہ سمجھتا تو میں ہر نماز کے لئے وضو کی طرح مسواک کرنا فرض کردیتا''۔

اور ان اصول میں سے ایک یہ ہے کہ جب امت کسی مقدار خاص کے متعلق یہ سمجھ لے کہ اس کے ترک کرنے سے خداتعالیٰ کی شان میں کوتاہی کرنا ہے اور یہ امر ان کے دلوں میں اس لئے خوب جم جائے کہ وہ شئے انبیا علیہم السلام سے منقول ہوتی چلی آتی ہے اور سلف کا برابر اس پر اتفاق

رہا ہے، یا ایسے ہی امور اور بھی ہوں تو ایسی حالت میں مقتضائے حکمت یہی ہے کہ جیسے لوگوں نے اس کو اپنے ذمہ واجب ٹھہرالیا ہے ان پر وہ شئے واجب ہی کر دی جائے جیسے اونٹوں کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام کر دیا گیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں جو آپ نے رمضان میں قیام کی نسبت فرمایا تھا یہی مراد ہے کہ میں اس بات سے ڈر گیا کہ کہیں یہ قیام تم پر فرض نہ ہو جائے۔

اور ان اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب تک کوئی شئے خوب صاف صاف اور ظاہر اور منضبط نہ ہو لوگوں پر وہ فرض نہ کی جائے یہی وجہ ہے کہ حیا اور تمام اخلاق اسلام کے ارکان نہیں قرار دیئے گئے گو وہ اسلام کے شعبے ہیں، اور ادنیٰ طاعت کی حالت آسائش و سختی کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے پس طاقت رکھنے والے کے لئے قیام فرض کیا گیا اور ناتواں کے لئے بیٹھنے کو قیام کا جانشین ٹھہرایا۔ اور ایسے ہی ملائمت حد اعلیٰ میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ کمیت کی زیادتی اس طرح ہے کہ نوافل کو بہ منزلہ فرائض کے ادا کرنا، جیسے سنت موکدہ اور نماز تہجد اور ہر ماہ میں تین روزے رکھنا اور نفل صدقہ دینا وغیرہ۔ اور کیفیت کی زیادتی اس طرح ہوتی ہے کہ خاص خاص سنتیں اور اذکار ادا کرنا اور ان امور سے پرہیز کرنا جو عبادت کے نامناسب ہیں پس ان امور کا عبادت میں اس لئے حکم دیا جاتا ہے کہ تکمیل ہو جائے اور ان کی بجا آوری پورے طور سے مقصود تک پہنچا دے جیسے وضو میں ان جوڑوں کا خیال رکھنا جن میں میل جمع ہو جاتا ہے، پس ان کے دھونے کا اس لئے حکم کیا گیا ہے کہ پورے طور پر پاکیزگی حاصل ہو جائے اور جیسے دائیں جانب سے ابتدا کرنے کا اس لئے حکم دیا گیا ہے تاکہ نفس عبادت کی عظمت پر تنبیہ ہو اور اعمال مہمہ میں عبادت کی طرف متوجہ ہو۔

واضح ہو کہ جب کوئی انسان کسی خلق کو حاصل کرنا چاہئے اور قصد کرے کہ یہ قصد اس کی رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس کا ہر طرف سے احاطہ کرے تو اس کے حصول کا ذریعہ یہی ہے کہ اس کے مناسب جو جو افعال ہوں ان سب کو انجام دے اگر چہ وہ تمام لوگوں کی نظر میں ادنیٰ اور ناقابل اعتبار ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے شجاعت کی مشق کرنے والا کہ وہ نہ دلدلوں میں چلنے سے جھجکتا ہے نہ آفتاب کی گرمی میں اور شب تاریک میں چلنے سے گھبراتا ہے۔ ایسے ہی جس کو خوف خدا کی

مشق منظور ہو تو ہر حال میں آداب تعظیمی کا التزام کرے، رفع حاجت کے وقت سرنگوں اور باحیا ہو کر بیٹھے اور جب خدا تعالیٰ کا ذکر کرے تو اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹ لے، اور جو عدالت کی مشق کرنا چاہے تو وہ ہر چیز کا حق ادا کرے، کھانے اور پاکیزہ چیزوں کے لئے دائیں ہاتھ کو خاص کرے اور نجاست دور کرنے کے لئے بائیں ہاتھ کو کام میں لائے اور یہی راز تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا تھا کہ بڑے کو مسواک دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب میں میں نے دیکھا کہ مسواک کر رہا ہوں اتنے میں دو شخص آئے ان میں سے ایک بڑا تھا میں نے مسواک چھوٹے کو دے دی اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ بڑے کو دو، ایسے ہی حویصہ اور محیصہ کے قصہ میں آپ نے فرمایا بڑے کو پہلے گفتگو کرنے دو (جنگ خیبر میں جب ابن سہیل قتل ہو گئے اور کوئی ان کا قاتل معلوم نہ ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عبدالرحمٰن مقتول کے بھائی اور مسعود کے دونوں بیٹے، حویصہ اور محیصہ آئے عبدالرحمٰن نے گفتگو شروع کر دی لیکن وہ عمر میں چھوٹے تھے اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا۔ بڑے کو پہلے گفتگو کرنے دو، پس آداب کے بارے میں یہ بڑا قاعدہ کلیہ ہے۔

• واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور ایسے ہی اور جگہ بھی شیاطین کی طرف بعض افعال کی نسبت کی گئی ہے اس لئے معنی میرے رب تبارک وتعالیٰ نے مجھ کو یہ سمجھائے ہیں کہ شیاطین کو خدا تعالیٰ نے قدرت دی ہے کہ خواب میں یا بیداری کی حالت میں لوگوں کی نظر کے سامنے ایسی شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں جو ان کے مزاج سے اور ان احوال سے جو ان پر شکل بننے کے وقت طاری ہوتے ہیں، حاصل ہوتی ہیں جن لوگوں کا وجدان سلیم ہوتا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ شیاطین کے مزاج کی وجہ سے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جو نہایت شنیع اور برے ہوتے ہیں اور ان کی مزاجی حالت ناپاکیوں سے قریب کر دیتی ہے، ذکر الٰہی میں اس کی وجہ سے سنگ دلی ہو جاتی ہے، جتنے عمدہ انتظامات ہوتے ہیں ان میں ان کی مزاجی حالت کی وجہ سے ابتری ہو جاتی ہے افعال شنیعہ سے ہماری مراد ایسے افعال ہیں کہ جب انسان ان کا ارتکاب کرے تو لوگوں کے دل اس کی وجہ سے نہایت بیزار ہوں، ان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، وہ زبان سے ان افعال پر لعن وطعن کریں۔ اور یہ بنی آدم کا قدرتی طریقہ ہے جو صورت

نوعیہ کے فیضان سے ان میں پیدا ہوا ہے اور اس قدرتی طریقہ کے حصول میں تمام فرقے بلا لحاظ رسم اور قوم اور ملت و مذہب کے مساوی ہیں۔ ایسے افعال شنیعہ مثلاً اپنی شرمگاہ کو ہاتھ میں لینا، کودنا، ناچنا، اپنی دبر میں انگلی داخل کرنا، اپنی داڑھی کو تھوک سے آلودہ کرنا یا ناک، کان کاٹ کر سیاہ رو ہونا، لباس کو الٹا پہننا، قمیص کا اوپر والا حصہ نیچے کر لینا، یا کسی چوپایہ پر سوار ہو کر اس کی دم کی طرف اپنا منہ کر لینا یا ایک پاؤں میں موزہ پہن کر دوسرا برہنہ چھوڑ دینا۔ ایسے ہی اور افعال ہیں جن کو دیکھتے ہی ہر شخص لعنت ملامت کرتا ہے۔

اور میں نے بعض اوقات میں شیاطین کو بعض ایسے افعال کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور خفیف کاموں سے میری مراد یہ ہے کہ اپنے کپڑے یا کنکریوں سے کھیلنا یا بدنما طور پر ہاتھ پاؤں ہلانا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خداوند کریم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان افعال کو منکشف کیا کہ یہ افعال شیطانی مزاجوں سے پیدا ہوتے ہیں، پس شیاطین جب کسی کو خواب میں یا حالت بیداری میں نظر آئیں گے تو ضرور ان افعال میں سے کوئی نہ کوئی حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، اور خدا تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ بتلایا کہ خدا تعالیٰ مومن کے لئے یہ پسند کرتا ہے کہ حتی الامکان شیاطین اور ان کی حالتوں سے ...یز کیا جائے پس اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال اور صورتوں کو بیان فرما دیا، ان کی کراہت ظاہر فرمائی اور ان سے محترز رہنے کا حکم دیا۔ اور اسی قسم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ قضائے حاجت کے موقعوں پر شیاطین آ موجود ہوتے ہیں اور اسی قسم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ شیا...ن بنی آدم کی مقعدوں سے کھیل کرتے ہیں اور جب انسان جمائی لیتے وقت ہاہ ہاہ کرتا ہے تو شیاطین ہنستے ہیں اور ملائکہ کی حالتوں کو جو رغبت لوگوں کو دلائی گئی ہے اس کو بھی اسی پر قیاس کر لو۔ چنانچہ اس باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ "تم ایسی صفیں کیوں نہیں باندھتے ہو جیسی ملائکہ صفیں باندھتے ہیں اور یہ حدیث ابواب آداب کے لئے ایک دوسرا قاعدہ ہے۔

واضح ہو کہ جب کوئی شے پر فرض کفایہ مقرر کی جاتی ہے تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ اگر سب لوگ مجتمع ہو کر اس کو کرنے لگیں تو انتظام معاش درہم برہم ہو جائے، ان کی تدابیر نافع معطل

ہو جائیں اور بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ ایک کام کے لئے خاص کر دیئے جائیں اور اوروں سے کوئی دوسرا کام لیا جائے، مثلاً جہاد ہے اگر سب لوگ اس کے لئے جمع ہو جائیں اور زراعت، تجارت اور صناعات کو سب لوگ چھوڑ دیں تو معاش درہم برہم ہو جائیں گی اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ بعض کو جہاد کا کام سپرد کر دیا جائے اور بعض کو تجارت کا اور بعض کو زراعت کا اور بعض کو قضا اور تعلیم علوم کی خدمت پر مقرر کر دیا جائے اس لئے کہ کسی کو کسی امر میں آسانی ہوتی ہے جو دوسرے کو نہیں ہوتی، اور جس امر کے لئے جو قابل ہے اس کا علم ناموں اور اقسام سے ہو نہیں سکتا کہ ان کو حکم کا مدار علیہ بنایا جا سکے۔ اور فرض کفایہ کے اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ اس امر کفایہ سے ایسی مصلحت مقصود ہو کہ اس سے انتظام باقی رہے اور اس کے ترک سے کوئی نفسانی ابتری اور بہیمیت کا غلبہ نہ ہو مثلاً قاضی ہونا، علوم دین کی تعلیم اور خلافت کا بندوبست کرنا کیونکہ یہ سب امور انتظاماً مقرر ہوئے ہیں، اور یہ امور ایک آدمی کے ذریعہ بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور جیسے مریض کی عیادت اور جنازہ کی نماز پڑھنا اس لئے مشروع ہوئے ہیں کہ ان سے مقصود یہ ہے کہ بیماری اور مردہ ضائع نہ ہو جائے اور یہ مقصود بعض لوگوں کے پورا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

آٹھواں باب: اوقات کے اسرار کا بیان

امت کی سیاست بغیر اس کے پوری نہیں ہوتی کہ ان کی عبادت کے اوقات مقرر کر دیئے جائیں اور تعیین اوقات میں اصلی امر فراست ہے جس سے مکلفین کی حالت خود معلوم کی جا سکتی ہے اور اس سے وہ چیز اختیار کر لیجاتی ہے جو لوگوں پر گراں نہ ہو اور اصل مقصود کے لئے اسی قدر بات کافی ہے مگر اس کے علاوہ تعین اوقات میں اور بھی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں جن کو علم میں کامل اشخاص خوب جانتے ہیں اور ان حکمتوں کا تین قاعدوں پر استنباط ہوتا ہے، اولاً یہ کہ اگرچہ خداوند کریم زمانہ سے برتر ہے لیکن آیات اور احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ بعض اوقات میں خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے قریب ہوتا ہے اور بعض اوقات میں لوگوں کے اعمال اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور بعض اوقات میں بعض بعض حوادث کو دنیا میں مقرر اور مقدر کرتا ہے۔ اور اسی قسم کے بہت سے احوال متجددہ ہیں اگرچہ ان کی اصلی حقیقت خدا تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو خدا تعالیٰ ہر شب آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن لوگوں کے اعمال خدا کے حضور میں پیش ہوتے ہیں، اور آپ کا فرمان ہے کہ خدا تعالیٰ نصف شعبان کی شب اخیر میں جھانکتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آسمان دنیا کی طرف نزول کرتا ہے، اس باب میں بہت سی حدیثیں وارد ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ امر ضروریات دین سے ہے کہ بعض اوقات میں زمین پر روحانیت پھیلتی ہے اور ان اوقات میں مثالی قوت سرایت کرتی ہے۔ قبول طاعت اور قبولیت دعا کے لئے ان اوقات سے عمدہ وقت کوئی نہیں ہوتا ہے، ان اوقات میں ذرا سی کوشش کرنے سے نہایت وسعت کے ساتھ قوت بہیمی ملکی طاقت کے مطیع ہو جاتی ہے اور ملأ اعلیٰ اس روحانیت اور مثالی قوت کے پھیلنے کو دورات (۱) آسمانی کے حساب سے نہیں پہنچانتے بلکہ اپنے ذوق اور وجدان سے اس کو اس طور پر معلوم کر لیتے ہیں کہ ان کے دلوں میں اولاً کوئی شئے مطیع ہوتی ہے اس سے وہ سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی روحانیات پھیلنے والی ہے اور کوئی حکم الٰہی نازل ہونے والا ہے، اسی روحانیت کے پھیلنے کو حدیث میں اس بات سے تعبیر کیا ہے کہ یہ گویا رنج کی آواز ہے جو پتھر پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔

انبیا علیہم السلام کے قلوب میں یہ علوم ملأ اعلیٰ کی جانب سے منطبع ہوتے ہیں پس وہ بھی ان علوم کو وجدان اور ذوق سلیم سے معلوم کرتے ہیں اور آسمانی دورات کا ان کو حساب لگانا نہیں پڑتا، اس کے بعد انبیا اس موقع کے مقرر کرنے میں کوشش کرتے ہیں جہاں اس ساعت کے ہونے کا گمان ہوتا ہے ان کے تعین کے بعد لوگوں کو حکم کرتے ہیں کہ اس ساعت کی محافظت کریں، پس ان ساعتوں میں بعض وہ ساعتیں ہیں جو دورہ سال کے ساتھ دورہ کرتی ہیں چنانچہ اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے "ہم نے قرآن کو مبارک شب میں نازل کیا ہے ہم برائیوں سے لوگوں کو ڈرانے والے ہیں ہمارے حکم سے اس شب میں مضبوط کام جدا جدا کئے جاتے ہیں، ہم ہی پیغمبروں کو بھیجا کرتے ہیں"۔ اور اسی ساعت میں اوّل آسمان میں قرآن کی روحانیت معین ہو گئی تھی اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ ساعت رمضان میں واقع ہوتی تھی اور ان میں سے بعض وہ

---

(۱) آسمانی گردش کے حساب و شمار

ساعتیں ہیں جو ہفتہ کے بعد آتی ہیں اور وہ ایک تھوڑا سا وقت ہے جس میں دعا اور عبادت کے قبول ہونے کی بڑی امید ہوتی ہے اور جب لوگ عالم معاد کی طرف رجوع کریں گے تو اسی وقت میں خدا تعالیٰ ان پر تجلی کرے گا اور اسی ساعت میں اللہ تعالیٰ بندوں کے قریب ہوگا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ ساعت جمعہ کے دن واقع ہوتی ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ بڑے بڑے واقعات جمعہ کے دن ہی ہوئے ہیں جیسے آدم علیہ السلام کی پیدائش اسی روز ہوئی، اور نیز بہائم کو ملائکہ سفلی کے ذریعہ سے بسا اوقات اس ساعت کی عظمت معلوم ہوجاتی ہے اس وقت وہ خوف زدہ اور ایسے مرعوب رہتے ہیں جیسے کوئی سخت آواز سے خوف زدہ رہتا ہے۔ جمعہ کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مشاہدہ کیا تھا، ان میں سے بعض ساعتیں ہر روز آتی ہیں اس وقت کی روحانیت اور روحانیتوں کی نسبت کسی قدر ضعیف ہوتی ہے اور اصحاب ذوق سلیم جن کو ملأ اعلیٰ سے علوم حاصل ہوتے ہیں ان کا اتفاق ہے کہ روزانہ ایسے اوقات چار ہیں (۱) آفتاب کے طلوع ہونے سے پیشتر (۲) نصف النہار سے ذرا پہلے (۳) آفتاب کے غروب ہونے کے بعد (۴) نصب شب سے لیکر صبح تک، پس خاص ان اوقات میں اور کسی قدر ان ہی سے پہلے اور بعد تک روحانیت پھیلتی ہے اور برکات ظاہر ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے تمام اہل مذاہب جانتے ہیں کہ ان اوقات میں عبادت زیادہ مقبول ہوتی ہے لیکن مجوس نے دین کی تحریف کرلی تھی اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر ان اوقات میں سورج کی پوجا کرنے لگے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریف کا سد باب کرنے کے لئے ان اوقات کو ایسے وقتوں سے بدل دیا جو ان اوقات سے کچھ دور بھی نہ تھے اور اصل غرض بھی اس تبدیلی سے فوت نہ ہوتی تھی اور نصف شب میں اس لئے نماز فرض نہیں کی کہ اس میں حرج تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت صحیح ثابت ہے آپ نے فرمایا ''شب میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اگر وہ مسلمان بندہ کو مل جائے اور اس میں دنیا اور آخرت کی کسی بھلائی کو خدا تعالیٰ سے مانگے تو اس کو خدا قبول فرماتا ہے اور دیتا ہے، اور ہر شب میں یہ ساعت ہوتی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے ''نصف شب کی نماز سب نمازوں سے افضل ہے لیکن اس کے پڑھنے والے لوگ کم ہیں''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سے وقت میں دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے،

آپ نے فرمایا کہ نصف شب میں۔ اور زوال کی ساعت کی نسبت فرمایا کہ وہ ایسی ساعت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھلتے ہیں اس میں پسند کرتا ہوں کہ اس ساعت میں میرے اچھے عمل اوپر جائیں، اور فرمایا کہ دن کے فرشتے رات کے فرشتوں کے آنے سے پہلے آسمان کی طرف جاتے ہیں اور رات کے فرشتے دن کے فرشتوں کے آنے سے پہلے آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں، ان مضامین کی طرف خدا تعالیٰ نے بھی اپنی محکم کتاب میں اشارہ فرمایا ہے، اس کا ارشاد ہے خدا تعالیٰ کی پاکی ہے جس وقت کہ تم شام کرتے ہو اور جس وقت کہ تم صبح کرتے ہو، اور آسمانوں اور زمین میں خدا کی تعریف ہے شام کے وقت اور جب کہ تمہارا وقت ظہر آتا ہے''۔ اور اس امر میں بہت سی نصوص ہیں جو سب کو معلوم ہیں اور میں نے اس کے متعلق بڑے بڑے مشاہدے کئے ہیں۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا مناسب وقت وہ ہے کہ انسان تمام طبعی تشویشات سے فارغ ہو مثلاً زیادہ بھوک، زیادہ پیاس، زیادہ سیری، نیند کا غلبہ، سستی کا ظہور اور بول و براز کی حاجت وغیرہ امور نہ ہوں اور خیالی پریشانیوں سے بھی انسان آزاد ہو مثلاً لغو اور بیہودہ گفتگوؤں سے کان بھرے ہوئے نہ ہوں اور مختلف صورتوں و پریشانی کرنے والی رنگتوں سے آنکھ پر نہ ہو اور اسی قسم کی تشویشات سے فراغت ہو، اور یہ فراغت اور آزادی عادات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوا کرتی ہے لیکن وہ وقت جو تمام عرب اور عجم، مشرق و مغرب کے لوگوں کے لئے بہ منزلہ طریقۂ طبعی کے ہو گیا ہے اور جو اس قابل ہے کہ نوامیس کلی میں اس کو دستور بنا دیا جائے اور اس کے خلاف وقت کو شاذ و نادر ہی سمجھا جاتا ہے وہ صبح اور شام کا وقت ہے۔ اور انسان کو ایک صیقل کی ضرورت ہے جس سے دل کا زنگ دور ہو جائے جبکہ وہ اپنے نفس پر قادر ہوتا ہے اور یہ وہ وقت ہے جب وہ بستر کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کو سونے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی لئے نبی علیہ السلام نے عشا کے بعد قصہ گوئی اور شعر خوانی سے منع فرمایا ہے۔ سیاست امت کے اتمام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کچھ کچھ زمانہ کے بعد نفس کو عبادت کے لئے آمادہ رہنے کا حکم دیا جائے تاکہ نماز کا انتظار اور نماز پڑھنے سے پہلے اس کی تیاری اور آمادگی اور نماز پڑھنے کے بعد اس کا بقیہ نور اور رنگ نماز کے حکم میں سمجھا جائے اور اس طرح پر اگر تمام اوقات کا استیعاب نہ ہو سکے تو

اکثر اوقات کا استیعاب ہو جائے۔ اور ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے کہ جو شخص نماز تہجد کے قصد سے سوتا ہے وہ کبھی خواب میں غرق نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی تجربہ کیا ہے کہ جس کا دل کسی انتظار دنیوی یا محافظت وقت صلوٰۃ یا وظیفہ میں لگا رہتا ہے کہ وہ ناغہ نہ ہو تو اس کو کبھی حالت میں محویت نہیں ہوتی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی راز ہے ''جو شخص خواب سے بیدار ہو اور پڑھے (لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیٔ قدیر وسبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ ''اس کے بعد کہے رب اغفرلی ،تو خدا تعالیٰ اس کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ اور اگر یہ شخص وضو کر کے نماز پڑھ لے گا تو اس کی نماز بھی قبول ہوگی)اور خدا تعالیٰ کے اس قول میں بھی یہی راز ہے ''وہ ایسے لوگ ہیں جن کو نہ تجارت خدا کی یاد سے غافل کرتی ہے اور نہ خرید وفروخت اور مناسب یہ ہے کہ دو وقتوں کے درمیان چوتھائی دن کا فاصلہ دیا جائے پس اتنے عرصہ میں تین گھنٹہ کی مہلت ہو جاتی ہے اور یہ تین گھنٹہ مقدار مستعمل کی اول حد کثرت ہے جو تمام عرب وعجم کے ہاں شب روز کی تقسیم میں معتبر ہے، حدیث میں آیا ہے، سب سے پہلے نوح علیہ السلام نے دن ورات کے حصے کئے تھے ان کے بعد ان کی اولاد یہی حصے کرتی چلی آئی۔

تیسرا قاعدہ اوقات میں یہ ہے کہ عبادت کا وقت ایسا ہونا چاہئے جو کسی نعمت الٰہی کو یاد دلائے مثلاً یوم عاشورہ کہ اس روز خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر غلبہ عطا فرمایا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ اور جیسے ماہ رمضان، کہ اس ماہ میں قرآن نازل ہوا اور ملت اسلام کے ظہور کی ابتدا اس سے ہوئی ۔یا انبیا علیہم السلام کی عبادت اور اس کے مقبول ہونے کو یاد دلائے جیسے عید الاضحیٰ کا دن، کیونکہ یہ روز حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح اور ان کے فدا ہونے کو یاد دلاتا ہے، یا یہ کہ اس روز عبادت کرنے سے بعض شعائر الٰہی کی تعظیم معلوم ہوتی ہے۔ جیسے عید الفطر کے دن نماز پڑھتے ہیں، صدقہ کرتے ہیں اس سے رمضان کی تعظیم، اور خدا نے روزہ رکھنے کی جو توفیق عطا فرمائی تھی اس کے ادائے شکر کی ایک شان معلوم ہوتی ہے۔ اور جیسے عید الاضحیٰ کا دن، کہ اس میں حجاج کے ساتھ ایک قسم کی مشابہت ہوتی ہے اور جو رحمتیں خدا تعالیٰ نے حجاج کے لئے مقرر کی ہیں ان کو اپنے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے یا یہ ہو کہ

ان اوقات میں عبادت کرنا ان صالحین کی سنت ہو جن کو سب لوگ اچھا کہتے ہیں جیسے نماز پنج گانہ کے اوقات حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا یہ تمہارا وقت ہے اور تم سے پہلے انبیا کا وقت بھی یہی تھا۔ اور جیسے رمضان کے روزوں کے متعلق ارشاد الٰہی ہے ''تم پر روزے ایسے ہی فرض ہوئے جیسے اگلے لوگوں پر فرض ہوئے تھے''۔ اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی ہے اور ہمارے متعلق یوم عاشورہ کے روزہ کا بھی یہی حال ہے۔ اور یہ تیسرا قاعدہ اکثر اوقات میں معتبر ہے، اور دونوں پہلے قاعدے اوقات کے اصل الاصول ہیں۔ واللہ اعلم۔

نواں باب: اعداد اور مقداروں کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ شریعت نے ایک چیز کی مقدار معین کی اور اس کی دوسری نظیر کی مقدار معین نہیں کی تو اس کی حکمتیں اور مصلحتیں خاص ہیں اگرچہ اس امر میں پورا اعتماد انسان کی فراست پر ہے جس سے مکلفین کی حالت اور وہ امور جانے جاتے ہیں جو لوگوں کی سیاست کے لائق ہیں اور یہ مصلحتیں اور حکمتیں چند اصول کی طرف رجوع کرتی ہیں (۱) یہ کہ طاق ایک ایسا مبارک عدد ہے کہ جب تک یہ کافی ہو سکے گا اس کو ترک نہیں کریں گے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں یہی مراد ہے ''بیشک خدا طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے پس اے قرآن والو! وتر نماز پڑھا کرو''۔ اس میں راز یہ ہے کہ ہر کثرت کی ابتدا وحدت سے ہوتی ہے اور طاق عدد تمام کثرت کے عددوں میں وحدت کے قریب تر ہے کیونکہ عدد کے ہر مرتبہ میں ایک غیر حقیقی وحدت شامل ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتبہ قرار پاتا ہے مثلاً دس کا عدد چند وحدتوں کا مجموعہ ہے جو ایک عدد اعتبار کیا گیا ہے پانچ اور پانچ کے دو عددوں کا نام دس نہیں ہے اسی پر اور عددوں کو بھی قیاس کر لو۔ اور یہ غیر حقیقی وحدت ان مراتب عددی میں حقیقی وحدت کا نمونہ ہے اور اس کی جانشین ہے اور طاق عدد میں ایک تو یہ غیر حقیقی وحدت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اسی قسم کی ایک اور وحدت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کی تقسیم دو صحیح عددوں پر مساویانہ نہیں ہو سکتی اس لئے طاق عدد بہ نسبت جفت عدد کے وحدت سے قریب تر ہے اور ہر موجود شئے کا اپنے مبداء سے قریب ہونا خدا تعالیٰ کے قریب ہونے کی طرف رجوع کرتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ تمام مبدوں کا مبداء ہے اور وحدت کاملہ اس میں ہوگی جو خلق الٰہی کا ایک نمونہ ہوگا۔

واضح ہو کہ طاق عدد کے چند مراتب ہیں، بعض طاق عدد جفت کے مشابہ اور قریب ہوتے ہیں جیسے نو اور پانچ کا عدد، کیونکہ اگر ان میں سے ایک ایک ہندسہ کم کر دیا جائے تو ان کی تقسیم صحیح دو دو جفت عدد کی طرف ہو جاتی ہے اور نو کا عدد اگر چہ دو صحیح عدد پر مساوی تقسیم نہیں ہوتا لیکن اس کے برابر برابر تین حصے ہو سکتے ہیں اور اسی طرح جفت کے بھی چند مرتبے ہیں، بعض جفت عدد ایسے ہیں جو طاق عدد سے مشابہ ہوتے ہیں، جیسے بارہ کا عدد کہ وہ تین بار چار چار عدد لینے سے حاصل ہوا ہے اور جیسے چھ کا ہندسہ ہے کہ وہ دو کو تین بار لینے سے بنا ہے اور سب طاق عددوں میں امام، اور جس میں جفت کے ساتھ مشابہت بھی نہیں ہے وہ ایک کا عدد ہے اور اس کے بعد اس کے وارث اور جانشین تین اور سات کے عدد ہیں اور جو عدد ان کے علاوہ ہیں وہ ایک عدد کی قوم اور امت میں سے ہیں اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی مقادیر میں ایک تین اور سات کو اختیار فرمایا اور جہاں بہ مقتضائے حکمت ان اعداد سے زیادہ کسی اور عدد کا حکم دیا گیا ہے تو وہاں وہ عدد اختیار کیا جو ان تینوں میں سے کسی کے بڑھ جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کا عدد ہے جو صفر سے دس دو صفر سے سو اور تین صفر سے ہزار ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح سے اس کے ساتھ ایک اور ملانے سے گیارہ کا عدد ہو جاتا ہے اور اسی طرح تین کا عدد ہے اس کے ساتھ صفر ملانے سے تیس اور تین ملانے سے تینتیس اور دو صفر ملانے سے تین سو ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح سات کا عدد صفر ملانے سے ستر اور دو صفر ملانے سے سات سو تک پہنچتا ہے جو عدد بڑھانے کے بعد حاصل ہوتا ہے وہ گویا بعینہ وہی عدد ہوتا ہے جس کو بڑھا لیا ہے، اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے بعد سو کلموں کا پڑھنا مسنون کر دیا پھر تین مرتبہ تینتیس سے اس کو تقسیم کر دیا اور ایک کو زاید کر کے چونتیس بار کر دیا تا کہ مجموعہ مل کر طاق ہو جائے جو طاق عددوں کے امام یا جانشین کی طرف رجوع کرتا ہو اور اعداد کی طرف ہر ایک مقولہ جو ہر اور عرض کے لئے بھی ایک اور جانشین ہوتا ہے مثلاً نقطہ بہ منزل امام کے ہے اور دائرہ اور کرہ اس کے جانشین ہیں اور تمام شکلوں میں اس سے زیادہ قریب ہیں۔

میرے والد قدس سرہ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ انھوں نے ایک بڑے واقعہ کا معائنہ کیا جس میں حیات، علم، ارادہ اور تمام صفات الٰہیہ، یا انھوں نے فرمایا حی، علیم، مرید اور کل اسما الٰہی (ان دونوں میں مجھ کو یاد نہیں کہ کونسا جملہ فرمایا تھا روشن دائروں کی شکل میں سامنے آئے اور پھر مجھ

سے یہ بھی فرمایا کہ بسیط شئے عالم اشکال میں وہ صورت قبول کرتی ہے جو نقطہ سے زیادہ قریب ہو اور ایسی شکل سطح میں دائرہ ہے اور جسم میں کرہ ہے، انتہی کلامہ۔

واضح ہو کہ عادت اللہ یہ رہی ہے کہ وحدت کا عالم کثرت میں نازل ہو، عالم مثال کے تعلقات کی وجہ سے ہوتا ہے اور انہی ارتباطات میں واقعات صورت پکڑتے ہیں اور زبان قدم کا ترجمان حتی الامکان انہی ارتباطات کی رعایت رکھتا ہے۔

دوسرا قاعدہ ان اعداد کے راز ظاہر کرنے میں ہے جن کا بیان ترغیب یا ترہیب کے موقع میں آیا ہے۔ معلوم ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نیکی اور برائی کے خصائل پیش کئے جاتے ہیں اور نیکی کے فضائل اور برائی کے عیوب آپ پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ نے جس طرح آپ کو بتلا دیا ویسے ہی آپ بیان کر دیتے ہیں اور انکشاف کے وقت جس شئے کا جو حال معلوم ہوا اس کا عدد آپ بتاتے ہیں لیکن اس عدد کے بیان کرنے سے آپ کا قصد حصر کرنا نہیں ہوتا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے برے اور بھلے اعمال مجھ کو دکھائے گئے، پس اچھے اعمال میں راستہ سے ایذا کا دور کر دینا بھی تھا، اور برے اعمال میں یہ بھی تھا کہ کوئی شخص مسجد میں لعاب دہن پائے اور بغیر دبائے ویسے ہی چھوڑ دے، اور نیز آپ نے فرمایا کہ میری امت کے اجر میرے سامنے پیش ہوئے حتی کہ جو شخص مسجد سے ناپاکی دور کر دے اس کا بھی اجر تھا۔ اور میری امت کے گناہ بھی مجھ کو دکھائے گئے، ان میں میں نے اس سے زیادہ کوئی گناہ نہیں پایا کہ کسی شخص کو قرآن کی کوئی سورت یا آیت یاد ہو اور اس کو وہ بھلا دے۔ اسی قاعدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو قیاس کرنا چاہئے کہ تین (۱) شخصوں کو دو دو اجر ملیں گے۔ (اول اہل کتاب جو اپنے پیغمبر پر بھی ایمان لایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا، دوسرے کسی کا غلام خدا کا حق بھی ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی، تیسرے وہ شخص جس کے پاس کوئی کنیز ہو وہ اس سے ہم بستر ہوتا تھا پھر اس کو ادب سکھایا اور اچھی طرح اس کو تعلیم دی اور اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین شخصوں سے خدا کلام نہ کرے گا (اور نہ ان کو ستھرا کرے گا ایک بوڑھا آدمی زانی، دوسرے جھوٹا بادشاہ، تیسرے متکبر حاکم) اسی طرح آپ نے

---

(۱) تین اور چالیس کے عدد سے کثرت مراد ہے، حصر مقصود نہیں ہے۔

فرمایا کہ چالیس خصلتیں ایسی ہیں کہ جو ان میں سے ایک خصلت کو بھی ثواب کی امید سے اور اس کے وعدہ کی تصدیق کر کے کرے گا۔ خدا اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ ان خصلتوں میں سے سب سے اعلیٰ یہ ہے کہ کسی کو بکری دے دے (تا کہ وہ شخص اس کے دودھ اور اون سے فائدہ اٹھائے اور پھر یہ شخص اس کو واپس لے لے) اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی عمل کے فضائل یا کسی شئے کے اجمالی حصے منکشف ہو جاتے ہیں پس آپ اس کو منضبط کرنے کی وجہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسا عدد مقرر کر کے خبر دیتے ہیں کہ جس میں اس کا کثیر الوقوع ہونا، یا عظیم الشان ہونا محصور ہو جائے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو تنہا نماز پڑھنے پر جماعت کی نماز کو ستائیس درجہ فضیلت ہے'' اسی پر قیاس کر لینا چاہئے اس لئے کہ ستائیس کا عدد تین تین کو ضرب دے کر پھر مضروف فیہ کو تین میں ضرب دینے سے حاصل ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں جماعت کے منافع تین قسم کے تھے، ایک وہ جس کا اثر خود نمازی کے جسم پر ہوتا ہے کہ اس کے نفس کی تہذیب ہو جاتی ہے، قوت ملکی غالب اور بہیمی قوت دب جاتی ہے، دوم، لوگوں میں سنت راشدہ کا اجرا ہوتا ہے نماز پڑھنے میں ان کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اس کے ذریعہ ان کے نفس کی تہذیب ہوتی ہے اور سب میں اتفاق پیدا ہوتا ہے، سوم یہ کہ ملت مصطفویہ کو بقا اور تازگی حاصل ہوتی ہے جس میں تحریف اور سستی خلط نہیں ہو سکتی، اور نیز پہلے حصہ میں تین منفعتیں ہیں، اللہ تعالیٰ اور ملأ اعلیٰ سے تقرب، نیکیوں کا لکھا جانا، گناہوں کا معاف ہونا، ایسے ہی دوسرے حصہ میں تین منافع ہیں، قوم اور شہر کا انتظام دنیا میں برکات کا نازل ہونا، ایک کا دوسرے کے لئے قیامت کے دن شفاعت کرنا، اور تیسرے حصہ میں بھی تین منافع ہیں، ملأ اعلیٰ کی اتفاقی کوشش کا جاری ہونا، لوگوں کا خدا تعالیٰ کی درازرسی کو پکڑنا، ایک دوسرے کے انوار کا باہم پرتو پڑنا۔ اور پھر ان نو امور میں سے ہر ایک کے لئے تین تین منافع، خدا تعالیٰ کی رضامندی، فرشتوں کا ان پر رحمتیں بھیجنا، شیاطین کا ان سے دور ہونا اور ایک روایت میں بجائے ستائیس کے پچیس کا عدد آیا ہے، اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ جماعت میں پچیس خوبیاں ہیں، دلوں کا استقلال، جماعت میں باہمی الفت، ملت کی پائیداری، ملائکہ کا نزول، شیاطین کی روپوشی، اور ان پانچ میں سے ہر ایک صورت میں پانچ پانچ منافع ہیں، خدا تعالیٰ کی رضامندی، دنیا میں لوگوں پر برکات کا نازل ہونا، ان کے

لئے نیکیوں کا لکھا جانا، گناہوں کا معاف ہونا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور فرشتوں کی ان کے لئے شفاعت کرنا، اختلاف روایت کا سبب وجوہ انضباط میں اختلاف واقع ہونا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور کبھی عدد کو کسی شئے کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرنے کے لئے لایا کرتے ہیں پس عدد کو صرف مثالی طور پر بیان کرتے ہیں، اس کی نظیر یہ ہے کہ لوگ کہا کرتے ہیں، فلاں شخص کی محبت میرے دل میں پہاڑ کے برابر ہے یا فلاں شخص کا مرتبہ آسمان تک بلند ہے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اسی معنی پر حمل کرنا چاہئے، آپ نے فرمایا کہ مومن کی قبر میں ستر گز تک کشادگی ہو جاتی ہے، اور فرمایا کہ جہاں تک نگاہ ہوتی ہے وسعت ہو جاتی ہے، اور فرمایا کہ میرے حوض کی وسعت اتنی ہے جس قدر کعبہ اور بیت المقدس میں فاصلہ ہے اور فرمایا کہ میرے حوض کی وسعت اس سے زیادہ ہے جتنی شہر ایلہ سے عدن تک ہے، ایسی صورتوں میں کبھی کوئی مقدار بیان کی جاتی ہے اور کبھی کوئی مقدار لیکن اصلی غرض کے لحاظ سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔

تیسرا قاعدہ مقادیر کے اندازہ میں یہ ہے کہ کسی شئے کی مقدار ایسی ظاہر، معلوم مقرر کی جائے جس کو مخاطبین اس حکم کے نظائر میں استعمال بھی کرتے ہوں اور اس کو حکم مدار علیہ اور حکم کی حکمت سے مناسبت ہو اس لئے درہموں کا اوقیوں سے اور خرما کا وسقوں سے اندازہ کرنا مناسب ہے۔ اور ایسی کسر بھی نہ لانی چاہئے جس کو حساب والے ہی غور وخوض سے معلوم کر سکیں جیسے سترہواں حصہ اور انیسواں حصہ اسی واسطے خدا تعالیٰ نے فرائض میں ایسی کسریں ذکر فرمائی ہیں جن کا نصف اور دو چند کرنا اور ان کا مخرج دریافت کرنا نہایت آسان ہے، ان فرائض اور سہام کے خدا تعالیٰ نے دو حصے قرار دیئے ہیں (۱) چھٹا، تہائی، دو تہائیاں، (۲) آٹھواں، چوتھائی، نصف، اور اس کا راز یہ ہے کہ ان میں قابل زیادہ کی زیادتی اور قابل کمی کی کمی ظاہر نظر میں معلوم ہو جاتی ہے، اور مسائل کا سمجھنا ادنیٰ اور اعلیٰ پر آسان ہو جاتا ہے اور جہاں ایسی مقدار مقرر کرنے کی ضرورت پڑے جو ان مقادیر معتبرہ مذکورہ کے علاوہ ہے اور ان میں باہم ضعف کی نسبت بھی نہیں ہے تو یہی مناسب ہے کہ دو مثلث سے تجاوز نہ کریں جو نصف سے زاید اور ایک سے کم ہے، اور ایک ثلث سے تجاوز نہ کریں جو ربع سے زاید اور نصف سے کم ہے، اس لئے کہ اور حصے ان دونوں حصوں کی نسبت زیادہ مخفی ہیں، اور جب کسی شئے کثیر کی مقدار بیان کرنا مقصود ہو تو اس کو تین کے عدد سے بیان کرنا چاہئے

اور اگر اس سے بھی زیادہ اس کی کثرت بیان کرنی ہو تو دس کے عدد سے اس کا اظہار کریں۔

اور جب کوئی شئے کبھی کم ہوتی ہے اور کبھی زیادہ ہوتی ہے تو اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس کی کم حد اور زیادہ حد جمع کر کے نصف کر لیں، زکوۃ کے باب میں پانچواں دسواں، بیسواں اور چالیسواں حصہ معتبر کیا گیا ہے اس لئے کہ زکوۃ کے زیادہ ہونے کا مدار کثرت منافع اور قلت مشقت پر ہے اور تمام اہل ولایت کے پیشے چار مراتب سے زیادہ میں منحصر نہ تھے اور ہر مرتبہ میں بین فرق رکھنا مناسب تھا اور وہ فرق یہ ہے کہ ہر مرتبہ دوسرے مرتبہ سے دو چند ہو، آئندہ اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

جب دولت مندی کا اندازہ کیا جائے تو ان امور کا لحاظ کرنا چاہئے جن کو عرفی دولت مندی میں دخل ہے، اور دولت مندی کے احکام و آثار کو دیکھنا چاہئے اور عرب و عجم اور اہل مشرق و مغرب کے حالات سے ان امور کا اخذ کرنا چاہئے اور مانع نہ ہونے کی صورت میں جو قدرتی طریقہ کے موافق ان کی حالت ہے اس کو دیکھنا چاہئے، پس اگر جمہور کے احوال کے اختلاف کی وجہ سے مجبور کی عادت پر مدار کار نہ ہو تو ان عرب اول کا اختیار کیا جائے گا جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا، اور ان کی عادت کے مطابق شریعت متعین ہوئی، اسی لئے شریعت نے دو سو درہم سے کنز کا اندازہ کیا ہے، کیونکہ آباد ملکوں میں ایک چھوٹے سے خاندان کو ایک سال تک کے لئے یہ مقدار کافی ہو سکتی ہے، ہاں اگر قحط سالی ہو یا شہر ہی بہت بڑے بڑے ہوں یا ان کے امراء کو کافی نہیں ہو سکتے۔

اور بکریوں کے چھوٹے ریوڑ کا اندازہ چالیس کے ساتھ اور بڑے کا ایک سو بیس کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اور زیادہ کھیتی کا اندازہ پانچ وسقوں سے کیا گیا ہے کیونکہ گھر میں کم از کم میاں، بیوی اور تیسرا کوئی نوکر یا لڑکا ہوتا ہے، اور روزانہ خوراک آدمی کی ایک مد (۱) یا ایک رطل ہوگی اور اس کے ساتھ سالن وغیرہ کی بھی ضرورت ہوگی اور ایک سال کے لئے اتنی مقدار سے کاربراری ہو سکتی ہے۔

اور آب کثیر کا اندازہ قلتین (۲) سے کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی مقدار ہے جس سے کم

---

(۱) مد کا ایک رطل ہوتا ہے اور ایک رطل آدھ سیر سے کچھ زائد کا ہوتا ہے۔ (۲) قلہ اس مٹکے کو کہتے ہیں جس میں پانچ سو رطل پانی آتا ہے۔

کوئی چشمہ نہیں ہوتا اور عادت عرف میں ظروف میں اتنا پانی نہیں جاسکتا، انہی پر باقی تمام اندازوں کو قیاس کر لینا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

دسواں باب: قضا اور رخصت کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ امور سیاست سے یہ بھی ہے کہ جب کسی شئے کا حکم کیا جائے یا کسی شئے سے روکا جائے اور مخاطبین کو اچھی طرح سے اس حکم کی غرض معلوم نہ ہو تو ضروری ہے کہ اس حکم کو اس طرح سمجھیں جس طرح ایک شئے موثر بالخاصیت ہوتی ہے جس کی تاثیر کی تصدیق کی جاتی ہے اور تاثیر کا سبب معلوم نہیں ہوتا، یا جس طرح کسی منتر کی تاثیر معلوم ہوتی ہے مگر اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر جگہ اوامر ونواہی کے صریح طور پر اسرار کے بیان کرنے سے سکوت فرمایا۔ البتہ اپنی امت کے راسخین فی العلم کے لئے ان اسرار کو کسی قدر ذہن نشین کر دیا، اسی لئے حاملین دین یعنی خلفائے راشدین اور ائمہ دین کی توجہ شریعت کی صورت قائم کرنے کی طرف بہ سبب ان کی ارواح قائم کرنے کے زیادہ تر تھی حتی کہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نماز کی حالت میں بحرین کا جزیہ شمار کرتا ہوں اور لشکر کشی کی تدابیر سوچا کرتا ہوں، اسی لئے سلف اور خلف میں مفتیوں کا یہ دستور رہا ہے کہ فتویٰ دیتے وقت مسئلہ کی دلیل کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے اور یہ بھی ضروری ہے کہ امر مامور پر سخت تاکید کر دی جائے اور اس کے ترک پر سخت باز پرس ظہور میں آنے اور ان کو مامور بہ کی طرف نہایت رغبت اور الفت دلائی جائے حتی کہ حق باتوں کی خواہش ان کے ظاہر اور باطن کو ہر طرف سے احاطہ کر لے اور جب کسی ضروری مانع سے وہ کام ترک ہو جائے تو کوئی بدل اس کے قائم مقام قرار دیا جائے اس لئے کہ ایسی ضرورتوں میں مکلّف کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس شخص سے باوجود مشقت اور دقت کے احکام کی تعمیل کرائی جائے اور یہ شرعی قاعدہ کے خلاف ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہارے لئے آسانی کا قصد کرتا ہے، دقت اور دشواری وہ تمہارے لئے نہیں چاہتا''۔

یا ان احکام کی تعمیل بالکل ترک کرادی جائے، اس وقت میں نفس ان کے ترک کا خوگر ہو جائے گا۔ اور مہمل چھوڑ دیا جائے گا اور نفس کو کسی فعل کی مشق کرانا ایسا ہے جیسے کسی تند چارپایہ کو تابع کرنا جس میں امر مطلوبہ کی رغبت اور الفت غنیمت سمجھی جاتی ہے جو لوگ اپنے نفس کی ریاضت

کرتے ہیں، یا لڑکوں کی تعلیم دیتے ہیں یا چار پایوں کو مشق کرواتے ہیں کہ کسی کام پر مداومت کرنے سے رغبت پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے عمل کرنا سہل ہو جاتا ہے۔ اور ترک کرنے سے رغبت جاتی رہتی ہے اور پھر اس کا کرنا نفس پر گراں معلوم ہوتا ہے اور دل تنگ ہوتا ہے پھر اگر اس کو دوبارہ کرنے کا ارادہ کیا جائے تو از سر نو الفت اور میلان پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، اس واسطے ضرور ہے کہ جب کسی کام کے کرنے کا وقت ہاتھ سے نکل جائے تو اس کے لئے قضا مشروع ہو، اور اس کی تعمیل میں رخصت دی جائے تاکہ بہ آسانی اس امر کو بجالائے، فقہا اور رخصت کے قرار دینے میں عمدہ شئے قوت فراست ہے جس سے مکلفین کی حالت کی شناخت، اس عمل کی غرض اور عمل کے اجزا جو اس غرض کے حاصل کرنے میں ضرور معلوم ہو سکتے ہیں۔

علاوہ فراست کے اس قضا اور رخصت کے قواعد بھی ہیں جن کو راسخین فی العلم جانتے ہیں۔
اول قاعدہ یہ ہے کہ رکن اور شرط میں دو امر ہیں، ایک امر اصلی ہے جو شئے کی حقیقت میں داخل یا اس کو لازم ہے کہ اصل غرض کا لحاظ کرتے ہوئے اس لازم کے بغیر وہ شئے غیر معتبر ہو جائے جیسے دعا یا جھکنا، جس سے تعظیم معلوم ہوتی ہے اور جیسے خصائل طہارت و خصائل خشوع کے لئے نفس کو متنبہ کرنا یہ امور اس قسم کے ہیں جن کو تنگی اور آسانی میں ہر وقت یکساں ادا کرنا چاہئے اس لئے کہ ایسے امور کے ترک کرنے سے عمل بالکل بے اثر ہو جاتا ہے۔

اور دوسرا امر تکمیلی ہے جو اور معنی کے لئے واجب قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو پابندی وقت کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے لئے اس اطاعت سے بہتر کوئی وقت نہیں اور یا اس لئے واجب قرار دیا جاتا ہے کہ کامل اور عمدہ طرح پر غرض حاصل ہونے کے لئے یہ صحیح آلہ ہے، یہ قسم اس قابل ہے کہ ضرورتوں اور ناگواریوں کی حالت میں اس میں رخصت دی جاسکتی ہے۔ اسی قاعدہ کے موافق تاریکی وغیرہ کی حالت میں استقبال قبلہ کے ترک ہونے کی رخصت اور تحری کا حکم ہے اور جس کو کپڑا میسر نہ ہو وہ ستر عورت کو ترک کر سکتا ہے، اور جس کو پانی نہ ملے وہ وضو ترک کر کے تیمم کر سکتا ہے اور جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھ سکتا ہو وہ اس کی جگہ کسی ذکر کو کر سکتا ہے اور جس میں قیام کی طاقت نہ ہو وہ بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز ادا کر سکتا ہے اور جس میں رکوع کرنے یا سجدہ کرنے کی طاقت نہ ہو وہ صرف سر جھکا کر نماز پڑھ سکتا ہے۔

دوم قاعدہ یہ ہے کہ بدل میں کوئی ایسی شئے ضرور باقی رکھنا چاہئے جس سے اصل یاد آئے اور معلوم ہو جائے کہ یہ اس کا نائب اور بدل ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ رخصتوں کو مشروع کر کے غرض مطلوب کو ثابت کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے عمل سے الفت بدستور باقی رہے اور نفس کو پہلے عمل کا انتظار سا باقی رہے، یہی وجہ ہے کہ موزوں پر مسح کرنے کے لئے موزہ پہننے کے وقت طہارت کا ہونا شرط قرار دیا گیا، اور اس کے مسح کی ایک مدت قرار دی گئی جس سے مسح کا اختتام ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے قبلہ میں تحری کو شرط قرار دیا گیا۔

سوم قاعدہ یہ ہے کہ ہر حرج کی صورت میں رخصت نہ دی جائے، اس لئے کہ حرج واقع ہونے کے بہت سے اسباب ہیں، پس اگر ہر ایک میں رخصت دی جائے تو طاعت بالکل متروک ہو جائے، اور رخصتوں میں زیادہ اہتمام کرنے سے محنت اور سختی کی برداشت بالکل مفقود ہو جائے، اور سختی کو برداشت کرنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی پیروی ہو رہی ہے اور نفس میں استقامت ہے، اس واسطے حکمت الٰہی کا یہی مقتضی ہوا کہ رخصتوں کا تعلق انہی وجوہ سے ہو جو کثیر الوقوع ہیں اور وہ اکثر پیش آتی ہیں، بالخصوص وہ ان لوگوں کو زیادہ پیش آتی ہیں جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اور جن کی عادات کے موافق شریعت متعین ہوئی ہے اور یہ بھی مناسب نہیں کہ حتی الامکان طاعت کے موثر بالخاصیت ہونے کو لحاظ نہ کیا جائے اسی واسطے سفر میں قصر نماز جائز ہوئی اور مشقت کے کاموں میں کاشتکاروں یا اور کاریگروں کے لئے قصر کرنا جائز نہیں کیا گیا۔ اور خوشحال مسافر کے لئے بھی وہ چیز جائز کر دی گئی جو غیر آسودہ حال مسافر کے لئے جائز ہوئی۔

قضا کے چند اقسام ہیں، بعض قضا بشکل معقول ہوتی ہے اور بعض بشکل غیر معقول، اور جبکہ اصل طاعت خداوندی حکم کے دل سے طاعت کرنا اور نفس میں خداوندی تعظیم قائم کرنا ہے تو جس شخص کا عمل بغیر قصد کے ہوتا ہے یا اس کا قصد کامل نہیں ہوتا اور نہ اچھی طرح تعظیم پر پابند ہو سکتا ہے تو اس کو معذور سمجھنا چاہئے اور اس کو زیادہ تنگی میں نہ ڈالنا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو اسی پر محمول کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا "میری امت میں تین شخص مرفوع القلم ہیں ایک وہ جو نیند میں ہو، دوم وہ جو لڑکا ہو، سوم وہ جو کم عقل ہو، یعنی ان سے مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ واللہ اعلم۔

گیارہواں باب: تدابیر کی اقامت اور رسوم کی اصلاح کا بیان

ہم نے پہلے صراحتاً یا اشارۃً ذکر کیا ہے کہ تدابیر ثانی یا ثالث جن پر آدمی مجبول ہے اور جن کی وجہ سے وہ تمام حیوانات سے ممتاز ہے، ان تدابیر کا چھوڑ دینا یا ان میں سستی کرنا لوگوں کے لئے محال ہے، اور لوگ ان تدابیر کے اکثر حصہ کے پورا کرنے میں ایسے حکیم کے محتاج ہوتے ہیں جو انسانی ضرورتوں سے واقف ہو۔ ان تدابیر سے منتفع ہونے کا طریقہ جانتا ہو، مصالح کلیہ کا لحاظ رکھتا ہو، وہ غور و فکر سے ان اصول کو مستنبط کرتا ہو یا اس کے نفس میں پیدائشی طور پر قوت ملکی موجود ہو جس کی وجہ سے اس کا نفس ملأ اعلیٰ کے علوم نازل ہونے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہو، یہ طریقہ انکشاف کا ان دونوں طریقوں میں سے زیادہ کامل اور قابل اعتماد ہوتا ہے۔

تدابیر کے باب میں رسوم کو ایسا ہی درجہ حاصل ہے جیسے دل کو بدن میں حاصل ہے۔ اور رسموں میں ایسے لوگوں کی سرداری کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کو عقل کلی سے کچھ مس نہیں ہوتا اور وہ درندوں کے سے اعمال یا شہوانی اور شیطانی افعال کرتے ہیں اور لوگوں میں ان کو رواج دیتے ہیں اور اکثر لوگ ان کے پیرو ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور وجوہ سے بھی رسوم میں ابتری بڑھ جاتی ہے، بہر حال ان رخنوں کو روکنے کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے جو غیب سے مؤید ہو اور مصلحت کلیہ کا پابند ہوتا کہ ان رسوم کو راہ راست کی جانب ایسی تدابیر کے ذریعہ مائل کر دے جن کی طرف رہبری اکثر ان ہی لوگوں کو ہوا کرتی ہے جو روح القدس سے مؤید ہوتے ہیں۔

پس جب اس قدر آپ کو معلوم ہو چکا تو اب سمجھنا چاہئے کہ انبیا کی بعثت اگر چہ اولاً اور بالذات عبادت کے طریقوں کی تعلیم دینے کے لئے ہوتی ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ یہ ارادہ بھی شامل ہوتا ہے کہ خراب رسوم کو مٹادیا جائے اور تدابیر کے طریقوں کی رغبت دلائی جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ میں دفوں اور لہوؤں کے مٹانے کے لئے پیدا ہوا ہوں"۔ اور ارشاد فرمایا ہے "میں مکارم اخلاق کے پورا کرنے کو بھیجا گیا ہوں"۔

واضح ہو کہ نہ تو خدا تعالیٰ کی مرضی اس میں ہے کہ تدابیر و رسوم متروک کر دی جائیں اور نہ انبیا میں سے کسی نے ایسا حکم کیا ہے اور معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے جو

پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے ہیں اور برائی بھلائی میں انھوں نے لوگوں سے میل جول بالکل ترک کر دیا ہے اور وحشیوں کی طرح ہو گئے ہیں، اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا رد فرمایا جس نے عورتوں سے کنارہ کشی چاہی تھی اور فرمادیا ''میں رہبانیت سکھلانے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ میں تو ایک پاک اور آسان دین کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں''۔ البتہ انبیا علیہم السلام تدابیر ومنافع میں میانہ روی کا حکم دیتے تھے کہ نہ تو عیش وآرام میں مستغرق لوگوں کی حالت، سلاطین عجم کی سی، اور نہ یہ کہ لوگوں کی زندگی پہاڑی باشندوں کی سی ہو جو وحشیوں سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔

اس موقعہ پر دو قیاس باہم متعارض ہیں ایک یہ کہ آسودگی اور آرام سے بسر کرنا عمدہ بات ہے جس سے مزاج صحیح ہوتا ہے، اخلاق درست ہوتے ہیں اور وہ اوصاف ظاہر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان اپنے تمام ابنائے جنس سے ممتاز ہے، غباوت اور عاجزی وغیرہ اوصاف سوء تدبیر سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ آسودگی بری چیز ہے، اس سے باہمی نزاع پیدا ہوتا ہے، تکالیف جھیلنی پڑتی ہیں۔ جانب غیب سے اس کی وجہ سے اعراض ہو جاتا ہے، اُخروی تدابیر کو آسودگی کی وجہ سے لوگ ترک کر دیتے ہیں، اسی واسطے پسندیدہ امر اور میانہ حالت ہے اور یہ تدابیر کو باقی رکھیں اور ان کے ساتھ اذکار وآداب کو ملائیں، اور عالم جبروت کی جانب متوجہ ہونے کے لئے فرصت کے متلاشی رہیں۔

اس باب میں تمام انبیا علیہم السلام نے جو خدا کی جانب سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے وہ یہی ہے کہ لوگوں کی حالت دیکھنی چاہئے، ان کے کھانے پینے کے آداب، لباس، تعمیر اور آرائش کے اسباب کیا ہیں، ان میں نکاح کا طریقہ کیا ہے اور زن وشوہر کس طرح باہم پیش آتے ہیں، وہ باہمی خرید وفروخت کن وجوہ سے کرتے ہیں، جرائم سے باز رکھنے کے لئے کیا کیا تعزیرات ان میں مستعمل ہیں، مقدمات کا فیصلہ وہ کس طرح کرتے ہیں، پس اگر یہ امور رائے کلی کے مطابق اور مناسب ہوں تو ان میں کسی قسم کی تبدیلی بے معنی ہے بلکہ لوگوں کو ان کی پابندی پر اور زیادہ آمادہ کرنا چاہئے اور ان میں ان کی رائے کو درست کہنا اور ان امور کی مصلحتیں بیان کر دینا چاہئے اور اگر وہ امور رائے کلی کے موافق نہ ہوں اور ان امور میں اس وجہ سے تبدیلی کی ضرورت پیش آئے کہ ان کے سبب سے ایک شخص دوسرے کے لئے ایذا رساں ہو سکتا ہو یا دنیوی لذات میں ان کی وجہ سے

زیادہ انہماک ہو یا ان کی وجہ سے آخرت اور اچھی باتوں سے اعراض ہوتا ہو، یا ان کی وجہ سے بے غمی پیدا ہوتی ہو جن سے دنیا و آخرت کی مصلحتیں فوت ہوتی ہوں یا اسی طرح کی کوئی اور بات پیش آتی ہو تو اس وقت ضروری ہے کہ ان امور کی تبدیلی اپنی صورت میں کرنا چاہئے جو لوگوں کے مالوف کے بالکل مخالف نہ ہو بلکہ ایسے نظائر میں ان کو تبدیل کرنا چاہئے جو لوگوں میں شائع ہوں یا ایسے نظائر کی جانب ان کو بدلیں جو ایسے صالحین میں مشہور ہوں جن کی بھلائی کی اوروں کی زبان شہادت دیتی رہی ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ تبدیل شدہ امور ایسے ہوں کہ اگر وہ ان کے سامنے پیش کئے جائیں تو ان کی عقلیں اوران امور کو رد نہ کریں بلکہ اس پر مطمئن ہو جائیں کہ یہ تبدیلی حق اور صحیح ہے اسی وجہ سے انبیا علیہم السلام کی شریعتوں میں اختلاف واقع ہوا۔ وہ لوگ جن کا علم راسخ ہے اس امر کو خوب جانتے ہیں کہ شریعت نے ابواب نکاح، طلاق، معاملات، زینت، لباس، فیصلہ جات، حدود، تقسیم میراث میں وہ امور مقرر نہیں کئے ہیں جن سے لوگ ناواقف ہوں، یا ان کے مکلّف کرنے سے وہ تردد میں پڑ جائیں، بلکہ شریعت نے ان امور کی کجی کو درست کر دیا ہے اور کمزور حالت کو مضبوط کر دیا ہے۔ اس وقت کے لوگوں میں سودخواری کی کثرت ہوگئی تھی پس اس سے وہ روک دئے گئے۔ اور باغوں کے پھل کارآمد ہونے سے پیشتر فروخت کر دیا کرتے تھے اور جب پھلوں کو صدمہ پہنچتا تھا تو باہم جھگڑا کرتے تھے۔ اس واسطے اس بیع سے بھی روکے گئے۔ عبدالمطلب کے زمانہ میں دیت کے دس اونٹ معین تھے جب انھوں نے دیکھا کہ اب بھی لوگ قتل سے باز نہیں آتے تو سو اونٹ مقرر کر دیئے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی سو باقی رکھے اور سب سے پہلے قسامہ(۱) ابوطالب کے حکم سے واقع ہوئی تھی۔ اور سردار قوم کے لئے مال غنیمت میں چہارم حصہ مقرر تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ ہر غنیمت میں سے خمس مقرر فرمایا اور قباذ اور اس کے بیٹے نوشیرواں نے لوگوں پر خراج اور عشر مقرر کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کے قریب قریب قرار دیا۔ بنی اسرائیل زانیوں کو سنگسار کرتے تھے اور چوروں کے ہاتھ کاٹتے تھے، جان کے بدلے جان لیتے تھے، پس قرآن میں بھی یہی احکام نازل ہوئے ہیں اس

(۱) قاتل کا حال معلوم نہ ہو تو قسم سے فیصلہ کیا جائے۔

قسم کے احکام بے شمار ہیں جو تتبع کرنے والے پر مخفی نہیں ہیں بلکہ اگر کوئی فہیم ہو، احکام کے اطراف و جوانب پر اس کی نظر محیط ہو تو ضرور اس کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ انبیا علیہم السلام نے عبادات میں سوائے ان امور کے جو لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ یا ان کی نظیر تھے کوئی نیا طریقہ مقرر نہیں کیا ہاں انبیا نے جاہلیت کی تحریفات کو مٹایا اور مبہم احکام کو اوقات و ارکان سے منضبط کر دیا اور جو پوشیدہ تھے ان کو لوگوں میں شائع کیا۔

واضح ہو کہ ایران اور روم میں جبکہ سالہا سال سے سلطنت چلی آئی اور وہ دنیوی لذت میں مستغرق ہو گئے اور دار آخرت کو بھول گئے اور شیطان ان پر غالب آ گیا تو وہ معیشت کے اسباب پیدا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور ان اسباب پر فخر کرنے لگے۔ اطراف عالم سے حکما کی ان کے پاس آمد و رفت رہی، یہ لوگ معاش کے دقائق اور کار آمد باتیں مستنبط کرتے رہے، پس ہمیشہ وہ ان امور پر عملدر آمد کرتے رہے، ہر ایک شخص دوسرے پر ان امور میں سبقت کرتے اور فخر کرنے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ یہ بات مشہور ہو گئی کہ اگر ان کے سرداروں میں سے جو شخص ایسی پیٹی یا تاج نہ رکھتا تھا جس کی قیمت لاکھ درہم سے کم ہوتی تھی یا جس کے پاس بلند محل، آبزن، حمام اور باغ نہ ہوتے تھے اور اس کے پاس عمدہ عمدہ گھوڑے اور خوبصورت غلام نہ ہوتے تھے اور اس کو کھانے پینے میں فراغ دستی نہ ہوتی تھی اور لباسوں میں تجمل نہ ہوتا تھا تو اس پر طعن و تشنیع کرتے تھے، ایسے ہی بہت سے امور تھے جن کا ذکر کرنا طوالت ہے۔ اور اپنے شہروں کے سلاطین کے حالات جو تم خود دیکھ رہے ہو ان کے ہوتے ہوئے ان گزشتہ کے حالات بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ پس یہ تکلفات ان کے اصول معاش میں اس طرح پیوست ہو گئے کہ اگر ان کے دلوں میں ریزہ ریزہ کر دیا جاتا تو یہ باتیں ان سے نکلنے والی نہ تھیں اور اس سے ایک ایسا سخت مرض پیدا ہوا جو شہر کے ایک ایک جز میں سرایت کر گیا اور ایسی آفت برپا ہوئی جس سے نہ دہقانی بچا نہ بازاری اور نہ غریب بچا اور نہ امیر بلکہ یہ عیش و آرام کی آفت ہر ایک پر غالب آ گئی تھی اور ان کے دست بگریباں ہو گئی تھی اور اس نے ہر ایک کو تھکا دیا تھا اور ایسے مصائب اور رنجشوں میں پھنسا دیا تھا جن کی کوئی انتہا نہ رہی، یہ عیش و آرام زیادہ تکالیف کے باعث اس لئے ہو گئے تھے کہ جب تک بہت سامان صرف نہ کیا جائے یہ لطف اصل نہیں ہو سکتے اور مال کی اتنی مقدار حاصل کرنے کے

لئے ضروری ہے کہ نہ سب تاجروں اور پیشہ وروں پر ٹیکس زیادہ کئے جائیں، ان پر سختی کی جائے اور وہ ادا نہ کریں تو حکام ان سے جنگ کریں اور ان کو طرح طرح کی تکالیف دیں اور اگر وہ لوگ ان کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں تو ان کو بہ منزلہ گدھے اور بیل کے کر دیں جو آب پاشی، جوتنے اور اناج کی کٹائی میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اگر ان کو ذخیرہ کیا جاتا ہے تو محض اپنے کام میں لانے کے لئے، پھر ذرا دیر بھی ان کو مشقت سے آرام نہیں دیا جاتا، یہ امرا ایسے ہی گرفتار ہو کر سعادت اخروی کی طرف سر بھی نہیں اٹھا سکتے اور نہ اس مرتبے کے قابل رہتے ہیں۔

اور اکثر بڑی سے بڑی مملکت میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو دین کا اہتمام اور خیال ہو، اور یہ عیش کے سامان بھی ایسے ہی لوگوں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں جو کھانے، لباس، مکانات وغیرہا کے حاصل کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور کاروبار کے ان اصول کو جن پر نظام عالم کا مدار ہے ترک کرتے ہیں اور عموماً جو لوگ ان سے ملتے جلتے ہیں تو وہ ان سب امور میں انہی کی نقل کرتے ہیں ورنہ ان کو ان امرا کی خدمت میں باریابی نہ ہو اور نہ ان کے دلوں میں ان کی کچھ وقعت رہے۔

اور تمام لوگ بادشاہ کے محتاج ہوتے ہیں، اس سے اپنی ضروریات کی کفالت چاہتے ہیں، بعض اس وجہ سے کہ وہ لشکری اور شہر کے منتظم ہیں یہ لوگ ان سرداروں کی روش تو اختیار کر لیتے ہیں لیکن اپنے فرائض ادا کرنے کا کچھ بھی قصد نہیں کرتے صرف اپنے رسوم اور سلف کے طریقہ کو پورا کرتے ہیں اور بعض اس لئے کہ وہ شاعر ہیں جن پر انعام و اکرام کرنے کے سلاطین عادی ہوتے ہیں، بعض اس لئے کہ وہ درویش اور پارسا ہیں، اور بادشاہوں کے لئے یہ زیبا نہیں کہ ان کی خبر گیری نہ کریں۔ اس واسطے یہ فرقے ایک دوسرے پر تنگی کرتے ہیں اور ان کے ذرائع معاش اس پر موقوف ہوتے ہیں کہ وہ بادشاہوں کی خدمت میں رہیں، ان سے نرم کلامی اور خوشامد سے پیش آئیں انہیں فنون میں ان کی فکریں ڈوبی رہتی ہیں، اور ان کے اوقات ضائع ہوتے رہتے ہیں، پس جب ان اشغال کی کثرت ہو جاتی ہے تو لوگوں کے دلوں میں ایک خسیس حالت پیدا ہو جاتی ہے اور عمدہ اخلاق سے وہ اعراض کرتے ہیں۔

اگر تم اس مرض کی حقیقت معلوم کرنا چاہو تو ان قوموں کو دیکھو جن میں کوئی سلطنت نہیں اور

نہ لذیذ کھانوں اور عمدہ لباسوں میں انہماک ہے بلاشک تم ان اقوام میں سے ہر شخص کو آزاد پاؤ گے، نہ ان پر بھاری محصول مقرر ہوں گے جن سے ان کی کمر جھک گئی ہو، پس ایسے لوگ دین وملت کے امور میں مصروف ہو سکتے ہیں، پھر انہی لوگوں کی حالت کو اس طرح خیال کرو کہ ان میں سلطنت قائم ہو جائے، سلاطین و امراان کو اپنا مطیع بنا کر ان پر اپنا قبضہ کر لیں۔

جب ایسی مصیبت زیادہ بڑھ گئی اور یہ بیماری سخت ہوگئی تو خدا تعالیٰ اور ملائکہ مقربین نے ان پر غصہ ظاہر فرمایا اور خدا کی مرضی ہوئی کہ اس مرض کو بالکل زائل کر دے اس واسطے اس نے ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا جس کا عجم اور روم سے کوئی میل جول نہ تھا، اس نے ان کے رسوم کو بالکل اختیار نہ کیا، اس پیغمبر کو خدا تعالیٰ نے ہدایت کے لئے میزان قرار دیا ہے، جس کے ذریعہ ان طریقوں میں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہیں، تمیز ہو جاتی ہے خدا تعالیٰ نے اس سے عجمیوں کی رسموں کی مذمت بیان کرادی اور دنیوی زندگی میں مطمئن اور مستغرق ہو جانے کی قباحتیں ظاہر کرا دیں۔ اس پیغمبر کے دل میں خدا تعالیٰ نے الہام فرمایا کہ وہ بڑے بڑے امور جن کے عجمی خوگر ہو گئے تھے اور ان پر فخر کرتے تھے لوگوں پر حرام ہیں، مثلاً ریشمی لباس، ارغوانی کپڑے پہننا، سنہری اور روپہلی برتن، سونے کے زیور، ایسے کپڑے جن میں تصویریں بنی ہوئی ہوں، مکانوں پر نقش ونگار کرنا وغیرہ، خدا تعالیٰ نے مقدر کر دیا کہ اس کی دولت سے ان کی دولتوں کا خاتمہ کر دے اور اس کی حکومت سے ان کی حکومتوں کا خاتمہ کر دے اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہو گیا اب اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔ اور ہلاک ہو گیا قیصر، اب کوئی قیصر نہ ہوگا۔

واضح ہو کہ زمانہ جاہلیت میں ایسے ایسے جھگڑے پیدا ہو گئے تھے جن سے تمام لوگ تنگ آ گئے تھے اور انکا دفع ہونا جب ہی ممکن تھا کہ ان کو اصل سے ہی ختم کر دیا جائے، جیسے مقتولوں کے بدلہ میں خون لینا، ایک شخص دوسرے کو قتل کر دیتا تھا پھر مقتول کا ولی قاتل کے بھائی یا بیٹے کو مار ڈالتا تھا پھر اس مقتول کا ولی بھی قاتل کے بھائی یا بیٹے کو قتل کرتا تھا اور اسی طرح سے ہیر پھیر رہتا تھا اس کے رفع کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”تمام خون میرے اس پاؤں کے نیچے باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں نے ربیعہ کے خون کو معاف کیا“۔

اور اسی طرح سے میراث کے باب میں قوم کے رؤسا مختلف طور پر فیصلے کیا کرتے تھے اور

اس زمانہ کے لوگ غصب اور سودخوری وغیرہ سے باز نہیں آتے تھے اور اسی پر عملدرآمد کرتے تھے۔

پھر اس کے بعد ایک اور زمانہ آیا تھا جس میں لوگ طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے تھے، اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرے سے یہ جھگڑا ہی ختم کر دیا اور فرمایا زمانہ اسلام میں ہر چیز کی تقسیم قرآن کے موافق ہوگی اور جو شئے زمانہ جاہلیت میں تقسیم ہو چکی یا وہ کسی نہ کسی طرح کسی شخص کے قبضہ میں آگئی تو وہ بدستور اپنے حال پر باقی رہے گی اور وہ اس سے نہ لی جائے گی مثلاً سود، اس زمانہ میں کوئی شخص قرض دیتا تھا اور کسی قدر اس پر بیشی کی شرط کر لیا کرتا تھا اس کے بعد مدیون کو تنگ کرتا تھا اور اصل و شرط کو اصل سرمایہ قرار دیتا تھا اور اس پر اور بیشی کی شرط کر لیا کرتا تھا اسی طرح بڑھتے بڑھتے وہ مال ایک تو ڈھیر ہو جاتا ہے، پس آپ نے سرے سے سود ہی کو مٹا دیا اور اصل سرمایہ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ اور فرمایا نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ کسی کا ظلم سہو یہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خرابیاں تھیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نہ ہوتا تو لوگ ان کو ترک کرنے والے نہ تھے۔

واضح ہو کہ بہت سی رسمیں اس واسطے مشروع ہوئی ہیں کہ لوگوں کی دلی رنجشیں دور ہو جائیں جیسے پانی پلانے میں ابتدا دائیں جانب سے کرنا، اس لئے کہ بعض اوقات مخالف لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی بزرگی تسلیم نہیں کرتے جس سے کہ ابتدا کی جائے تو دفع خصومت کے لئے اسی قسم کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے اور جیسے (امامت جنازہ میں) مالک مکان کا امامت کرنا اور جب دو شخص ایک گھوڑے پر سوار ہونے کا قصد کریں تو گھوڑے کے مالک کا آگے بیٹھنا اور ساتھ والے کا پیچھے بیٹھنا وغیرہ ذلک، واللہ اعلم۔

بارھواں باب: ان احکام کا بیان جو ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں

خدا تعالیٰ فرماتا ہے ”ہم نے تجھ سے پہلے انہی لوگوں کو پیغمبر بنایا جن پر وحی بھیجی ہے اگر تم نہیں جانتے ہو تو ذکر والوں سے دریافت کر لو“ اور ہم نے تجھ پر قرآن اس واسطے نازل کیا ہے کہ تو لوگوں سے نازل شدہ باتیں بیان کر دے اور امید ہے کہ لوگ غور کریں۔

واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو اس واسطے مبعوث کیا ہے کہ لوگوں کو وہ عبادت کے طریقے بیان فرما دیں جو بذریعہ وحی آپ کو معلوم ہوئے ہیں تا کہ لوگ اس پر عمل کریں اور گناہوں کے ابواب کو بتلا دیں تا کہ لوگ ان سے پرہیز کریں اور عمدہ تدابیر سے آگاہ کریں تا کہ لوگ اس کا

اتباع کریں۔ اسی بیان میں یہ بھی ہے کہ نبی لوگوں کو ان امور کی بھی تعلیم دے جو وحی کے اقتضا یا ایما سے ثابت ہوں۔

اور یہ قواعد کلیہ ہیں جن پر احادیث نبوی کا بہت بڑا حصہ منطبق کیا جاتا ہے ہم یہاں اس میں سے بڑے بڑے قواعد ذکر کرتے ہیں۔ ان قواعد میں سے ایک یہ ہے کہ جب عادت الٰہی اس طور پر جاری ہے کہ اسباب کو مرتب کر کے مسببات کو ان سے پیدا کرتا ہے تا کہ وہ مصلحت حاصل ہو جائے جو خدا تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور رحمت کاملہ سے مقصود ہے تو اس انتظامی حالت کا مقتضا یہ ہے کہ مخلوق الٰہی کو بدل دینا شر کی بات ہوگی اور خرابی برپا کرنے کی کوشش ہوگی اور ملأ اعلیٰ سے نفرت نازل ہونے کا سبب بنے گی، پس جبکہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا کہ اکثر اوقات اس کی پیدائش ایسی نہ ہو جس طرح کیڑے مکوڑے زمین سے پیدا ہو جاتے ہیں، اور حکمت الٰہی کا مقتضا بھی یہ تھا کہ نوع انسانی باقی رہے بلکہ کثرت کے ساتھ دنیا میں پھیلے تو اس نے انسان میں تناسل کے قوی پیدا کیے اور طلب نسل کی ان کو رغبت دلائی اور خواہش نفسانی کو ان پر غالب کر دیا تا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کر دے جس کو اس کی حکمت بالغہ نے ضروری قرار دیا ہے۔

جب خدا تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راز پر مطلع کر دیا اور اصلی حالت آپ پر بالکل منکشف ہوگئی تو ضروری ہوا کہ آپ اس راستہ کے بند کرنے کو یا ان قوی کے معطل کر دینے کو یا ان کے بیجا استعمال کو منع فرمائیں، یہی وجہ ہے کہ خصی کرنے سے اور لواطت سے نہایت سختی کے ساتھ منع کر دیا اور عزل کو مکروہ قرار دیا۔

واضح ہو کہ جب لوگوں کا مزاج سلیم ہوتا ہے اور ان کے مادہ میں احکام نوعی کے ظہور کی قوت ہوتی ہے تو اس کی ایک معین صورت اور شکل ہوتی ہے، یعنی قد کا سیدھا ہونا، جلد کا صاف ہونا وغیرہ ذلک، یہ امور لوگوں میں نوع کا حکم، اس کا مقتضا اور اثر ہوتے ہیں، اور عالم بالا کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ انواع باقی رہیں اور ان کی صورتیں زمین پر باقی رہیں اسی واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً کتوں کو مار ڈالنے کا حکم کیا تھا لیکن بعد میں اس کو منع فرما دیا اور ارشاد فرمایا کتا بھی گروہوں میں سے ایک گروہ ہے"۔ یعنی یہ ایک نوع ہے جس کو اللہ تعالیٰ موجود رکھنا چاہتا ہے اور اس کا زمین سے مٹا دینا خدا کو پسند نہیں اس قسم کی خواہش کا یہ اثر ہے کہ نوع کے احکام تمام افراد

نوع میں ظہور پذیر ہوں اس واسطے اس خواہش کے خلاف کرنا اور اس کے رد کرنے میں کوشش کرنا قبیح اور مصلحت کلی کے خلاف ہے، اسی قاعدہ سے ان بدنی تصرفات کا حکم نکلتا ہے جن کو نوعی احکام نہیں چاہتے جیسے خصی کرنا، اگلے دانتوں کے بیچ میں کشادگی پیدا کرنا اور چہرے سے بالوں کا چننا وغیرہ ذالک، لیکن آنکھوں میں سرمہ لگانا یا بالوں میں کنگھی کرنا یہ ایسے امور ہیں جن سے احکام مقصودہ کے ظہور کو مدد ملتی ہے اور ان کے موافق ہیں۔

جب خدا تعالیٰ نے بنی آدم کے لئے ایک شریعت مقرر کر دی جس سے ان کے حالات منتظم اور درست ہوں اور عالم بالا میں بھی اس شریعت کے ظہور کا منشا تھا اس لئے شریعت کی حالت بھی انواع کی سی ہوگئی جو زمین میں اپنے افراد کا ظہور چاہتی ہے اور اسی وجہ سے شریعت کے بگاڑنے میں سعی کرنا عالم بالا میں ناراضی کا باعث ہے، ان کے مقتضا کے بالکل خلاف اور ان کی سطح ہمت سے بعید ہے۔ ایسے ہی وہ منافع اور تدابیر بھی بہ منزلہ امر طبعی کے ہو گئے ہیں جن پر لوگوں کے عام فرقوں نے عرب ہوں یا عجم، ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ اتفاق کر لیا ہے۔

اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے قسموں اور دستاویزوں کو مشروع فرمایا جن سے اصل حال اور واقعہ کا انکشاف ہوتا ہے تو اس سے یہ ضروری ہو گیا کہ جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسم خدا اور اس کے ملائکہ کی نظر میں ناخوشی کا باعث ہے۔

ان قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو کسی حکم شرعی کی وحی کرتا ہے اور اس کی حکمت اور سبب بھی بتا دیتا ہے تو نبی کو مناسب ہے کہ اس مصلحت کا پابند ہو جائے اور اس کی کوئی علت مقرر کر کے اس حکم کا مدار علیہ اس علت کو ٹھیرائے، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قیاس ہے اور امت کا قیاس یہ ہے کہ حکم منصوص کی علت معلوم کر کے جہاں علت پائی جائے وہاں اس حکم کو بھی پہنچا دیں اس کی مثال وہ اذکار ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح، شام اور سوتے وقت معین فرمائے، اس لئے کہ جب آپ نماز کے مشروع ہونے کی حکمت پر مطلع ہو گئے تو آپ نے یہ بھی اجتہاد سے ثابت کر لیا۔

انہی قواعد میں سے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت سے سیاق کلام کی وجہ دریافت فرما لیتے تھے اگرچہ اور لوگ دقت کلام یا کثرت احتمالات کے ہونے سے وجہ، نہ سمجھ سکتے

تھے تو آپ نے فہم کے موافق حکم دیتے تھے جیسے خدا تعالیٰ کا قول ہے، ''کوہ صفا اور مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں''۔ اس آیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ گئے کہ صفا کو مروہ پر مقدم کرنے سے اس امر کے بیان کی موافقت ہوتی ہے جو لوگوں کے لئے مشروع ہوا ہے جیسے کہ یہ تقدیم کبھی موافقت سوال یا کسی اور وجہ سے ہوتی ہے پس آپ نے فرمادیا جس چیز سے خدا نے ابتدا کی ہے اسی سے تم بھی ابتدا کرو''۔ اور ایسے ہی اجتہاد کی مثال یہ بھی ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ ان کے خالق کو سجدہ کرو''۔ اور نیز خدا تعالیٰ کا قول ہے'' جب چاند ڈوب گیا تو ابرہیمؑ نے کہا میں ڈوبنے والے کو پسند نہیں کرتا'' ان دونوں آیتوں کے مضمون سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سمجھ گئے کہ کسوف اور خسوف کی حالت میں عبادت الٰہی کرنا مستحب ہے اور خدا تعالیٰ کے اس قول سے ''مشرق ومغرب خدا ہی کے لئے ہے''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھ لیا کہ نماز کی حالت میں استقبال قبلہ فرض ہے اور عذر کی حالت میں اس کی فرضیت ساقط ہو سکتی ہے۔ اسی سے آپ نے اس شخص کا حکم مستنبط کیا جس نے تحری سے شب تاریک میں نماز پڑھی اور سمت قبلہ اس کو ٹھیک معلوم نہ ہوئی اور کسی اور سمت رخ کر کے اس نے نماز پڑھ لی، اور اسی آیت سے آپ نے اس شخص کے متعلق بھی حکم معلوم کر لیا جو شہر سے باہر سواری پر نوافل پڑھتا ہے۔

انہی قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب خدا کسی شخص کو لوگوں سے معاملہ کرنے کا حکم دیتا ہے تو یہ اس امر کا مقتضی ہے کہ لوگوں کو ان معاملات میں اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے، جب قاضیوں کو حدود الٰہی قائم کرنے کا حکم دیا گیا تو سرکشوں کو ان کے احکام کی فرمانبرداری کرنے کا حکم دیا گیا کہ مصدق کو قوم سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا تو لوگوں کو یہ حکم کیا گیا کہ مصدق جب ان کے پاس سے واپس آئے تو ناخوش نہ آئے، اور جب عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم دیا تو مردوں کو حکم دیا کہ اپنی نگاہیں ان سے نیچی رکھیں۔

اور انہی قواعد میں سے یہ ہے کہ جب کسی شئے سے منع کیا جائے تو اس کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کا وجوباً یا استحباباً حکم کیا جائے جیسا موقع کے مناسب ہو، اور جب کسی شئے کے کرنے کا حکم کیا جائے تو اس کی ضد منع کر دی جائے۔ پس جب نماز جمعہ پڑھنے اور اس کی طرف سعی کرنے کا حکم دیا گیا تو ضرور ہے کہ خرید وفروخت اور دیگر مشاغل اس وقت ممنوع قرار دیئے

جائیں‘‘۔اور انہیں قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کسی شئے کے واجب ہونے کا حکم کیا جائے تو مناسب ہے کہ اس کے مقدمات اور دواعی کی ترغیب دیجائے اور جب کسی شئے کو قطعی طور پر منع کیا جائے تو ضروری ہے کہ اس کے داعی اور اسباب کی بندش کردی جائے اور ان کو نابود کردیا جائے اور جبکہ بت پرستی گناہ تھی اور تصویروں و بتوں سے میل ملاپ بت پرستی کی طرف لے جاسکتا تھا جیسا کہ پہلی امتوں میں یہ چیز پیش آچکی ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ مصوروں سے مواخذہ کیا جائے، اور جبکہ شراب پینا گناہ تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ شراب بنانے والوں سے مواخذہ کیا جائے اور جس دسترخوان پر شراب ہو اس میں حاضر ہونا منع کردیا جائے۔اور جبکہ فتنہ کے وقت جنگ وجدال گناہ تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ ایسے وقت میں ہتھیاروں کی فروخت سے منع کردیا جائے۔

اور سیاست مدن میں اس باب کی نظیر یہ ہے کہ جب حکام کو کھانے پینے میں زہر دیے جانے کا خوف ہوتا ہے تو دوافروشوں سے عہد ہو جاتا ہے کہ زہریلی چیزوں کی بیع نہ کریں مگر اس قدر کہ جس سے پینے والا اکثر ہلاک نہ ہو۔اور جب کسی قوم کی خیانت کا حال معلوم ہوتا ہے تو ان کو گھوڑوں پر چڑھنے کی اور ہتھیار رکھنے کی ممانعت ہوجاتی ہے۔اور اسی طرح باب عبادت میں جب نماز تمام نیکی کے ذرائع میں بلند مرتبہ تھی تو ضرور ہوا کہ لوگوں کو جماعت کا شوق دلایا جائے تاکہ نماز کی پابندی میں اس سے مدد ملے، اور یہ بھی ضرور ہوا کہ اذان کی رغبت لوگوں میں پیدا کی جائے تاکہ سب لوگ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ جمع ہوسکیں اور ایسے ہی لوگوں کو مساجد کی تعمیر اور مساجد کے پاکیزہ اور ستھرا رکھنے پر آمادہ کرنا ضروری ہے، اور جبکہ ابر وغیرہ کی حالت میں ماہ رمضان کی پہلی تاریخ کا معلوم کرنا ماہ شعبان کے دنوں کے شمار کرنے پر موقوف تھا تو ہلال شعبان کا خیال رکھنا مستحب ہوگیا۔

اور سیاست مدنیہ میں اس کی نظیر یہ ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ تیراندازی میں بڑی منفعت ہے تو زیادہ کمانیں بنانے، تیر بنانے اور ان کی تجارت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

انہی قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کسی کام کے کرنے کا حکم دیا جائے یا کسی شئے کی ممانعت کی جائے تو ضروری ہے کہ فرماں برداروں کی عزوشان ظاہر کی جائے اور نافرمانوں کی تحقیر کی جائے اور جبکہ قرأت قرآن سے اس کی اشاعت اور اس کی تلاوت کا التزام مقصود تھا تو یہ امر

مسنون قرار دیا گیا کہ لوگوں کی امامت وہی شخص کرے جو سب سے عمدہ قرآن پڑھتا ہو اور مجالس میں قرآن پڑھنے والوں کی توقیر کی جائے اور جبکہ زنا کی تہمت لگانا گناہ تھا تو ضروری ہوا کہ تہمت لگانے والے کی شہادت قبول نہ کی جائے اور حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ بدعتی اور فاسق سے سلام وکلام کی ابتدا نہیں کرنا چاہئے تو وہ اسی پر محمول ہے، سیاست مدن میں اس کی نظیر یہ ہے کہ تیر اندازوں کو تنخواہ زیادہ دی جاتی ہے، ان کو انعام زیادہ ملتا ہے اور تقرر میں ان کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

انہی قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کسی شئے کا حکم کیا جائے یا اس سے روکا جائے تو اس کا پورا حق یہ ہے کہ لوگوں کو امر کا حکم کر دیا جائے کہ دلی قصد سے اس پر اقدام کریں اور عزیمت قلبی سے منہی عنہ سے باز رہیں اور ان سے اس امر کا مطالبہ کیا جائے کہ دل میں اس کام کے کرنے کی خواہش رکھیں، اسی واسطے مہر اور قرض میں عدم ادائیگی کے قصد کرنے پر نہایت سخت سرزنش وارد ہوئی ہے، اور انہی قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جس شئے میں خرابی کا احتمال ہو اس کو مکروہ قرار دیا جائے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص سو کر اٹھے وہ اپنا ہاتھ ہرگز برتن میں نہ ڈالے کیونکہ اس کو کیا معلوم کہ رات کو اس کا ہاتھ کس جگہ پر پڑا تھا''۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت اور عمدہ تدابیر کے احکام تعلیم فرما دیئے اور اسی طرح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیان فرمادیا اور ہر ایک باب کے متعلق بڑے بڑے احکام کو آپ نے مستنبط کیا، اس باب میں اور اس باب میں جو اس کے بعد آتا ہے، جو امور بیان کئے گئے ہیں ان سب کو فقہائے امت نے علوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا اور ان کے دلوں نے نہایت تدبر سے ان کو یاد رکھا، پس جو کچھ انھوں نے اپنی تصنیفات میں لکھا ہے وہ انہی علوم نبوی سے حاصل ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

تیرھواں باب: مبہم کے انضباط، مشکل کی تمیز اور کلیہ سے حکم نکالنے وغیرہ کا بیان

واضح ہو کہ بہت سی چیزیں جن کا نام لے کر حکم بتائے گئے ہیں تقسیم اور مثال کی وجہ سے تو معلوم ہیں لیکن وہ اشیا باعتبار ایسی تعریف کے غیر معلوم ہیں جو جامع اور مانع ہو اور اس سے ہر ہر فرد کا حال معلوم ہو جائے کہ یہ اس شئے کا فرد ہے یا نہیں، مثلاً سرقہ کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے

''چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کے ہاتھ کاٹ ڈالو''۔ خدا تعالیٰ نے حد چور کے نام پر جاری کی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ بنی ابیرق، طعیمہ اور مخزومی عورت کے قصہ میں یہی سرقہ واقع ہوا تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ غیر کا مال لینے کے چند اقسام ہیں من جملہ ان کے چوری ہے، رہزنی ہے اچک لینا ہے، بد دیانتی ہے، زمین سے پڑی ہوئی چیز اٹھالینا ہے، زبردستی چھین لینا ہے، اور من جملہ ان کے لئے بے پروائی ہے ایسی صورتوں میں بسا اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر ہر صورت کے متعلق دریافت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ آیا یہ بھی چوری میں داخل ہے۔ ایسا سوال خواہ زبانی ہو یا حالی، اس لئے آپ پر ضروری ہے کہ چوری کی حقیقت اس طرح سے بیان فرمائیں کہ اس کے مشابہ چیزوں سے تمیز ہو جائے اور ہر ہر فرد کا حال واضح ہو جائے۔

اس کا طریقہ یہی ہے کہ ان چیزوں کے ذاتی امور دیکھے جائیں جو چوری میں نہ پائے جاتے ہوں، اور ان کی وجہ سے چوری اور غیر چوری میں امتیاز ہو جائے۔ ایسے ہی سرقہ کی ذاتیات میں نظر کرنا چاہئے جن کو اہل عرف اسی لفظ سرقہ سے سمجھ جاتے ہیں، پھر سرقہ کی تعریف امور معلومہ کے ساتھ بیان کی جائے جن کی وجہ سے چوری ممیّز ہو جائے، مثلاً یہ بات علم میں آتی ہے کہ رہزنی اور لڑائی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن سے مظلوموں کے مقابلہ میں قوت پر اعتماد کرنا پایا جاتا ہے اور ایسی جگہ اور ایسے وقت کو اختیار کرنا پایا جاتا ہے جہاں لوگوں کی جماعت مدد کے لئے نہیں پہنچ سکتی اور لفظ اختلاس بتلاتا ہے کہ لوگوں کی نظروں کے سامنے سے کوئی شئے اُچک لی جائے۔ اور لفظ خیانت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کسی قسم کی شرکت یا بے تکلفی یا حفاظت اس کی کی گئی تھی اور لفظ التقاط سے کسی چیز کا بغیر حفاظت پایا جانا ثابت ہوتا ہے، اور لفظ غصب سے معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم کی نسبت غاصب میں علانیہ قوت زیادہ تھی، اس کو لڑائی میں غالب آنے پر اعتماد تھا، یا یہ خیال تھا کہ حاکموں تک یہ قصہ نہ پہنچے گا یا ان پر پورا حال منکشف نہ ہوگا، یا رشوت وغیرہ دینے سے وہ سچا فیصلہ نہ کریں گے، اور بے پروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیر چیزوں میں اطلاق کی جاتی ہے جن کو عرف میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور اس سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے جیسے پانی اور لکڑی اور سرقہ ایسا لفظ ہے جس سے مخفی طور پر لینا ثابت ہوتا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرقہ کی حد چوتھائی دینار یا تین درہم مقرر کر دی تا کہ حقیر چیزوں سے تمیز ہو جائے اور فرمایا کہ خیانت

کرنے والے اور لوٹنے والے اور اوچکے کا ہاتھ نہ کاٹا جائے اور فرمایا کہ اس پھل میں بھی ہاتھ نہ کاٹا جائے جو درخت پر لٹکتا ہو اور نہ ایسی چیز میں جو پہاڑ میں پڑی ہے، ان احادیث سے سرقہ میں حفاظت کا شرط ہونا پایا جاتا ہے اور من جملہ ان چیزوں کے جن کی تمیز جامع و مانع تعریف کے لحاظ سے نہیں ہوسکتی، انتہا درجہ کی عیش پسندی بھی ہے ایسی حالت فساد میں ڈالنے والی ہے۔ جس کی نہ ہی کچھ تعیین ہے اور نہ ہی اس کے پائے جانے کے مواقع ظاہری نشانات سے متمیّز ہیں جن کی وجہ سے ہر ایک ادنیٰ اور اعلیٰ کی گرفت کی جاسکے اور اس میں کسی کو شبہ نہ رہے کہ انہی امور میں عیش پسندی پائی جاتی ہے۔

یہ امر معلوم ہے کہ عجمیوں کی عادات عمدہ عمدہ سواریوں، بلند مکانات، بیش قیمت لباس اور زیورات وغیرہ میں نہایت درجہ کی عیش پسندی تک پہنچ گئی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ لوگوں کی حالت مختلف ہونے سے ان کی عیش پسندی بھی مختلف ہوتی ہے، پس بعض لوگوں کا سامان عیش دوسروں کی نظر میں تنگی اور سختی ہوتی ہے، اور بہت سی چیزیں جو ایک ملک میں عمدہ سمجھی جاتی ہیں دوسرے ملک میں وہی چیزیں نہایت حقیر خیال کی جاتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ منافع کا حصول عمدہ شئے سے بھی ہوتا ہے اور ناقص شئے سے بھی ہوتا ہے لیکن ردی اور ناقص شئے کا استعمال عیش پسندی نہیں ہے اور بغیر عمدگی کا قصد کئے کسی عمدہ شئے سے متنفع ہونا یا اکثر اوقات میں کسی شخص کا عمدہ اشیا کا پابند نہ ہونا عیش پسندی نہیں ہوسکتا اس واسطے شرع نے ہر صورت میں عیش پسندی کی خرابیوں پر مطلع کیا ہے اور ان اشیا کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا ہے جن سے لوگ صرف عیش و آرام ہی کے لئے متنفع ہوتے ہیں اور ان سے عیش حاصل کرنا لوگوں کی عام عادت ہے اور شرع نے عجم اور روم کو گویا ان اشیا پر متفق پایا تھا اس واسطے شرع نے کمال عیش اور آرام کے مواقع ان امور کو قرار دے کر ان کو حرام کر دیا اور شاذ و نادر جن اشیا سے نفع اٹھایا جاتا ہے یا اطراف و ممالک میں ان کی عادت ہے ان پر شارع نے کچھ التفات نہیں کیا، پس حریر اور سونے چاندی کے برتنوں کی حرمت اسی قبیل سے ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عیش و آرام کی حقیقت اس کو پایا کہ ہر ایک امور نافع سے عمدہ شئے پسند کی جائے اور ردی سے اعراض کیا جائے اور کامل درجہ کی عیش پسندی یہ پائی کہ ایک جنس کی اشیا میں سے صرف عمدہ ہی کو اختیار کریں اور ردی کو بالکل ترک

کردیں اور معاملات میں ان معاملات کو بھی موجب عیش قرار دیا جن میں ایک جنس کی اشیا میں سے صرف عمدہ ہی کو اختیار کی جائیں اور ردی بالکل ترک کردی جائیں، البتہ بعض بعض مادوں میں اس کا لحاظ نہ بھی کیا جاتا ہو لیکن قوانین شرع میں ایسے مادوں کا کچھ اعتبار نہیں، اس واسطے آپ نے ایسے معاملات کو بھی حرام قرار دیا کیونکہ یہ معاملہ عیش پسندی کے لئے بہ منزلہ صورت اور مثال کے ہیں ان کی تحریم بھی بہ مقتضائے طبع ہے کیونکہ مقتضائے طبع کے لحاظ سے عیش پسندی مکروہ امر ہے اور جب اسی مقتضائے طبیعت کی وجہ سے اشیا کے مواقع حرام ہیں تو ان مواقع کی صورتیں اور مثالیں بھی بطریقۂ اولیٰ حرام ہوں گی پس نقد کو نقد کے بدلہ میں اور کھانے کی چیز کو اسی کے جنس کے بدلہ میں بڑھا کر فروخت کرنے کی حرمت اسی قاعدہ سے مستنبط ہے لیکن کسی عمدہ شئے کو زیادہ قیمت پر خریدنا حرام نہیں ہے کیونکہ قیمت اختلاف جنس کے وقت ذات مبیع کی طرف رجوع کرتی ہے نہ کہ اس کے وصف کی طرف، ایسے ہی ایک لونڈی کا دو لونڈیوں کے بدلہ میں اور ایک کپڑے کا دو کپڑوں کے بدلہ میں خریدنا حرام نہیں ہے اس لئے کہ یہ اشیاء ذوات القیم میں سے ہیں اس واسطے قیمت کی زیادتی اس شئے خاص کے خواص کے بدلہ میں قرار دی جائے گی اور اس کا عمدہ پن انہی خواص میں مندرج ہو جائے گا، پس اس عمدہ پن کا بادی الرائے میں کچھ اعتبار نہ ہوگا اور ہماری ان تمہیدات سے بہت سے نکتے جو اس باب سے متعلق ہیں منکشف ہو جاتے ہیں، مثلاً حیوان کے بدلہ حیوان کی بیع کے مکروہ ہونے کی وجہ وغیر ذالک، پس ان میں غور کرنا چاہیے۔

اور کبھی دو شئے آپس میں نہایت مشابہ ہوتی ہیں کہ ان دونوں میں مخفی امور کی وجہ سے فرق ہوتا ہے جن کو سوائے نبی علیہ السلام اور آپ کی امت کے علما کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا اس واسطے ضرورت پیش آئی کہ ان میں سے ہر ایک کی ظاہر علامت معلوم کی جائے، نیکی اور برائی کا حکم ان دونوں اشیا کی علامات پر لگایا جائے اور ان میں تفریق کے احکام بیان کئے جائیں، مثال اس کی نکاح اور شہوت رانی ہے، پس نکاح کی حقیقت اس مصلحت کو قائم کرنا ہے جس پر زن وشوہر میں باہم ہمدردی سے نسل کی طلب اور شرمگاہ کی حفاظت و دیگر وجوہ سے انتظام عالم موقوف ہے اور یہ تمام امور خدا کے نزدیک پسندیدہ اور مطلوب ہیں اور شہوت رانی کی حقیقت نفس کو گمراہی کی طرف چھوڑنا، نفسانی خواہش کا اتباع کرنا، حیا کی پردہ دری کرنا اور اس سے آزاد ہو جانا، مصلحت کلی اور

انتظام عالم کی راہ کو ترک کرنا ہے اور یہ امور خدا کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ اور ممنوع ہیں، لیکن نکاح اور شہوت رانی اکثر امور میں مشابہ ہیں کیونکہ دونوں خواہش نفسانی پورا کرنے میں طبیعت کی شورش کے ازالہ میں عورتوں کی جانب رغبت کرنے میں برابر ہیں، اسی طرح سے دونوں امور میں بھی مشترک ہیں اس واسطے ضرورت ہوئی کہ ظاہری علامت سے ایک کو دوسرے سے بالکل الگ کر دیا جائے اور طلب ومنع کا اس پر مدار ہو، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی تعیین چند امور کے ساتھ قرار دی، من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ نکاح عورتوں سے کیا جائے نہ مردوں سے کیونکہ نسل کی طلب صرف عورتوں سے ہو سکتی ہے اور یہ کہ نکاح اپنے قصد، مشورہ اور اعلان کے ساتھ ہو اسی لئے گواہوں اور ولی کی موجودگی اور عورت کی رضامندی شرط کی گئی ہے، من جملہ ان امور کے ایک یہ ہے کہ دونوں اپنے نفس کو باہمی تعاون پر آمادہ کریں اور یہ صورت اکثر اوقات جب ہی ہو سکتی ہے کہ نکاح دائمی اور لازمی ہو، اس کی کوئی میعاد معین نہ ہو، اس واسطے نکاح پوشیدگی میں (جو بغیر گواہوں کے ہو) اور متعہ اور لواطت حرام قرار پائے۔

اور کبھی کوئی نیک کام ایسے کام کے مشابہ ہوتا ہے جو دوسرے نیک کام کے مقدمات میں سے ہوتا ہے اس واسطے ان دونوں میں فرق کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے 'قومہ' اس لئے مشروع ہوا کہ رکوع اور سرنگوں ہونے میں جو سجدہ کے مقدمات میں سے ہے فرق ظاہر ہو جائے، اور کبھی کوئی شئے ایسی بھی ہوتی ہے جو بہت کارآمد اور اتفاق میں داخل نہیں ہوتی، جیسے دو سجدوں کے درمیان جلسہ کرنا اور کبھی کسی شئے کی شرط یا رکن حقیقت میں ایک امر خفی ہوتا ہے جو قلب سے متعلق ہوتا ہے پس اس کے لئے افعال بدنی میں سے کوئی فعل یا کوئی قول اس امر خفی کے لئے علامت قرار دیا جاتا ہے اور اسی کو رکن بنا دیا جاتا ہے تاکہ امر خفی کا انضباط ہو جائے جیسا کہ نیت اور خدا کے لئے اخلاص سے کوئی کام کرنا امر خفی ہے اس لئے استقبال قبلہ اور تکبیر ان کی علامت مقرر کر کے نماز میں اصل قرار دیئے گئے اور جب نص کسی صیغہ کے ساتھ مذکور ہو یا حال کسی نوع کو کسی حکم کا مدار بنانا چاہے اور پھر بعض مواقع ہیں اشتباہ واقع ہو جائے تو یہی مناسب ہے کہ اس صیغہ کی تفسیر میں یا اس نوع کی جامع ومانع تعریف معلوم کرنے میں عرف عرب کی طرف رجوع کیا جائے جیسے ماہ رمضان کے روزے رکھنے کے لئے نص وارد ہوئی ہے لیکن ابر کے وقت شبہ پڑ جاتا ہے اس

واسطے اس کا حکم وہی ہوگا جو عرب کے عرف میں تھا کہ شعبان کے تیس دن پورے کر لئے جائیں اور یہ کہ مہینہ کبھی تیس روز کا ہوتا ہے کبھی انتیس کا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے ''ہم ان پڑھ لوگ ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب کرنا جانتے ہیں کہ مہینہ اتنے دن کا ہوتا ہے'' الحدیث، ایسے ہی قصر میں سفر کے صیغہ کے ساتھ نص مذکور ہے۔ پھر بعض مواقع میں سفر کے معنی معلوم کرنے میں اشتباہ واقع ہوا اس لئے صحابہ نے حکم کیا کہ سفر گھر سے اتنی دور جانے کو کہتے ہیں کہ جہاں پورے ایک روز اور اس شب کے شروع حصہ میں نہ پہنچ سکے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی مسافت ایک روز اور دوسرے روز کا کچھ حصہ ہو اس طرح پر سفر کا اندازہ چار بردوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حکم کے ساتھ مخصوص کرنے میں اور آپ کی امت کے لئے اس حکم کے نہ ہونے میں عمدہ اور اصل یہ ہے کہ اس حکم کا مدار علیہ اس شئے کی حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ حکم امر مظنون کی طرف رجوع کرتا ہے چنانچہ حضرت طاؤس نماز عصر کے بعد دو رکعت نماز کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ لوگ ان کو وسیلہ نہ بنالیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت سے واقف تھے، پس حقیقت کے معلوم ہو جانے کے بعد آپ کی شان میں امر مظنون کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً چار عورتوں سے زیادہ سے شادی کرنے میں احتمال تھا کہ بیویوں کے ساتھ عمداً معاشرت نہ ہو اور ان کے حقوق میں کسی قسم کی غفلت ہو جائے اور تمام یہ بات کا شبہ ہو سکتا ہو لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے تھے کہ عورتوں کے ساتھ معاشرت میں کون سے امور پسندیدہ ہیں اس لئے خاص اپنے لئے جائز رکھا اور احتمالی مواقع کو ناجائز قرار دیا، یا وہ حکم رسم کی طرف رجوع کرتا ہے تہذیب نفس سے اس کا تعلق نہیں، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ کسی شرط کے لگانے سے منع فرمایا ہے، پھر آپ نے حضرت جابرؓ سے ایک اونٹ اس شرط پر خریدا کہ مدینہ تک وہ جابر کی سواری میں رہے، یا وہ حکم ایسے شخص کو جو معصوم نہیں ہے کسی اور کام کی طرف لے جاتا ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روزہ دار کے بوسے لینے کی بابت فرماتی ہیں ''تم میں سے کون شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح خواہش نفس پر غالب ہو سکتا ہے''۔ یا وجہ تخصیص یہ ہوتی ہے کہ آپ کا نفس قدسی کسی خاص نیک امر کا مقتضی ہوتا

ہے اس واسطے آپ پر اس کا کرنا واجب کر دیا جاتا ہے کیونکہ آپ کا نفس قدسی خدا تعالیٰ کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کا اور غفلت کی چادر اُتار دینے کا بہت مشتاق تھا جیسے قوی آدمی زیادہ غذا کھانے کا آرزومند ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک روایت کے بموجب تہجد اشراق اور چاشت کی نماز کی بابت ہے۔ واللہ اعلم۔

چودھواں باب: مذہبی آسانیوں کا بیان

خدا تعالیٰ فرماتا ہے "خدا کی رحمت کے ساتھ لوگوں سے نرمی کرو اگر تم سخت دلی سے پیش آؤ گے تو لوگ تمہارے پاس سے منتشر ہو جائیں گے" اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے "خدا تعالیٰ تمہارے حق میں آسانی کا ارادہ کرتا ہے نہ دشواری کا"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا تو ان سے فرمایا آسانیاں پیدا کرنا نہ دشواریاں، لوگوں کو خوش کرنا، متنفر نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا، اختلاف نہ کرنا"۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم آسانیاں بڑھانے کو پیدا ہوئے ہو نہ دشواریاں پیدا کرنے کو"۔ اور آسانی چند وجوہات سے حاصل ہوتی ہے من جملہ ان کے یہ ہے کہ کسی دشوار امر کو عبادت کا رکن یا شرط نہ قرار دیا جائے اور اس کی اصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "اگر میں امت کے لوگوں پر دشوار نہ سمجھتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا"۔ من جملہ ان کے یہ ہے کہ عبادات میں سے بعض امور کو ایسی رسومات بنا دیا جائے جن سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور ان امور میں داخل کر دیا جائے جن کو لوگ اپنی نفسانی رغبتوں سے عمل میں لاتے ہیں مثلاً عیدین اور جمعہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "تاکہ یہودی جان لیں کہ ہمارے مذہب میں کیسی وسعت ہے"۔ کیونکہ بڑے بڑے مجمعوں میں اپنے آپ کو مزین کرنا اور فخر کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت کا طالب ہونا لوگوں کی عادت میں داخل ہے۔ من جملہ ان کے یہ ہے کہ عبادات میں بعض وہ امور مسنون کر دیئے جائیں جو لوگوں کو بالطبع مرغوب ہوں تاکہ جس امر کی عقل خواہاں ہے طبیعت بھی اس کی خواہاں رہے۔ پس دونوں رغبتیں جمع ہو کر ایک دوسرے کی مددگار رہیں اسی وجہ سے مساجد کو پاک اور مزین رکھنا اور جمعہ کے دن غسل کرنا اور خوشبو لگانا مسنون قرار دیا اور قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنا اور اذان کا خوش آوازی سے پڑھنا مستحب قرار دیا۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ جس سے لوگوں کو دلی نفرت ہو اور ان کو وہ بوجھ معلوم ہو اس کو دور کر دیا جائے، اسی لئے غلام، اعرابی اور مجہول النسب کی امامت مکروہ قرار دی گئی ہے کیونکہ لوگ ایسے آدمیوں کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے دل گرفتہ ہوتے ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ لوگوں پر وہ شئے باقی رکھی جائے جس کو اکثر لوگوں کی طبیعت چاہتی ہو یا اس امر کے ترک کرنے سے ان کے دل تنگ ہوتے ہوں، جیسے امامت کے لئے سب سے زیادہ مستحق سلطان اور مالک خانہ قرار دیئے گئے ہیں، اور جو شخص نئی عورت سے شادی کرے تو اس کے پاس سات روز یا تین روز رہ کر پھر ایام کو برابر تقسیم کر دے۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ لوگوں کو علم و نصائح کی ہمیشہ تعلیم دیتا رہے، نیکی کا حکم کرتا رہے اور ممنوعات سے روکتا رہے تاکہ ان امور سے لوگوں کے دل بھر جائیں اور پھر احکام الٰہی کو بہ سہولت قبول کریں اور کلفت پیش نہ آئے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لوگوں کو نصیحت فرماتے رہا کرتے تھے منجملہ ان کے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعض ان امور کو عمل میں لائیں جن کا لوگوں کو حکم کرتے ہوں یا ان کے کرنے میں لوگوں کو اختیار دیتے ہوں تاکہ آپ کے فعل سے لوگوں کو اعتبار حاصل ہو۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ نبی ہمیشہ خدا سے دعا کرتا رہے کہ لوگ مہذب اور کامل بن جائیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے ذریعہ سے ان پر خدا کی جانب سے اطمینان اور تسکین ایسی نازل ہوتی رہے کہ لوگ آپ کے سامنے سر جھکا کر اس طرح بیٹھے رہیں گویا ان کے سر پر پرند ہیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ جو شخص حق سے سرتابی کرے اس کی سرکوبی کر دی جائے اور اس کو محروم کر دیا جائے جیسے قاتل کو مقتول کے ورثہ سے محروم کیا گیا اور زبردستی کی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی پس ایسا کرنا زبردستی کرنے والوں کو جبر اور اکراہ کرنے سے باز رکھے گا، جبکہ ان کی غرض حاصل نہ ہوگی، منجملہ ان کے یہ ہے کہ جن امور میں مشقت ہو ان کو آہستہ آہستہ شروع کرنا چاہیے چنانچہ حضرت عائشہ کا اسی کے متعلق قول ہے کہ قرآن میں اوّل وہ مفصل سورتیں نازل ہوئیں جن میں صرف جنت اور دوزخ کا ذکر تھا، اور جب اسلام کی طرف لوگ آنے لگے تو حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے اگر شروع ہی میں یہ نازل ہوتا کہ شراب مت پیو تو لوگ کہہ دیتے کہ

ہم شراب کبھی ترک نہ کریں گے، اور اگر شروع ہی میں یہ نازل ہوتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم زنا کبھی ترک نہ کریں گے۔

من جملہ ان کے یہ ہے کہ نبی ایسے فعل کو ترک کر دے جس سے لوگوں کے دلوں میں تشویش پیدا ہو اس لئے بعض امور مستحبہ کو ترک کر دیا گیا ہے چنانچہ آنحضرت علیہ السلام کے اس قول سے جو آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا، یہی مراد ہے ''اگر تیری قوم سے کفر کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو منہدم کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر تعمیر کرتا''۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ شارع نے مختلف نیکیوں، وضو، غسل، نماز، زکوۃ، روزہ، حج وغیرہ کا خود حکم دیا اور ان امور کو لوگوں کی رائے پر موقوف نہ رکھا، بلکہ ان سب کے ارکان، شروط و آداب وغیرہا کو منضبط کر دیا، پھر ان ارکان، شروط اور آداب کو زیادہ منضبط نہ کیا بلکہ ان کی تکمیل کو لوگوں کی عقلوں پر چھوڑ دیا کہ وہ ان الفاظ کے معانی اپنی عادات کے موافق خود سمجھ لیں مثلاً شارع نے یہ تو بیان کر دیا کہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز نہیں ہوئی لیکن حرفوں کے مخارج نہیں بیان کئے جن پر سورۂ فاتحہ کا ٹھیک طور پر پڑھنا موقوف ہے اور نہ ان کی تشدیدات و حرکات و سکنات بیان فرمائے اور نیز شارع نے یہ بیان کر دیا کہ استقبال قبلہ نماز میں شرط ہے لیکن کوئی ایسا قاعدہ نہیں بتایا جس سے استقبال قبلہ معلوم ہو سکے۔ اور اسی طرح یہ بھی بیان کر دیا کہ زکوۃ کا نصاب دو سو درہم ہے لیکن یہ نہیں بیان فرمایا کہ درہم کا وزن کتنا ہو اور جب اس قسم کی کوئی بات آپ سے دریافت کی گئی تو اسی قدر بتایا جس کو وہ سمجھ سکتے تھے اور کوئی ایسی بات نہیں بتلائی جو ان کی عادات میں نہیں تھی، اسی واسطے ماہ رمضان کے چاند کی نسبت فرمادیا اگر ابر ہو تو ماہ شعبان کے تیس روزے پورے کر لو۔ اور اس پانی کی نسبت جو بیابان میں ہوتا ہے درندے اور چہار پائے وہاں آتے جاتے ہیں یہ فرمایا جب پانی بقدر قلتین کے ہو تو ناپاک نہیں ہوتا''۔

اور ایسے امور کی اصل اہل عرب میں موجود تھی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سب اشیا کی حقیقتوں کا بیان کرنا انہی اشیا کے ساتھ ممکن ہے جن میں ظہور، خفاء اور عدم انضباط ویسا ہی ہو۔

اور پھر ان کے بیان کی ضرورت پڑے گی اور ایسے ہی ضرورت پڑتی جائے گی اور اس میں

بڑا حرج ہے اس لئے کہ ہر پابندی میں کسی قدر دقت ہوتی ہے، پس جب پابندیاں زیادہ ہو جائیں گی تو دقتیں بھی انتہا کو پہنچ جائیں گی، اور نیز شرعی احکام ادنی اور اعلیٰ سب ہی کے لئے ہیں تو ان تعریفات کو تفصیل وار یاد کرنے میں سخت دقت پڑے گی، اور نیز جب لوگ نیکی کی قیودات کی طرف زیادہ متوجہ ہوں گے تو وہ ان نیکیوں کے فوائد نہ معلوم کر سکیں گے اور نہ ہی نیکیوں کے ارواح کی جانب وہ متوجہ ہو سکیں گے جیسا کہ تم بہت سے قاریوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس وجہ سے کہ ان کی دلی توجہ الفاظ کی طرف رہتی ہے قرآن کے معنی میں غور وفکر نہیں کرتے اس لئے اس سے بہتر کوئی اور مصلحت نہ تھی کہ اصول کو منضبط کر کے باقی امور لوگوں کی رائے پر چھوڑ دیں، واللہ اعلم۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ شارع نے لوگوں سے ان کی عقل کے موافق ہی خطاب کیا ہے جو ان کی اصلی فطرت میں فن حکمت، علم کلام اور علم اصول کے دقائق میں غور کرنے سے پیشتر ہی ودیعت رکھی گئی تھی، اسی واسطے خداتعالیٰ نے اپنے واسطے جہت کو ثابت کیا اور فرمایا ''خداتعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہے''۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کالے رنگ کی عورت سے پوچھا تھا اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، تو آپ نے فرمایا یہ عورت مومنہ ہے اور اسی طرح قبلہ کی سمت پہنچانے میں نماز کے اوقات دریافت کرنے میں اور عیدین کے مقرر کرنے میں علم ہیئت اور ہندسہ کے مسائل کو حفظ کرنے کی تکلیف نہیں دی اور مسئلہ کی وجہ کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمادیا ''قبلہ، مشرق اور مغرب کے درمیان ہے جب کعبہ کی سمت منہ ہو جائے'' اور فرمادیا ''حج کا دن وہی ہے جس روز تم حج کرتے ہو اور یوم الفطر وہی ہے جس روز تم افطار کرتے ہو''۔ واللہ اعلم۔

پندرھواں باب: ترغیب اور ترہیب کے اسرار کا بیان

خداتبارک وتعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے وحی کے ذریعہ سے انبیا علیہم السلام کو ثواب اور عذاب بتلادیا جو اعمال پر مرتب ہوتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو مطلع کردیں اور لوگوں کے دل خوف اور امید سے پر ہو جائیں اور وہ دلی خواہش اور ارادہ سے شرائع کی پیروی کریں جس طرح وہ باقی اور امور کو عمل لاتے ہیں جن سے کوئی ضرور ہوتا ہے یا ان سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے چنانچہ اس آیت میں یہی مراد ہے'' بے شک نماز ایک بڑی بھاری چیز ہے لیکن نہ

ان خوف کرنے والوں پر جن کو خیال رہتا ہے کہ ہم اپنے پروردگار سے ملیں گے اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

پھر ترغیب اور ترہیب سے متعلق قواعد کلی ہیں جن سے ترغیب اور ترہیب کے تمام جزئی امور متفرع ہوتے ہیں، فقہا صحابہ ان کو اجمالاً جانتے تھے اگرچہ انھوں نے ان قواعد کو تفصیلاً منضبط نہیں کیا تھا اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس پر دلیل یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اپنی بیوی سے مباشرت کرنے میں بھی تمہارے لئے اجر ہے، صحابہ نے عرض کیا کہ کیا کوئی خواہش پوری کرے جب بھی ثواب ملتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر حرام میں خواہش کا استعمال کرتا، کیا اس پر اس کو گناہ نہ ہوتا'' اس لئے صحابہ کا اس مسئلہ میں توقف کرنا اور ان پر اس کی علت کا مشتبہ ہو جانا اسی وجہ سے تھا کہ ان کے نزدیک اعمال اور ان کی اجزا میں جو کچھ مناسبت ہوتی ہے۔ اس کو وہ جانتے تھے اور اس کو خوب جانتے تھے کہ اعمال کے نتائج ایسے قاعدہ پر مبنی ہیں جو معقول المعنی ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے سوال کرنے کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب دینے کی جو آپ نے ایک واضح شئے پر قیاس کر کے دیا ہے، کوئی وجہ نہ ہوتی، اور میرے اس قول کی نظیر یہ بھی ہے کہ جو فقہا نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے، حدیث یہ ہے اگر تیرے باپ پر قرضہ ہوتا تو اس کو ادا کرتا یا نہیں؟ اس نے کہا ہاں، ادا کرتا آپ نے فرمایا پس خدا کا قرضہ زیادہ ادا کرنے کے قابل ہے'' فقہا کہتے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام کو قواعد کلیہ سے تعلق ہوتا ہے۔

صحابہ کے سوال کا حاصل یہ ہے کہ نیکیوں سے تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے مثلاً تسبیح تہلیل، تکبیر، یا ان سے شہری انتظام میں کوئی مصلحت حاصل ہوتی ہے اور برائیوں سے ان دونوں کے خلاف امور حاصل ہوتے ہیں اور خواہش نفس کے پورا کرنے میں بہیمیت کے غلبہ کی پیروی ہوتی ہے اور اس میں عادت سے زیادہ اور کوئی مصلحت بھی نہیں ہوتی اور قضا شہوت کے پورا کرنے میں بہیمیت کے غلبہ کی پیروی ہوتی ہے اور اس میں عادت کے علاوہ نہ تو کوئی مصلحت سمجھی جاتی ہے اور نہ ہی اس کے مثل کوئی ایسی شئے سمجھی جاتی ہے جو معرفت کلیہ کی طرف رجوع کرتی ہو اور قضا شہوت کے مسئلہ کو معرفت کلیہ کی طرف لوٹانا نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اپنی بیوی سے مباشرت کرنے میں خاوند اور بیوی کی پاکدامنی مستحکم ہوتی ہے اور اس میں بے موقع خواہش نفس پورا کرنے سے نجات ملتی ہے، ترغیب اور ترہیب کے چند طریقے ہیں اور ہر طریقہ کا ایک راز ہے اور ہم تم کو ان میں سے بڑے بڑے طریقے بتلاتے ہیں، ان طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ تہذیب نفس کے بارے میں کسی کام کا جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ بیان کر دیا جائے یعنی نفس کی نیک و بد قوتوں میں سے کسی کا کمزور پڑ نایا اس کا غالب آنا، اسی کو زبان شرع میں نیکیوں کا لکھا جانا اور برائیوں کا مٹ جانا کہتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص **لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک و لہ الحمد وھو علی کل شی قدیر** ، روزانہ سو بار پڑھ لیا کرے تو یہ دس غلام آزاد کرنے کے برابر ہے اور اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کے سو گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اور اس روز شام تک وہ شیطان سے محفوظ رہتا ہے اور ایسے شخص سے افضل کسی کا عمل نہیں ہوتا مگر اس شخص کا جو اس سے بھی زیادہ عمل کرے، اس حدیث کا راز ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اور ان طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ شیطان وغیرہ سے محفوظ رہنے کی بابت اس عمل کے اثر کو بیان کیا جائے جیسے آپ نے فرمایا تھا اور شام تک وہ شیطان سے محفوظ رہتا ہے'' اور جیسے آپ کا یہ فرمان ہے ''بدکار لوگ اس کو نہیں کر سکتے'' یا اس عمل کا اثر رزق کی وسعت اور برکت کا ظہور بیان کیا جائے وغیر ذلک۔

ان میں سے بعض میں یہ راز ہے کہ کوئی شخص خدا سے سلامتی کو طلب کرتا ہے اور اس کی یہ طلب قبولیت دعا کا سبب بن جاتی ہے، چنانچہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس حدیث میں جس کو آپ خدا کی جانب سے روایت کرتے ہیں یہی مراد ہے، آپ نے فرمایا ''اگر بندہ مجھ سے پناہ چاہے گا تو میں اس کو پناہ دوں گا اور اگر کسی امر کی مجھ سے درخواست کرے گا تو میں اس کو ضرور دونگا''۔

اور بعض احادیث میں یہ راز ہے کہ ذکر الٰہی میں مستغرق ہونے سے اور عالم جبرت کی طرف متوجہ ہونے سے اور ملکوت سے مدد طلب کرنے سے شیاطین سے مناسبت منقطع ہو جاتی ہے اور تاثیر کا مدار مناسبت پر ہوا کرتا ہے اور بعض احادیث میں یہ راز ہے کہ جس کی ایسی حالت ہوتی

ہے تو ملائکہ اس کے لئے دعا کرتے ہیں اس لئے وہ بہت سی راہوں پر چل پڑتا ہے پس کبھی تو وہ حصول منافع کے راستہ پر ہوتا ہے اور کبھی مضرت کے دفع ہونے کے راستہ پر۔

اور ان ترغیب وترہیب کے طریقوں میں سے یہ ہے کہ اعمال کا وہ اثر جو آخرت میں ظاہر ہوگا بیان کر دیا جائے اور اس کا راز دو مقدموں سے معلوم ہوتا ہے اوّل مقدمہ یہ ہے کہ معاد میں کسی شئے کو ثواب اور عذاب کا سبب قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ جزا کے دونوں اسباب میں سے کسی سبب کے ساتھ مناسبت نہ ہو، یا تو اس کو ان چاروں اخلاق میں دخل ہو جن پر سعادت اور تہذیب نفس کا ہونا یا نہ ہونا مبنی ہے، اور وہ چاروں اخلاق یہ ہیں: پاکیزگی حاصل کرنا، رب العالمین کے حضور میں عاجزی کرنا، سخاوت کرنا، لوگوں میں عدل وانصاف قائم کرنے کی کوشش کرنا، یا اس شئے کو ان امور کے اجزا میں نفیاً واثباتاً دخل ہو جس اجرا پر ملاء اعلیٰ کا اتفاق ہے جیسے شرائع کو مستحکم کرنا، انبیا علیہم السلام کی امداد کرنا اور عمل اور سبب جزا میں مناسبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ عمل اس معنی سببی کے وجود کا محل سمجھا جاتا ہو یا عادۃً اس معنی سببی کو لازم ہو یا اس کے لئے ذریعہ ہو جیسے دو رکعت نماز کو اس طرح سے ادا کرنا کہ کوئی نفسانی وسوسہ واقع نہ ہو، اس میں خدا کے حضور میں عاجزی، خدا کے جلال کی یاد اور بہیمیت کی پستی سے ایک قسم کی ترقی کا ظہور ہے۔ اور ایسے ہی پورا پورا وضو کرنا اس پاکیزگی کا باعث ہے جو نفس میں اثر کرتی ہے اور ایسے ہی مال کثیر کا خرچ کرنا جس میں عادۃ بخل کیا جاتا ہے اور کسی کے ظلم کو معاف کرنا اور اپنے حقوق میں جھگڑے کو ترک کرنا سخاوت نفس کی دلیل اور اس کو متلازم ہے۔ اور ایسے ہی بھوکے کو کھانا کھلانا پیاسے کو پانی پلانا اور لوگوں میں آتش جنگ کو بجھانے میں سعی کرنا اصلاح عالم کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اور اسی طرح عرب سے محبت رکھنا ان کی روش اختیار کرنے کا ذریعہ ہے اور یہ دین الٰہی حاصل کرنے کا آسان طریق ہے کیونکہ شریعت عادات عرب کے ہی موافق معین کی گئی ہے اور نیز اس پسندیدگی میں شریعت مصطفوی کی تعظیم ہے اور اسی طرح روزہ کے افطار کرنے میں عجلت کرتے رہنا، دوسرے مذاہب کے اختلاط اور ان کی تحریفات سے جدا رہنا ہے۔

اور ہمیشہ سے لوگوں کے فرقے یعنی حکما اور ارباب صناعت اور اطبا احکام کو ان کی علتوں پر جاری کرتے آئے ہیں اور عرب بھی ہمیشہ اپنے خطبات اور محاورات میں اسی قانون پر چلتے آئے

ہیں اور کسی قدر اس کو ہم نے ذکر بھی کیا ہے۔

اور یا یہ عمل نہایت شاق ہو یا گم شدہ ہو یا سخت ناگوار طبع ہو جس پر وہی شخص اقدام کر سکے جس میں کامل اخلاص ہو اس لئے ایسا عمل اس کے اخلاص کی شرح ہو جائے گا مثلاً خوب سیر ہو کر زمزم کا پانی پینا اور حضرت علیؓ سے محبت رکھنا اس وجہ سے کہ حضرت علیؓ خدا کے احکام کی تعمیل میں نہایت سخت تھے اور جیسے انصار سے محبت کرنا، کیونکہ معد اور یمن کے عرب باہم ایک دوسرے سے متنفر تھے یہاں تک کہ اسلام نے ان میں الفت پیدا کر دی، اس واسطے ان سے محبت کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ دل میں اسلام کی بشاشت اثر کر گئی ہے اور جیسے پہاڑ پر چڑھ کر دیکھنا اور لشکر اسلام کی حفاظت میں جاگنا، پس یہ اس امر کو بتلاتا ہے کہ اس کا ارادہ دین الٰہی کے قائم کرنے میں سچا ہے اور اس کو دین سے محبت ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے اور وہ اپنے نفس اور نفس کی ان حالتوں کی طرف رجوع کرتا ہے جن کی موافقت یا منافرت کا نفس پر رنگ چڑھا تھا تو وہاں کے مناسب تکالیف و آرام کی صورتیں اس پر ضرور ظاہر ہوتی ہیں، ان نفسانی حالات اور تکلیف و آرام میں ملازمت عقلیہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے بلکہ یہ ملازمہ ایک دوسری قسم کا ہے جس سے نفس کے بعض امور کی بعض کی طرف کشش ہوتی ہے اور اسی کے موافق خواب میں معانی متشکل ہوتے ہیں جیسے ماہ رمضان میں موذن کا اذان دے کر لوگوں کو مباشرت اور کھانے پینے سے منع کرنا ان کے موہنوں اور شرمگاہوں پر مہر لگا دینے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، پھر عالم مثال میں اور مناسبات ہیں جن پر احکام مبنی ہیں، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام دحیہ کلبیؓ کی صورت میں آنے اور کسی کی صورت میں نہ آئے تو یہ ایک خاص مناسبت کی وجہ سے تھا اور خاص وجہ ہی کے سبب سے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آگ کا ظہور ہوا تھا۔ پس ان مناسبات کا سمجھنے والا ہی خوب جان سکتا ہے کہ اس عمل کی جزا کس صورت میں ہوگی جیسے خواب کی تعبیر دینے والا خوب جانتا ہے کہ جو صورت اس نے خواب میں دیکھی ہے اس صورت میں کون سی شے ظاہر ہوئی ہے۔

اصل کلام یہ ہے کہ اسی طریقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ جو شخص علم کو چھپائے اور وقت ضرورت تعلیم سے سکوت کرے تو اس کو آتشی لگام سے عذاب دیا جائے گا یہ تشبیہ اس لئے

دی گئی ہے کہ ایسے سکوت سے نفس کو تکلیف ہوتی ہے اور لگام سکوت کے مشابہ اور اس کی صورت ہے، اور جو شخص مال سے زیادہ محبت کرتا ہے اور ہمیشہ اس کا دل مال سے ہی متعلق رہتا ہے تو اس کی گردن میں گنجے سانپ کا طوق ڈالا جائے گا اور جو شخص دراہم، دنانیر اور مویشیوں کی حفاظت میں مصروف رہتا ہے اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے باز رہتا ہے تو اس کو انہی اشیا کے ذریعہ سے عذاب دیا جائے گا جیسے تکلیف دینے کا طریقہ ملاء اعلیٰ کی نظر میں مقرر ہے اور جو شخص کسی ہتھیار یا زہر سے خودکشی کرتا ہے اور اس وجہ سے وہ خدا کے حکم کی مخالفت کرتا ہے تو انہی صورتوں سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔ اور جو شخص فقیر کو کپڑے پہنائے گا تو اس کو روز قیامت میں حریر جنت کا لباس پہنایا جائے گا اور جو شخص کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے گا اور غلام کی مصیبت سے جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے آزاد کرے گا تو اس غلام کے ہر عضو کے بدلہ میں اس شخص کا ہر عضو دوزخ سے آزاد کیا جائے گا۔

اور ان ترغیب اور ترہیب کے طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ عمل کو اس چیز سے تشبیہ دی جائے جس کی خوبی یا برائی ذہنوں میں شرع یا عادت کی وجہ سے پائی جاتی ہے اور اس وقت میں ضرور ہے کہ ان دونوں امروں میں کوئی جامع شئے ہو جو کسی وجہ سے دونوں میں مشترک ہو جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جو صبح کی نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک مسجد میں عبادت کے لئے بیٹھا رہے، صاحب حج وعمرہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور ہبہ کر کے واپس لینے والے کو اس کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو قئے کر کے پھر اس کو چاٹ لیتا ہے اور تشبیہ میں یہ بھی ضرور ہے کہ اس عمل کو محبوب لوگوں یا قابل نفرت لوگوں کی طرف منسوب کیا جائے یا اس عمل کرنے والے کے حق میں دعا یا بددعا کی جائے اور ان امور سے اگرچہ اس عمل کے عمدہ یا قبیح ہونے کی وجہ کا لحاظ بھی نہ کیا جائے، اس عمل کی اجمالی حالت معلوم ہو جاتی ہے جیسے شارع کا قول۔ یہ (۱) منافق کی نماز ہے"۔ اور جیسے آپ نے فرمایا "جو شخص ایسا کام کرے گا وہ ہم سے نہیں"۔ یا فرمایا "یہ کام شیطان کا ہے یا یہ کام فرشتوں کا سا ہے اور خدا اس پر رحم کرے جو ایسا کرتا ہے؟ اور اسی کے مثل اور عبادتوں کو قیاس کر لینا چاہئے اور ان ترغیب وترہیب کے طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ فعل کی

---

(۱) جو عصر کی نماز تنگ وقت میں پڑھے۔

حالت ہی خدا کی خوشی یا ناخوشی سے متعلق ہے اور یہ حالت ہی ملائکہ کی دعا یا بددعا کا سبب ہے جیسے شارع کا قول ہے'' خدا ایسے ایسے امور کو پسند کرتا ہے اور ایسے ایسے امور کو ناپسند کرتا ہے''۔ اور جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' خدا تعالیٰ اور فرشتے دائیں جانب کی صفوں پر رحمت بھیجتے ہیں'' اور اس کا راز ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔

سولھواں باب: کمال مطلوب کے حاصل ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے امت کے درجات کا بیان

اس باب میں اصل خدا تعالیٰ کا وہ قول ہے جو سورۂ واقعہ میں مذکور ہے'' تم تین تین جوڑے ہو، اصحاب الیمین اور اصحاب الیمین کیا ہیں؟ اور اصحاب المشئمة اور اصحاب المشئمة کیا ہیں اور جو لوگ سب پر سبقت لیجانے والے ہیں وہی مقرب ہیں۔ الی آخر السورۃ۔ اور نیز خدا تعالیٰ کا وہ قول ہے'' پھر ہم نے ان لوگوں کو وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تھا، پس بعض لوگ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں بعض میانہ رو اور بعض نیکیوں میں سب سے آگے بڑھنے والے ہیں، خدا کے حکم سے یہ خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔

تم معلوم کر چکے ہو کہ سب سے اعلیٰ درجہ کے نفوس مفہمین کے ہیں اور ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں، مفہمین کے بعد اس گروہ کا درجہ ہے جس کو سابقین کہتے ہیں۔ سابقین کی دو قسمیں ہیں۔ اول قسم اہل علو و اصطلاح کی ہے جن کی استعداد کمالات کے حاصل کرنے میں مفہمین کی سی ہوتی ہے لیکن ان کی سعادت ان کو ان کے مرتبہ تک نہیں پہنچاتی پس ان کی استعداد خوابیدہ آدمی کی سی ہے جو ایک بیدار کرنے والے کا محتاج ہوتا ہے، پس جب ان کو رسولوں کی خبریں بیدار کرتی ہیں تو وہ ان علوم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جو ان کی استعداد کے مناسب ہوتے ہیں ایسی مخفی مناسبت کی وجہ سے جو ان کے باطن نفوس میں موجود ہوتی ہے اس لئے یہ لوگ مجتہدین فی المذہب کے مرتبہ کے ہو جاتے ہیں اور ان کے الہام کی حالت یہ ہے کہ وہ اس الہام اجمالی کلی کو حاصل کرتے ہیں جو ان کے نفوس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس استعداد کی وجہ سے جو بارگاہ الٰہی میں ان کو محیط ہوتی ہے اور یہ ایسا امر ہے جو اکثر سابقین میں مشترک ہے اور پیغمبروں نے اس کو بیان کیا ہے۔

دوسری قسم اہل جذب اور علو کی ہے جن کو رہبر توفیق نے ایسی ریاضات اور توجہات کی

طرف چلا کر مشغول رکھا ہے جس سے ان کی بہیمیت مغلوب ہوگئی پس خدا تعالیٰ نے ان کو کمال علمی اور کمال عملی دونوں عطا فرمائے ہیں۔ اور اپنے امور میں ان کو پوری بصیرت حاصل ہوگئی ہے اسی واسطے ان کو خداوندی واقعات، رہنمائی اور اطلاع حاصل ہوتی رہتی ہے جیسے طرق صوفیہ کے اکابر صوفیہ تھے، تمام سابقین میں دو امر ضرور جمع ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی طاقت خدا کی طرف متوجہ ہونے میں اور قرب حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں اور دوسرا امر یہ ہے کہ ان کی فطرت نہایت قوی ہوتی ہے پس ملکات مقصودہ ہو بہو ان کے سامنے متمثل ہوتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کو ملکات کے قالب اور صورتوں کی طرف ضرورت پڑے، ان کو ان قالبوں کی ضرورت صرف ان ملکات کی تشریح کے لئے ہوتی ہے اور اس لئے ہوتی ہے کہ وہ قوالب ان ملکات کے لئے ذرائع ہوتے ہیں، سابقین میں سے ایک قسم مفردین کی ہے جو عالم غیب کی طرف متوجہ رہتے ہیں ذکر الٰہی ان کے بوجھ اور دقتوں کو دور کر دیتا ہے، ایک قسم صدیقین کی ہے جو خدا تعالیٰ کی شدت کے ساتھ فرمانبرداری کرنے کی وجہ سے اور اسی کے لئے خاص ہونے کی وجہ سے تمام لوگوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور ایک قسم شہدا کی ہے جو لوگوں کی رہبری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، ان میں عالم بالا کا یہ اثر ہوتا ہے کہ کافروں پر لعنت کرتے ہیں ایمان والوں سے خوش ہوتے ہیں، اور نیک امور کا حکم کرتے ہیں، برے کاموں سے منع کرتے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اسلام کو غالب کرتے ہیں، پس یہ قیامت کے روز کفار سے مخاصمہ کریں گے اور ان کے خلاف شہادت دیں گے اور یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں بہ منزلہ اعضا کے ہیں تاکہ بعثت سے جو مقصود ہے وہ ان کے ذریعہ سے تکمیل کو پہنچ جائے، اسی واسطے ان کو اوروں سے افضل جاننا اور ان کی عزت و توقیر کرنا ضروری ہے اور ایک قسم راسخین فی العلم کی ہے جن میں ذکاوت اور ہوشمندی کامل ہوتی ہے اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے علم و حکمت کی باتیں سنتے ہیں تو ان میں ایک استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

پس کتاب الٰہی کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھنے میں وہ استعداد ان کے باطن کی مدد کرتی ہے اسی طرف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارہ کیا ہے جبکہ فرمایا "یا استنباط قرآنی کی طاقت جو مسلمان آدمی کو دی جاتی ہے" اور ایک قسم عباد کی ہے جو عبادت کے فوائد کو عیاناً دیکھتے ہیں اور اس

کے نفوس اس عبادت کے انوار سے منور ہوجاتے ہیں اور وہ فوائد ان کے صمیم قلب میں داخل ہوجاتے ہیں پس یہ لوگ عبادت الٰہی نہایت بصیرت سے کرتے ہیں اور ایک درجہ سابقین میں سے زہاد کا ہے۔ ان کو عالم معاد اور وہاں کے لذائذ کا کامل یقین ہوتا ہے اور ان لذائذ کے مقابلہ میں ان کو دنیوی لذت نہایت حقیر معلوم ہوتی ہے اور لوگ ان کی نظر میں اونٹ کی مینگنیوں کی مانند بے قدر معلوم ہوتے ہیں، اور سابقین میں سے بعض لوگ انبیا علیہم السلام کی جانشینی کی استعداد رکھتے ہیں جو وصف عدالت کے ساتھ موصوف ہوکر خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے رہتے ہیں اور وصف عدالت کو احکام الٰہی میں صرف کرتے ہیں اور سابقین میں سے خوش خلق لوگ ہیں یعنی ان میں سخاوت، تواضع اور عفو کی صفات ہوتی ہیں اور سابقین میں سے ایک جماعت ان لوگوں کی ہے جو فرشتوں کے ساتھ مشابہ ہوتے ہیں اور ان کا فرشتوں کے ساتھ اختلاط رہتا ہے جیسے حدیث میں آیا ہے کہ بعض صحابہ کو فرشتے سلام کیا کرتے تھے۔

ان سابقین کے فرقوں میں سے ہر ایک فرقہ میں ایک تو جبلی اور فطری استعداد ہوتی ہے جو اپنے کمال کا ایسی بیداری کے ذریعہ تقاضا کرتی ہے جو انبیا کی اطاعتوں سے پیدا ہوتی ہے اور ایک استعداد کسبی ہوتی ہے جو احکام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے پس ان دونوں استعدادوں کے ذریعہ سابقین کو کمالیت حاصل ہوتی ہے، مفہمین میں سے لوگ ہدایت کے لئے مبعوث نہیں ہوئے وہ بھی شرائع میں سابقین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

سابقین کے بعد اس جماعت کا درجہ ہے جن کو اصحاب الیمین کہتے ہیں، اصحاب الیمین کی بھی چند قسمیں ہیں، ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے قلوب سابقین کے درجہ سے بہت قریب ہیں لیکن ان کو فطری امور کی تکمیل کی توفیق نہیں ہوئی اس لئے انھوں نے اعمال کی ارواح کو چھوڑ کر صرف اعمال کی صورتوں پر ہی اکتفا کیا لیکن ان کو ان ارواح سے بالکل بیگانگی بھی نہیں ہے اور ایک قسم اصحاب جذب کی ہے ان کے نفوس میں قوت ملکی ضعیف ہوتی ہے اور قوت بہیمی قوی ہوتی ہے اس لئے سخت سخت ریاضتوں کی ان کو توفیق ہوتی ہے اس سے ان کو وہ علوم حاصل ہوجاتے ہیں جو ملاء سافل کے لئے ہوتے ہیں، یا ان کی بہیمی قوت ضعیف ہوتی ہے اور وہ ذکر الٰہی سے تزکیۂ قلب حاصل کرتے ہیں پس ان پر جزئی الہامات، جزئی عبادات اور طہارت کا ترشح ہوتا ہے، اور ایک قسم

اہل اصطلاح کی ہے. جن کی ملکی قوت نہایت ضعیف ہوتی ہے ان لوگوں کی بہیمی طاقت اگر قوی ہے تو سخت سخت ریاضتوں میں مصروف رہتے ہیں اور اگر قوت بہیمی ضعیف ہے تو ہمیشہ وظائف میں لگے رہتے ہیں، پس ان تمام محنتوں سے ان کو کسی قسم کا انکشاف حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ اعمال اور صورتیں جو عمدہ ملکات کی تصویریں ہیں ان کے نفوس میں راسخ ہو جاتی ہیں، ان میں سے اکثر لوگوں کے عمل میں کامل اخلاص اور طبیعت و عادت کے میلان سے پورے طور پر علیحدگی شرط نہیں ہوتی ایسے لوگ صدقہ دیتے ہیں لیکن تنگ دلی اور ثواب کی امید دونوں ان کی نیت میں داخل ہوتی ہیں وہ نماز اس لئے پڑھتے ہیں کہ ان کے خاندان میں نماز پڑھنے کا طریقہ جاری ہے اور ان کو ثواب کی امید بھی رہتی ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے اور لوگوں کے خوف سے زنا اور شراب خوری سے اجتناب کرتے ہیں، یا یہ لوگ مرغوبات حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتے اور لہو ولعب میں مال خرچ نہیں کر سکتے تو ایسے لوگوں سے اعمال قابل قبول ہوں گے بشرطیکہ ان کے قلوب اخلاص خالص کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور ان کے نفوس نفس اعمال کے پابند رہیں نہ صرف ان کاموں کے جو کسی قدر ملکات کی شرح ہوتے ہیں، پیشتر زمانہ کی حکمت میں مندرج تھا کہ بعض صورت میں تو حیا خیر ہے اور بعض صورتوں میں حیا عاجزی اور ضعف ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حیا سب صورتوں میں عمدہ شئے ہے پس نبی کا یہ فرمان ہماری مذکورہ بالا تقریر کی تائید کرتا ہے اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر کبھی کبھی قوت ملکی کی تجلی چمک جاتی ہے لیکن ان میں اس کا ملکہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسی تجلی سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں ایسے لوگ وہ ہیں جو خدا سے استغفار کرتے ہیں، برائیوں پر اپنے نفس کو ملامت کرتے ہیں اور وہ ہیں جو تنہائی میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور ایسے لوگ وہ ہیں جن کا نفس برائی کا پابند نہیں ہو سکتا ان کا دل پرندوں کا سا ہوتا ہے، اس وجہ سے کہ یا تو ان کی فطرت ضعیف ہوتی ہے یا قوت کو زائل کرنے والی کوئی شئے ان کے مزاج میں پیدا ہو جاتی ہے جیسے کسی کو شکم میں بیماری ہو یا مصیبتوں میں گرفتار ہو ایسے لوگوں کے مصائب ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اصحاب الیمین کو سابقین کی دونوں خصلتوں میں سے ایک حاصل ہوتی ہے اور ایک حاصل نہیں ہوتی، اصحاب الیمین کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جن کو اصحاب الاعراف

کہتے ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک قسم کے تو وہ لوگ ہیں جن کے مزاج صحیح اور فطرت پاکیزہ ہے اور ان کو دعوت اسلام کی کچھ خبر نہیں ہوئی ہے یا خبر تو ہوئی ہے لیکن اس طرح سے کہ وہ ان پر حجت نہ بن سکی اور نہ ہی اس سے ان کے دلوں کا شبہ دور ہو سکا اس واسطے ان لوگوں کو خسیس ملکات اور برے اعمال میں نہ تو انہماک ہوتا ہے اور نہ ہی جناب حق کی طرف ان کی توجہ ہوتی ہے نہ اثباتاً اور نہ نفیاً، یہ لوگ اپنے اکثر حالات میں دنیوی کاروبار میں مشغول رہتے ہیں پس یہ لوگ جب مریں گے تو ایک کورانہ حالت کی طرف رجوع کریں گے نہ ان کو عذاب ہوگا اور نہ ثواب، یہاں تک کہ ان کی بہیمیت محو ہو جائے اور پھر ملکی قوت کی تجلّیوں میں سے کچھ ان پر چمکیں اور دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن میں عقلی مادہ کم ہے جیسے اکثر لڑکے، دیوانے، کاشتکار اور غلام، اور اکثر و بیشتر ان کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی خوف نہیں اور جب رسوم کی پابندی ان میں نہ ہو تو خود محض بے عقل رہ جاتے ہیں ایسے لوگوں کے مومن ہونے میں اتنا ہی کافی ہے جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ لونڈی کے لئے کافی سمجھا تھا، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دریافت فرمایا، خدا کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی جانب اشارہ کیا، ایسے لوگوں سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے مشابہ ہیں تاکہ کلمہ کی تفریق نہ ہو، لیکن وہ لوگ جو بری عادتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور نامناسب طریقہ سے جناب حق کی طرف میلان کرتے ہیں تو ایسے لوگ اصحاب جاہلیت ہیں جن کو مختلف صورتوں سے عذاب دیا جائے گا، اصحاب اعراف کے بعد ایک اور جماعت ہے جن کو منافقین کہتے ہیں ان کا نفاق عملی ہوتا ہے، ان لوگوں کی چند قسمیں ہیں، ان منافقین میں وہ سعادت پیدا نہ ہوئی جس سے کمال مطلوب پورے طور پر حاصل ہو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ان پر طبیعت کے حجاب غالب آ گئے پس وہ برے خصائل میں پڑے رہے جیسے کھانے اور عورتوں کی خواہش ہے اور کینہ ہے، ان کی طاعت نے ان کے گناہوں کو زائل نہیں کیا یا رسم کے حجاب ان پر غالب آ گئے، اس لئے رسوم جاہلیت یا بھائی بندوں یا وطنوں کو ترک کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے، یا ان پر سوء معرفت اور کج فہمی کا حجاب پڑ گیا جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اوروں کو تشبیہ دینے والے یا عبادت اور استعانت میں خدا کے ساتھ اوروں کو شریک کر کے شرک خفی کرنے والے جو اس بات کے قائل ہیں کہ شرک مبغوض اس کے علاوہ کوئی اور ہے، یہ شرک ان امور میں

ہوتا ہے جن کی مذہب میں پوری تصریح نہیں اور نہ ہی ان کو بخوبی واضح اور روشن کیا گیا ان میں سے بعض لوگ ضعیف المزاج، نحیف اور کمزور عقل کے ہوتے ہیں جن کو خدا اور رسول کی محبت نے گناہوں سے باز نہ رکھا، جیسے اس شخص کا قصہ جو خدا اور رسولؐ سے دلی محبت رکھتا تھا اور شراب پیا کرتا تھا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی محبت کی شہادت دی، اور ایک جماعت ہے جس کو فاسقین کہتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر ملکات رذیلہ کی بہ نسبت برے اعمال غالب ہیں، ان فاسقین میں سے بعض میں بہیمیت بہت زیادہ ہوتی ہے وہ درندوں اور بہائم کی خواہشوں میں منہمک رہتے ہیں اور ان میں سے بعض کے مزاج فاسد ہوتے ہیں اور ان کی رائیں لغو ہوتی ہیں، وہ بہ منزلہ اس مریض کے ہوتے ہیں جو مٹی اور جلی ہوئی روٹی کھانے کو پسند کرتا ہے، پس ایسے لوگوں سے شیطانی امور سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ فاسقین کے بعد درجہ کفار کا ہے یہ وہ متمرد اور سرکش لوگ ہیں جنھوں نے باوجود کمال عقل اور صحیح تبلیغ کے لا الٰہ الا اللہ کہنا بھی گوارا نہ کیا یا شریعت انبیا علیہم السلام کے پھیلانے میں باری تعالیٰ کا جو ارادہ تھا اس کی مخالفت کی پس انھوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے باز رکھا اور دنیوی زندگی پر قناعت کی اور دنیا کے مابعد زندگی کی کچھ پرواہ نہیں کی، ایسے لوگ ابدی لعنت اور دائمی قید میں رہیں گے، ان کفار میں سے اہل جاہلیت ہیں اور ان میں وہ منافق بھی شامل ہے جو صرف زبان سے ایمان کا اظہار کرتا ہے اور اس کا دل کفر خالص پر قائم ہے۔ واللہ اعلم۔

سترھواں باب: اس بیان میں کہ ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو اور مذاہب کا ناسخ ہو

تمام مذاہب جو روئے زمین پر موجود ہیں تم ان کی چھان بین کرو، کیا تم کو ان امور میں جن کا ہم نے گزشتہ ابواب میں ذکر کیا ہے کچھ خلاف نظر آتا ہے؟ بخدا ہرگز نہیں، بلکہ تمام مذاہب میں صاحب مذہب کی نسبت اعتقاد، صداقت اور اس کی تعظیم ہوتی ہے، اس کی نسبت یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ بڑا کامل اور بے نظیر ہے، اور اس اعتقاد کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عبادات میں لوگ اس کے استقلال کو دیکھتے ہیں یا اس سے خلاف عادت امور کے ظہور کو دیکھتے ہیں یا اس کی دعاؤں کی مقبولیت کو دیکھتے ہیں، اور نیز مذاہب میں ایک حصہ حدود، شرائع اور تعزیرات کا ہوتا ہے جن کے بغیر مذہب کا انتظام نہیں ہوسکتا، پھر اس کے بعد ہمارے مذکورہ بالا اور ان کے مماثل امور میں سے

کچھ امور ایسے ہوتے ہیں جو عمل میں آسانی کی استطاعت پیدا کرتے ہیں۔

ہر ایک قوم کا ایک طریقہ اور شریعت ہوتی ہے جس میں ان کے بزرگوں کی عادت کا اتباع کیا جاتا ہے اور اس میں ائمہ دین اور حاملین مذہب کی روش کو پسند کیا جاتا ہے پھر اس مذہب کی بنیادوں کو اور ارکان کو نہایت مستحکم کیا جاتا ہے حتیٰ کہ اس مذہب کے پیرو اس کی حمایت میں جنگ کرتے ہیں اور جان و مال اس کے لئے قربان کرتے ہیں، یہ جان بازیاں نہایت مضبوط تدابیر اور پختہ مصلحتوں کی وجہ سے ہوتی ہے جن کو عوام لوگ نہیں سمجھ سکتے اور جب ایک فرقہ کا مذہب جدا قرار پا جاتا ہے اور وہ اپنے طریقے مقرر کر لیتے ہیں اور اس کے مخالف امور کی اپنی زبانوں سے مدافعت کرتے ہیں اور اپنی تلواروں سے اس کے لئے مقاتلہ کرتے ہیں اور پھر ان میں اس وجہ سے بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے کہ جو شخص ملت کے قیام کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ اس کا سربراہ کار ہو جاتا ہے، یا نئے نئے طریقے اس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں اور اس میں مل کر پوشیدہ ہو جاتے ہیں، یا حاملین ملت اشاعت مذہب میں سست ہو جاتے ہیں تو ان اسباب سے لوگ مذہب کے اکثر حصہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ نام و نشان باقی رہ جاتا ہے جس سے حالت کا پتہ نہیں چلتا، اور ہر ایک مذہب والا اپنے مخالف مذہب کو برا بھلا کہتا ہے، اس کا انکار کرتا ہے اور اس کے خلاف قتال کرتا ہے اور حق پوشیدہ ہو جاتا ہے تب ایک ایسے کامل رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو تمام مذاہب سے ایسا ہی معاملہ کرے جیسا کہ ہدایت یافتہ خلیفہ ظالم بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے اور تم اس میں غور کرو جس کو کتاب 'الکلیلة و الدمنه' کے مترجم نے جس کا اس نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے مذاہب کے خلط ملط ہونے کے متعلق ذکر کیا۔

مترجم نے قصد کیا تھا کہ درست اور صحیح بات ثابت ہو جائے لیکن سوائے قدر قلیل کے وہ اس کو نہ کر سکا، اسی طرح مورخین کے اس بیان میں غور کرو جو زمانۂ جاہلیت کے حالات اور ان کے مذاہب کی ابتری سے متعلق ہے، اس امام کو جو تمام فرقوں کو ایک مذہب پر جمع کرنا چاہتا ہے علاوہ ان اصول امامت کے جو پیشتر مذکور ہو چکے ہیں اور اصول کی بھی ضرورت پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں کو راہِ راست کی طرف بلائے ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور ان کی حالت کو درست کرے، پھر ان کو بہ منزلہ اپنے اعضا کے بنائے تا کہ ان کے ذریعہ تمام عالم میں جہاد کرے

اوران کو دنیا میں پھیلادے۔ چنانچہ خدا کے اس قول میں یہی مراد ہے ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی تکمیل کے لئے پیدا کئے گئے ہو''۔ اور یہ اس لئے ہے کہ یہ امام خود تنہا بے شمار قوموں سے جہاد نہیں کرسکتا اور جب یہ بات ہے تو ضروری ہے کہ اس کی شریعت کا مادہ تمام معتدل اقالیم کے باشندوں کے لئے اور تمام عرب و عجم کے لئے بہ منزلہ طبعی مذہب کے ہو اس کے بعد وہ مادہ شریعت اس کی قوم کے علم وارتفاقات کے موافق ہو اور اس میں بہ نسبت دوسروں کے اس کی قوم کی حالت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہو، پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کا حکم دیا جائے کیونکہ یہ نہیں کہ ہر ہر قوم کی حالت کو اسی کے سپرد کردیا جائے یا ہر زمانہ کے اماموں پر اس کو چھوڑ دیں اس لئے کہ اس سے شریعت مقررہ بے سود ہو جاتی ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ہر ہر قوم کے حالات و عادات دیکھ کر ہر ایک کے لئے جداگانہ شریعت مقرر کی جائے اس لئے کہ ان کی عادات اور ان کے حالات کا احاطہ کرنا باوجود ان کے شہر اور مذاہب کے اختلافات کے محال کے درجہ میں ہے۔

حالانکہ تمام نقل کرنے والوں نے صرف ایک شریعت کے نقل کرنے میں عاجز آ گئے ہیں تو مختلف شرائع کی نسبت تم کیا خیال کرسکتے ہو، اور نیز اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت دراز کے بعد دوسرے لوگ شریعت کے مطیع ہوتے ہیں جس کے لئے نبی کی عمر وفا نہیں کرتی اس وقت کی موجودہ شریعتوں میں ایسا ہی ہوا ہے، یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے متقدمین میں سے ایک مختصر سی جماعت ہی ایمان لائی تھی پھر اس کے بعد ان کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا تو اس سے زیادہ عمدہ اور آسان طریقہ نہیں ہے کہ شرائع، حدود اور تدابیر میں اسی قوم کی عادت واعتبار کیا جائے جس کی طرف رسول مبعوث ہوا ہے۔ اور یہ کہ ان کے بعد دوسرے آنے والوں پر یہ کہ ان کے بعد دوسرے آنے والوں پر یہ امور بالکل تنگی کا باعث نہ ہوں گو کسی قدر ان پر تنگی رہے۔

متقدمین کے لئے تو اس شریعت کو قبول کرنا اپنی دلی شہادت اور اپنی عادات کی وجہ سے آسان ہو جاتا ہے اور متاخرین کے لئے اس شریعت کا اختیار کرنا اس مذہب کے ائمہ اور خلفا کی سیرتوں میں رغبت رکھنے کی وجہ سے سہل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ امر ہر قوم کے لئے ہر زمانہ میں خواہ قدیم ہو یا جدید بہ منزلہ امر طبعی کے ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تمام ممالک جو مزاج معتدل کی تولید کی صلاحیت

رکھتے ہیں دو بڑے بادشاہوں کے ماتحت تھے، ایک ان میں سے کسریٰ جو ملک عراق، یمن، خراسان اوران کے متصل ملکوں کا بادشاہ تھا اور ماوراءالنہر اور ہند کے بادشاہ اس کے محکوم تھے، ہر سال وہ کسریٰ کوخراج بھیجتے تھے اور دوسرا قیصر جوشام، روم اوران کے قرب وجوار کے ملکوں پر مسلط تھا، مصر، مغرب اورافریقہ کے بادشاہ اس کے زیر فرمان اور باج گزار(۱) تھے، اسی وجہ سے ان دونوں شہنشاہوں کی طاقت کومتزلزل کردینا اوران کے ممالک پر قبضہ کرلینا گویا تمام روئے زمین پر قبضہ کرلینا تھا، ان سلاطین کے عادات واطوار پر جوآسائش سے متعلق تھے تمام ان کے ماتحت ملکوں میں پھیل گئے تھے پس ان عادات کوتبدیل کردینا تھا اور ایسی حرکات سے ان کو باز رکھنا گویا تمام ملکوں کی عادات پر تنبیہ کردینا تھا اگر چہ بعد میں ان کے امور مختلف ہو گئے۔ اور حضرت عمرؓ نے جب عجم کی لڑائیوں میں ہرمزان سے مشورہ لیا تھا تو کسی قدر اس حالت کا اس نے ذکر کیا تھا۔ ان کے علاوہ اطراف دنیا جواعتدال مزاجی سے دور تھے، مصلحت کلی میں قابل اعتبار نہ تھے اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تک ترک تم سے کنارہ کریں تم بھی ان سے تعرض نہ کرو اور اہل حبش جب تک تم سے نہ لڑیں تم ان سے نہ لڑو''۔

حاصل یہ ہے کہ جب خداوند تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ مذہب کی کجی کو دور کردے اور لوگوں کے لئے ایسا گروہ پیدا کردے جولوگوں کو نیک امور بتلائے اور برائیوں سے روکے اور لوگوں کی خراب رسموں کو بدل ڈالے تو ایسا انتظام دونوں دولتوں کے زوال پر موقوف تھا اوران دونوں سلطنتوں کے حال پر تعرض کرنے سے بہ سہولت حاصل ہوسکتا تھا، کیونکہ انہی کی حالتیں تمام عمدہ ملکوں میں سرایت کرگئی تھیں یا سرایت کرنے کے قریب تھیں اس واسطے خدا تعالیٰ نے ان دونوں سلطنتوں کا زوال مقدر کردیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ کسریٰ ہلاک ہوگیا اب کوئی کسریٰ اس کے بعد نہ ہوگا اور قیصر ہلاک ہوگیا اب کوئی قیصر اس کے بعد نہ ہوگا اوراس حق کو نازل کیا جوتمام دنیا کی بیہودگی کو دور کرے اس طور سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ذریعہ عرب کی اصلاح کی گئی، اور عرب کے ذریعہ ان دونوں سلطنتوں کی بیہودگی رفع کی جائے اور پھران دونوں کے ذریعہ سے

(۱) اس وقت کی یوروپ کی سلطنتیں جیسے فرانس، انگلینڈ، جرمنی، اٹلی وغیرہ بہت چھوٹی چھوٹی سلطنتیں تھیں اور اکثر قیصر کے ماتحت رہا کرتی تھیں۔

تمام عالم کو دروغ اور ناراسی سے پاک صاف کر دیا جائے۔ اور امام کے لئے جن اصول کی ضرورت پڑتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ خلافت عامہ کا بھی انتظام کرتا رہے اور اپنے بعد خلفا اپنے ہی اہل شہر اور قوم میں سے مقرر کرے جن کا نشو و نما انہیں عادات اور طریقوں پر ہوا ہے کیونکہ آنکھیں سیاہ کرنا سرمہ لگانے کے مانند (۱) نہیں، اور لوگوں میں خاندانی حمیت اور غیرت کے ساتھ مذہبی حمیت بھی ہوتی ہے اور ان کی شان اور رتبہ کی بلندی صاحب مذہب کی شان اور اس کے مرتبہ کی بلندی سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''امام خاندن قریش سے ہونے چاہئیں'' امام ہمیشہ خلفا کو دین کے قائم کرنے اور شائع کرنے کی ہدایت کرتا رہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے۔ تمہارا دین پر باقی رہنا اس وقت تک ہے جب تک تمہارے ائمہ تمہارے ساتھ ٹھیک پیش آتے رہیں۔

اور ان اصولوں میں سے یہ بھی ہے کہ امام اپنے مذہب کو سب مذاہب پر غالب کرے اور کسی شخص کو ایسا نہ چھوڑے جس پر دین غالب نہ ہو جائے خواہ اس میں کسی کی عزت ہو یا ذلت، پس لوگ تین درجہ کے ہو جائیں گے ایک وہ جو ظاہراً و باطناً دین کے فرمان بردار ہوں گے، دوسرے وہ جو مجبوراً ظاہر میں اس کی اطاعت کریں گے اور اس کی مخالفت نہ کر سکیں گے، تیسرے کفار ذلیل، جن کو کھیتی کاٹنے اناج نکالنے اور تمام کاموں میں امام اسی طرح مسخر اور ذلیل بنا کر رکھے گا جیسے چار پائے، کھیتی اور بوجھ لادنے کے کام میں آتے ہیں، اور ایسے لوگوں پر ذلت کی کوئی بات ضرور مقرر کی جائے گی اور ان سے بہ حالت ذلت جزیہ وصول کیا جائے گا۔

دوسرے مذاہب پر ایک دین کے غالب آ جانے کے چند اسباب ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام مذاہب کے شعاروں پر اپنے مذہب کے شعار کا اعلان کرے، اور مذہبی شعار ایک امر ظاہری ہوتا ہے جو اس مذہب کے ساتھ خاص ہوتا ہے اسی کی وجہ سے یہ مذہب والا دوسرے مذاہب سے ممتاز ہوتا ہے مثلاً ختنہ، مسجدوں کی تعظیم، اذان، جمعہ اور جماعات اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ صاحب مذہب اور لوگوں کو تمام ادیان کے شعائر عمل میں لانے سے روک دے اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ قصاص، میں دیتوں میں، نکاحوں میں،

---

(۱) یعنی اصل اور نقل میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔

ریاستوں کے انتظام میں کافروں کو مسلمانوں کے ہمسر نہ کرے تاکہ یہ امور ان کو ایمان پر مجبور کریں۔

اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو نیکی اور بدی کے اعمال ظاہری کی تکلیف دے اور لوگوں پر ان اعمال کی سخت پابندی کرا دے۔ اور ان کی ارواح کی طرف زیادہ اشارہ نہ کرے اور شریعت کی کسی بات میں ان کو خود مختار نہ کرے، شرائع کے علم اسرار کو جو تفصیلی احکام کا مأخذ ہے عام لوگوں سے مخفی رکھے جس کا پتہ راسخ العلم ہی لگا سکے اس واسطے کہ اکثر مکلفین نہ تو ان مصالح کو معلوم کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی معرفت کی استطاعت ان کو حاصل ہو سکتی ہے جب تک کہ ان مصالح کے قواعد منضبط نہ کر دیئے جائیں اور وہ بہ منزلہ محسوسات کے ہو جائیں کہ ہر حاصل کرنے والا ان کو حاصل کر سکے پس اگر کسی امر کے چھوڑنے کی ان کو اجازت دے دی جائے یا ان کو یہ بتلا دیا جائے کہ مقصود اصلی ان ظاہری اعمال کے سوا کوئی اور امر ہے تو ان کے واسطے غور کرنے کے مواقع وسیع ہو جائیں گے اور وہ نہایت سخت اختلاف میں مبتلا ہو جائیں گے اور لوگوں کے متعلق خدا تعالیٰ کا جو مقصود ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ واللہ اعلم۔

من جملہ ان اسباب کے یہ ہے کہ تلوار کے ذریعہ محض غلبہ پانے سے لوگوں کے دلوں کے شبہات دور نہیں ہو سکتے پس احتمال رہتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد پھر وہ کفر کی طرف رجوع کر جائیں۔ اس واسطے امام کے لئے ضروری ہے کہ یقینی اور قطعی دلائل کے ذریعہ یا خطابی امور کے ذریعہ جو عام لوگوں کے اذہان میں مفید ہوں یہ ثابت کر دے کہ اور مذاہب اتباع کے قابل نہیں ہیں اس لئے کہ وہ کسی معصوم شخص سے منقول نہیں ہیں یا وہ قواعد ملت کے مطابق نہیں ہیں یا ان میں تحریف اور تبدیلی واقع ہو گئی ہے، اور بعض امور بے موقع ہیں اور سب لوگوں کے سامنے دین اسلام کی صحت اور اس کے مرجحات کو صاف صاف بیان کر دے کہ یہ دین آسان اور صاف ہے اور اس کے احکام واضح ہیں جن کی خوبیاں عقل معلوم کر سکتی ہے اور اس کی رات بہ منزلہ دن کے ہے (۱)، اور اس کے طریقے عام لوگوں کو زیادہ نافع ہیں اور انبیاء سابقین کی سیرت میں سے جو امور لوگوں میں باقی ہیں ان کے ساتھ یہ دین زیادہ مشابہ ہے اور اسی جیسی تفاصیل امام کو واضح کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

---

(۱) یعنی دین اسلام میں مشتبہ امر بھی بالکل واضح ہے۔

اٹھارھواں باب: دین کو تحریف سے محفوظ اور مضبوط کرنے کا بیان

اس شخص کے لئے جو نہایت بڑے انتظام کا مالک ہے خدا کی طرف سے ایسے دین کو لاتا ہے جو تمام مذاہب کا ناسخ ہے، یہ امر ضروری ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اس طرح پختہ کرے کہ کسی قسم کی تحریف کا اس تک گزر نہ ہو سکے اور یہ اس لئے کہ یہ شخص متفرق جماعتوں کو شامل کرتا ہے جن کی استعدادیں اور اغراض مختلف ہوا کرتی ہیں، پس بسا اوقات ان کی ہوائے نفسانی یا اس مذہب کی الفت جس میں وہ پہلے رہ چکے ہیں، یا قصور فہم کہ کسی شئے کو وہ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی اکثر مصلحتیں ان کو معلوم نہیں ہوتیں یہ امور ان کو آمادہ کرتے ہیں کہ مذہب کے منصوص مسائل میں فروگزاشت کریں، یا جو چیزیں اس مذہب میں شامل نہیں ہیں ان کو مندرج کر دیں اس لئے اس مذہب میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جیسا کہ گزشتہ مذاہب میں ایسا ہی ہوا ہے اور جبکہ خرابیوں کے تمام طریقوں کا ضبط کرنا ناممکن تھا کیونکہ وہ حصر میں نہیں آ سکتے اور نہ ہی ان کی تعیین ہو سکتی ہے اور یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جو بتامہ حاصل نہ ہو وہ بالکل چھوڑا بھی نہ جائے تو یہ ضروری ہے کہ اجمالی طور پر تحریف کے اسباب سے ان کو خوب متنبہ کر دے اور ان مسائل کو متعین کر دے جن میں ظن اور تخمین سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں سستی اور تحریف کرنا بنی آدم میں ایک استمراری بیماری ہے، پس ان میں فساد کے راستے کو نہایت اہتمام سے بند کر دے اور ایک ایسی شئے کو مشروع قرار دے جو تمام مذاہب فاسدہ کے مالوف کے خلاف ہو ایسے امر میں جو لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور ہو جیسا کہ مثلاً نمازیں ہیں۔ من جملہ باب تحریف کے ایک سستی ہے اور اس سستی کی حقیقت یہ ہے کہ حواریوں کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو جاتے ہیں جو نمازوں کو تباہ کرتے ہیں اور اپنی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں، درس و تدریس اور عمل کے ذریعہ اشاعت دین میں کچھ بھی سعی نہیں کرتے نہ وہ لوگوں کو نیکی کی تعلیم کرتے ہیں اور نہ برائی سے ان کو روکتے ہیں اسی واسطے بہت جلد مذہب کے خلاف رسمیں قائم ہو جاتی ہیں اور لوگوں کی طبیعتیں ان امور کی طرف ہو جاتی ہیں جو شرائع کے خلاف ہوتے ہیں، ان کے بعد اور ناخلف پیدا ہوتے ہیں جو سستی میں ان سے بھی بڑھ کر ہوتے ہیں یہاں تک کہ علم مذہب کا بڑا حصہ بھلا دیا جاتا ہے، بزرگان قوم اور روساکی سستی لوگوں کے حق میں زیادہ ضرر رساں اور باعث فساد ہوتی ہے اسی سبب سے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما

السلام کا مذہب نیست و نابود ہو گیا اور اب لوگوں میں سے کوئی بھی ان مذاہب کی اصل حالت کو جاننے والا نہ رہا، اور سستی کے اسباب کے چند امور ہیں۔

از آں جملہ صاحب مذہب سے مذہبی امور کا نقل نہ کرنا اور ان پر عمل نہ کرنا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں یہی مراد ہے "ہوشیار رہو جاؤ عنقریب ایسا ہوگا کہ پیٹ بھرا آدمی اپنی مسند پر بیٹھ کر یہ کہے گا۔ اس قرآن کو مضبوطی سے لو پس جو چیزیں تم قرآن میں حلال پاؤ ان کو حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ، ان کو حرام سمجھو، حالانکہ جو شئے رسول اللہ نے حرام کی ہے وہ ویسی ہی حرام جیسی خدا تعالیٰ نے حرام کی ہے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "خدا تعالیٰ علم کو لوگوں کے دلوں سے بھلا کر دور نہ کرے گا بلکہ علما کو ختم کر کے علم کو چھین لے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم ہی باقی نہ رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، لوگ ان سے مسائل دریافت کریں گے وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اس لئے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے"۔

اور سستی کے اسباب میں سے ایک سبب اغراض فاسدہ ہیں جن کی خاطر لوگ جھوٹی تاویلیں کرتے ہیں جیسے بادشاہوں کی خوشنودی کی خاطر ان کی خواہش نفسانی پورا کرنے کے لئے لوگ ایسا کرتے ہیں، خدا تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ کتاب الٰہی کے احکام کو جو منزل من اللہ ہیں چھپاتے ہیں اور ان کے عوض کچھ قیمت لے لیتے ہیں وہ اپنے شکموں میں آگ کو کھاتے ہیں"۔ اور ان اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ لوگوں میں برائیاں پھیل جاتی ہیں اور علما ان سے لوگوں کو باز نہیں رکھتے اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے "پس تم سے پہلی نسلوں میں سے اہل فضل زمین میں فساد پیدا کرنے سے منع کرنے والے کیوں نہ ہوئے سوائے ان چند لوگوں کے جن کو ان میں سے ہم نے بچالیا اور ظالم اسی چیز کے پیچھے پڑے جس میں ان کو فارغ البالی دی گئی تھی اور وہ مجرم بن گئے"۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہو گئے تو ان کے علما نے ان کو روکا لیکن وہ باز نہ آئے پس علما بھی ان کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے تو خدا نے سب کے دل یکساں کر دیئے اور حضرت داؤد و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی، یہ لعنت ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ہوئی اور تحریف کے اسباب میں سے ایک سبب تعمق ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ شارع

کسی شئے کا حکم کرتا ہے اور کسی چیز سے ممانعت کرتا ہے پس اس کی امت کا کوئی شخص اس کو سنتا ہے اور اپنے ذہن کے موافق اس کو سمجھتا ہے پس وہ اس حکم کو ان امور میں تجویز کرتا ہے جو کسی وجہ سے اصل شئے کے مشابہ ہوتے ہیں یا ان میں اس حکم شرعی کی علت کے بعض اجزا پائے جاتے ہیں۔ یا شارع کے حکم کو اس شئے کے اجزا میں یا اس کے محتمل مواقع یا اس کے اسباب میں بھی تجویز کرتا ہے اور روایتوں کے تعارض کی وجہ سے جب اس کو کسی امر میں شبہ ہو جاتا ہے تو وہ نہایت اشد کام کی پابندی کرتا ہے اور اس کو واجب قرار دیتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال کو عبادت پر محمول کرتا ہے حالانکہ حق بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے کام حسب عادت بھی کئے ہیں۔

پس اس کا یہی خیال رہتا ہے کہ امر اور نہی ان امور عادیہ کو بھی شامل ہیں اور وہ بآواز بلند یہ کہنے لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے اور اس شئے سے منع کیا ہے۔ مثلاً شارع نے جب نفس کو مغلوب کرنے کے لئے روزہ کو مقرر کیا اور روزہ کی حالت میں جماع سے روکا تو بعض لوگوں نے سحر کا کھانا خلاف مشروع اور ناجائز سمجھ لیا اس لئے کہ وہ نفس کی مغلوبیت کے خلاف ہے اور روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینا بھی حرام سمجھ لیا اس لئے کہ بوسہ لینا ہم بستری کے اسباب میں سے ہے اور اس لئے کہ نفس کی شہوت پورا کرنے میں بوسہ لینا ہم بستری کے مشابہ ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قول کی خرابی بیان فرما دی اور واضح کر دیا کہ یہ دین میں تحریف ہے۔

اور تحریف کے اسباب میں سے ایک تشدد ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جن شاق امور کا شارع نے حکم نہیں دیا ہے ان کی پابندی کی جائے مثلاً ہمیشہ روزہ رکھنا تمام رات نماز پڑھنا دنیا سے آزاد رہنا اور شادی نہ کرنا اور واجبات دین کی مانند مستحبات اور سنن کی پابندی کرنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت عثمان بن مظعون کو جبکہ انھوں نے نہایت سخت سخت عبادات کی پابندی کا قصد کیا تھا منع کرتے ہوئے فرمایا جس نے مذہبی امور میں زیادہ تعمق کیا ہے دین اس پر غالب آ گیا ہے اور جب ایسا سخت اور پابند آدمی کسی فرقہ کا معلم اور رئیس ہو جاتا ہے تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ شرع کا حکم اور شارع کی مرضی سے ہے۔ یہود و نصاریٰ کے راہبوں میں یہی بیماری تھی۔ تحریف کے اسباب میں سے استحسان بھی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی

شخص شارع کو ہر حکم کے لئے مناسب موقع تجویز کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور امور شرعی کو منضبط کرتے ہوئے پاتا ہے تو امور شرعی کے بعض بعض اسرار جن کو ہم ذکر کر چکے ہیں معلوم کر لیتا ہے اور اپنے نزدیک مصلحت سمجھ کر لوگوں کے لئے احکام جاری کرتا ہے جیسا کہ یہود نے جب دیکھا کہ شارع نے حدود کا اس لئے حکم دیا ہے کہ لوگ گناہوں سے باز رہیں اور ان کی اصلاح ہو جائے اور پھر خیال کیا کہ رجم سے اختلاف اور جنگ وجدال پیدا ہوتا ہے اور اس میں اور زیادہ فساد کا اندیشہ ہے تو انھوں نے زانی کا منہ سیاہ کرنا اور تازیانے مارنا اختیار کر لیا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ یہ مذہب میں تحریف ہے اور توریت کے حکم منصوص کے بالکل مخالف ہے حضرت ابن سیرینؒ سے منقول ہے کہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا ہے اور سورج اور چاند کی عبادت قیاس کی وجہ سے ہوئی ہے اور حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی خلقتنی من نار و خلقته من طین مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا تھا اور آدم کو شئے سے اور فرمایا کہ ابلیس نے یہ قیاس کیا تھا اور سب سے پہلے ابلیس نے ہی قیاس کیا تھا۔ اور امام شعبی فرماتے ہیں کہ واللہ اگر تم قیاسوں پر عمل درآمد کرو گے تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر لو گے اور حضرت معاذ بن جبل سے منقول ہے کہ قرآن لوگوں پر کشادہ ہو جائے گا یہاں تک کہ عورت، بچہ اور آدمی سب اس کو پڑھا کریں گے پس ایک شخص کہے گا کہ میں قرآن پڑھا لیکن لوگ میرے مطیع نہ ہوئے، واللہ میں اس پر خوب عمل کروں گا تاکہ لوگ میرے تابع ہو جائیں پس وہ ان میں رہ کر عمل کرے گا لیکن لوگ اس کے تابع نہ ہوں گے، پس وہ کہے گا میں نے قرآن پڑھا اور لوگ میرے تابع نہ ہوئے میں نے ان میں رہ کر عمل کیا پھر بھی وہ میرے تابع نہ ہوئے اب میں اپنے گھر میں ایک مسجد بناؤں گا تاکہ لوگ تابع ہوں پس وہ مسجد بنا کر بیٹھے گا تب بھی لوگ اس کی پیروی نہ کریں گے پھر وہ کہے گا میں نے قرآن پڑھا لیکن لوگ میرے تابع نہ ہوئے اس پر میں نے عمل کیا تب بھی کسی نے پیروی نہ کی، میں مسجد بنا کے بیٹھا تب بھی کوئی تابع نہ ہو، واللہ اب میں ان کو ایسی حدیث بنا کر سناؤں گا جو نہ قرآن میں ہوگی اور نہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی، اس سے شاید کوئی میرا مطیع ہو جائے، اس کے بعد حضرت معاذ نے فرمایا اے لوگو! تم ایسی باتوں سے بچنا جن کو یہ شخص بیان کرے، یہ چیزیں جن کو وہ بیان کرے گا سرتاپا گمراہی ہوں گی، حضرت عمرؓ سے روایت

ہے کہ عالم کی لغزش، منافق کا کتاب الٰہی کے ساتھ جھگڑنا، گمراہ اماموں کا حکم اسلام کو منہدم کر دیتا ہے، اور سب امور سے وہی مراد ہیں جو کتاب الٰہی اور سنت رسول اللہ سے مستنبط نہ ہوں۔

اور اسباب تحریف میں سے اجماع کی پیروی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ حاملین دین کا ایک فرقہ جن کی نسبت عام لوگوں کا یہ گمان ہو کہ ان کی رائے اکثر یا ہمیشہ درست ہوتی ہے کسی امر پر اتفاق کر لے اور اس اتفاق سے یہ خیال کیا جائے کہ ثبوت حکم کے لئے یہ اتفاق قطعی دلیل ہے اور یہ اجماع ایسے امر میں ہے جس کی قرآن وحدیث میں کچھ اصل نہیں ہے، یہ اجماع اس اجمال کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے کیونکہ سب کے سب لوگ ایسے اجماع پر متفق ہیں جس کی سند قرآن وحدیث میں ہو یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو اور لوگوں نے ایسے اجماع کو جائز قرار نہیں دیا جس کی سند قرآن وحدیث میں کوئی بھی نہیں، چنانچہ اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اور جب کفار سے کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں پر ایمان لے آؤ جو خدا تعالیٰ نے نازل کی ہیں تو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ ہم تو ان ہی باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے" الآیۃ۔ اور یہودیوں کی دلیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کی نبوت کے انکار کرنے میں یہی تھی کہ ان کے بزرگوں نے حضرت عیسیٰ اور محمدؐ کے حالات کی چھان بین کی لیکن انبیا کے شرائط ان میں نہیں پائے عیسائیوں کے بہت سے احکام توریت وانجیل کے بالکل خلاف ہیں۔ ان کے بزرگوں کا صرف اجماع ہی ان کی دلیل ہے اور اسباب تحریف میں سے غیر معصوم کی تقلید ہے، یعنی نبی جس کی عصمت ثابت ہے اس کے علاوہ کسی اور کی تقلید کی جائے اس تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ علماء امت میں سے کوئی شخص کسی مسئلہ اجتہاد کرے اور کسی عالم کے پیرو یہ خیال کریں کہ یہ اجتہاد بالکل صحیح ہے اور اس کے مقابلہ میں حدیث صحیح کو بھی رد کر دیں، اس قسم کی تقلید اس تقلید کے مخالف ہے جس پر امت مرحومہ نے اتفاق کیا ہے اس لئے کہ سب کا اتفاق ہے کہ مجتہدین کی تقلید جائز ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی جاننا چاہئے کہ مجتہد سے خطا اور صواب دونوں سرزد ہوتے ہیں اور ہر مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصوص حکم پر نظر رکھنی چاہئے اور یہ عزم ہونا چاہئے کہ جب امر تقلیدی کے خلاف کوئی حدیث صحیح ظاہر ہو جائے تو تقلید کو ترک کر دیا جائے گا اور حدیث کا اتباع کیا جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں

(یہودیوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو بجز خدا کے اپنا رب قرار دیا) فرمایا کہ یہودی ان علما اور راہبوں کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے علما جس کو حلال کہتے وہ اس کو حلال سمجھتے اور جس کو حرام کہہ دیتے اس کو حرام جانتے تھے۔

اسباب تحریف میں سے ایک مذہب کو دوسرے میں خلط ملط کر دینا بھی ہے یہاں تک کہ ایک دوسرے میں تمیز باقی نہ رہے اور یہ اختلاط اس طرح ہوتا ہے کہ جب انسان کسی مذہب کا پابند ہوتا ہے تو اس کا دلی تعلق اس مذہب کے علوم سے ہوتا ہے پھر یہ شخص مذہب اسلام میں داخل ہو جاتا ہے لیکن اس کا قلبی میلان انہی امور کی جانب باقی رہتا ہے جن کے ساتھ اس کا پہلا تعلق تھا اس واسطے ان امور کے جواز کے لئے ملت اسلام میں کوئی وجہ تلاش کرتا ہے خواہ ضعیف یا موضوع ہی کیوں نہ ہو، اور بسا اوقات اس وجہ کی خاطر جھوٹی حدیث بناتا ہے اور روایت کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ "بنی اسرائیل کا معاملہ درست رہا حتی کہ ان میں مخلوط النسل لوگ اور قیدیوں کی اولاد پیدا ہوئی تب انھوں نے رائے سے کہنا شروع کیا وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اور من جملہ ان چیزوں کے جو ہمارے دین میں داخل ہوگئی ہیں بنی اسرائیل کے علوم اور زمانہ جاہلیت کے خطبا کے وعظ و پند ہیں، یونانیوں کا فلسفہ اور اہل بابل کے وظائف ہیں، اہل فارس کی تاریخ، علوم نجوم ورمل اور علم کلام ہے اور جناب رسول اللہ کے ناراض ہونے کا سبب یہی تھا جس وقت آپ کے سامنے توریت کا ایک نسخہ پڑھا گیا اور یہی راز تھا حضرت عمرؓ کے مارنے میں اس شخص کو جو حضرت دانیال کی کتابیں تلاش کرتا تھا، واللہ اعلم۔

انیسواں باب: ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب اور یہود ونصاریٰ کے مذہب کے مختلف ہونے کے اسباب کا بیان

واضح ہو کہ جب خدا تعالیٰ کسی قوم میں رسول بھیجتا ہے تو پیغمبر اپنی زبان میں لوگوں کے لئے اس مذہب کو قائم کرتا ہے پس وہ نبی اس میں کسی قسم کی کمی باقی نہیں رکھتا پھر مذہبی روایتیں اس سے منتقل ہوتی ہیں اور اس پیغمبر کے حواری ایک مدت تک مناسب حالت میں ان روایتوں کے حامل ہوتے ہیں پھر ان حواریوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوتے ہیں جو دین میں تحریف اور

سستی کرتے ہیں اس لئے وہ دین حق خالص نہیں رہتا بلکہ اس میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے" خدا تعالیٰ نے جب کبھی کوئی نبی بھیجا ہے تو اس کی امت میں سے حواری اور ایسے لوگ پیدا کئے ہیں جو اس کے طریقے کی پیروی اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہیں، پھر ان حواریوں کے بعد ایسے ناخواندہ اور ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں اور احکام الٰہی کے خلاف اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں" یہ باطل امور جن کی نذر میں آمیزش ہو جاتی ہے ان میں سے ایک حصہ تو شرک جلی اور صریح تحریف کا ہے جو ہر حالت میں مواخذہ کے قابل ہے۔ اور ایک حصہ شرک خفی اور مخفی تحریف کا ہے جس پر خدا تعالیٰ اس وقت مواخذہ کرتا ہے کہ رسول کو بھیج چکا ہوتا ہے تاکہ وہ رسول ہر شئے کی دلیل قوی ان کے سامنے پیش کر دے اور ہر قسم کا شبہ دور کر دے، اب جو کوئی زندگی چاہے یا ہلاکت اختیار کرے تو دیدہ و دانستہ کرے جب کوئی پیغمبر لوگوں میں مبعوث ہوتا ہے تو ہر شئے کو اس کی اصل حالت کی طرف پھیر لاتا ہے وہ پہلی شریعت کے احکام میں غور و نظر کرتا ہے پس ان میں جو امور شعائر اللہ ہوتے ہیں جن میں شرک کی آمیزش نہیں ہوتی یا عبادات کے طریقے یا انتظامی امور کے طریقے جو مذہبی قوانین کے مطابق ہوتے ہیں ان سب کو وہ باقی رکھتا ہے اور جو نابود ہو جاتے ہیں ان کا مہتم بالشان ہونا بتاتا ہے اور ہر شئے کے ارکان و اسباب بیان کرتا ہے اور جو تحریف اور سستی کے امور ہوتے ہیں ان کو دور کرتا ہے اور بتلا دیتا ہے کہ یہ باتیں مذہب میں سے نہیں ہیں اور جو احکام اس زمانہ کی مصلحتوں پر مبنی تھے پھر اختلاف عادات کی وجہ سے وہ مواقع مصلحت بدل گئے تو ان احکام کو نبی بدل دیتا ہے کیونکہ احکام کے مشروع کرنے سے مقصود اصلی مصلحتیں ہی ہیں اور مظان کو ان کے عنوان کے طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شئے کسی مصلحت کا مظنہ ہوتی ہے اور بعد میں اس مصلحت کا مظنہ نہیں رہتی، مثلاً اصل میں بخار کا سبب خلطوں کی ہیجان ہے پس طبیعت اس ہیجان کا ایک مظنہ مقرر کرتا ہے جس کی طرف وہ بخار کی نسبت کرتا ہے جیسا کہ دھوپ میں چلنا اور سخت حرکت کرنا اور کسی خاص غذا کا کھالینا ہیجان کا مظنہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ یہ چیزیں ہیجان کا مظنہ نہ رہیں پس اسی کے لحاظ سے احکام بھی بدل جاتے ہیں اور جو امور ایسے ہیں جن پر ملاء اعلیٰ کا اتفاق اور اجماع ہو گیا ہے جو ان کے اعمال، عادات، علوم اور نفسانی حالت میں

داخل ہیں تو ان امور کو نئی اور زیادہ کر دیتا ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کے انبیا چند باتیں زیادہ ہی کر دیا کرتے تھے کچھ کم نہیں کرتے تھے اور بہت ہی کم تبدیلی کرتے تھے پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت نوح علیہ السلام کے مذہب پر چند عبادتیں، اعمال فطری اور ختنہ کو بڑھا دیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب پر چند امور اور زیادہ کر دیئے جیسے اونٹ کے گوشت کو حرام کر دیا اور ہفتہ کے دن کو ضروری قرار دیا اور زانیوں کے لئے سنگسار کرنا قرار دیا اور اسی طرح کے اور امور تھے، اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادتی بھی کی، کمی بھی کی ہے اور تبدیلی بھی کی ہے، دقائق شریعت میں خوض کرنے والا جب اس زیادتی، کمی اور تبدیلی کی چھان بین کرے گا تو ان کی چند وجوہات پائے گا۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہودی مذہب احبار اور راہبوں کے ہاتھ میں رہا پھر انھوں نے ان طریقوں کے ذریعہ تحریفات کیں جن کا پیشتر ذکر ہو چکا ہے، پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو آپ نے ہر چیز کو اصلی حالت کے موافق کر دیا اس واسطے شریعت محمدیہ اس یہودیت سے مختلف ہو گئی جو یہود کے ہاتھ میں تھی پس اس لئے یہود کہنے لگے کہ اس شریعت میں زیادتی، کمی اور تبدیلی ہے حالانکہ حقیقت میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں ایک دوسری بعثت شامل تھی ایک بعثت تو یہ ہے کہ آپ بنی اسمٰعیل کی طرف مبعوث ہوئے چنانچہ خدا تعالیٰ کے اس قول میں یہی مراد ہے ''خدا ہی نے امیوں کے لئے ان میں ہی سے ایک شخص کو پیدا کیا''۔ اور خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے ''تا کہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے آباواجداد نہیں ڈرائے گئے تھے اسی لئے وہ غفلت میں ہیں''۔ اس بعثت کے لئے ضروری ہے کہ شریعت محمدیہ کا مادہ وہی شعائر ہوں، وہی عبادات کے طریقے ہوں اور وہی انتظامی امور ہوں جو بنی اسمٰعیل کے پاس موجود تھے اس لئے کہ شریعت لوگوں کے امور متعارف کی اصلاح کیا کرتی ہے نہ کہ ان کو ایسے امور کا مکلف کرتے جن کو وہ جانتے بھی نہ ہوں، اور اس کی نظیر یہ قول الٰہی ہے ''ہم نے قرآن عربی زبان میں نازل کیا ہے شاید تم اس کو سمجھو''۔ اور یہ قول الٰہی ہے۔ ''اگر ہم قرآن کو عجمی زبان میں نازل کرتے تو لوگ کہتے اس کی آیتیں جدا جدا مفصل کیوں نہ کی گئیں کیا یہ عجمی بھی ہے اور عربی بھی''۔ اور یہ قول الٰہی ہے

''ہم نے جو نبی بھیجا ہے اسی قوم کی زبان والا بھیجا ہے''۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بعثت یہ ہے کہ آپ تمام اہل زمین کے لئے پیغمبر ہیں اس بعثت میں وہ علوم اور تدابیر مندرج ہیں جو تمدن سے متعلق ہیں اور اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے آپ کے زمانہ میں تمام قوموں پر لعنت کی اور ان کی سلطنت کے زوال کو مقدر کیا جیسا کہ عجم اور روم کے ساتھ ہوا اور حکم کیا کہ انتظام دنیوی کے آئین کا قیام ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درجہ اور غلبہ کو امر مقصود کے اتمام کا ذریعہ قرار دیا اور ان سلاطین کے خزانوں کی کنجیاں آپ کو عطا کیں پس اس کمالیت کی وجہ سے احکام توریت کے علاوہ اور احکام بھی آپ کو حاصل ہوئے مثلاً خراج، جزیہ مجاہدات، اسباب تحریف سے احتیاط وغیرہ۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ایسے انقطاع وحی کے زمانہ میں پیدا ہوئے جس میں تمام مذاہب حقہ محو ہو گئے تھے اور ان میں تحریف ہو چکی تھی اور تعصب و اصرار نے لوگوں کو دبا لیا تھا پس وہ اپنے طریقہ باطل اور عادات جاہلیت کو ترک نہیں کر سکتے تھے تاوقتیکہ ان عادات کی سخت مخالفت نہ کی جاتی، پس یہ چیز بھی کثیر اختلافات کا باعث ہوئی۔

بیسواں باب: اسباب نسخ کا بیان

نسخ کے باب میں اصل خدا تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ''ہم کوئی آیت منسوخ نہیں کرتے نہ اس کو بھلاتے ہیں مگر اس کے بدلہ میں اس سے بھی بہتر یا ویسی ہی لاتے ہیں''۔

واضح ہو کہ نسخ کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انتظامات یا عبادات کے طریقوں پر غور و فکر کر کے ان کو شریعت کے قوانین کے موافق منضبط کرتے ہیں اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد ہے لیکن خدا تعالیٰ آپ کو اس اجتہاد پر قائم نہیں رکھتا بلکہ اس مسئلہ میں جو اصلی حکم ہے اس کو آپ پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اس حکم کا اظہار یا تو یوں کرتا ہے کہ اس کے موافق قرآن نازل فرماتا ہے یا اس طرح پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد ہی اس حکم کی طرف تبدیل ہو جاتا ہے اور دوسرا اجتہاد آپ کے ذہن میں قرار پا جاتا ہے، پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تھا پھر قرآن میں اس حکم کی منسوخیت نازل ہوئی اور دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے چھاگل کے ہر برتن میں نبیذ بنانے سے منع کر دیا تھا پھر ہر برتن میں نبیذ بنانا لوگوں کے لئے جائز

کر دیا اور فرمایا کہ ''نشہ کی کوئی چیز نہ پیو''۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نشہ پیدا ہونا ایک مخفی امر ہے اس لئے اس کے ظاہری سبب کو اس کے قائم مقام کر دیا اور وہ ظاہری سبب ایسے برتنوں میں نبیذ بنانا ہے جن میں مسامات نہیں ہیں جیسے وہ ظروف جو مٹی، لکڑی اور کدو سے بنتے ہیں اس لئے کہ ان برتنوں میں وہ چیز بہت جلد مسکر ہو جاتی ہے جن کی نبیذ بنائی جائے، اور چھاگل میں نبیذ بنانے کو آپ نے تین دن تک اس کے نشہ آور نہ ہونے کا سبب قرار دیا، پھر آپ نے اجتہاد میں تبدیلی ہوگئی اور حکم کا مدار سکر کو ٹھیرایا کیونکہ کسی چیز کا نشہ آور ہونا اس کے جوش کرنے اور جھاگ لانے سے معلوم ہو سکتا ہے اور اس چیز کو جو لوازم سکر ہے یا شئے مسکر کے صفات میں سے ہے سکر کا موقع اور مظنہ قرار دینا کسی امر کو اجنبی مظنہ سکر قرار دینے سے بہتر ہے اور اس اجتہاد کے بدل دینے کی ایک اور توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ لوگ نشہ آور چیزوں کی طرف بہت راغب ہیں اگر صرف نشہ آور شئے سے ہی منع کر دیا جائے تو اس کا احتمال تھا کہ کوئی شخص نشہ آور چیز کو پی لے اور یہ عذر کرنے لگے کہ اس کا خیال تھا کہ وہ مسکر نہیں ہے یا اس پر اس کے نشہ آور ہونے کی علامات مشتبہ ہوگئی تھیں یا برتنوں میں شراب لگی ہوئی تھی اور ایسے برتنوں میں نبیذ بنانے سے نشہ جلد پیدا ہو جاتا ہے، پس جب اسلام قوی ہو گیا اور نشہ آور چیزوں کے ترک پر وہ مطمئن ہو گئے اور وہ آلودہ برتن بھی نہ رہے تو آپ نے خاص نشہ آور ہونے کے حکم کا مدار ٹھیرایا اور اس توجیہ کے لحاظ سے یہ مثال اس امر کی ہو جاتی ہے کہ موقعوں کے بدلنے سے حکم بدل جایا کرتا ہے اور نسخ کی اسی قسم کے متعلق آپ نے فرمایا ہے ''میرا کلام کلام اللہ کو منسوخ نہیں کر سکتا اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے اور کلام اللہ کا بعض بعض کو منسوخ کرتا ہے''۔

دوسری قسم نسخ کی یہ ہے کہ ایک شئے میں کوئی مصلحت یا خرابی ہوتی ہے اسی کے موافق اس کا حکم متعین کر دیا جاتا ہے اس کے بعد ایک زمانہ آتا ہے جس میں اس شئے کی وہ حالت نہیں رہتی اس واسطے اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی اور مسلمانوں میں اور ان کے رشتہ داروں میں امداد کا طریقہ منقطع ہو گیا اور اس وقت میں ہمدردی کا ذریعہ صرف وہ بھائی چارہ ہی تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری مصلحت کی وجہ سے لوگوں میں قائم کر دیا تھا اس واسطے قرآن میں نازل ہوا کہ وراثت

کے حقوق اخوت سے متعلق کر دیئے جائیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کا فائدہ بھی بیان کر دیا ''اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں شورش اور بڑا فساد ہو جائے گا''۔ پھر جب اسلام کو قوت حاصل ہو گئی اور مہاجرین کے اقارب بھی مسلمان ہو کر ان سے آملے تو وہی طریقہ نسبی وراثت کا مقرر ہو گیا، یا ایسا ہوتا ہے کہ ایسی نبوت کے زمانہ میں جس کے ساتھ خلافت کا مرتبہ شامل نہیں ہوتا ایک شئے میں کوئی مصلحت اور خوبی نہیں ہوتی جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل یا آپ ہی کے عہد میں ہجرت سے قبل اور اس نبوت کے زمانہ میں جس کے ساتھ خلافت ضم ہو جاتی ہے اسی شئے میں مصلحت پیدا ہو جاتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم سے پیشتر کسی امت کے لئے مال غنیمت کو حلال نہیں کیا تھا لیکن ہمارے لئے اس کو حلال کر دیا، حدیث میں اس حلت کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ خدا تعالیٰ نے ہماری عاجزی اور کمزوری دیکھ کر مال غنیمت کو ہمارے لئے حلال کر دیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حلت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت دوسرے انبیا پر اور امت محمدیہ کی فضیلت دوسری امتوں پر ظاہر کرنا مقصود ہے۔

ان دونوں وجہوں کی تحقیق یہ ہے کہ آپ سے پہلے اور انبیا کی بعثت محض اپنی قوم کے لئے ہوئی تھی جن کی تعداد محدود ہوتی تھی، کبھی کبھی سال دو سال میں نوبت جہاد کی آیا کرتی تھی، نیز ان کی امتیں قوی تھیں وہ جہاد بھی کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ اسباب دنیوی زراعت وتجارت بھی کر سکتے تھے اس واسطے ان کو اموال غنیمت کی ضرورت نہ تھی پس خدا تعالیٰ نے بھی ارادہ فرمایا کہ ان کے عمل میں کوئی غرض دنیوی نہ ملے تاکہ ان کو ان کے عمل کا پورا پورا اجر ملے۔ اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام لوگوں کے لئے تھی جو اندازہ اور شمار میں نہیں آسکتے تھے اور زمانہ جہاد بھی غیر معین تھا اور آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی تھی کہ جہاد بھی کرے اور کاروبار معاش، زراعت وتجارت بھی کرے، اس واسطے ان کو مال غنیمت کے جائز ہونے کی ضرورت پڑی نیز آپ کی امت میں دعوت اسلام کے عام ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ بھی شامل ہوتے تھے جن کی نیت وارادے کمزور ہوتے تھے اور انہی کی نسبت وارد ہے کہ خدا تعالیٰ اس دین کی تائید مرد فاسق سے بھی کرا دیتا ہے، اس قسم کے ضعیف الاعتقاد لوگ بغیر فائدہ دنیوی کے جہاد نہیں کر سکتے۔ اور جہاد کے بارے میں خدا تعالیٰ کی رحمت سب کو شامل تھی اور خدا تعالیٰ کا غضب ان کے دشمنوں کی

طرف حد درجہ متوجہ تھا۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''خدا نے تمام لوگوں کو دیکھا اور عرب وعجم سب سے وہ ناخوش ہوا''۔

اسی ناخوشی کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ضروری قرار دیا کہ ان کے مالوں اور جانوں کی حفاظت بالکل منقطع ہو جائے اور ان کے اموال میں تصرف کر کے خوب ان کے دل جلائے جائیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کی اونٹنی کو جس کی ناک میں چاندی کی نکیل تھی حرم میں قربانی کے لئے بھیجا تھا تا کہ کفار کو صدمہ پہنچے، اور جیسا کہ آپؐ نے کفار کے نخلستان کے کاٹنے اور جلانے کا حکم دیا تھا تا کہ ان کو پیچ وتاب ہو پس اسی وجہ سے اس امت کے لئے قرآن میں غنائم کی اباحت نازل ہوئی۔

اسی قسم کی دوسری مثال یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس امت کے لئے کفار سے جنگ کرنا مناسب نہ تھا کیونکہ اس وقت نہ فوج تھی اور نہ خلافت، پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور مسلمان واپس آگئے اور خلافت ظاہر ہوگئی اور دشمنان خدا سے جنگ کرنے کی قوت حاصل ہوگئی تو خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت ہے جن کے ساتھ لڑائی کی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور بے شک خدا تعالیٰ ان کو مدد پہنچانے پر قادر ہے''۔ اسی قسم کے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ قول ہے ''ہم جو آیت منسوخ کرتے ہیں یا کوئی آیت بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور نازل کرتے ہیں''۔ پس خدا تعالیٰ کے قول 'بخیر منها' کا اطلاق ان امور پر ہے جن میں نبوت کے ساتھ خلافت بھی شامل ہے اور خدا تعالیٰ کے قول او مثلها کا اطلاق ان صورتوں میں ہے جن میں اختلاف مواقع کی وجہ سے حکم مختلف ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اکیسواں باب: اس حالت کا بیان جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں میں تھی پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح فرمائی

اگر تم شریعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقائق میں غور کرنا چاہو تو اولاً ان اَن پڑھ لوگوں کے حالات کی تحقیق کرو جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، وہی حالات آپ کی شریعت کا مادہ ہیں اس کے بعد ان حالات کے اصلاح کی اس کیفیت کو دریافت کرو جو ایسے

مقاصد کی وجہ سے ہے جو باب تشریع اور تیسیر اور احکام ملت میں مذکور ہیں۔

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملت حنفیہ اسماعیلیہ کی کجی کو درست کرنے کے لئے تھی، اس کی تحریف کو دور کرنے کے لئے تھی اور اس کی روشنی کو پھیلانے کے لئے تھی۔ اور خدا تعالیٰ کے اس قول میں یہی مراد ہے "اپنے باپ ابراہیم علیہ السلا کا مذہب اختیار کرو"۔

اور جبکہ حالت ایسی ہے تو ضرور ہے کہ ملت ابراہیم کے اصول قابل تسلیم اور اس کا طریقہ مقررہ ہو اس واسطے کہ نبی جب ایسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے جن میں عمدہ طریقے باقی ہیں تو ان طریقوں میں تغیر و تبدل بے معنی ہے بلکہ ان کو قائم رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان لوگوں کے نفوس ان کو اچھی طرح سے قبول کرتے ہیں اور ان سے ان پر خوب حجت ہوسکتی ہے۔

اور نبی اسمٰعیل اپنے باپ ابراہیمؑ کے طریقے پر برابر چلتے رہے اور وہ اسی شریعت پر ثابت قدم رہے یہاں تک کہ عمرو بن لحی پیدا ہوا اس شخص نے اپنی بیہودہ رائے سے ملت اسمٰعیل میں بہت سی چیزیں داخل کردیں پس خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اسی نے بت پرستی اولاً شروع کی، سانڈ چھوڑے اور بحیرہ مقرر کئے اس وقت سے دین بالکل خراب ہوگیا اور صحیح چیز غلط کے ساتھ مخلوط ہوگئی اور لوگوں پر جہالت، شرک اور کفر چھا گیا، تب خدا تعالیٰ نے ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی کج روی کی درستی کے لئے اور ان کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسمٰعیل کی شریعت میں غور کیا اور اس میں جو طریقہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مسلک کے موافق یا من جملہ شعائر الٰہی کے پایا اس کو باقی رکھا اور جس میں تحریف ہوگئی تھی یا اس میں خرابی پیدا ہوگئی تھی یا اس میں شرک و کفر کی علامات تھیں اس کو مٹا دیا اور اس کا بطلان مستحکم کردیا۔

اور جو امور عادات وغیرہ کی قسم سے تھے ان کی خوبیاں اور برائیاں اس طرح بیان کردیں کہ ان میں سے غالی رسموں سے احتراز کیا جاسکے، اور بری رسموں سے آپ نے منع فرمادیا اور عمدہ رسموں کا حکم فرمایا۔

اور جو مسائل اصلی یا عملی زمانۂ فترت میں متروک ہوگئے تھے ان کو شاداب و تر و تازہ ویسا ہی کردیا جیسا کہ وہ تھے اس طرح پر خدا کا انعام مکمل اور اس کا دین مستقیم ہوگیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے عہد میں اہل جاہلیت بعثت انبیا کو تسلیم کرتے تھے اور اعمال کی سزا و جزا کے قائل تھے، اقسام نیکی کے اصول کے معتقد تھے اور جو امور منافع قوم اور تمدن کے متعلق تھے ان پر عمل کرتے تھے۔

ان اہل جاہلیت میں دو فرقے پائے جاتے تھے جو خوب ظاہر اور پھیلے ہوئے تھے اور ایسے لوگوں کا ہونا ہمارے گزشتہ بیان کے منافی نہیں ہے، ان میں ایک فرقہ فاسقین اور زندیقوں کا تھا پس یہ فاسق لوگ بہائم اور درندوں کے سے کام کرتے تھے جو ملت اسمٰعیل کے بالکل خلاف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں خواہشات نفسانی کا غلبہ تھا اور مذہبی امور کا لحاظ کم تھا، یہ لوگ ملت کے دائرہ سے خارج تھے درآں حالیکہ اپنے میں برائی کا اقرار بھی کرتے تھے۔

اور زندیق لوگوں میں پیدائشی طور پر نقص فہم تھا وہ پوری طرح پر اس امر کی تحقیق نہیں کر سکتے تھے جو صاحب ملت کا مقصود تھا اور نہ ہی صاحب ملت کی تقلید کرتے تھے اور نہ اس امر کو تسلیم کرتے تھے جس کی وہ خبر دیتا تھا۔ وہ اپنے شکوک میں سرگرداں رہتے تھے اور اس کے ساتھ ان کو اپنے لوگوں سے اندیشہ رہتا تھا، لوگ ان کو برا جانتے تھے اور ان کو دین سے خارج سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ انھوں نے اپنے آپ کو مذہب کی پابندی سے آزاد کر دیا ہے پس جبکہ حالت یہ تھی کہ لوگ ان کو ناپسندیدہ اور برا جانتے تھے تو ان کا مذہب سے خارج ہونا ضرر رساں نہ تھا۔

دوسرا فرقہ جاہل اور غافل لوگوں کا تھا جنھوں نے دین کی جانب کسی قسم کی توجہ اور التفات نہیں کیا تھا، اس قسم کے اشخاص قریش اور ان کے قریب کے لوگوں میں بہت تھے کیونکہ ان کا زمانہ انبیا سے بہت دور ہو گیا تھا خدا تبارک و تعالیٰ کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے'' تا کہ تو ایسے لوگوں کو ڈرائے جن کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے''۔

لیکن وہ راستہ سے اتنی دور نہیں ہوئے تھے کہ ان کے سامنے دلیل بھی پیش نہ ہو سکے اور ان کو الزام بھی نہ دیا جا سکے اور ان میں خاموشی پیدا نہ کی جا سکے۔

جو اصول اہل جاہلیت میں مسلم تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آسمان و زمین اور جو جو ہر ان دونوں کے درمیان ہیں ان کے پیدا کرنے میں خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، اور بڑے بڑے امور کی تدبیر کرنے میں اس کا کوئی شریک نہیں، اور ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ کوئی اس کے حکم کو رد نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اس کی قضا اور فیصلہ کو روک سکتا ہے جبکہ وہ مبرم اور قطعی ہو جائے، اس آیت میں

اسی طرف اشارہ ہے ''بیشک اگر تو ان لوگوں سے دریافت کرے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ سب کہیں گے کہ خدا نے پیدا کیا ہے''۔ اور اس کا فرمان ہے ''بلکہ تم خدا ہی کو پکارتے ہو''۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''وہ گمراہ ہیں جن کو تم بجز خدا کے پکارتے ہو''۔

لیکن ان کے زندیق ہونے کی ایک بات یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ فرشتوں میں سے اور ارواح میں سے بعض ایسے ہیں جو علاوہ بڑے بڑے انتظامات کے اہل زمین کے دوسرے امور میں مدبر ہوتے ہیں جیسا کہ اپنے پرستش کرنے والے کی حالت درست کرنا ہے جس کا تعلق خاص اس کی ذات سے ہوتا ہے اور اسکی اولاد اور اموال سے ہوتا ہے، یہ مشرکین ان فرشتوں اور ارواح کو ان بادشاہوں کی حالت سے تشبیہ دیتے ہیں جو ان کے شہنشاہ کے مقابلہ میں ہوتی ہے اور جو حالت شفیعوں اور ندیموں کی ایسے بادشاہ کے سامنے ہوتی ہے جو طاقت کے ساتھ تصرف کرتا ہے، اور اس سوفہمی کا منشا یہ ہوا کہ شریعتوں میں بہت سے امور فرشتوں کی طرف تفویض کئے گئے، اور مقرب لوگوں کی دعا مقبول ہونے کی تصریح ہے اس سے وہ لوگ ان امور کو انہی کے تصرفات سمجھ گئے جیسے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کے ہوتے ہیں اور انھوں نے غائب کو حاضر پر قیاس کر لیا اور یہی شئے فساد کا باعث ہوئی اور اہل جاہلیت کے اصول میں سے ایک یہ تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کی ذات کو اس شئے سے پاک سمجھتے تھے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے اور اس کے اسما میں الحاد کو ناجائز جانتے تھے لیکن انھوں نے اپنی گمراہی کی وجہ سے یہ سمجھ لیا تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں اور فرشتے ایک واسطہ قرار دیئے گئے ہیں تاکہ خدا تعالیٰ ان کے ذریعہ سے اس امر کو معلوم کرے جس کا اس کو علم نہیں ہے، انھوں نے خدا تعالیٰ کو بادشاہوں پر قیاس کیا جیسا کہ وہ جاسوسوں کے ذریعہ سے حالات معلوم کیا کرتے ہیں، اور ان کے مسلمہ اصول میں سے ایک یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے پیدا کرنے سے پیشتر تمام حوادث کو مقدر کر دیا تھا۔ امام حسن بصریؒ کا قول ہے کہ اہل جاہلیت اپنے خطبوں اور اشعار میں ہمیشہ تقدیر کا ذکر کیا کرتے تھے پس شرع نے اس کو اور موکد کر دیا ہے۔

اور ان کے مسلمہ اصول میں سے ایک یہ تھا کہ عالم بالا میں ایک مقام معین ہے جہاں بتدریج حوادث پائے جاتے ہیں اور اس جگہ فرشتوں اور اچھے آدمیوں کی دعا میں کچھ نہ کچھ تاثیر ہے، لیکن اس کی صورت ان کے ذہنوں میں ایسی تھی جیسے بادشاہوں کے وزیران کی شفاعت کا اثر

بادشاہوں پر پڑتا ہے۔

ان کے مسلمہ اصول میں سے یہ بھی تھا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احکام مقرر کئے ہیں ان میں سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام کیا ہے اور یہ کہ وہ ہر کام کی جزا دیتا ہے اگر اعمال اچھے ہیں تو جزا بھی اچھی ہوتی ہے اور اگر اعمال برے ہیں تو جزا بھی بری ہوتی ہے اور یہ کہ خدا تعالیٰ کے پاک فرشتے ہیں جو اس کی بارگاہ میں مقرب ہیں اور بڑے درجہ والے ہیں خدا کے حکم سے وہ اس عالم کی تدابیر میں مصروف رہتے ہیں، احکام الٰہیہ کی تعمیل سے سرتابی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ براز کرتے ہیں اور نہ شادی کرتے ہیں اور کبھی کبھی نیک آدمیوں کے پاس حاضر ہوتے ہیں اور ان کو بشارت اور خوف دلاتے ہیں۔

اور ان کو اس پر بھی اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ایسے شخص کو لوگوں کی طرف مبعوث کرتا ہے جس پر وحی نازل کرتا ہے اور اس کے پاس فرشتوں کو بھیجتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کی طاعت لوگوں پر فرض کرتا ہے پس لوگوں کو اس کے حکم کی تعمیل اور فرمانبرداری کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

ملاء اعلیٰ اور حاملین عرش کا ذکر اشعار جاہلیت میں بکثرت موجود ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن ابی الصلت کے ان دو اشعار کی تصدیق فرمائی ہے اس کا قول ہے (شعر)

رجل وثور تحت رجل یمینه

والنسر للاخری ولیث مرصد

آدمی اور بیل اس کے دائیں پاؤں کے نیچے ہیں۔

''اور گرگس ایک پائے کا اور شیر دوسرے پائے کا محافظ ہے''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شعر سن کر فرمایا امیہ نے سچ کہا اس کے بعد امیہ کا یہ شعر پڑھا (شعر)

والشمس تطلع کل اٰخر لیلة

حمراء یصبح لونها یتورد

تـأبـی فـمـا تطلع لنا فی رسلها

الا مـــعـــذبة والا یـــجـــلـــد

سورج ہر رات کے ختم ہونے کے بعد صبح کو سرخ اور گلابی رنگ کا نکلتا ہے، وہ خوشی سے ہمارے لئے طلوع نہیں ہوتا بلکہ وہ معذب ہوکر اور تازیانہ کھا کر آتا ہے، (یعنی خدا کی قدرت سے مغلوب رہتا ہے)

پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امیہ نے سچ کہا، اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اہل جاہلیت کا یہ عقیدہ تھا کہ عرش کے اٹھانے والے چار فرشتے ہیں، ایک انسان کا ہم شکل ہے اور وہ خدا کے حضور میں بنی آدم کا شفیع ہے، اور دوسرے کی صورت بیل کی ہے اور وہ چار پایوں کا شفیع ہے، تیسرے کی صورت کرگس کی ہے اور وہ پرندوں کی شفاعت کرتا ہے اور چوتھا شیر کی شکل کا ہے اور وہ درندوں کی شفاعت کرتا ہے۔

پس شرع میں بھی اس کے قریب قریب آیا ہے لیکن شرع نے ان تمام فرشتوں کا نام دعول (بزکوہی) رکھا ہے اس اعتبار سے کہ عالم مثال میں ان فرشتوں کی صورتیں ایسی ہی ظاہر ہوتی ہیں، یہ سب باتیں اہل جاہلیت کو معلوم تھیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اس باب میں غائب کو حاضر پر قیاس کرتے تھے اور امور علمی اور یقینی کو اپنے پسندیدہ خیالات کے ساتھ خلط ملط کر دیتے تھے۔ اور اگر تم کو ہمارے مذکورہ بیان میں شبہ ہو تو ان مضامین میں غور کرلو جن کو خدا تعالیٰ نے قرآن عظیم میں بیان فرمایا اور اس باقی علم کے ذریعہ جو ان کے پاس رہ گیا تھا ان پر دلیل قائم کی، اور ان شکوک وشبہات کو جو انھوں نے اپنی معلومات میں داخل کر لئے تھے دور فرمایا بالخصوص اس آیت کو دیکھو۔ جبکہ اہل جاہلیت نے نزول قرآن کا انکار کیا تو خدا تعالیٰ نے فرمایا'' آپ فرما دیجئے کہ بتاؤ وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جسے حضرت موسیٰ لائے تھے اور جب ان لوگوں نے کہا یہ'' کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے تو خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی'' آپ رسولوں میں سے کوئی انوکھے اور عجیب نہیں ہیں'' ایسی ہی اور بہت سی مثالیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اگرچہ راہ راست سے دور ہٹ گئے تھے لیکن جو علمی حصہ ان میں باقی رہ گیا تھا اس کے ذریعہ سے ان پر حجت قائم ہوسکتی تھی اہل جاہلیت میں جو لوگ حکیم ہوئے ہیں ان کے خطبوں کو

دیکھو مثلاً قس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل اور عمرو بن لحی سے پیشتر کے نیک لوگوں کے کلام کو دیکھو تو سب میں یہ بات مفصلاً معلوم ہوگی، بلکہ ان کے کلام میں اگر نہایت غور وخوض کرو گے تو ان کے فضلا اور حکما کو پاؤ گے کہ وہ عالم معاد اور فرشتوں وغیرہ کا اعتقاد رکھتے تھے اور وہ توحید کو ٹھیک طور پر مانتے تھے حتی کہ زید بن عمرو بن نفیل نے اپنے شعر میں یہ کہہ دیا۔ شعر

عبادک یخطئون وانت رب
یکفیک المنایا والمحترم

تو پروردگار ہے سب لوگوں کا بادشاہ ہے
موتیں اور فیصلے تیرے ہی قبضہ میں ہیں

اور اس نے یہ بھی کہا:

اربا واحدا ام الف رب
ادین اذا نقسمت الامر
ترکت اللات والعزیٰ جمیعا
کذلک یفعل الرجل البصیر

میں ایک پروردگار کو مانوں یا ہزار کو
جب کاموں کی تقسیم ہو
میں نے لات وعزیٰ سب کو چھوڑ دیا
سمجھ دار آدمی ایسا ہی کیا کرتا ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن ابی الصلت کے حق فرمایا ''اس کے شعر میں ایمان ہے لیکن اس کے دل میں ایمان نہیں ہے'' اور یہ سب باتیں وہ تھیں جو ان میں حضرت اسمٰعیل کے طریقہ سے وراثتاً چلی آئی تھیں اور اہل کتاب سے ان کو حاصل ہوئی تھیں ان کو بخوبی معلوم تھا کہ انسان کا اصل کمال یہی ہے کہ اپنے رب کے سامنے سرنگوں ہو اور انتہائی کوشش سے خدا کی عبادت کرے اور عبادت کے ابواب میں سے ان کے ہاں ایک طہارت بھی تھی اور غسل جنابت تو ان کا یہاں ایک معمول تھا اور اسی طرح ختنہ اور تمام فطری خصائل ان میں تھے، توریت

میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے ختنہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لئے ایک نشان قرار دیا تھا اور اس وضو کو مجوس اور یہود وغیرہ سب کیا کرتے تھے اور حکمائے عرب بھی اس کے پابند تھے اور ان میں نماز بھی مروج تھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پیشتر تین سال سے نماز پڑھا کرتے تھے اور قس بن ساعدہ ایاوی بھی نماز پڑھا کرتے تھے، یہود، مجوسی اور بقیہ عرب میں نماز کے تعظیمی افعال مروج تھے خاص کر سجود کے پابند تھے اور دعا و ذکر الٰہی سے متعلق اقوال بھی تھے اور وہ لوگ زکوٰۃ بھی دیا کرتے تھے۔ اور مہمان کی ضیافت کرنا، مسافر کو کھانا کھلانا، کسی کے اہل وعیال کا نفقہ، مساکین کو صدقہ دینا، اہل قرابت سے صلۂ رحمی کرنا اور مصائب حق میں مدد کرنا اور ان کا دستور تھا اور یہ سب زکوٰۃ میں داخل تھے، انہی امور سے ان کی مدح ہوتی تھی اور انہی امور کو انسان کا کمال اور اس کی سعادت سمجھتے تھے۔

چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے آپ سے عرض کیا تھ بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو پسماندہ نہ کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں دوسروں کے عیال اور ضعفا کے کفیل ہوتے ہیں، حوادث میں لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔

ایسا ہی ابن دغنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت کہا تھا، اور وہ لوگ صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھا کرتے تھے اور مسجد میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔

اور حضرت عمرؓ نے زمانۂ جاہلیت میں ایک شب کے اعتکاف کی نذر کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس میں استفتا کیا تھا۔

اور عاص بن وائل نے وصیت کی تھی کہ میری جانب سے فلاں فلاں غلام آزاد کئے جائیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اہل جاہلیت مختلف تعظیمات کے ذریعہ خدا کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن حج بیت اللہ اور اس کے شعائر کی تعظیم اور بزرگ مہینوں کی عظمت، پس یہ امور تو اہل عرب میں ایسے مشہور تھے جو کسی پر مخفی نہیں تھے ان کے پاس کئی قسم کے منتر اور تعویذات بھی تھے لیکن ان میں شرک کی باتیں داخل کردی تھیں، حلق کا ذبح کرنا اور گردن میں برچھا مارنا ان کا طریقہ تھا نہ وہ ذبیحہ کا گلا گھونٹتے تھے اور نہ پیٹ چاک کرتے تھے وہ بقیہ دین ابراہیم علیہ السلام پر قائم تھے، وہ علم

نجوم کو نہ مانتے تھے اور سوائے بدیہی چیزوں کے علم طبیعات کے دقائق میں غور و خوض نہ کرتے تھے، آئندہ امور کے دریافت کرنے میں ان کے ہاں عمدہ طریقہ خواب تھا اور گزشتہ انبیا کی بشارات تھیں، اس کے بعد کہانت اور تیروں سے آئندہ حالات کا اندازہ لگانا اور بدشگونی کرنا ان میں رواج پایا گیا تھا اور اس بات کو جانتے تھے کہ یہ امور اصل ملت میں داخل نہیں تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی تصویریں دیکھیں جن کے ہاتھوں میں تیر تھے تو فرمایا یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انھوں نے تیروں کے ذریعہ کبھی اندازہ نہیں لگایا، بنی اسمٰعیل اپنے جدا سمٰعیل علیہ السلام کے طریقہ پر رہے یہاں تک کہ ان میں عمرو بن لحی پیدا ہو گیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً تین سو برس قبل پیدا ہوا تھا، ان لوگوں کے لئے کھانے میں، پینے میں، لباس میں، دعوتوں میں، عیدوں میں، مردوں کے دفن کرنے میں، نکاح، طلاق، عدت اور سوگ میں اور خرید و فروخت و معاملات میں نہایت مستحکم طریقے معین تھے جن کے ترک کرنے پر لوگوں کو ملامت کی جاتی تھی اور ہمیشہ سے وہ محارم کو جیسے بیٹیاں، مائیں، بہنیں وغیرہ ہیں حرام سمجھتے تھے ظلم اور تعدی کے موقع پر ان کے ہاں سزائیں مقرر تھیں جیسے قصاص، دیت اور قسامت کی سزائیں تھیں، ایسے ہی زنا اور چوری کی سزائیں مقرر تھیں، نیز ایران و روم کی سلطنتوں کے ذریعہ سے ان میں منزلی اور تمدنی تدابیر و علوم بھی آ گئے تھے لیکن ان میں بدکاری کی کثرت ہو گئی تھی، آپس میں ایک دوسرے کو قید کر کے اور لوٹ مار کر کے ظلم کرتے تھے، زنا، فاسد نکاح اور سود خوری خوب پھیل گئی تھی، نماز اور ذکر الٰہی کو بالکل ترک کر دیا تھا اور ان کی طرف کچھ توجہ نہ کرتے تھے، پس ان حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے پس آپ نے ان کے تمام امور میں غور و خوض کیا ان میں سے جو حصہ ملت ابراہیمی کا صحیح تھا اس کو باقی رکھا اور اس پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی، اور آپ نے اسباب و اوقات، شروط و ارکان آداب و مفسدات، رخصت و عزیمت اور ادا و قضا کی تعلیم کر کے ان کے لئے عبادات کو منضبط کر دیا اور معاصی کو بھی ارکان و شروط بیان کر کے ان کے لئے منضبط کر دیا، اور گناہوں کی روک تھام کے لئے حدود، سزائیں اور کفارات معین فرمائے ترغیب اور ترہیب کے بیان کے ذریعہ دین کو ان کے لئے آسان کر دیا۔ گناہوں کے تمام ذرائع بند کر دیئے اور ان امور پر آمادہ کیا جن سے نیکی کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ

تمام باتیں بتلائیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ملت حنیفہ کے پھیلانے میں اور اس کے تمام مذاہب پر غالب کرنے میں نہایت کوشش فرمائی، ان کی تمام تحریفات کو مٹایا اور ان کے مٹانے میں انتہائی کوشش کی اور جو رسوم صحیح تھیں ان کو باقی رکھا اور ان کا حکم فرمایا اور جس قدر ان کی رسوم فاسدہ تھیں ان سے روک دیا اور خلافت کبریٰ کو ان میں قائم کیا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے غیروں سے جہاد کیا یہاں تک کہ امر خداوندی پورا ہو گیا گو، وہ ان پر شاق ہی گزرتا رہا۔

بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مجھ کو آسان حنفی روشن مذہب دیکر بھیجا گیا ہے'' آسان، سے آپ کی مراد یہ ہے کہ اس میں ایسی سخت عبادتیں نہیں ہیں جن کو راہبوں نے ایجاد کر لیا تھا، بلکہ اس ملت میں ہر ایک عذر کے لئے رخصت ہے جس کی وجہ سے قوی اور ضعیف، کاربند اور بیکار سب عمل کر سکتے ہیں اور حنفی سے مراد ملت ابراہیمؑ ہے جس میں شعائر الٰہی کا قیام اور شرک کے شعار کی برائی ہے اور تحریف و رسوم فاسدہ کا ابطال ہے۔

اور روشن سے مراد یہ ہے کہ اس کی علتیں اور حکمتیں اور وہ مقاصد جن پر شریعت کی بنیاد قائم ہے نہایت صاف ہیں جو شخص ان میں تامل کرے گا اس کو کچھ شبہ باقی نہ رہے گا بشرطیکہ وہ سلیم العقل ہو اور ہٹ دھرمی کرنے والا نہ ہو، واللہ اعلم۔

ساتواں مبحث

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے احکام شرعی کے استنباط کی کیفیت

پہلا باب: علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقسام کا بیان

واضح ہو کہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور کتب حدیث میں مدون ہے اس کی دو قسمیں ہیں اور وہ امور جن کا ذریعہ تبلیغ رسالت ہے اس سے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ قول ہے "پیغمبر جو کچھ تم کو بتائے اس کی تعمیل کرو اور جس سے منع کرے اس سے باز آؤ"۔

ایسے امور میں سے ایک حصہ علوم معاد اور عالم ملکوت کے عجیب عجیب حالات کا ہے یہ سب امور بواسطہ وحی کے ہوتے ہیں، اور ایک حصہ احکام شرعی ضبط عبادات اور ارتفاقات کا ہے ان وجوہ ضبط کے ساتھ جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، ان میں سے بعض وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں اور بعض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کے ذریعہ میں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ رکھا تھا کہ آپ کی رائے خطا پر جم سکے اور یہ بھی ضروری نہ تھا کہ آپ کا اجتہاد کسی امر منصوص سے مستنبط ہو جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں بلکہ اکثر یہ حالت تھی کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو شرع کے مقاصد بتلا دیئے تھے اور تشریع، تیسیر و احکام کے قانون کی تعلیم کر دی تھی پس اسی قانون کے ذریعہ آپ ان مقاصد کی وضاحت کر دیا کرتے تھے جو بذریعہ وحی آپ کو حاصل ہوتے تھے۔

انہی امور تبلیغ رسالت میں سے ایک حصہ ان حکمتوں اور مصلحتوں کا جو بلا قید رکھی گئی ہیں جن کا نہ وقت معین ہے اور نہ ان کی حدیں بیان کی گئی ہیں، جیسے عمدہ اور ناقص اخلاق کا بیان اور یہ حصہ غالباً اجتہادی ہے بایں معنی کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو قوانین انتظامات تعلیم فرمائے پس ان قوانین

سے حکمتوں کو اخذ کیا اور ان کو کلیہ بنایا۔

اور انہی امور میں سے ایک حصہ فضائل اعمال اور عاملین کے مناقب اور اوصاف کا ہے، میری رائے میں ان میں سے بعض امور وحی الٰہی کے واسطہ سے ہوتے ہیں اور بعض اجتہادی ہوتے ہیں، اور ان قوانین کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور اسی حصہ کی تشریح اور ان کے مقاصد کا بیان کرنا ہمیں مقصود ہے۔

دوم وہ امور جو تبلیغ رسالت کے باب سے نہیں ہیں اسی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "میں ایک انسان ہوں جب میں تم کو کسی مذہبی امر کا حکم کروں تو اس کو لے لو اور جو بات میں تم سے اپنی رائے سے کہوں پس میں بشر ہوں"۔ درخت خرما کے نر و مادہ کے ملانے میں بھی آپ نے یہی فرمایا تھا "یہ میرا ایک گمان تھا پس ظنی بات میں میرا مواخذہ نہ کرو لیکن جب میں خدا کی جانب سے کوئی بات بیان کروں تو اس کو اختیار کرو، اس لئے کہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں بولا"۔

اسی حصہ میں سے طب کا حصہ ہے اور اسی سے متعلق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ "گھوڑا نہایت سیاہ جس کی پیشانی پر ہلکی سی سفیدی ہو ضرور رکھو"۔ اور اس بارے میں مستند آپ کا تجربہ تھا۔

اور اسی قبیل سے وہ امور بھی ہیں جن کو آپ عادۃً کیا کرتے تھے اور ان کو بطور عبادت کے نہیں کرتے تھے، یا آپ نے ان کو اتفاقاً کیا تھا، قصداً نہیں کیا تھا اور اسی قبیل سے وہ مذکورات ہیں جن کو آپ اپنی قوم سے کہا کرتے تھے، حدیث ام زرع اور حدیث خرافہ اسی قسم کی احادیث ہیں، اسی کو زید بن ثابت نے فرمایا ہے جبکہ چند آدمی آپؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہم سے بیان کیجئے، حضرت زید نے کہا "میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ میں رہتا تھا جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ مجھ کو بلا بھیجتے تھے پس میں اس کو لکھ دیا کرتا تھا، آپ کی یہ عادت تھی کہ جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ دنیا کا ذکر کرتے، اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ کھانے کا ذکر کرتے، پس کیا میں تم سے یہ سب قسم کی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کروں" اور اسی قبیل سے وہ

امور بھی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جزئی مصلحت مقصود تھی لیکن وہ تمام امت کے لئے ضروری نہ تھے اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ فوجوں کی ترتیب کرتا ہے اور کوئی شعار (۱) مقرر کرتا ہے، اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے "ہم کو طواف میں رمل (۲) سے کیا تعلق، ہم ان لوگوں کو یہ حالت دکھاتے تھے جن کو خدا نے اب ہلاک کر دیا ہے"۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں رمل کا کوئی اور سبب نہ ہو۔ اور بہت سے احکام اسی مصلحت جزئی پر محمول ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "جہاد میں جو کوئی کسی کو قتل کرے وہی شخص اس مقتول کا اسباب و سامان لے"۔

اسی حصہ میں سے آپ کے احکام اور خاص فیصلے ہیں اور ان میں آپ گواہ اور قسم کا اعتبار کر لیتے تھے، حضرت علیؓ سے آپ نے فرمایا تھا "جو کچھ شاہد جانتا ہے غائب نہیں جانتا"۔

دوسرا باب: مصلحتوں اور شریعتوں کے مابین فرق کا بیان

واضح ہو کہ شارع نے ہم کو دو قسم کے علمی فائدے پہنچائے ہیں جن کے احکام اور مراتب جدا جدا ہیں، پس ان میں سے ایک قسم مصالح اور مفاسد کا علم ہے یعنی جس میں نفس کو مہذب کرنے کا بیان ہے اس طور پر کہ وہ اخلاق جو دنیا اور آخرت میں نافع ہیں حاصل کئے جائیں اور ان کے مخالف اخلاق کو دور کیا جائے، اور جس میں تدبیر خانہ داری، آداب معاش اور سیاست مدینہ کا بیان ہے جن کی شارع نے نہ مقدار معین کی، نہ کسی مبہم کو حدود کے ساتھ منضبط کیا اور نہ ہی علامات معلومہ کے ساتھ کسی قابل اشکال امر کو ممتاز کیا بلکہ پسندیدہ امور کی ترغیب دی اور رذائل سے کنارہ کش رہنے کی ہدایت فرما دی اور اپنے کلام کو اہل زبان کے فہم پر چھوڑ دیا اور نفس مصالح کو طلب اور باز رہنے کا مدار علیہ قرار دیا، نہ ان کے لئے مواقع مقرر کئے اور نہ علامات جن سے طلب یا باز رہنے کی طرف رہبری ہو سکے، مثلاً آپ نے دانائی اور بہادری کی مدح فرمائی اور امر معیشت میں نرمی، محبت اور میانہ روی کا حکم فرمایا اور دانائی کی کوئی حد نہیں بیان کی جو طلب کا مدار علیہ ہو اور نہ اس کا مظنہ بتلایا جس سے تجاوز کرنے پر لوگوں سے مواخذہ کیا جاتا ہو۔

---

(۱) شعار وہ کلمات مقررہ ہوتے ہیں جن سے رات کو اپنے اور غیر میں تمیز ہو جاتی ہے۔ (۲) طواف کی حالت میں سینہ نکال کر چلنے کو رمل کہتے ہیں۔

جس مصلحت کی شرع نے ہم کو ترغیب دی ہے اور جس خرابی سے باز رکھا ہے اس کی انتہا تین اصولوں میں سے ایک نہ ایک پر ہوتی ہے، ان میں سے اوّل ان چار خصلتوں کے ذریعہ نفس کو مہذب کرنا ہے جو آخرت میں نفع بخش ہوں، یا ان تمام خصائل سے نفس کو مہذب کرنا ہے جو دنیا میں مفید ہوں، دوم، کلمتہ اللہ کا بلند کرنا، شرائع کا مستحکم کرنا اور ان کی اشاعت میں سعی کرنا ہے۔ سوم لوگوں کی حالت کا انتظام کرنا، ان کی تدابیر کو درست کرنا اور ان کی رسوم کو مہذب صورت میں لانا ہے۔

اور مصلحت اور خرابی کی انتہا ان اصول پر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی شئے کو ان امور میں اثباتاً یا نفیاً دخل ہوتا ہے۔ بایں طور کہ یہ شئے ان میں سے کسی خصلت کا شعبہ ہو یا ان کے شعبہ ہو یا ان کے شعبہ کی ضد ہو یا ان کے پائے جانے کا محل ہو یا نہ پائے جانے کا محل ہو یا ان سے متلازم ہو یا ان کی ضد سے متلازم ہو، یا ان اصول کے حصول کا ذریعہ ہو یا ان سے اعراض کا ذریعہ ہو، اور خدا کی خوشنودی اصل میں انہی مصلحتوں سے متعلق ہوتی ہے اور اس کی ناراضی انہی مفاسد اور خرابیوں سے متعلق ہوتی ہے، پیغمبروں کی بعثت سے پہلے کا زمانہ اور بعد کا زمانہ اس خوشنودی اور ناراضی میں یکساں ہے، اگر ان دونوں حصوں سے خدا کی رضا اور ناراضی کا تعلق نہ ہوتا تو پیغمبر نہ بھیجے جاتے اس لئے کہ یہ تمام شرائع اور حدود تو انبیا کے پیدا ہونے کے بعد ہوئے ہیں۔ پس ابتداً ان شرائع کا حکم دینا یا ان پر مواخذہ کرنا لطف الٰہی نہیں تھا، لیکن مصالح اور مفاسد نفس کی پاکی یا ناپاکی پر یا لوگوں کے انتظامی یا بدانتظامی امور پر بعثت انبیا سے پہلے ہی موثر تھے اس واسطے لطف الٰہی مقتضی ہوئی کہ لوگوں کو ضرر رساں امور سے خبردار کیا جائے اور جو امور ان کے لئے ضروری ہیں ان کا حکم دیا جائے اور یہ چیز بغیر مقادیر اور شرائع کے پوری نہیں ہوسکتی تھی اس واسطے لطف الٰہی نے ان مقادیر اور شرائع کے تعین کا بالطبع اقتضا کیا، اور یہ قسم ایسی ہے جو عقل میں آتی ہے۔

پس اس قسم میں سے بعض امور ایسے ہیں کہ عام لوگوں کی عقلیں ان کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اور اسی قسم میں سے بعض امور ایسے ہیں جن کو صرف ان اذکیا کی عقلیں ہی سمجھتی ہیں پر انبیا کے قلوب کے انوار کا پرتو پڑا ہے، شریعت نے انہیں متنبہ کیا تو خبردار ہوگئے اور کسی امر کا اشارہ کیا تو فوراً سمجھ گئے۔

اور شخص ان اصول کو جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اچھی طرح سے ضبط کر لے تو اس کو ان مصالح

اور مفاسد میں سے کسی میں بھی توقف نہ ہوگا۔ اور ان میں سے دوسری قسم شرائع، حدود اور فرائض کا علم ہے یعنی وہ مقادیر جن کو شارع نے بیان کر کے مصالح کے لئے مظان کو مقرر کر دیا، اور مصالح کے لئے ایسی علامات معین کر دیں جو منضبط اور معلوم ہوں اور ان پر حکم کا مدار رکھا اور لوگوں کو ان کا مکلف بنایا، اور نیکی کے اقسام کو ان کے ارکان، شروط اور آداب متعین کر کے منضبط کیا اور نیکی کے انواع میں سے ہر نوع کی ایک ایسی حد مقرر کی جو لوگوں سے واجباً مطلوب ہے اور ایک ایسی حد مقرر کی جس کو وہ بغیر ایجاب کے مستحباً کرتے ہیں، اور ہر نیکی میں سے ایک مقدار ایسی اختیار کی جس کو لوگوں پر واجب کر دیا اور ایک مقدار ایسی اختیار کی جو ان کے لئے مستحب کر دی، اس واسطے تکلیف شرعی خاص ان مظاہر سے متعلق رہی اور احکام شرعی خاص ان علامات پر مبنی ہوئے اور یہ نوع سیاست ملی کے قوانین کی طرف رجوع کرتی ہے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مصلحت کے ہر مظنہ کو لوگوں پر واجب کر دیا جائے بلکہ اس کو واجب کیا جاتا ہے جو معلوم اور محسوس ہو یا ایسا وصف ظاہر ہو جس کو ہر خاص و عام جانتا ہو، اور کبھی وجوب اور حرمت کے لئے عارضی اسباب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے عالم بالا میں وجوب اور تحریم لکھ دی جاتی ہے پس وہاں ایجاب و تحریم کی صورت متحقق ہو جاتی ہے جیسے کسی سائل کا سوال کرنا اور لوگوں کا اس کی طرف التفات کرنا یا اس سے اعراض کرنا، اور یہ سب ایسے معنی ہیں جن کو عقل نہیں سمجھ سکتی بایں معنی کہ ہم کو اگرچہ اندازہ اور تشریع کے قوانین کا علم ہے لیکن ان کا عالم بالا میں لکھا جانا اور حظیرۃ القدس میں وجوب کی صورت کا متحقق ہونا بغیر نص شارع کے ہم کو معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ ایسے امور ہیں جن کے ادراک کا سوائے باری تعالیٰ کے اخبار کے کوئی اور ذریعہ نہیں، اس کی مثال برف کی سی ہے، ہم کو یہ تو معلوم ہے کہ اس کا سبب برودت ہے جو پانی کو جما دیتی ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ فلاں برتن کا پانی اسوقت جم گیا ہے یا نہیں ہاں خود مشاہدہ کرنے سے یا ایسے شخص کے خبر دینے سے جس نے مشاہدہ کیا ہے معلوم ہو سکتا ہے۔

پس اسی طرح ہم یہ جانتے ہیں کہ زکوٰۃ کے لئے کوئی نصاب مقرر ہونا چاہئے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ دو سو درہم یا پانچ وسق نصاب کے لئے ایک عمدہ مقدار ہے کیونکہ اس مقدار سے معتد بہ غنا حاصل ہو جاتی ہے اور یہ دونوں مقداریں لوگوں کے نزدیک معلوم اور مستعمل ہیں، لیکن

یہ امر کہ شارع نے ہم پر یہ نصاب مقرر کیا ہے اور رضامندی اور ناراضی کا مدار اس پر رکھا ہے بغیر نص شارع کے معلوم نہیں ہوسکتا اور کیونکر معلوم ہوسکتا ہے جبکہ بہت سے امور ایسے ہیں جن کا علم بغیر باری تعالیٰ کے بتلائے ہو ہی نہیں سکتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ ''سب مسلمانوں میں بڑا گنہگار وہ شخص ہے' الحدیث۔ اور اس قول میں بھی یہی مراد ہے۔'' مجھ کو خوف تھا کہ تم پر تراویح کہیں فرض نہ ہو جائے''۔

اور معتبر علما اس پر متفق ہیں کہ مقادیر کے باب میں قیاس کو دخل نہیں ہے اور اس پر بھی متفق ہیں کہ قیاس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی علت مشترکہ کی وجہ سے اصل کے حکم کو فرع کے لئے ثابت کردیا جائے نہ یہ کہ مصلحت کے مظنہ کو علت بنادیا جائے یا کسی مناسب شئے کو رکن یا شرط قرار دے دیا جائے۔

اور اس پر بھی متفق ہیں کہ قیاس مصلحت کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ وہ ایسی علت پیدا کرتا ہے جس پر حکم کا مدار ہوتا ہے، اسی واسطے اس مقیم کو جس کے ساتھ کوئی حرج لاحق ہو نماز اور روزہ کی رخصت میں مسافر پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حرج کا زائل ہونا رخصت دینے کی مصلحت ہوسکتا ہے، قصر اور افطار کی علت نہیں ہوسکتا بلکہ علت وہی سفر ہے۔

پس یہ ایسے مسائل ہیں جن میں اجمالاً علما کا اختلاف نہیں ہے لیکن ان میں سے بہت سے ان مسائل کی تفصیل میں اختلاف کرتے ہیں کیونکہ بسا اوقات مصلحت، علت اور تشریع کے ساتھ مشابہ ہو جایا کرتی ہے اور بعض فقہا نے جبکہ قیاس میں غور و خوض کیا تو متحیر ہوکر بعض مقادیر کو لیا اور اس کو اس کے مناسب چیزوں کے ساتھ بدلنے کو برا سمجھا اور بعض میں تسامح کرکے اور چیزوں کو اس کے قائم مقام کردیا، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہا نے روئی کا نصاب پانچ گٹھے مقرر کئے اور کشتی پر سوار ہونے کو دوران سر کا مظنہ خیال کرکے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم دے دیا اور پانی کا دہ دردہ کے ساتھ اندازہ کیا، اور جبکہ شرع نے کسی مقام میں مصلحت کو سمجھایا پھر اسی مصلحت کو ہم نے دوسرے مقام میں پایا تو یہ سمجھ لیا کہ رضاء الٰہی خاص اس مصلحت سے متعلق ہے اور خاص اس موضع سے اس کا تعلق نہیں، بخلاف مقادیر کے کہ وہاں نفس مقادیر سے ہے رضا متعلق ہوتی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص ایک وقت کی نماز بھی ترک کرے گا، گناہ گار ہوگا۔ خواہ اس

وقت میں ذکر الٰہی و دیگر تمام عبادات ہی میں کیوں نہ مشغول ہو، اور جو زکوٰۃ ترک کرے گا گناہگار ہوگا خواہ اس سے زیادہ مال خیرات میں صرف کرتا ہو اور اسی طرح وہ شخص بھی گناہگار ہوگا جو ریشم اور سونا خواہ ایسی تنہائی میں پہنے جہاں فقرا کی دل شکنی اور لوگوں کو دنیوی دولت مندی پر برانگیختہ کرنا منظور نہیں ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ ترفہ مقصود ہے، اور اسی طرح سے جو شخص دوا کے ارادے سے شراب پئے گا اور وہاں فساد بھی نہیں ہے اور ترک نماز بھی نہیں ہے تب بھی وہ گناہگار ہوگا کیونکہ ان سب میں رضامندی اور ناراضی خاص ان امور سے متعلق ہے اگر چہ غرض اصلی لوگوں کو مفاسد سے روکنا اور مصالح کی ترغیب دینا ہے لیکن خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ اس وقت میں امت کی سیاست ان چیزوں کے واجب اور حرام کئے بغیر ممکن نہیں، اس واسطے اس کی رضامندی اور ناراضی ان چیزوں سے متعلق ہوگئی اور ملاء اعلیٰ میں یہ بات لکھ دی گئی۔

اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اعلیٰ پشمینہ پہنتا ہے جو ریشم سے کہیں زیادہ بیش قیمت اور عمدہ ہے اور یاقوت کے برتن استعمال میں لاتا ہے تو وہ شخص محض اس فعل کی وجہ سے گناہگار نہ ہوگا، البتہ اگر اس فعل سے فقرا کی دل شکنی ہو اور لوگ اس سے برانگیختہ ہوتے ہوں یا اپنا ترفہ مقصود ہو تو ان خرابیوں کی وجہ سے وہ رحمت الٰہی سے دور ہو جائے گا اور اگر یہ خرابیاں نہ ہوں تو اس کو رحمت الٰہی سے بعد نہ ہوگا اور جہاں کہیں تم نے صحابہ اور تابعین کو پایا ہے کہ انھوں نے اندازہ سا کیا ہے تو اس سے ان کی غرض محض مصلحت کا بیان کرنا اور اس میں رغبت دلانا ہے یا اس کی خرابی بیان کرنا اور اس سے ڈرانا ہے اور وہ اس صورت کو محض بطور مثل کے بیان کرتے ہیں۔ خاص وہ مثال مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس سے ان کا مقصود معانی ہوتے ہیں گو، بادی الرائے میں یہ امر مشتبہ معلوم ہو۔

اور جہاں شرع نے ایک مقدار کو اس کی قیمت سے بدلنا جائز رکھا ہے جیسا کہ ایک قول ہے کہ بنت مخاض (۱) کو اس کی قیمت سے مبادلہ کرنا جائز ہے تو علی تقدیر تسلیم یہ بھی اندازہ کی ایک قسم ہی ہے کیونکہ پورا اندازہ نہیں ہو سکتا اور اس سے تنگی لازم آتی ہے، بلکہ بسا اوقات ایسی شئے کے ذریعہ اندازہ کیا جاتا ہے جو بہت سی چیزوں پر منطبق ہو سکے، مثلاً بنت مخاض ہی کو لیا جائے کہ کبھی ایک بنت مخاض دوسری بنت مخاض سے عمدہ ہوتی ہے اور کبھی قیمت کا اندازہ بھی کسی قدر حد معلوم

---

(۱) اونٹنی کا دو سالہ بچہ۔

سے کیا جاتا ہے جیسے قطع ید کا نصاب ہے کہ اس کا اندازہ ربع دینار تا تین درہم ہیں۔

واضح ہو کہ ایجاب وتحریم بھی ایک قسم کا اندازہ ہے اس واسطے کہ اکثر کسی مصلحت یا مفسدہ کی بہت سی صورتیں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ پس ایجاب یا حرمت کے لئے ایک صورت معین کی جاتی ہے کیونکہ یہ صورت ان امور میں سے ہوتی ہے جن کا انضباط ہو سکتا ہے یا اس کا حال پہلے مذاہب میں معلوم ہو چکا ہوتا ہے یا اس میں لوگوں کی بہت زیادہ رغبت ہوتی ہے اسی واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کے بارے میں عذر کیا تھا اور فرمایا کہ میں ان کے فرض ہو جانے سے ڈرتا ہوں'' اور یہ بھی فرمایا ''اگر میں اپنی امت پر سختی نہ سمجھتا تو ان کو ہر نماز میں مسواک کا حکم دیتا''۔ اور جب حالت یہ ہے کہ جس شئے کا حکم منصوص نہیں ہے اس کو ایسی شئے پر محمول نہیں کیا جا سکتا جس کا حکم منصوص ہے لیکن ندب اور کراہت، پس ان دونوں میں تفصیل ہے، شارع نے جس خاص مندوب کا حکم دیا اور اس کی عظمت بیان فرمائی اور اس کو لوگوں کے لئے مسنون کر دیا تو اس کا حال واجب کا سا ہے، اور شارع نے جس مندوب کی صرف مصلحت بیان کرنے پر اکتفا کیا یا خود اس پر عمل کیا اور نہ اس کو لوگوں کے لئے مسنون کیا اور نہ اس کی عظمت بیان فرمائی تو وہ اپنی اس حالت پر باقی ہے جو تشریع سے پہلے تھی اور اس میں اجر کا درجہ اس مصلحت کی وجہ سے ہے جو اس میں پائی جاتی ہے، خود اس فعل کی وجہ سے اجر نہیں ہے اور اسی طرح کی تفصیل مکروہ کے حال کی ہے۔

جب تم اس کو مقدمہ کی تحقیق ہوگئی تو یہ امر بھی تم پر واضح ہو گیا کہ اکثر قیاسات جن پر لوگ فخر کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ جماعت اہل حدیث پر فوقیت ظاہر کرتے ہیں خود انہی کے لئے وبال ہیں جس کی انہیں خبر بھی نہیں۔

تیسرا باب: امت کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت کو اخذ کرنے کا بیان

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں ان میں سے ایک طریقہ ظاہر قول سے حاصل کرنے کا ہے اور اس کے لئے اقوال نبوی کی نقل ضروری ہے خواہ یہ نقل متواتر ہو یا غیر متواتر اور متواتر کی ایک قسم وہ ہے جس کے الفاظ بھی متواتر ہوتے ہیں جیسے قرآن مجید اور چند احادیث، ان میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے، روز قیامت تم اپنے رب کو صاف صاف دیکھو گے۔

اور متواتر کی ایک قسم وہ ہے جس کے معنی متواتر ہوتے ہیں، جیسے طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، بیع، نکاح اور غزوات کے بہت سے احکام جن میں اسلامی فرقوں میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔

اور غیر متواتر میں سب سے بلند رجہ مستفیض کا ہے، مستفیض اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو تین یا زیادہ صحابہ روایت کریں اور پانچویں طبقہ تک برابر اس کے راوی بڑھتے رہیں اور اس قسم کی حدیثیں بہت ہیں اور بڑے بڑے مسائل فقہ کی ان ہی پر بنیاد ہے۔

مستفیض کے بعد اس حدیث کا درجہ ہے جس کی صحت یا حسن کا فیصلہ حفاظ اور اکابر محدثین کے بیان سے ہو گیا ہو، ایسی حدیثوں کے بعد ان احادیث کا مرتبہ ہے جن میں محدثین نے کلام کیا ہے بعض نے ان کو قبول کیا اور بعض نے قبول نہیں کیا، پس ان میں سے جو حدیثیں شواہد یا اکثر اہل علم کے اقوال سے یا عقل صریح سے مؤید ہوں وہ بھی واجب العمل ہیں، اور ان میں سے دوسرا طریقہ احادیث کی دلالت اور رہنمائی سے احکام شریعت اخذ کرنے کا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی امر فرماتے ہوئے یا کرتے ہوئے دیکھا اور اس سے کوئی حکم وجوب وغیرہ کا مستنبط کر لیا اور اس حکم کی لوگوں کو خبر کر دی کہ فلاں شئے واجب ہے اور فلاں شئے جائز ہے، پھر تابعین نے صحابہ سے ان احکام کو اسی طرح حاصل کیا پھر تیسرے طبقہ کے لوگوں نے ان کے فتووں اور فیصلوں کو جمع کر لیا اور خوب استحکام کر لیا اور اس طریقہ سے اخذ احکام شریعت کرنے والوں میں بڑے پایہ کے لوگ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں، لیکن حضرت عمرؓ کی یہ عادت تھی کہ وہ صحابہ سے ہر مسئلہ میں مشورہ اور مناظرہ کیا کرتے تھے یہاں تک کہ اس امر کا پورا انکشاف ہو جاتا تھا، اور آپ کو یقینی امر معلوم ہو جاتا تھا اس واسطے حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور فتوؤں کا تمام مشارق اور مغارب میں اتباع کیا گیا، چنانچہ ابراہیم فرماتے ہیں جب حضرت عمر فوت ہو گئے تو علم کے دس حصوں میں سے نو حصے مفقود ہو گئے"۔ اور عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ جب عمر کسی راستہ پر چلتے تھے تو ہم اس کو سہل پاتے تھے، اور حضرت علی اکثر اوقات مشورہ نہیں کرتے تھے اور ان کے اکثر فیصلے کوفہ میں واقع ہوئے ہیں اور ان فیصلوں کو بہت کم لوگوں نے لیا ہے اور عبداللہ بن مسعود بھی کوفہ میں رہا کرتے تھے اس

لئے ان کے اکثر فتوے بھی اسی نواح کے لوگوں میں رہے اور حضرت عبداللہ بن عباس نے پہلے لوگوں کے زمانہ کے بعد اجتہاد کیا اور بہت سے احکام میں ان کی مخالفت کی اور اس امر میں ان کے اصحاب نے جو مکہ میں تھے ان کی پیروی کی، اور جس امر میں حضرت عبداللہ بن عباس تنہا ہیں اس کو جمہور اہل اسلام نے اختیار نہیں کیا، ان چاروں کے علاوہ اور لوگ بھی احادیث کی دلالت اور رہبری سے واقف تھے لیکن ان کو رکن اور شرط میں اور آداب وسنن میں فرق معلوم نہ ہوتا تھا اور اختلاف احادیث ودلائل کی حالت میں بہت کم اپنی طرف سے فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اسی درجہ کے لوگ تھے۔

اور اس طریقے سے علم حاصل کرنے والے تابعین میں سب سے بڑے مدینہ کے ساتوں فقیہ تھے بالخصوص مدینہ میں سعید بن مسیّب، مکہ میں عطا ابن ابی رباح اور کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شریح اور شعبی اور بصرہ میں حسن۔

اور ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک میں خلا ہے جو بغیر ایک دوسرے کے نہیں بھرتا ہے اور ایک طریقہ کو دوسرے کی حاجت ہے۔

پہلا طریقہ یعنی نقل ظاہر میں یہ نقصان ہے کہ روایت بالمعنی میں تغیر وتبدل ہو جاتا ہے اور معنی کے بدل جانے کا خوف ہوتا ہے دوسرا نقصان یہ ہے کہ کسی خاص واقعہ میں کوئی حکم دیا جاتا ہے اور راوی اس کو حکم کلی سمجھ لیتا ہے، اور تیسرا نقصان یہ ہے کہ اس حکم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیدی جملہ فرمایا تاکہ لوگ اس کا خوب اہتمام کریں پس راوی نے اس سے اس کا واجب ہونا یا حرام ہونا سمجھ لیا اور واقع میں ایسا نہیں تھا، پس جو شخص فقیہ ہے اور خود اس موقع پر موجود تھا تو وہ قرائن سے حقیقت حال معلوم کرے گا۔ جیسے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے مزارعت کے متعلق اور پھل پکنے سے پیشتر پھلوں کی خرید وفروخت کی نسبت کہا ہے کہ یہ نہی بطور مشورہ تھی۔

اور دوسرے طریقہ یعنی اجتہادی حالت میں یہ نقصان ہے کہ اس میں صحابہ اور تابعین کے قیاسات جو کتاب وسنت سے مستنبط ہیں داخل ہو جاتے ہیں اور اجتہاد ہر حالت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ درست ہی ہوا کرے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کو حدیث نہیں پہنچی یا اس طرح سے پہنچی کہ اس جیسی حدیث قابل حجت نہیں ہوتی اس واسطے اس پر عمل نہیں کیا،

پھر اس کے بعد اصل حال دوسرے صحابی کی زبانی معلوم ہوا جیسے تیمم جنابت کے متعلق حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے۔

اور اکثر اوقات بڑے بڑے صحابہ ایسے امر پر متفق ہوئے ہیں جس کی خوبی عقل سے معلوم ہوئی ہے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرے طریقہ کی اور میرے بعد خلفا راشدین کے طریقہ کی پابندی کرو'۔ حالانکہ یہ اتفاق اصول شریعت میں سے نہیں ہے، پس جس شخص کو اخبار اور الفاظ حدیث میں کمال حاصل ہے تو اس کو لغزش سے نجات پانے میں آسانی ہوسکتی ہے، اور جب ایسی حالت ہے تو فقہ میں خوض کرنے والے کو ضرور ہے کہ وہ دونوں مشربوں سے سیراب ہو اور دونوں مذہبوں میں کمال رکھتا ہو۔

اور احکام ملت میں عمدہ وہ احکام ہیں جن پر جمہور رواۃ اور علما متفق ہوں اور دونوں طریقے ان میں مطابق ہوں، واللہ اعلم۔

چوتھا باب: کتب حدیث کے طبقات کا بیان

واضح ہو کہ ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے سوا کوئی ذریعہ شرائع اور احکام کے معلوم کرنے کا نہیں ہے بخلاف مصالح کے کہ ان کو تجربہ، غور کامل اور حدس وغیرہ سے بھی معلوم کرسکتے ہیں، اور ہمارے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا علم حاصل کرنے کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ وہ روایتیں ہم پہنچیں جن کی سند آپ تک پہنچتی ہے خواہ وہ احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہوں یا موقوف احادیث ہوں کہ ان کی روایت جماعت صحابہ وتابعین سے بصحت پہنچتی ہو، اس طرح کہ اگر شارع کی جانب سے نص یا اشارہ نہ ہوتا تو وہ اس کے قطعی ہونے پر اقدام نہ کرتے پس اس قسم کی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دلالۃً ماخوذ ہے۔

اور ہمارے زمانہ میں اس قسم کی روایتوں کے حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ بجز اس کے نہیں ہے کہ جو کتابیں علم حدیث میں مدون ہیں ان کا تتبع کیا جائے کیونکہ آج کل سوائے کتب مدونہ کے کوئی معتبر روایت نہیں پائی جاتی، کتب حدیث کے درجے اور طبقے مختلف ہیں اس لئے ان طبقات کا معلوم کرنا ضروری ہے۔

پس ہم کہتے ہیں کہ صحت وشہرت کے لحاظ سے کتب حدیث کے چار درجات ہیں، اس کی

وجہ یہ ہے کہ پہلے تم جان چکے ہو کہ حدیث کی قسمیں یہ (تین) ہیں، اول متواتر جس کے قبول کرنے اور عمل کرنے پر امت کا اجماع ہے، اس کے بعد دوسری قسم کی وہ ہیں جو متعدد طریقوں سے حاصل ہوئی ہوں اور کوئی معتد بہ شبہ ان کے ثبوت میں نہ رہا ہو اور ان پر عمل کرنے میں جمہور فقہا بلاد متفق ہوں، یا خصوصاً علما حرمین نے اختلاف نہ کیا ہو، اس واسطے کہ قرون اولی میں حرمین خلفا راشدین کے قیام کی جگہ تھی، اور پھر ہر زمانہ میں وہاں علما آتے رہے ہیں سو یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ علما حرمین ظاہری خطا کو تسلیم کر سکیں یا کوئی قول مشہور ہو گیا ہو ملک کے بڑے حصہ میں اس پر عمل کیا گیا ہو اور صحابہ و تابعین کی بڑی جماعت نے اس کی روایت کی ہو۔

اور تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جو صحیح ہوں، ان کی اسناد حسن ہو، علما حدیث نے ان کی شہادت دی ہو اور وہ حدیث ایسا قول متروک نہ ہو جس کی طرف علما امت میں سے کسی نے التفات نہ کیا ہو لیکن جو احادیث ضعیف، موضوع، یا منقطع یا مغلوب السند یا مغلوب المتن ہوں یا مجہول الحال لوگوں سے مروی ہوں یا اس حدیث کے خلاف ہوں جس پر ہر طبقہ میں علما کا اتفاق رہا ہو، پس ایسی حدیثوں کا قائل ہونا ممکن نہیں، کتب حدیث کے صحیح ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مولف کتاب نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہو کہ وہ انہیں حدیثوں کو روایت کرے گا جو صحیح یا حسن ہوں گی نہ ایسی حدیث کو جو مغلوب ہوں یا شاذ ہوں یا ضعیف ہوں، ہاں اگر ضعیف کو روایت کرے تو ساتھ ہی اس کا حال بھی بیان کر دے کیونکہ ضعیف کا اس طرح روایت کرنا اس کا ضعف بھی بیان کر دیا جائے کتاب میں موجب اعتراض نہیں ہے اور شہرت حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو احادیث کتب میں مذکور ہیں وہ تدوین کتب حدیث سے پہلے اور بعد محدثین کی زبان پر دائر و سائر ہوں اور ائمہ حدیث نے مولف سے پہلے ہی ان حدیثوں کو مختلف طرق سے روایت کیا ہو اور اپنے مسندوں اور مجموعوں میں ان کو بیان کیا ہو اور مؤلف کے بعد کے لوگوں نے اس کی روایت کرنے اور محفوظ رکھنے کی طرف توجہ کی ہو، اس کا اشکال رفع کر دیا ہو، اس کے غریب الفاظ کی شرح کر دی ہو اس کا اعراب بیان کیا ہو، اس کے طرق بیان کئے ہوں، مسئلہ فقہی اس سے مستنبط کیا ہو، اور ہر درجہ اور مرتبے میں ہمارے زمانہ تک اس کے راویوں کے حالات کا سراغ لگایا گیا ہو یہاں تک کہ کوئی چیز جو حدیث سے متعلق ہے ایسی باقی نہ رہے جس میں پورا غور نہ کر لیا ہو، الا ما شاء اللہ، ناقدین حدیث

نے مؤلف سے پہلے اور اس کے بعد اس کے اقوال سے موافقت کی ہو اور ان کی صحت کا حکم دیا ہو اور ان میں مصنف کی رائے پر رضا مند ہو گئے ہوں اور اس کی کتاب کی ثنا خوانی بھی کی ہو اور ائمہ فقہ نے ہمیشہ ان احادیث سے استنباط مسائل کیا ہو اور ان پر اعتماد کیا ہو اور عام لوگ بھی ان پر اعتقاد رکھتے ہوں اور ان کی تعظیم کرتے ہوں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب کسی کتاب میں یہ دونوں اوصاف جمع ہوں تو وہ طبقۂ اولیٰ کی سمجھی جائے گی پھر ان اوصاف کے اعلیٰ درجہ کے لحاظ سے فوقیت ہوتی جائے گی اور جس کتاب میں یہ دونوں اوصاف بالکل مفقود ہوں گے تو اس کتاب کا کچھ بھی اعتبار نہ ہوگا، اور جو کتاب طبقۂ اولیٰ میں اعلیٰ درجہ کی ہو تو وہ تواتر کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس سے کم درجہ کی مستفیض کے مرتبہ تک پہنچتی ہے، پھر اس کے بعد وہ ہے جو قطعی صحت کے قریب ہو، اور قطعی ہونے سے مراد وہ یقین ہے جو علم حدیث میں معتبر اور مفید عمل ہے، اور دوسرے طبقہ کی احادیث وہ ہیں جو مستفیض کے قریب ہوں یا صحت قطعیہ کے قریب ہوں یا ظنیہ کے قریب ہوں اور اسی طرح ان احادیث کا درجہ کم ہوتا جاتا ہے، پس استقرا اور تلاش سے طبقۂ اولیٰ کی صرف تین کتابیں ہیں، موطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم، امام شافعی فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد سب کتابوں میں زیادہ صحیح کتاب امام مالک کی مؤطا ہے اور اہل حدیث متفق ہیں کہ امام مالک اور ان کے موافقین کی رائے کے مطابق موطا کی تمام احادیث صحیح ہیں اور دوسرے محدثین کی رائے کے موافق اس میں کوئی مرسل اور منقطع حدیث ایسی نہیں ہے کہ دیگر طرق سے اس کی سند متصل نہ ہوئی ہو پس اس وجہ سے موطا کی تمام احادیث صحیح ہی ہیں امام مالک کے زمانہ میں بہت سی مؤطا تصنیف کی گئیں جن میں موطا مالک کی احادیث کی تخریج کی گئی اور اس کی منقطع احادیث کو متصل کیا گیا جیسے ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، ثوری اور معمر وغیرہم جن کے اساتذہ اور امام مالک کے اساتذہ مشترک تھے اور اس کتاب کو امام مالک سے بلا واسطہ ایک ہزار سے زیادہ آدمیوں نے روایت کیا ہے، نہایت دور دراز ملکوں سے لوگ سفر کر کے احادیث موطا کے لئے امام مالک کے پاس حاضر ہوئے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشین گوئی کی تھی، امام مالک کے شاگردوں میں سے بعض بڑے بڑے فقہا تھے جیسے امام شافعی، محمد بن حسن، ابن وہب اور ابن قاسم، اور ان میں سے بعض بڑے بڑے محدثین تھے جیسے

یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبدالرزاق، اور ان کے شاگردوں میں سے بعض امراء اور سلاطین تھے جیسے ہارون رشید اور ان کے دونوں بیٹے، اور مؤطا کی شہرت امام مالک ہی کے زمانہ میں تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی تھی، اس کے بعد جو زمانہ بھی آیا اس میں اسی کتاب کو زیادہ شہرت ہوئی اور اسی کی طرف توجہ زیادہ ہوئی اور شہروں کے فقہا نے اپنے مذاہب کا مبنیٰ بھی اسی کو قرار دیا یہاں تک کہ بعض امور میں اہل عراق نے بھی اسی کو بنیاد ٹھیرایا اور علما برابر اس کی حدیثوں کی تخریج کرتے رہے ہیں اور اس کے شواہد اور توابع کو بیان کرتے رہے ہیں اور اس کے غریب الفاظ کی شرح اور مشکل کا انضباط کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ اس کے مسائل میں مباحثہ کرتے رہے ہیں اور اس کے راویوں کی اس حد تک تفتیش کی ہے کہ اس کے بعد غور کا کوئی درجہ باقی نہ رہا اور اگر تم حق صریح چاہتے ہو تو کتاب موطا کا امام محمد کی کتاب الآثار اور امام ابو یوسف کی کتاب امالی سے موازنہ کرلو، موطا میں اور ان دونوں کتابوں میں بعدالمشرقین تم کو نظر آئے گا۔

تم نے کسی محدث اور کسی فقیہ کو سنا ہے کہ ان دونوں کی طرف اس نے توجہ کی ہے؟

لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم، پس محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں اور یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک بالتواتر پہنچتی ہیں اور جو ان کی عظمت نہ کرے وہ مبتدع ہے جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔

اور اگر تم حق صریح چاہو تو ان دونوں کتابوں کا ابن ابی شیبہ اور طحاوی کی کتابوں اور خوارزمی وغیرہ کی مسندوں سے مقابلہ کرو تم ان میں بعدالمشرقین پاؤ گے۔

اور حاکم نے صحیحین کی احادیث پر ان دونوں کی شرط کے موافق دیگر احادیث کا اضافہ کیا ہے جن کو شیخین نے ذکر نہیں کیا تھا، میں نے ان احادیث کا تتبع کیا ہے جن کا حاکم نے اضافہ کیا ہے ان کو ایک وجہ سے میں نے درست پایا اور ایک وجہ سے غیر درست، اس واسطے کہ حاکم نے بہت سی احادیث کو صحت اور اتصال میں اساتذۂ شیخین سے ان دونوں کی شرط کے موافق مروی پایا، پس حاکم کا اس وجہ سے اضافہ کرنا درست ہے لیکن شیخین اس حدیث کو ذکر کرتے ہیں جن میں ان کے اساتذہ نے خوب غور کرلیا تھا اور اس کے بیان کرنے پر اور اس کی صحت پر ان کا اتفاق ہوگیا تھا جیسے امام مسلم نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ انھوں نے یہ کہا کہ میں یہاں صرف وہی

احادیث بیان کروں گا جن پر سب اساتذہ کا اتفاق ہے اور بڑی سے بڑی احادیث جن کو حاکم نے ذکر کیا ہے وہ ہیں جو صحیحین کے مشائخ کے زمانہ میں مخفی تھیں اگرچہ بعد میں ان کی شہرت ہوگئی تھی یا وہ تھی یا وہ ہیں جن کو راویوں میں محدثین نے اختلاف کیا ہے، پس شیخین اپنے اساتذہ کی طرح حدیثوں کے موصول اور منقطع ہونے میں اتنا غور وخوض کرتے تھے کہ اصلی حالت کا انکشاف ہو جاتا تھا اور حاکم نے اکثر ان قواعد پر اعتماد کیا ہے جو محدثین کے فنون سے حاصل کئے گئے ہیں جیسا کہ حاکم کا قول ہے کہ ثقہ راویوں کی زیادتی مقبول ہے۔

اور جب حدیث کے موصول و مرسل ہونے اور موقوف و مرفوع وغیرہ ہونے میں علما کا اختلاف ہو تو جس نے ایک بات زیادہ یاد رکھی وہ اس پر حجت ہے جس نے اس کو یاد رکھا، اور حق بات یہ ہے کہ بسا اوقات حفاظ میں موقوف اور منقطع کے موصول کرنے میں خلل پڑ جاتا ہے بالخصوص جبکہ حفاظ کو متصل مرفوع کی طرف زیادہ میلان وتوجہ ہوتی ہے اس واسطے شیخین بہت سی ان احادیث کے قائل نہیں ہیں جن کے حاکم قائل ہیں، واللہ اعلم۔

اور یہی تینوں کتابیں وہ ہیں جن کے ضبط مشکلات اور رد تحریفات کا قاضی عیاض نے مشارق الانوار میں اہتمام کیا ہے۔

طبقۂ ثانیہ میں وہ وہ کتابیں ہیں جو مؤطا اور صحیحین کے درجہ تک نہیں پہنچتی ہیں لیکن ان کے قریب قریب ہیں، ان کے مصنف وثوق، عدالت اور حفظ میں مشہور تھے اور فنون حدیث میں تبحر تھے اور انھوں نے اپنی اس درجہ کی تصانیف میں ان شروط میں کوتاہی کرنے کو پسند نہیں کیا جن کو انھوں نے اپنے اوپر لازم کرلیا تھا پس ان کے بعد ہر زمانہ میں محدثین اور فقہا نے ان کتابوں کو قبول کیا اور ان کی طرف توجہ کی اور وہ لوگوں میں مشہور ہوگئیں اور لوگوں نے ان کے غریب کی شرح کی اور ان کے راویوں کی تفتیش کی اور ان کتابوں سے مسائل کا استنباط کیا اور عام علوم کی بنا انہی کتابوں کی احادیث پر ہے اس طبقہ میں سنن ابوداؤد، جامع ترمذی اور نسائی ہیں، اس طبقہ کی اور طبقۂ اولی کی احادیث کو رزین نے تجرید صحاح میں اور ابن اثیرؒ نے جامع الاصول میں جمع کیا ہے اور مسند امام احمد بھی تقریباً اسی طبقہ کی ہے، اس واسطے کہ امام احمد نے اس کتاب کو اصل قرار دیا ہے جس سے صحیح اور سقیم میں فرق ہوتا ہے، اور فرمایا ہے جو حدیث میری کتاب میں نہیں ہے اس کو قبول نہ کرو۔

طبقۂ ثالثہ میں وہ مسندیں، جوامع اور تصنیفات داخل ہیں جو بخاری و مسلم سے پہلے یا ان کے زمانہ میں یا ان کے بعد تصنیف ہوئی ہیں اور ان میں صحیح، حسن، ضعیف، معروف، غریب، شاذ، منکر، خطا و ثواب اور ثابت و مقلوب ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں اگرچہ ان سے اجنبیت محض رفع ہوگئی ہے تاہم علما میں ان کی ویسی شہرت نہیں ہے۔

ان احادیث کا جو ان کتابوں میں متفرد ہیں فقہا نے کچھ زیادہ استعمال نہیں کیا اور محدثین نے ان کی صحت و سقم سے زیادہ بحث نہیں کی۔

اور ان میں سے بعض کتابیں ایسی ہیں کہ کسی اہل لغت نے ان کی غرابت دور کرنے میں کوئی خدمت نہیں کی اور کسی فقیہ نے سلف کے مذاہب پر ان کو منطبق نہیں کیا اور کسی محدث نے ان کی مشکلات کو بیان نہیں کیا اور کسی مورخ نے ان کے اسمار جال کو ذکر نہیں کیا، میری مراد ان متاخرین سے نہیں ہے جن کی نظر گہری ہے، میرا کلام ان ائمہ حدیث میں ہے جو زمانۂ سلف میں تھے پس یہ کتابیں خفا اور گمنامی حالت میں باقی رہیں، جیسے مسند ابویعلیٰ، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند طیالسی، بیہقی، طحاوی اور طبرانی کی تصانیف۔

اور ان مصنفین کی غرض محض احادیث کا جمع کر دینا تھا احادیث کا خلاصہ کرنا، ان کو مہذب بنانا اور عمل کے قابل بنانا مقصود نہ تھا۔

طبقۂ رابعہ میں وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفین نے زمانہ دراز کے بعد ان احادیث کو جمع کرنے کا قصد کیا جو طبقۂ اولیٰ اور طبقۂ ثانیہ کی کتابوں میں نہیں تھیں اور وہ ایسے مجموعوں اور مسندوں میں موجود تھیں جن کی شہرت نہیں ہوئی تھی، ان مصنّفین نے ان احادیث کی وقعت کی اور یہ احادیث ایسے لوگوں کی زبان زد تھیں کہ جن کی حدیث کو محدثین نے اپنی کتابوں میں نہیں لیا تھا جیسے اکثر واعظ مبالغہ آمیز باتیں کیا کرتے ہیں یا وہ حدیثیں کہ اہل ہوا اور ضعیف راویوں سے مروی تھیں، یا وہ صحابہ و تابعین کے آثار تھے یا بنی اسرائیل کے احبار یا حکما و واعظین کے کلام تھے جن کو راویوں نے سہواً یا عمداً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے خلط ملط کر دیا تھا، یا قرآن مجید اور حدیث صحیح کے بعض احتمالات تھے جن کو نیک لوگوں نے جو روایت کے غوامض سے واقف نہیں ہوتے تھے، بالمعنی روایت کر دیا اور ان معانی کو احادیث مرفوعہ سمجھ لیا، یا بعض معانی کتاب وسنت

کے اشارات سے مفہوم ہوتے تھے ان کو عمداً مستقل حدیث سمجھ لیا یا چند احادیث میں چند مختلف جملے وارد ہوئے تھے ان کو ترتیب دے کر ایک حدیث بنا لیا۔ اور ان احادیث کا محل ابن حبان اور کامل ابن عدی کی کتاب الضعفا ہے اور خطیب، ابونعیم، جوزقانی، ابن عساکر، ابن بخار اور دیلمی کی کتب ہیں، اور مسند خوارزمی اسی طبقہ سے معلوم ہوتی ہے اور اس طبقہ میں سب سے زیادہ درست وہ احادیث ہیں جو ضعیف و محتمل ہیں اور سب سے بدتر وہ ہیں جو موضوع یا مقلوب و حد درجہ منکر ہیں اور ابن جوزی کی کتاب الموضوعات میں اسی طبقہ کی احادیث ہیں۔

اس مقام پر ایک طبقہ خامسہ بھی ہے اس طبقہ سے متعلق وہ احادیث ہیں جو فقہا صوفیہ مورخین وغیرہ کی زبان پر مشہور ہیں اور ان چاروں طبقوں میں ان کی کوئی اصل نہیں اور اسی طبقہ سے متعلق وہ احادیث ہیں جن کو بے دین زبان دانوں نے اختراع کیا اور انھوں نے ایسی اسناد قوی بیان کی جن میں جرح نہیں ہو سکتی اور ایسے کلام بلیغ سے بیان کیا جس کا صدور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعید معلوم نہیں ہوتا۔ پس ایسے لوگوں نے اسلام میں ایک سخت مصیبت برپا کر دی لیکن اہل حدیث کے فضلا ایسی حدیثوں کو متابعات اور شواہد پر مطابق کر کے دیکھتے ہیں اس وقت ان پر پردہ دری ہوتی ہے اور عیب ظاہر ہو جاتا ہے لیکن طبقۂ اولیٰ اور طبقۂ ثانیہ۔ پس ان پر محدثین کا اعتماد کامل ہے انہی سے ان کو ہمیشہ وابستگی رہی ہے لیکن طبقۂ ثالثہ پس اس طبقہ کی حدیثوں پر عمل کرنا اور ان کا قائل ہونا ان متبحرین اور محققین کا کام ہے جو اسمار جال اور علل احادیث کو محفوظ رکھتے ہیں۔ البتہ اس طبقہ کی حدیثوں سے اکثر متابعات اور شواہد ماخوذ ہوتے ہیں۔ قد جعل اللہ لکل شئ قدراً لیکن طبقۂ رابعہ، پس اس طبقہ کی احادیث سے شغل رکھنا ان کو جمع کرنا اور ان سے مسائل کا استنباط کرنا، علما متاخرین کی طرف سے ایک طرح کا تعمق ہے۔

اور حق بات یہ ہے کہ متبدعین کے گروہ روافض اور معتزلہ وغیرہ ادنی توجہ سے ان احادیث سے اپنے مذاہب کے شواہد کو تلخص کر سکتے ہیں۔ لیکن علما حدیث کے معرکوں میں اس طبقہ کی احادیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، واللہ اعلم۔

پانچواں باب: اس بیان میں کہ کلام سے مراد کیسے سمجھ میں آتی ہے

واضح ہو کہ متکلم کا دلی مقصود بیان کرنے اور سامع کا اس سے مطلب سمجھنے کے بلحاظ ظہور و خفا

کے بالترتیب کئی درجات ہیں، سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک شئے خاص کے لئے صریح طور پر حکم ثابت کیا گیا ہو اور اسی کے بتانے اور سمجھانے کو وہ کلام بولا گیا ہو اور اس میں کسی دوسرے معنی کا احتمال نہ ہو، اور اس کے بعد اس کا درجہ ہے جس میں ان تین قیدوں میں سے کوئی قید نہ پائی جائے بلکہ یا اس میں حکم کا ثبوت کسی عنوان کے لئے ہو جو چند افراد کو خواہ بطریق شمول خواہ بطریق بدلیت شامل ہو جیسے الناس اور مسلمون اور قوم ورجال ہے اور اسماء اشارہ جب اس کا صلہ عام ہو اور موصوف جس کی صفت عام ہو اور منفی بلام الجنس ہے اس واسطے کہ اکثر عام معنی کو خصوصیت لاحق ہو جاتی ہے اور یا یہ ہو کہ کلام خاص اس مقصد کے لئے نہ بولا جائے بلکہ اس موقع سے وہ مطلب لازمی طور پر حاصل ہوتا ہو جیسے اس کلام: ''میرے پاس زید فاضل آیا''۔ میں زید کی فضیلت اور ''اے فقیر زید''۔ میں زید کا فقر لزوماً معلوم ہوتا ہے، یا اس لفظ میں کسی دوسرے معنی کا بھی احتمال ہو جیسے لفظ ''مشترک'' اور وہ لفظ جس کے حقیقی معنی استعمال میں آتے ہوں۔ لیکن معنی مجازی زیادہ مشہور ہوں اور وہ لفظ جس کا علم مثال اور تقسیم سے ہوتا ہو اور کسی جامع مانع تحریف سے معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ سفر معلوم ہے کہ من جملہ اس کی امثلہ کے مدینہ سے مکہ تک کا قصد کرنے کے نکلنا ہے، اور معلوم ہے کہ بعض حرکات بطور تفریح کے ہوتی ہیں اور بعض حرکات ضرورت کی بنا پر ہوتی ہیں کہ اسی روز وہ اپنے گاؤں کی طرف لوٹ آتا ہے اور بعض حرکات سفر ہوتی ہیں اور ان کی حد معلوم نہیں ہوتی اور جیسا کہ وہ لفظ جو دو شخصوں کے دائر ہو جیسے اسم اشارہ اور ضمیر جبکہ قرائن میں تعارض ہو، یا وہ دونوں ایک صلہ کے مصداق ہو رہے ہوں، پھر اس کلام کے بعد اس کلام کا درجہ ہے جس کے بغیر توسط استعمال لفظ کے مطلب مفہوم ہو جائے، ایسے طریقے بڑے بڑے تین ہیں، ایک نحوی کلام ہے اور وہ یہ ہے کہ کلام کسی ایسے امر کا حال بتلائے جس کا عبارت میں ذکر نہیں، ایسے معنی کے توسط سے جس کی وجہ سے وہ حکم ذکر کیا گیا ہے جیسے ''ماں باپ کو اف بھی نہ کرو'' اس سے ماں باپ کو مارنے کی حرمت بطریق اولیٰ سمجھی جاتی ہے اور جیسے کہا جائے کہ جو شخص رمضان میں دن میں کھائے گا تو اس پر قضا واجب ہو جائے گی اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو روزہ توڑے گا اس پر قضا لازم ہوگی اور صرف کھانے کی صورت اس واسطے ذکر کی گئی کہ یہ صورت ذہن میں جلد آجایا کرتی ہے۔ دوسرا اقتضا ہے اس سے مطلب اس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ وہ معنی مستعمل فیہ کو عادتاً یا عقلاً یا

شرعاً لازم ہوتا ہے مثلاً یہ کلام ''میں نے آزاد کیا یا فروخت کیا'' اس امر کا اقتضا کرتا ہے کہ پہلے سے وہ شئے اس کی ملک ہو، اور ''وہ چلا'' تقاضا کرتا ہے کہ اس کے پاؤں سالم تھے، اور اس نے نماز پڑھی، کا مقتضایہ ہے کہ وہ طہارت سے تھا، تیسرا ایما ہے اور وہ ایک مقصود کو عبارات میں مناسب اعتبارات سے ادا کرنا ہے پس بلیغ لوگ اس بات کا قصد کرتے ہیں کہ عبارت اس اعتبار مناسب کے مطابق ہو جو اصل مقصود پر زاید ہے، اس واسطے کلام سے اس کے مناسب اعتبار کو سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شئے کو وصف یا شرط سے مقید کرنا، اس وصف اور شرط سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اگر یہ وصف اور شرط نہ پائے جائیں گے تو یہ حکم بھی نہ ہوگا لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب اس کلام سے جس میں وصف یا شرط ہے سوال وجواب کی مشابہت مقصود نہ ہو اور نہ اس صورت کا بیان کرنا مقصود ہو جو اذہان کی طرف متبادر ہوتی ہے اور نہ حکم کا فائدہ بیان کرنا مقصود ہو، اور ایسے ہی مفہوم استثنا، غایت اور عدد کا حال ہے، اور ایما کے اعتبار کرنے میں یہ شرط ہے کہ اس ایما کی وجہ سے اہل زبان کے عرف میں کلام میں تناقض سمجھا جائے مثلاً کوئی شخص اس طرح کہے کہ مجھ کو دس دینے ہیں سوائے ایک شئے کے اور پھر یہ کہے کہ مجھ کو ایک دینا ہے پس جمہور اس کے کلام میں تناقض کہیں گے لیکن وہ امور جن کو سوائے علم معانی میں غور وخوض کرنے والوں کے کوئی نہیں سمجھتا ان کا کچھ لحاظ نہیں ہے، اس کے بعد ان مطالب کا درجہ ہے جن کی رہبری مضمون کلام سے ہوتی ہے اس کی بھی تین بڑی قسمیں ہیں، اول عموم میں کسی شئے کو مندرج کرنا مثلاً بھیڑیا کچلیوں والا ہوتا ہے اور ہر کچلی والا جانور حرام ہوتا ہے اور اس کا بیان قیاس اقترانی سے ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''گدھوں کے بارے میں سوائے اس تنہا جامع آیت کے مجھ پر اور کچھ نازل نہیں ہوا اور وہ آیت یہ ہے ''جو شخص ذرہ برابر بھی کرے گا وہ اس کی جزا دیکھے گا اور جو شخص ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کی جزا دیکھے گا''۔ اور اسی قسم سے ہے عبداللہ بن عباس کا استدلال اس آیت سے: **فبھداھم اقتدہ** اور اس آیت سے: **وظن داؤد انما فتناہ فاستغفر ربہ وخر راکعا واناب** ''پھر عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ تمہارے پیغمبر کو ان کی پیروی کا حکم ہوا تھا، اور ایک استدلال ملازمت یا منافات کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ وتر اگر واجب ہوتے تو آپ ان کو سواری پر ادا نہ کرتے لیکن آپ ان

کو سواری پر ادا کیا کرتے تھے۔ اور اس استدلال کا بیان قیاس شرط کی صورت میں ہے اور اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کی یہ آیت "لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا"۔ اور ایک قیاس ہوتا ہے اور وہ کسی علت مشترکہ کی وجہ سے ایک صورت کو دوسری صورت سے تمثیل دینا ہے جیسے یہ قول: گیہوں کی طرح چنا بھی ربوی ہے (یعنی اس میں بھی ربوٰی ہوتا ہے) ایسا ہی قیاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں ہے "اگر تیرے باپ پر قرضہ ہوتا اور تو اس کو ادا کرتا تو کیا اس کی طرف سے کافی ہو جاتا؟ اس شخص نے کہا ہاں، ہو جاتا، تب آپ نے فرمایا "پس تو باپ کی طرف سے حج کر"۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: کتاب و سنت سے احکام شرعیہ کے سمجھنے کی کیفیت کا بیان

واضح ہو کہ جن الفاظ سے رضا اور ناراضی معلوم ہوتی ہے وہ الفاظ حب و بغض، رحمت و لعنت اور قرب و بعد ہیں اور وہ الفاظ ہیں جن میں فعل کی نسبت محبوب یا مغضوب کی طرف ہوتی ہے جیسے مومنین اور منافقین، ملائکہ اور شیاطین، اہل جنت اور اہل نار، اور وہ الفاظ ہیں جن سے طلب اور منع ہوتی ہے یا اس جزا کا بیان ہوتا ہے جو فعل پر مرتب ہوتی ہے یا عرف کی کسی عمدہ یا مذموم شئے کے ساتھ تشبیہ ہوتی ہے، اور نیز رضا و ناراضی اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کے کرنے کا اہتمام فرمائیں یا باوجود دواعی کے اس سے اجتناب کریں، لیکن یہ امر کہ رضا اور ناراضی کے درجات وجوب و ندب اور حرمت و کراہت میں باہم تمیز ہو، پس اس میں سب سے زیادہ صورت یہ ہے کہ اس فعل کے مخالف کا حال بیان کیا جائے جیسے یہ حدیث "جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرے گا قیامت کے روز اس کا مال گنجے سانپ کی صورت میں ہوگا" اور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "ومن لا فلا حرج" اور ان درجات کی تمیز اس سے بھی ہوتی ہے کہ مثلاً کہا جائے فلاں شئے واجب ہے یا فلاں شئے ناجائز ہے یا کوئی شئے اسلام یا کفر کے لئے رکن قرار دی جائے یا اس کی بجا آوری یا ترک پر نہایت شدت کی جائے یا اس کے متعلق ایسا کہہ دیا جائے کہ یہ امر مروت سے بعید ہے یا مناسب نہیں ہے، نیز صحابہ اور تابعین اس بارے میں کوئی حکم معین کریں جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے" اور جیسے حضرت علی کا قول ہے کہ "وتر واجب نہیں ہے"۔ یا مقصد کی حالت دیکھی جائے کہ آیا اس سے کسی

طاعت کی تکمیل ہوتی ہے یا کسی گناہ کا ذریعہ بند ہوتا ہے یا اس عمل میں وقار اور حسن ادب کی شان معلوم ہوتی ہے لیکن کسی فعل کی علت اور رکن اور شرط معلوم کرنا ہو تو ان امور کے لئے سب سے صریح اور صاف یہ ہے کہ وہ نص سے ثابت ہو جیسے ہر نشہ والی چیز حرام ہے، جو شخص نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے گا اس کی نماز نہ ہوگی، تم میں سے کسی کی نماز بغیر وضو کے قبول نہ ہوگی''۔ اس کے بعد وہ ہے جو اشارہ اور ایما سے ثابت ہو جیسا کہ ایک شخص نے کہا تھا کہ ''رمضان میں میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہو گیا، آپ نے فرمایا ایک غلام آزاد کر'' اور جیسا کہ نماز کو قیام، رکوع اور سجود کے نام سے تعبیر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ امور نماز کے ارکان ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے: ''ان کو چھوڑ کیونکہ میں نے ان کو طہارت کی حالت میں پہنا ہے''۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ موزے پہننے کے وقت طہارت کا ہونا شرط ہے نیز علت و شرط و رکن کی یہ پہچان ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شئے کے پائے جانے کے وقت ایک شئے کے وجود اور اس کے نہ پائے جانے کے وقت اس شئے کے عدم کا حکم کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ذہن میں اس شئے کا علت ہونا یا شرط ہونا یا رکن ہونا اس طرح جم جاتا ہے جس طرح اہل عرب کی ممارست سے اور قرائن کے موافق الفاظ کو معانی موضوعہ میں استعمال کرنے سے ایک فارسی کے ذہن میں لغات عرب کے معانی کی معرفت متمکن ہو جاتی ہے حالانکہ وہ ان الفاظ کے معنی وضعی نہیں جانتا، اور اس کے جاننے کا مدار انہی مواضع استعمال کی معرفت پر ہے پس اسی طرح جب ہم شارع کو دیکھتے ہیں کہ جب بھی وہ نماز پڑھتا ہے تو رکوع اور سجود کرتا ہے اور اپنے بدن سے ناپاکی دور کرتا ہے اور ہر دفعہ ایسا ہی کرتا ہے تو ہم کو یقین ہو گیا کہ یہ امور مقصود ہیں، اگر تم حق معلوم کرنا چاہتے ہو تو ذاتی صفات معلوم کرنے کا مدار علیہ یہی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ لکڑیاں جمع کرتے ہیں اور ان سے ایسی چیز بناتے ہیں جو نشست کے قابل ہو اور اس کو تخت کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو اس سے ہم کو تخت کے اوصاف ذاتی کا انتزاع ہوتا ہے اس کے بعد وجود مناسبت پر اعتماد کرتے ہوتے یا مشابہت وحذف پر اعتماد کرتے ہوئے مدار علیہ کی تخریج کرنا ہے، لیکن ان مقاصد کا معلوم کرنا ہے جن پر احکام کی بناء ہوتی ہے نہایت دقیق علم ہے اس علم میں وہی شخص خوض کر سکتا ہے جس کا ذہن نہایت لطیف اور فہم نہایت مستقیم ہو، اور فقہائے صحابہ نے طاعتوں اور گناہوں کے اصول کو ان مشہور امور

سے اخذ کرلیا تھا جن پر اس زمانہ کے فرقوں کا اتفاق ہو گیا تھا جیسے مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ، اس واسطے صحابہ کو ان احکام کی وجہ اور ان کے متعلق مباحث کی ضرورت نہ تھی، اور شریعت کے قوانین اور سہولت و استحکام دین کے قوانین کو انھوں نے امر و نہی کے مواقع کا مشاہدہ کر کے حاصل کرلیا تھا جیسے طبیب کہ ہم نشین مدت کی میل جول اور مشاقی سے ان دواؤں کے فوائد و مقاصد معلوم کر لیتے ہیں جن کے استعمال کا وہ طبیب حکم کرتا ہے اور صحابہ ان قوانین کو خوب اچھی طرح سے جانتے تھے اسی واقفیت کی وجہ سے حضرت عمر نے اس شخص کی نسبت جو نفل و فرض ملا کر پڑھتا تھا فرمایا تھا اسی سے وہ لوگ ہلاک ہوئے تھے جو تم سے پہلے تھے اس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابن الخطاب تیری رائے کو خدا نے درست کر دیا ہے"۔

اور اسی قبیل سے ابن عباس کا وہ قول ہے کہ جو جمعہ کے غسل کے مسنون ہونے کی وجہ میں کہا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی کہ میں تین باتوں میں اپنے رب کے ساتھ موافق رہا۔

اور زید بن ثابت کا یہ قول بھی اسی قبیل سے ہے جو انھوں نے بیوع ممنوعہ کی وجہ میں فرمایا تھا کہ پھلوں میں مختلف بیماریاں لگنے، گر پڑنے اور سوکھ جانے کی پیدا ہو جایا کرتی تھیں۔

اور اسی قبیل سے حضرت عائشہؓ کا یہ قول ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان امور کو دیکھتے جو عورتوں نے اب ایجاد کر لئے ہیں تو ان کو مساجد میں آنے سے روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئی تھیں، معانی شرعیہ معلوم کرنے کا سب سے واضح طریقہ یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت میں مصرح طور پر مذکور ہو۔ اور خدا کا فرمان اے عقلمندو! قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔ اور خدا کا فرمان "خدا نے معلوم کیا کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہو اس واسطے خدا تعالیٰ نے تم پر توجہ فرمائی اور تم کو معاف کر دیا"۔ اور خدا تعالیٰ کا فرمان "اب خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی کر دی اور جان لیا کہ تمہارے اندر ضعف ہے"۔ اور خدا تعالیٰ کا فرمان "اگر اس کو نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور فساد ہو گا"۔ اور خدا تعالیٰ کا فرمان "اگر ان میں سے کوئی راستہ سے بھک جائے تو ایک دوسرے کو یاد دلائے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ کہاں پڑا رہا ہے"۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "جو صبح تک سوتا ہے اس کی ناک پر شیطان شب گزارتا ہے"۔

اس کے بعد ان معانی کا درجہ ہے جو ایما اور اشارہ سے معلوم ہوتے ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ''لعنت کے دنوں (۱) سببوں سے بچو''۔ آپ کا فرمان: ''حدیث کا بندھن (۲) دونوں آنکھیں ہیں''۔ اس کے بعد ان کا درجہ ہے جن کو مجتہد صحابی بیان کرے، اس کے بعد علت حکم کے خارج کرنے کا درجہ ہے، یہ تخریج اس طرح ہو کہ اس کی انتہا ایسے مقصود پر ہوتی ہو جس کا ملحوظ ہونا یا اس کے نظیر کا مسئلہ کی نظر میں ملحوظ ہونا ظاہر ہو، اور مذہبی امور میں سے کسی امر میں لغویت نہیں ہے اس واسطے ضرور ہے کہ مقادیر سے بحث کی جائے کہ خاص خاص مقادیر معین ہوئیں ان کی نظائر معین کیوں نہ ہوئیں اور ضرور ہے کہ مخصصات عموم سے بحث کی جائے کہ ان کو کیوں مستثنیٰ کیا گیا آیا ان میں مقصد فوت تھا یا کوئی مانع موجود تھا جس کو تعارض کے وقت ترجیح دے دی گئی ہے، واللہ اعلم۔

ساتواں باب: مختلف حدیثوں میں فیصلہ کا بیان

بنیادی امر یہ ہے کہ ہر ایک حدیث پر عمل کرنا چاہئے سوائے اس صورت کے کہ کسی تناقض کی وجہ سے تمام احادیث پر عمل نہ ہوسکتا ہو اور واقع میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ فقط ہماری نظر میں اختلاف معلوم ہوتا ہے جب دو مختلف حدیثیں ظاہر ہوں تو اگر وہ فعل رسول کو بیان کرتی ہیں، پس ایک صحابی نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں کام کیا تھا اور دوسرے صحابی نے بیان کیا آپ نے دوسرا کام کیا تھا تو ان حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہوا، اگر یہ دونوں فعل عادت سے متعلق ہیں اور از قسم عبادت نہیں ہیں تو وہ دونوں مباح ہوں گے یا ایک مستحب اور دوسرا جائز ہوگا بشرطیکہ پہلے میں عبادت کے آثار ہوں اور دوسرے میں نہ ہوں، یا دونوں مستحب یا واجب ہوں گے کہ ایک دوسرے کی جگہ کافی ہو جائے گا اگر وہ دونوں عبادت سے متعلق ہیں، حفاظ صحابہ نے اکثر سنن میں ایسی ہی تصریح کی ہے مثلاً وتر میں گیارہ رکعت بھی ہیں نو اور سات بھی ہیں، اور تہجد میں پکار کر پڑھنا بھی ہے اور آہستہ بھی اور اسی قاعدہ کے موافق رفع یدین میں فیصلہ کرنا چاہئے کہ کانوں تک اٹھائے جائیں یا شانوں تک اور ایسے ہی حضرت عمر، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن

---

(۱) [illegible] سایہ دار درخت کے نیچے پاخانہ کرنا دوم عام راستہ پر پاخانہ کرنا۔ (۲) جب تک انسان جاگتا رہتا ہے مضبوط رہتا ہے اور جب سو جاتا ہے تو ہر بند ڈھیلا ہو جاتا ہے اس واسطے سونے سے وضو جاتا رہتا ہے۔

عباس رضی اللہ عنہم کے تشہد میں بھی فیصلہ کرنا چاہئے، اور ایسے ہی وتر میں کہ آیا وہ ایک رکعت ہے یا تین رکعات ہیں، اور ایسے ہی طلب نصرت کی دعاؤں میں اور صبح وشام کی دعاؤں میں اور تمام اسباب واوقات کی دعاؤں میں فیصلہ کرنا چاہئے، یا وہ دونوں حدیثیں کسی تنگی اور حرج کا مخلص ہوں گی اگر ایسی حدیثوں سے پیشتر کوئی ایسا امر ہو گیا ہو جس نے حرج کو واجب کر دیا ہو جیسے کفارہ سے متعلق امور، اور لڑنے والوں کے معاوضے، ایک قول کے موافق۔

یا ان احادیث میں کوئی مخفی علت ہو جو ایک فعل کو ایک وقت میں واجب اور دوسرے فعل کو دوسرے وقت میں مستحسن کر دیتی ہے، یا کسی شئے کو ایک وقت میں واجب اور دوسرے وقت میں اس کے ترک کی رخصت دیتی ہے واسطے ایسی علت کی تفتیش کرنا ضروری ہے، یا ان میں سے ایک فعل کو عزیمت اور دوسرے کو رخصت قرار دیں گے بشرطیکہ اول میں اصالت کا اثر ظاہر ہو اور دوسرے میں حرج اور اگر نسخ کی دلیل ظاہر ہو جائے تو نسخ کا اعتبار ہوگا اور اگر ان دونوں حدیثوں میں سے ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل بیان کیا ہو اور دوسری حدیث میں آپ کے کسی قول کا رفع ہوتا ہو تو اگر اس قول سے تحریم یا وجوب قطعی طور پر معلوم نہ ہوتا ہو، یا وہ قول قطعی الرفع نہ ہو تو دونوں حدیثوں میں کئی وجوہ کا احتمال ہوگا، اور اگر وہ قول تحریم یا وجوب میں قطعی ہے تو دونوں حدیثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت فعل پر محمول ہوں گی یا ان کو نسخ پر محمول کیا جائے گا پس ان دونوں کے قرائن کی تفتیش کی جائے گی اور اگر وہ دونوں حدیثیں قولی ہیں پس اگر ایک حدیث ایک معنی میں ظاہر ہو اور تاویل کرنے سے دوسرے معنی ہو سکتے ہوں اور تاویل بعید بھی نہ ہو تو یہ قرار دیں گے کہ ایک حدیث دوسری حدیث کے لئے بیان ہے اور اگر تاویل بعید ہے تو یہ معنی تاویلی اسی وقت لئے جائیں گے کہ کوئی قرینہ نہایت قوی ہو یا کسی فقیہ صحابی سے یہ تاویل منقول ہو، مثلاً اس ساعت کے متعلق جس میں قبولیت دعا کی امید ہوتی ہے۔ عبداللہ بن سلام سے مروی ہے کہ وہ آفتاب غروب ہونے سے ذرا پہلے کی ساعت ہے، اس پر ابوہریرہؓ نے اعتراض کیا کہ یہ نماز کا وقت نہیں ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ وہ ساعت ہے جس میں مسلمان کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہوگا، جو مانگے گا ملے گا، اس کے جواب میں عبداللہ بن سلام نے یہ فرمایا کہ نماز کا انتظار کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے نماز پڑھنے والا، پس یہ تاویل بعید ہے، اگر ایک

فقیہ صحابی نے اس کو بیان نہ کیا ہوتا تو ایسی تاویلیں قابل قبول نہ ہوتیں۔

اور تاویل کے بعید ہونے کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر اس کو عقول سلیمہ پر بغیر قرینہ یا دلیل کے پیش کیا جائے تو عقول اس کو قبول نہ کریں اور جب یہ تاویل کسی ایما ظاہر یا واضح مفہوم یا مورد نص کے مخالف ہوگی تو بالکل جائز نہیں ہوگی، اور تاویل قریب میں سے قصر عام ہے کہ اس طرح کے حکم میں بعض افراد پر حکم کرنے میں عادت جاری ہو، اور اس میں سے ایک لفظ عام کا استعمال کرنا ہے ایسے موضع میں جہاں عادتاً تسامح کیا جاتا ہے جیسے مدح اور ذم اور اس میں سے ایک ایسے لفظ عام کا استعمال کرنا ہے جو اصل حکم کے افادہ کے بعد واضح حکم کی مشروعیت کے لئے لایا گیا ہو پس وہ قضیہ مہملہ کے درجہ میں کیا جائے گا جیسے آنحضرت کا یہ قول: ''جس کو بارانی پانی ملا اس میں عشر ہے''۔ اور جیسے آپ کا یہ قول: ''پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں'' اور من جملہ تاویلات کے یہ ہے کہ ہر حدیث کو ایک خاص صورت پر محمول کیا جائے بشرطیکہ مناط اور مناسب شاہد ہو، اور تاویلات میں سے یہ بھی ہے کہ ان دونوں کو کراہیت اور بیان جواز پر محمول کیا جائے اگر ممکن ہو اور سختی کو زجر پر محمول کیا جائے بشرطیکہ کوئی خرابی مقدم ہو چکی ہو، لیکن یہ اقوال کہ ''تم پر مردار حرام کیا گیا'' یعنی اس کا کھانا ''اور تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں'' یعنی ان سے نکاح کرنا، اور جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نظر کا لگنا حق ہے'' یعنی اس کی تاثیر ثابت ہے۔ اور رسول حق ہے'' یعنی اس کی بعثت خدا کی جانب سے ہوتی ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت سے خطا اور نسیان کو دور کر دیا گیا'' یعنی وہ گناہ جو اس حالت میں ہو معاف ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بغیر طہارت کے نماز نہیں ہوتی، بغیر ولی کے نکاح نہیں ہوتا، اعمال نیتوں سے ہوتے ہیں'' یعنی ان امور پر وہ آثار جو شریعت نے ان کے لئے مقرر کئے ہیں مرتب نہیں ہوتے اور ''جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو وضو کرو'' یعنی اگر تم کو وضو نہ ہوا کرے۔

پس یہ سب اقوال ظاہر ہیں ان میں کوئی امر تاویلی نہیں ہے اس واسطے کہ عرب ان میں سے ہر لفظ کو ایک محل پر استعمال کرتے تھے اور اس محل کے مناسب معنی مراد لیتے تھے اور یہ ان کی زبان تھی جس کو وہ ظاہر معنی سے عدول کیا ہوا نہیں سمجھتے تھے اور اگر وہ دونوں فعل کسی مسئلہ کا جواب یا کسی واقعہ کے فیصلہ کے متعلق ہوں پس اگر کوئی علت دونوں کو جدا کرنے والی موجود ہو تو اسی کے موافق

فیصلہ کیا جائے گا اس کی مثال یہ ہے کہ ایک جوان شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روزہ میں بوسہ لینے کا مسئلہ پوچھا آپ نے اس کو منع کر دیا اور ایک بوڑھے نے پوچھا تو آپ نے اس کو اجازت دے دی اور ان دونوں میں سے ایک حدیث میں کسی حاجت پر یا سائل کے اصرار پر یا تکمیل امر کی طرف توجہ نہ کرنے پر یا کسی ایسے شخص کی حالت کے رد کرنے پر جس نے اپنی ذات پر نہایت سختی کی ہو سیاق کلام دلالت کرے اور دوسری حدیث میں یہ امور سیاق سے ثابت نہ ہوں تو ایک میں عزیمت اور دوسری میں رخصت کہا جائے گا اور اگر وہ دونوں فعل کسی مبتلا شخص کے لئے مخلص یا گنہگار کے لئے عقوبت یا قسم توڑنے والے کے لئے کفارہ ہوں تو دونوں کی صحت کا حکم کیا جائے گا اور نسخ کا بھی احتمال ہوگا اور اسی قاعدہ کے مطابق استحاضہ والی عورت کا فتویٰ ہے کہ کبھی اس کو ہر دو نمازوں کے لئے غسل کا حکم دیا گیا اور کبھی یہ کہ ایام عادت کو حیض سمجھے یا ان دونوں کو ایام حیض سمجھے جن میں زیادہ خون ظاہر ہو، یہ تقریر اس قول کے موافق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استحاضہ والی عورت کو دونوں امر کا اختیار دیا تھا اور یہ کہ عادت اور خون کی رنگت دونوں حیض کا مظنہ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اسی طرح اس اختلاف کو دور کیا جائے گا کہ آپ نے اس شخص کے حق میں جو مر گیا اور اس کے ذمہ روزہ باقی ہے اس کی جانب سے روزہ رکھنے کا اور ایک روایت کے بموجب کھانا کھلانے کا فتویٰ دیا تھا اور اسی طرح ایک قول کے موافق اس شخص کے حق میں جس کو نماز میں شک پڑتا ہو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے شک کو دونوں باتوں میں سے جس طرح چاہے رفع کرے یا تو رکعتوں کی جانچ کرے یا یقینی رکعتوں کو اختیار کرے اور اسی طرح ایک قول کے موافق نسب کے ثابت کرنے میں بھی کبھی قیافہ اور کبھی قرعہ کے ذریعہ فیصلہ فرمایا اور اگر ان احادیث میں دلیل نسخ ظاہر ہو تو ان میں نسخ کا اعتبار کیا جائے گا اور نسخ کبھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے فرمایا ہے کہ میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کر دیا تھا لیکن اب زیارت کیا کرو، اور کبھی نسخ اس درجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حدیثوں کو جمع نہ کر سکتے ہوں۔

اور ایک حدیث دوسری حدیث کے بعد وارد ہوئی ہو، اور جب شارع نے کسی حکم کو مقرر کیا ہو اور پھر اس کی جگہ دوسرا حکم مشروع کر دیا ہو اور پہلے حکم سے سکوت کیا ہو تو فقہا صحابہ نے اس سے

سمجھا ہے کہ وہ پہلے حکم کے لئے ناسخ ہے، یا نسخ کبھی اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ چند احادیث مختلف ہوں اور کسی صحابی نے فیصلہ کیا ہو کہ ایک حدیث دوسری حدیث کے لئے ناسخ ہے پس یہ صورت نسخ کے لئے ظاہر ہے قطعی نہیں ہے اور فقہا کا ان احادیث کو منسوخ کہہ دینا جو ان کے مشائخ کے عمل کے خلاف ہوں کفایت نہیں کرتا، اور نسخ جن امور میں ہیں کہ وہ ظاہر کرتے ہیں، ایک حکم کو دوسرے حکم کے ساتھ تبدیل کر دینا ہے اور درحقیقت وہ ایک حکم کا ختم ہو جانا ہے یا تو اس وجہ سے کہ علت ختم ہو گئی یا مقصود اصلی کے لئے اس علت کا مظنہ ہونا ختم ہو گیا یا علت کے ظاہر ہونے سے کوئی امر مانع پیش آ گیا یا وحی خداوندی کی وجہ سے یا آپ کے اجتہاد کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر دوسرے حکم کی ترجیح ظاہر ہو گئی ہو اور اس قسم کی ترجیح اس وقت ہوتی ہے جبکہ پہلا حکم اجتہادی ہو حدیث معراج میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''میرے ہاں قول میں تبدیلی نہیں ہوتی''۔

اور جب دونوں حدیثوں کے جمع کرنے کی گنجائش نہ ہو اور نہ ہی تاویل کی گنجائش ہو اور نسخ بھی معلوم نہ ہو تو ان حدیثوں میں تعارض پایا جائے گا پس اگر ان میں سے ایک کی ترجیح ثابت ہو گی تو راجح کو اختیار کیا جائے گا۔ ورنہ دونوں حدیثیں ساقط ہو جائیں گی، اور ترجیح یا تو سند کی وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کے راوی زیادہ اور فقیہ ہوں اور وہ حدیث متصل ہو اور اس کے مرفوع ہونے کی تصریح ہو اور راوی سے خود اس حدیث کا تعلق ہو کہ اس نے خود فتویٰ دریافت کیا ہو یا اس سے خطاب کیا گیا ہو یا اس فعل کو جو اس میں مذکور ہے وہ اپنے عمل میں لایا ہو، اور یا ترجیح اس وجہ سے ہوتی ہے کہ نفس حدیث میں کوئی امر موکد و مصرح ہو یا ترجیح حکم اور اس کی علت کی وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ حکم احکام شرعیہ کے مناسب ہو اور اس علت کو ان احکام سے اتنا شدید تعلق ہو کہ اس علت کی تاثیر پہچانی جاتی ہو، یا ترجیح کسی خارجی امر کی وجہ سے ہوتی ہے جس کو اکثر اہل علم نے قبول کیا ہو، اور حدیثوں کے ساقط ہونے کی صورت محض فرضی ہے۔ ایسی حدیثیں تقریباً معدوم ہیں اور صحابی کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور منع کیا اور آپ نے فیصلہ کیا اور آپ نے رخصت دی، اس کے بعد یہ کہنا کہ ہم کو یہ حکم دیا گیا اور ہم کو اس سے منع کیا گیا پھر یہ کہنا کہ یہ امر مسنون ہے اور جس نے ایسا کیا اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی، پھر یہ کہنا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے تو اس سے بظاہر مرفوع ہونا معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے

علت کو حکم کا مدار علیہ خیال کر کے اپنے اجتہاد کو دخل دیا ہو حکم کی خود تعیین کر دی ہو کہ وہ واجب ہے یا مستحب، عام ہے یا خاص۔

اور صحابی کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کیا کرتے تھے، اس سے کسی کام کو چند بار کرنا ظاہر ہوتا ہے اور کسی دوسرے صحابی کا یہ کہنا کہ آپ دوسرا فعل کیا کرتے تھے، اس پہلے فعل کے منافی نہیں ہے۔ اور صحابی کا یہ کہنا کہ میں آپ کی صحبت میں رہا اور میں نے آپ کو منع کرتے نہیں دیکھا، یا یہ کہنا کہ ہم آپ کے عہد میں اس فعل کو کرتے تھے تو اس سے اس حکم کا ثبوت ظاہر ہوتا ہے اور وہ نص نہیں ہوسکتا، اور کبھی روایتوں اور طرق کے اختلاف سے احادیث کے الفاظ میں اختلاف ہو جاتا ہے اور یہ اختلاف حدیث کی نقل بالمعنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی حدیث ایسی وارد ہو کہ فقاہت کا اس کے الفاظ میں اختلاف نہ ہو تو ظاہراً یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہوں گے اور ان الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے، واؤ اور فا سے اور ایسے ہی ان معانی سے جو اصل مراد سے زائد ہوں استدلال ہوسکتا ہے اور اگر راویوں نے باہم ایسا اختلاف کیا ہے جن کا احتمال ہوسکتا ہے اور وہ سب فقاہت، حفظ اور کثرت میں ہم مرتبہ ہوں تو اس امر کا ظہور ساقط ہو جائے گا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں، پس صرف اس معنی سے استدلال ہو سکے گا جس کو بالاتفاق سب نے بیان کیا ہوگا اور عام رواۃ صرف اصل معانی کا اعتبار کیا کرتے تھے حواشی اور زوائد کا لحاظ نہیں کرتے تھے اور اگر راویوں کے مراتب میں اختلاف ہو تو اس قول کو لیا جائے گا جو ثقہ سے منقول ہے۔ یا اکثر سے منقول ہے یا اس شخص سے منقول ہے جو واقعہ سے خوب واقف ہے اور اگر کسی ثقہ کے قول میں کوئی زاید بات نہایت ضبط کے ساتھ منقول ہو تو اس کو لیا جائے گا جیسے راوی کا یہ قول کہ حضرت عائشہ نے ''وثب'' کا لفظ فرمایا اور ''قام'' کا لفظ نہیں کہا اور حضرت عائشہ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ نے اپنی جلد پر پانی بہایا اور یہ نہیں کہا کہ آنحضرتؐ نے غسل کیا، اور اگر راویوں نے روایت حدیث میں بہت زیادہ اختلاف کیا ہو اور وہ سب رتبہ میں برابر ہوں اور کوئی مرجح نہ ہو تو وہ خصوصیات جن میں اختلاف ہے ساقط ہو جائیں گی اور اگر حدیث مرسل کے ساتھ کوئی قرینہ شامل ہو گیا ہو مثلاً کسی صحابی کی حدیث موقوف سے اس میں قوت آ گئی ہو یا کسی صحابی کی سند ضعیف یا کسی دوسرے راوی کی مرسل حدیث سے اس کی تائید ہو گئی ہو اور راوی دونوں

کے مختلف ہوں یا اکثر اہل علم کے قول یا قیاس صحیح یا نص کے ایما سے اس کی تائید ہوگئی ہو یا یہ معلوم ہو جائے کہ یہ راوی سوائے ثقہ کے حدیث کو بطریق ارسال بیان نہیں کرتا تو ان سب صورتوں میں اس حدیث مرسل کو قابل حجت سمجھنا صحیح ہوگا لیکن ایسی حدیث مسند سے کم درجہ کی ہوگی اور اگر اس مرسل کی ایسی حالت نہیں ہے تو وہ قابل حجت نہیں ہے، اور اسی طرح وہ حدیث جس کو کوئی قاصر الضبط جو متہم نہ ہو یا مجہول الحال روایت کرے تو مذہب مختار یہ ہے کہ وہ حدیث مقبول ہوگی بشرطیکہ کوئی قرینہ بھی اس کے ساتھ ہو مثلاً قیاس کے موافق ہو یا اکثر اہل علم کا اس پر اتفاق ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تو قابل قبول نہ ہوگی، اور جب کوئی راوی ایسی بات حدیث میں زاید بیان کرے جس پر اور راوی سکوت کر سکتے ہوں تو ایسی زیادتی مقبول ہوگی مثلاً حدیث مرسل کی اسناد بیان کرنا یا اسناد میں کسی راوی کو زیادہ بیان کرنا یا حدیث کا مورد بیان کرنا یا روایت اور درازی کلام کا سبب بیان کرنا اور یا کوئی مستقل جملہ ذکر کرنا جس سے کلام کے معنی میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی ہو اور اگر اس کی زیادتی پر دوسرے رواۃ کا سکوت کرنا ممتنع ہو تو وہ زیادتی مقبول نہ ہوگی مثلاً ایسی زیادتی کرنا جو معنی کو بدل دے یا کوئی ایسی نادر شئے زیادہ کرنا جس کا ذکر کرنا عادۃً ترک نہیں ہوتا اور جب کوئی صحابی حدیث کو کسی موقع پر محمول کرے تو اس میں اگر اجتہاد کو دخل ہے تو وہی حمل کرنا ظاہر سمجھا جائے گا یہاں تک کہ اس حمل کے خلاف کوئی دلیل قائم ہو جائے اور اگر اجتہاد کو اس میں دخل نہ ہو تو یہ حمل کرنا قوی ہوگا اور اس کو ایسا قرار دیا جائے گا جیسے کوئی عاقل زبان دان قرائن حالیہ یا قالیہ کی وجہ سے کوئی معنی خاص متعین کرتا ہے اور اگر صحابہ وتابعین کے آثار میں اختلاف واقع ہو جائے تو مذکورہ بالا وجوہ سے اگر ان میں جمع ممکن ہے تو بہتر ہے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ اس مسئلہ میں دو یا دو سے زیادہ اقوال ہیں اس کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ ان میں سے کون سا زیادہ صحیح ہے اور مذاہب صحابہ کا ماخذ معلوم کرنا ایک مخفی علم ہے اس کے معلوم کرنے میں خوب کوشش کرو اس سے تم کو بڑا فائدہ پہنچے گا، واللہ اعلم۔

تتمہ

پہلا باب: فروعات میں صحابہ اور تابعین کے اختلاف کے اسباب کا بیان

واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد شریف میں نہ تو احکام فقہ جمع ہوئے تھے اور نہ اس وقت مسائل میں ایسی بحثیں ہوتی تھیں جیسی یہ فقہا کرتے ہیں کہ نہایت کوشش سے ارکان وشروط اور ہر شئے کے آداب ایک دوسرے سے جدا جدا مع دلائل کے بیان کرتے ہیں اور صورتیں فرض کر کے ان مفروضہ صورتوں میں گفتگوئیں کرتے ہیں اور جو حد کے قابل ہے اس کی حد بیان کرتے ہیں اور جو حصر کے قابل ہے اس کا حصر کرتے ہیں اور اسی قسم کے بہت سے امور کرتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں، پس آپ وضو کرتے تھے اور صحابہ آپ کے وضو کو دیکھ کر اس پر عمل کرتے تھے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے کہ یہ رکن ہے اور وہ مستحب ہے۔

اور آپ نماز پڑھتے تھے پس صحابہ جس طرح آپ کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتے تھے اسی طرح خود بھی نماز پڑھتے تھے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا پس لوگوں نے بھی دیکھ کر ویسے ہی افعال حج ادا کئے جیسے آپؐ نے ادا کئے، پس غالب حال آپ کا یہی تھا، آپؐ نے اس کی تشریح نہں کی کہ وضوء میں فرائض چھ ہیں یا چار ہیں اور نہ آپؐ نے اس احتمال کو فرض کیا کہ انسان بغیر پے در پے کے وضو کرے تاکہ اس کے صحیح یا فاسد ہونے کا حکم کیا جائے الا ماشاء اللہ اور صحابہ اس قسم کی باتیں آپ سے بہت کم دریافت کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کسی قوم کو نہیں دیکھا انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات تک صرف تیرہ مسئلے دریافت کئے جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں، ان

مسائل میں سے یہ ہے: لوگ آپ سے ماہ حرام میں لڑنے کا حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے اس مہینے میں لڑنا بڑی برائی ہے، اور آپ سے حیض کا حال دریافت کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ صحابہ وہی امور دریافت کرتے تھے جو مفید ہوتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر کا قول ہے کہ وہ امور مت دریافت کرو جو ابھی تک ہوئے نہ ہوں اس واسطے کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب کو اس شخص پر لعنت کرتے سنا ہے جو ایسی باتیں دریافت کرے جو ابھی تک وقوع میں نہ آئی ہوں، قاسم کہتے ہیں کہ تم ایسی باتیں دریافت کرتے ہو جن کو ہم دریافت نہیں کیا کرتے تھے اور ایسی باتوں کی تفتیش کرتے ہو جن کی ہم تفتیش نہیں کیا کرتے تھے، تم وہ امور دریافت کرتے ہو جن کو ہم نہیں جانتے اور اگر ہم ان کو جانتے تو ان کو چھپانا ہم کو جائز نہ تھا، عمر بن اسحٰق سے مروی ہے کہ میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جن سے ملا ہوں، ان کی تعداد ان سے زیادہ تھی جو مجھ سے پہلے گزر چکے تھے، میں نے کسی قوم کو نہیں پایا جن کی روش میں ان سے زیادہ آسانی اور ان سے کم سختی ہو، عبادہ بن بسر کندی سے روایت ہے کہ ان سے کسی نے اس عورت کا حال دریافت کیا جو ایک قوم کے ساتھ مر گئی تھی اور اس کا کوئی ولی نہ رہا تھا پس انھوں نے کہا میں بہت سے لوگوں سے ملا ہوں جو تمہاری طرح سختی نہیں کرتے تھے اور تمہاری طرح مسائل دریافت نہیں کرتے تھے، ان آثار کو دارمی نے روایت کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعات کے متعلق لوگ دریافت کیا کرتے تھے تو آپ بتلا دیا کرتے تھے اور آپ کے پاس قضایا آتے تھے پس آپ فیصلے کر دیا کرتے تھے اور لوگوں کو کوئی اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو ان کی تعریف کرتے تھے اور اگر برا کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو منع کرتے تھے اور جب کبھی آپ نے کسی مستفتی کو فتوی دیا یا کسی قضیہ کا فیصلہ کیا یا کسی کام کرنے والے کو منع کیا تو یہ سب کچھ مجلسوں میں ہوتا تھا اور یہی حالت شیخین حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی تھی، جب ان کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا تھا تو لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث دریافت کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدہ کے حصہ کے متعلق کوئی حکم نہیں سنا اور لوگوں سے انھوں نے اس کو دریافت کیا، ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر فرمایا تم میں سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدہ کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا میں نے سنا

ہے، حضرت ابوبکر نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا، انھوں نے کہا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جدہ کو چھٹا حصہ دلوایا تھا، حضرت ابوبکر نے فرمایا تمہارے سوا کوئی اور شخص بھی اس کو جانتا ہے؟ محمد بن سلمہ نے کہا مغیرہ سچ کہتے ہیں، تب ابوبکرؓ نے جدہ کو چھٹا حصہ دلوایا اور ایسے ہی قصہ ہے حضرت عمرؓ کا غلام آزاد کرنے کی بابت لوگوں سے سوال کرنا اور مغیرہؓ کی خبر کی طرف رجوع کرنا اور لوگوں سے وبا کے متعلق دریافت کرنا اور عبدالرحمٰن بن عوف کی خبر کی جانب رجوع کرنا اور ایسے ہی مجوس کے قصہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی خبر کی طرف رجوع کرنا اور جب عبداللہ بن مسعود کی رائے سے معقل بن یسار کی خبر مطابق ہوگئی تھی تو عبداللہ بن مسعود کا خوش ہونا اور ایسے ہی ابوموسیٰ کا حضرت عمر کے دروازہ سے واپس چلا جانا اور حضرت عمرؓ کا ان سے حدیث دریافت کرنا اور ابوسعیدؓ کا ان کی تصدیق کرنا اور اسی طرح کے بے شمار قصے معلومہ ہیں جو صحیحین اور سنن میں مروی ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت حمیدہ یہی تھی ہر صحابی نے جس قدر اس کو توفیق الٰہی ہوئی آپ کی عبادت، فتاویٰ اور فیصلوں کو دیکھا پس ان کو خوب حفظ کر لیا اور سمجھ لیا اور قرائن سے ہر ایک کی وجہ بھی معلوم کر لی، اور ان امارات اور قرائن کی وجہ سے جو اس صحابی کو معلوم تھے بعض امور کو اباحت پر اور بعض کو نسخ پر محمول کیا۔

صحابہ کی نظر میں سوائے اطمینان قلب اور یقین کے کوئی پسندیدہ امر نہیں تھا انکو استدلال کے طریقوں کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی جیسے تم اعراب کی حالت دیکھتے ہو کہ وہ باہم مقصود کلام کو سمجھتے ہیں اور تصریح یا اشارہ سے ان کو اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے اور ان کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ان کو کیسے اطمینان حاصل ہو گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مبارک ختم ہو گیا اور صحابہ اسی حالت پر رہے، آپ کے بعد صحابہ تمام بلاد میں پھیل گئے اور ہر شخص ایک ایک حصہ کا مقتدیٰ اور رہبر ہو گیا پس واقعات زیادہ پیش آتے گئے اور لوگوں نے مسائل دریافت کرنے شروع کئے ہر صحابی نے اپنی یادداشت اور استنباط کے موافق جواب دیا، اور اگر انھوں نے اپنی یادداشت اور استنباط میں کوئی امر جواب کے قابل نہ پایا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا اور اسی علت کو معلوم کیا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنے مصرح احکام میں مدار علیہ قرار دیا تھا پس انھوں نے جہاں اس علت کو پایا وہیں اس کا حکم متعین کر دیا۔ اور حکم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض کے موافق کرنے میں کوئی کمی نہ کی پس اس وقت ان کے درمیان اختلاف کے چند پہلو ہو گئے جن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک صحابی نے ایک معاملہ میں کوئی حکم یا فتویٰ سن لیا اور دوسرے نے اس کو نہیں سنا اس واسطے اس دوسرے نے اپنی رائے سے اس میں اجتہاد کیا اور اس اجتہاد کے بھی کئی طریقے ہو گئے، اول یہ کہ اس کا اجتہاد اس حدیث کے موافق ہو گیا۔ اس کی مثال وہ حدیث ہے جو نسائی وغیرہ نے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن مسعود سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا کہ ایک عورت کا خاوند مر گیا اور اس نے اس کے لئے کچھ مہر مقرر نہیں کیا تھا، انھوں نے کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں کوئی فتویٰ دیتے نہیں دیکھا ہے لیکن لوگ ایک ماہ تک ان کے پاس آتے جاتے رہے اور اصرار کرتے رہے تب انھوں نے اپنی رائے سے اجتہاد کر کے فیصلہ دیا کہ اس کو اس کے خاندان کی عورتوں کے برابر مہر ملے گا نہ کہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ اور اس کے لئے عدت ضروری ہے اور اس کو ورثہ ملے گا اس کو سنکر معقل بن یسار نے کھڑے ہو کر شہادت دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک عورت کے حق میں ایسا ہی فیصلہ دیا تھا۔ اس سے عبداللہ بن مسعود ایسے خوش ہوئے کہ بعد اسلام کے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے تھے۔

دوم یہ ہے کہ دو صحابیوں میں باہم مناظرہ واقع ہوا اور حدیث اس طرح ظاہر ہو جائے جس کے ہونے کا گمان غالب ہو وہ صحابی اپنے اجتہاد سے اس حدیث مسموع کی جانب رجوع کرے، اس کی مثال وہ حدیث ہے جو ائمہ نے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کا مذہب تھا کہ جس نے جنابت کی حالت میں صبح کی ہو اس پر روزہ نہیں ہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ازواج نے ان کے مذہب کے خلاف حدیث بیان کی تب ابو ہریرہؓ نے اپنے مذہب سے رجوع کیا۔

سوم یہ کہ صحابی کو حدیث پہنچی لیکن اس طرح سے ظاہر نہ ہو جس سے اس کے حدیث ہونے کا ظن غالب ہو، اس واسطے وہ صحابی اپنے اجتہاد کو ترک نہ کرے، بلکہ حدیث میں طعنہ کرے، اس کی مثال وہ حدیث ہے جو اصحاب اصول نے روایت کی ہے کہ فاطمہ بن قیسؓ نے حضرت عمر بن

الخطاب کے پاس حاضر ہوکر شہادت دی کہ اس کو تین طلاقیں خاوند نے دی تھیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے نفقہ اور مکان نہیں دلایا لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی شہادت کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ میں اس عورت کے قول سے کتاب اللہ کو نہیں چھوڑ سکتا ہوں ہم کو معلوم نہیں ہے کہ یہ عورت سچی ہے یا جھوٹی ہے، بیشک مطلقہ کے لئے نفقہ اور مکان ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فاطمہ سے فرمایا کہ تو خدا سے خوف نہیں کرتی، یعنی اپنے قول میں۔ اس کی دوسری مثال وہ ہے جو بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کا مذہب تھا کہ جس جنبی کو پانی نہ ملے اس کے لئے تیمّم کافی نہیں ہے، تب ان کے سامنے عمار بن یاسر نے کہا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھا اور مجھ کو غسل کی ضرورت ہوئی اور پانی نہ ملا پس میں خاک میں لوٹا، اس کے بعد یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو میں نے بیان کی پس آپ نے فرمایا ''تم کو ایسا کرنا کافی تھا اور آپ نے زمین پر دونوں ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر مسح کرلیا''۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا اور ایک مخفی اعتراض کی وجہ سے جو حدیث میں ان کو معلوم ہوا انھوں نے اس حدیث کو حجت قرار نہیں دیا لیکن دوسرے طبقہ میں بہت سے طریقوں سے اس حدیث کی شہرت ہوگئی اور معترض کا وہم ضعیف ہوگیا اس واسطے سب نے اس پر عمل کیا۔

چہارم یہ ہے کہ صحابی کو حدیث پہنچی ہی نہیں، اس کی مثال یہ ہے کہ مسلم نے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عمر عورتوں کو غسل کے وقت حکم کرتے تھے کہ سر کے بالوں کو کھول لیا کریں، پس حضرت عائشہؓ نے یہ بات سنی اور فرمایا ابن عمر سے تعجب ہے کہ وہ عورتوں کے سر کھولنے کا حکم دیتے ہیں ان کو سر منڈوانے کا حکم کیوں نہیں دیدیتے، یقیناً میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے نہایا کرتے تھے اور میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتی تھی کہ اپنے سر پر تین بار پانی بہادیا کرتی تھی، اس کی دوسری مثال وہ ہے جس کو امام زہریؒ نے روایت کی ہے کہ ہندہ کو مستحاضہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نماز کی رخصت کا علم نہ تھا اس واسطے وہ نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے رویا کرتی تھیں۔

اور صحابہ میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ کو کوئی فعل کرتے ہوئے

دیکھا پس بعض نے عبادت پر اور بعض نے اباحت پر اس کو محمول کیا، اس کی مثال وہ حدیث ہے جو اصحاب رسول نے حج کرنے کے بعد مقام ابطح میں قیام کرنے کے متعلق روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ قیام فرمایا تھا پس ابو ہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ آپ عبادت کے طور پر وہاں ٹھیرے تھے، اس واسطے انھوں نے سنن حج میں اس کو شمار کیا اور حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ یہ ٹھیرنا محض اتفاقی امر تھا اور سنن حج میں داخل نہیں ہے اور دوسری مثال یہ ہے کہ جمہور کا مسلک ہے کہ طواف میں رمل کرنا سنت ہے اور عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاقی طور پر ایک امر عارض کی وجہ سے کیا تھا اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے کہا تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے کمزور کر دیا ہے اور یہ رمل کرنا سنت نہیں ہے۔

اور صحابہ کے اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہم کے اختلاف سے ان میں اختلاف ہو گیا، اس کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا اور لوگوں نے آپ کو دیکھا پس بعض نے خیال کیا کہ آپ متمتع تھے اور بعض نے خیال کیا آپ قارن تھے اور بعض نے خیال کیا کہ آپ مفرد تھے، اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ابوداؤد نے سعید بن جبیر سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن عباس سے کہا اے ابو العباس مجھ کو تعجب ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے احرام باندھنے میں اختلاف کیا عبداللہ بن عباس نے فرمایا میں اس کی حقیقت کو سب لوگوں پر زیادہ جانتا ہوں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک حج تھا پس اس میں لوگوں کا اختلاف ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لئے باہر نکلے پس جب آپ نے مسجد ذوالحلیفہ میں نماز پڑھی تو اسی جگہ آپ نے احرام باندھا اور جب دونوں رکعات سے فارغ ہوئے تو تلبیہ حج کیا پس اس کو لوگوں نے سنا اور میں نے اس کو محفوظ رکھا، پھر آپ سوار ہوئے پس جب آپ کی ناقہ آپ کو لیکر کھڑی ہوئی تو آپ نے تلبیہ پڑھا اور اس کو بھی لوگوں نے سنا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے پاس لوگوں کے جدا جدا گروہ آتے تھے پس جب آپ کی اونٹنی کھڑی ہوئی تو لوگوں نے آپ کو تلبیہ پڑھتے سنا پس ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تلبیہ پڑھا جب آپ ناقہ پر سوار ہو گئے تھے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ فرمایا پس

جب بیدا کی بلندی پر چڑھے تو آپ نے تلبیہ فرمایا اور اس کو بھی لوگوں نے سنا پس انھوں نے کہا کہ آنحضرتؐ نے تلبیہ بیدا کی بلندی سے شروع کیا، اور قسم ہے اللہ کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز کی جگہ سے احرام باندھا تھا اور جب اونٹنی کھڑی ہوئی تو آپ نے تلبیہ کہا تھا اور جب بیدا کی چوٹی پر چڑھے تھے تو بھی آپ نے تلبیہ کہا تھا۔

اور صحابہ میں اختلاف کی ایک وجہ سہو ونسیان بھی ہے مثلاً روایت کی گئی ہے کہ عبداللہ بن عمر کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں عمرہ کیا تھا پس حضرت عائشہ نے یہ سن کر فرمایا کہ عبداللہ بن عمر بھول گئے۔

اور صحابہ کے اختلاف کی ایک وجہ ضبط کا مختلف ہونا ہے اس کی مثال وہ حدیث ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عمر نے یا حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ مردہ کو اس کے اہل وعیال کے رونے سے قبر میں عذاب ہوتا ہے، اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ان کو ٹھیک طور پر حدیث معلوم نہیں ہے، (اصل بات یہ ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودیہ کے جنازہ کے پاس سے گزرے اور اس پر اس کے گھر والے رو رہے تھے آپ نے فرمایا "یہ لوگ اس عورت پر رو رہے ہیں اور اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے"۔ پس عبداللہ بن عمرؓ نے خیال کیا کہ "رونا" عذاب قبر کی علت ہے اور سمجھا کہ یہ حکم ہر میت کے لئے عام ہے۔ اور وجوہ اختلاف میں سے ایک یہ ہے کہ صحابہ کا علت حکم میں اختلاف ہو جائے جیسے جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا، پس بعض نے کہا کہ یہ قیام ملائکہ کی تعظیم کے لئے ہے اس لئے مومن اور کافر دونوں کے جنازہ کو شامل ہے اور بعض نے کہا کہ یہ قیام موت کے خوف کی وجہ سے ہے تب بھی دونوں کو شامل ہے اور حسن بن علیؓ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک یہودی کا جنازہ آپ کے پاس سے گزرا آپ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور آپ کو یہ مکروہ معلوم ہوا کہ وہ آپ کے سر کے اوپر سے گزرے، پس یہ حکم خاص کافر کے لئے ہے۔

اور ان وجوہ اختلاف میں سے ایک وجہ وہ مختلف امور کے جمع کرنے میں صحابہ کا آپس میں اختلاف کرنا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال خیبر میں متعہ کی اجازت دے دی تھی اس کے بعد سال اوطاس میں اس کی اجازت دی اور سال اوطاس کے بعد منع فرما دیا، پس عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اجازت ضرورت کی وجہ سے تھی اور ضرورت کے رفع

ہونے پر ممانعت کردی گئی اور وہی ممانعت کا حکم باقی ہے اور جمہور علما کا قول ہے کہ اجازت اباحت کے لئے تھی اور ممانعت نے اس اباحت کو منسوخ کر دیا، اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجا کی حالت میں قبلہ کی جانب رخ کرنے سے منع فرمایا تھا پس ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم عام ہے منسوخ نہیں ہوا اور حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ نے قبلہ کی جانب پیشاب کیا تھا پس انھوں نے سمجھا کہ اس سے پہلے نہی منسوخ ہوگئی، اور حضرت عبداللہ بن عمر نے آنحضرت کو قبلہ کی جانب پشت اور شام کی جانب رخ کئے قضائے حاجت فرماتے دیکھا تھا پس اس سے انھوں نے اس جماعت کے قول کو رد کر دیا اور ایک جماعت نے ان دونوں روایتوں کو جمع کیا ہے پس امام شعبیؒ وغیرہ اس طرف گئے ہیں کہ استقبال قبلہ کی ممانعت جنگل کے ساتھ مخصوص ہے پس جب پاخانوں میں ہوں تو نہ استقبال منع ہے اور نہ استدبار، اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ وہ قول منع فرمانے کا عام اور محکم ہے اور آپ کے فعل میں احتمال ہے کہ وہ آپ کی ذات کے ساتھ خاص ہو اس واسطے وہ نہ ناسخ ہوسکتا اور نہ مخصص ہوسکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان طریقوں سے صحابہ کے مذاہب مختلف ہوگئے تھے اور ان سے تابعین نے اسی طرح حاصل کیا جس طرح جس کو توفیق ہوئی، جس حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مذاہب صحابہ کو انھوں نے سنا اس کو حفظ کیا اور سمجھا اور جہاں تک ہوسکا مختلف امور کو جمع کیا اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو اپنی نظر میں ضعیف سمجھا اگرچہ وہ کبار صحابہ سے مروی تھے جیسے حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کا مذہب کہ وہ جنبی کے لئے تیمم کو جائز نہیں سمجھتے تھے، جب عمار اور عمران بن حصین وغیرہ کی احادیث مشہور ہوئیں تو ان کو وہ مسلک ضعیف معلوم ہوا، اس طرح تابعین میں سے ہر عالم کا ایک مذہب اس کے خیال کے موافق قائم ہوگیا، پس ہر شہر میں ایک امام قائم ہوگیا جیسے مدینہ میں سعید بن المسیب اور سالم بن عبداللہ ابن عمر ہوئے اور ان کے بعد وہیں مدینہ میں امام زہری، قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰنؒ ہوئے، اور مکہ میں عطا بن ابی رباح تھے، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی تھے، بصرہ میں حسن بصری تھے، یمن میں طاؤس بن کیسان تھے اور شام میں مکحول تھے، پس خدا نے بہت سے قلوب کو ان کے علوم کا گرویدہ کر دیا اور لوگوں نے نہایت

رغبت سے ان سے حدیث، صحابہ کے فتوے اور اقوال اور خود ان کے مذاہب اور ان کی تحقیقات کو حاصل کیا اور ان سے مسائل کا استفسار کیا اور مسائل کا خوب ان میں تذکرہ رہا تمام معاملات کے وہ مرجع رہے، سعید بن مسیب اور ابراہیمؒ اور ان کے ہم مرتبہ لوگوں نے تمام ابواب فقہ کو مرتب کر دیا تھا اور ہر باب کے متعلق ان کے پاس اصول وقواعد مرتب تھے جن کو انھوں نے اپنے اسلاف سے حاصل کیا تھا سعید بن مسیّب اور ان کے اصحاب کا یہ مذہب تھا کہ فقہ میں حرمین کے علماء سب سے پختہ اور ان کے مذہب کی بنیاد عبداللہ بن عمر حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عباس کے فتویٰ اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلے ہیں ان سب علوم کو انھوں نے بقدر استطاعت جمع کیا اور ان میں تفتیش کی نظر سے دیکھا جن مسائل پر علماء مدینہ کا اتفاق دیکھا ان کو خوب مستحکم طور سے اختیار کیا اور جو مسائل ان کے نزدیک مختلف فیہ تھے ان میں سے قوی اور راجح کو اختیار کیا ان کے راجح ہونے کی وجہ یا یہ تھی کہ اکثر علما نے اس طرف میلان کیا تھا یا وہ کسی قیاس قوی کے موافق تھے یا کتاب وحدیث سے مصرع طور پر مستنبط ہوئے تھے یا اسی طرح کا کوئی اور امر تھا اور جب انھوں نے اپنے محفوظات میں مسئلہ کا جواب نہ پایا تو اس کو ان کے کلام سے حاصل کیا اور کتاب وسنت کے ایما اور مقتضیٰ کا تتبع کیا اس کی وجہ سے ہر ایک باب میں بکثرت مسائل ان کو حاصل ہو گئے۔ ابراہیم اور ان کے شاگردوں کی رائے یہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے شاگرد فقہ میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں جیسے علقمہ نے مسروق سے کہا تھا کہ کوئی فقیہ عبداللہ بن مسعود سے زیادہ قابل وثوق نہیں ہے اور ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے امام اوزاعیؒ سے کہا تھا کہ ابراہیم، سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحابی ہونے کی فضیلت عبداللہ بن عمر میں نہ ہوتی تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمر سے زیادہ فقیہ ہیں اور عبداللہ بن مسعود تو عبداللہ بن مسعود ہی ہیں اور امام ابوحنیفہ کے مذہب کی اصل عبداللہ بن مسعود کے فتوے حضرت علیؓ کے فیصلے اور قاضی شریح اور دیگر قضاۃ کوفہ کے فتاوے ہیں پس ان میں سے امام ابوحنیفہؒ نے بقدر امکان مسائل فقہ کو جمع کیا اور جیسے اہل مدینہ کے آثار سے مدینہ کے علما نے تخریجات کی تھی ایسے ہی اہل کوفہ کے آثار سے انھوں نے تخریج مسائل کی پس ہر باب کے متعلق مسائل فقہ مرتب ہو گئے۔ اور حضرت سعید بن مسیّب فقہائے مدینہ کی زبان تھے اور ان کو حضرت عمرؓ کے فیصلہ اور حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث سب سے زیادہ یاد

تھیں اور ابراہیم فقہائے کوفہ کی زبان تھے پس جب وہ دونوں کوئی بات کہتے اور کسی کی جانب اس کو منسوب نہ کرتے تو وہ اکثر صراحتاً یا کنایتہً یا کسی اور طرح سے سلف میں سے کسی کی طرف منسوب ہوتی تھی پس فقہائے مدینہ اور کوفہ نے ان دونوں پر اتفاق کیا، ان سے علم حاصل کیا اور سمجھا اور اس علم کے ذریعہ دیگر مسائل کی تخریج کی، واللہ اعلم۔

دوسرا باب: فقہا کے مذاہب مختلف ہونے کے اسباب کا بیان

واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس پیشین گوئی کو پورا کرنے کے لئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی تھی کہ ''بعد والی نسل میں سے عادل لوگ اس علم دین کو حاصل کریں گے''۔ تابعین کے زمانہ کے بعد حاملین علم کی ایک جماعت کو پیدا کیا انھوں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو غسل، نماز، حج، نکاح، بیوع اور تمام کثیر الوقوع احکام کو سیکھا اور احادیث نبوی کی روایت کی، انھوں نے مختلف شہروں کے قاضیوں کے فیصلے اور وہاں کے مفتیوں کے فتوے سنے اور مسائل دریافت کرتے رہے اور ان سب امور میں نہایت کوشش کی آخر وہ مسلمانوں کے مقتدا بن گئے اور تمام امور مذہبی کا مرجع بن گئے، پس انھوں نے بھی اپنے مشائخ کے طریق کو اختیار کیا، ایما اور اقتضائے کلام کے معلوم کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی، پس انھوں نے فیصلے کئے، فتوے دیئے احادیث روایت کیں اور لوگوں کو تعلیم دی، اس طبقہ میں علما کا کام یکساں تھا، اور ان سب کے عمل کا حاصل یہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مسند اور مرسل دونوں سے تمسک کرتے تھے اور صحابہ و تابعین کے اقوال سے استدلال کرتے تھے یہ سمجھ کر کہ یہ اقوال یا تو احادیث ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جن کو کم درجہ کی سمجھ کر احادیث موقوف قرار دیا، جیسے ابراہیم نخعیؒ نے کہا تھا جبکہ انھوں نے اس حدیث کو نقل کیا۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع محاقلہ (پکنے سے پہلے کھیت کو فروخت کر دینا) اور بیع مزابنہ (تر چھواروں کو جو درختوں پر ہوں خشک چھواروں سے فروخت کر دینا) سے منع فرمایا ہے، تو لوگوں نے ان سے کہا: کیا آپ کو اس حدیث کے علاوہ کوئی اور حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا 'ہاں' یاد ہے لیکن میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آنحضرت کا ادباً نام نہ لوں بلکہ یہ کہہ دوں کہ عبداللہ نے ایسا کہا ہے اور علقمہؒ نے ایسا کہا ہے، اور جیسے امام شعبیؒ نے کہا تھا جبکہ ان سے ایک حدیث دریافت

کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ اس کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے، تو انھوں نے کہا میں حدیث کو مرفوع نہیں کرتا میرے نزدیک یہ بہتر ہے کہ کسی اعلیٰ شخص کی طرف حدیث کی نسبت کروں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ سے پست ہے، پس اگر حدیث میں کوئی کمی یا زیادتی ہوگی تو وہ انہی لوگوں پر ہے کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پست درجہ میں ہیں، یا وہ ان اقوال صحابہ سے استدلال کرتے تھے یہ سمجھ کر کہ ان کو صحابہ وتابعین نے منصوصات سے مستنبط کیا یا اپنی رائے سے اجتہاد کیا ہے، اور وہ ان تمام امور میں آئندہ پیدا ہونے والے لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر کام کرنے والے تھے اور ان کی رائے زیادہ درست تھی اور ان کا زمانہ بہت پہلے تھا، ان کے عملی محفوظات زیادہ تھے اس واسطے ان کے اقوال پر عمل کرنا معین ہوگیا سوائے اس صورت کے جبکہ ان میں باہم اختلاف ہو اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر طور پر ان کے اقوال کے مخالف ہو، اور ان سب کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کسی مسئلہ میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف وارد ہوئی تھیں تو وہ اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے تھے، پس اگر وہ ان میں سے کسی کو منسوخ کہتے تھے یا اس کو ظاہر معنی سے ہٹاتے تھے یا نسخ کی تصریح تو نہیں کرتے تھے لیکن اس حدیث کے ترک کرنے اور اس کے مضمون کے قائل نہ ہونے پر متفق ہوتے تھے اس واسطے کہ اس میں کوئی علت ہوتی تھی یا نسخ کا حکم ہوتا تھا یا تاویل کی گنجائش ہوتی تھی تو ان سب امور میں وہ صحابہ کا اتباع کرتے تھے، چنانچہ امام مالکؒ نے اس حدیث کے متعلق جو کتے کے پانی پینے کے متعلق ہے کہا تھا کہ یہ حدیث تو ہے لیکن مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں، ابن حاجب نے مختصر الاصول میں اس حدیث کو نقل کرکے کہا ہے کہ میں فقہا کو اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے نہیں پاتا ہوں اور جب صحابہ اور تابعین کے اقوال کسی مسئلہ میں مختلف ہوتے تھے تو ہر عالم کے نزدیک اپنے مشائخ کا مذہب پسندیدہ ہوتا تھا کیونکہ ان کے صحیح اور سقیم اقوال کو وہ خوب جان سکتا ہے اور ان اقوال کے مناسب اصول کو خوب یاد رکھ سکتا ہے اور ان کے فضل اور تبحر کی جانب اس کا میلان قلب زیادہ ہوتا ہے اسی واسطے اہل مدینہ کے نزدیک حضرت عمر، حضرت عثمان عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ، عبداللہ بن عباس، زید بن ثابت کا مذہب اور ان کے اصحاب مثل سعید بن مسیب جن کو حضرت عمر کے فیصلے اور ابو ہریرہؓ کی احادیث خوب محفوظ تھیں، اور مثل عروہ، سالم، عطا بن یسار، قاسم، عبیداللہ بن عبداللہ زہری، یحییٰ بن سعید، زید

بن اصم اور ربیعہ کا مذہب اختیار کرنا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ہر زمانہ میں وہ علما اور فقہا کا مرکز رہا ہے اسی واسطے امام مالک اہل مدینہ کے مسلک کو لازم سمجھتے تھے اور اہل کوفہ کے نزدیک عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب کا مذہب حضرت علیؓ، شریح اور شعبیؒ کے فیصلے اور ابراہیم کے فتوے اختیار کرنا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے اسی وجہ سے علقمہ نے مسروق سے کہا تھا جبکہ وہ تشریک (۱) میں زید بن ثابت کے قول کی طرف مائل ہوئے کہ تم میں سے کون شخص عبداللہ بن مسعود سے زیادہ وثوق کے قابل ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ بے شک کوئی نہیں ہے، لیکن میں نے زید بن ثابت اور اہل مدینہ کو تشریک کرتے ہوئے دیکھا ہے پس اگر ایک شہر کے لوگ کسی بات پر متفق ہو جاتے تھے تو نہایت پختگی سے اس کو اختیار کرتے تھے، اسی کے متعلق امام مالک نے کہا ہے: وہ احادیث جن میں ہمارے نزدیک اختلاف نہیں اتنی اور اتنی ہیں، اور اگر کسی مسئلہ میں ان کا اختلاف ہوتا تھا تو سب میں جو قول قوی اور راجح ہوتا تھا اس کو وہ لیتے تھے، اور اس قول کی قوت یا اس وجہ سے ہوتی تھی کہ اس کے قائل زیادہ ہیں یا وہ کسی قوی قیاس کے موافق ہے یا کتاب وسنت سے اس کی تخریج کی گئی ہے، ایسے ہی اقوال کے متعلق امام مالک کہتے ہیں جو اقوال میں نے سنے ہیں، ان سب میں یہ زیادہ بہتر ہے۔

پس جب ان علما کو اپنی یادداشت میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تھا تو ایما اور اقتضا کا تتبع کر کے قدما کے ہی کلام سے مسئلہ کا جواب حاصل کرتے تھے، اسی زمانہ میں علما کو تدوین کا الہام ہوا، پس مدینہ میں امام مالک اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب نے تصنیف کرنا شروع کیا اور مکہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ نے اور کوفہ میں سفیان ثوری نے اور بصرہ میں ربیع بن صبیح نے، اور سب نے تصنیف میں وہی طرز اختیار کیا جس کا میں نے ذکر کیا ہے، جب منصور عباسی نے حج کیا تو امام مالک سے کہا کہ میرا قصد یہ ہے کہ آپ کی مصنفہ کتاب (مؤطا) کے چند نسخے لکھوا کر اہل اسلام کے شہروں میں سے ہر شہر میں ایک ایک نسخہ بھیج دوں اور لوگوں کو حکم کروں کہ اسی کے مسائل پر عمل کریں اور اس سے تجاوز کر کے اور طرف نہ جائیں، امام مالک نے کہا اے امیر المومنین ایسا نہ کرو

(۱) جوتے میں تسمہ باندھنا۔

کیونکہ لوگوں تک پہلے ہی سے اقوال پہنچ چکے ہیں اور وہ احادیث کو سن چکے ہیں اور روایات کو نقل کر چکے ہیں اور ہر قوم نے اس پر عمل درآمد کرلیا ہے جو اس کے پاس پہنچ چکا ہے اور لوگوں میں اختلاف ہوگیا ہے اس واسطے لوگوں کو اس حالت پر رہنے دو جو انھوں نے اپنے لئے پسند کرلیا ہے یہ قصہ ہارون رشید کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ ہارون رشید نے امام مالک سے مشورہ لیا تھا کہ مؤطا کو خانہ کعبہ میں لٹکا دیا جائے اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی جائے، امام مالک نے کہا ایسا نہ کرو کیونکہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فروعات میں مختلف ہوئے ہیں اور شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر سنت گزر چکی ہے، تب ہارون رشید نے کہا تم کو خدا توفیق دے اے ابوعبداللہ، سیوطی نے اس حکایت کو نقل کیا ہے۔

علما مدینہ کو جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی تھیں ان سب علما میں امام مالک سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے اور ان کی حدیث سب سے زیادہ معتبر ہے، اور حضرت عمر کے فیصلے حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عائشہ اور ان کے اصحاب فقہائے سبعہ کے اقوال کو امام مالک سب سے زیادہ یاد رکھنے والے تھے، ان سے اور انہی جیسے علما کی وجہ سے روایت اور فتویٰ کا علم قائم ہوا ہے، پس جب ان کی طرف تفویض کا رہوئی تو انھوں نے حدیث کا درس اور فتوی دینا شروع کیا اور لوگوں کو خوب فائدہ پہنچایا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول انہی پر صادق آیا ''عنقریب لوگ تحصیل علم کے لئے سفر کریں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ کسی کو واقف نہ پائیں گے''۔

ابن عیینہؒ اور عبدالرزاقؒ نے اس حدیث کا محمل امام مالک ہی کو قرار دیا ہے تمہارے لئے ایسے دو شخصوں کی شہادت کافی ہے، امام مالک کے شاگردوں نے ان کی روایات اور پسندیدہ اقوال کو جمع کیا اور ملخص کر کے لکھا اور ان کی شرح کی اور ان سے مسائل کا اخراج کیا، ان اقوال کے اصول اور دلائل میں گفتگو کی اور ان کے شاگرد مغربی ممالک اور زمین کے اطراف میں پھیل گئے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بہت فائدہ پہنچایا اگر تم ہمارے قول کی تحقیق کرنا چاہو جو ہم نے ان کے اصل مذہب کی نسبت بیان کی ہے، تو تم کتاب مؤطا میں غور کرو جیسا ہم نے ذکر کیا ہے ویسا ہی پاؤ گے، اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ، ابراہیم نخعیؒ اور ان کے ہم عصر علما کے مذہب کے زیادہ پابند تھے اور ابراہیم نخعیؒ کے مذہب سے بہت کم تجاوز کرتے تھے اور ان کے

مذہب کے موافق مسائل کی تخریج کرنے میں عظیم الشان تھے، تخریجات کی وجوہ دریافت کرنے میں دقیق النظر تھے اور فروعات کی جانب ان کی نہایت توجہ تھی، اور اگر تم ہمارے قول کی تحقیق کرنا چاہو تو امام محمد رحمۃ اللہ کی کتاب الآثار اور جامع عبدالرزاق اور ابوبکر بن ابی شیبہ کی تصنیف سے ابراہیمؒ اور ان کے معاصرین کے اقوال کو ملخص کرو پھر امام ابوحنیفہؒ کے مذہب سے اس کا اندازہ کرو تو تم ان کے طرز سے بہت ہی کم موقعوں پر مخالف پاؤ گے، اور وہ ان چند مواقع میں بھی فقہا کوفہ کے مذہب کو نہیں چھوڑتے ہیں، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سب مشہور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ ہیں، ہارون رشید کے عہد میں قاضی القضاۃ مقرر کئے گئے تھے پس وہ امام ابوحنیفہ کے مذہب کی شہرت کا اور اطراف عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں معمول بہ ہونے کا سبب ہو گئے اور آپ کے شاگردوں میں نہایت ذہین اور عمدہ تصنیف کرنے والے امام محمد بن حسن ہیں، اور ان کے حالات میں سے یہ ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف سے علم فقہ حاصل کیا اس کے بعد مدینہ جا کر امام مالک سے مؤطا کو پڑھا، پھر خوب توجہ کی اور اپنے اصحاب کے مذہب کو ہر ہر مسئلہ میں مؤطا کے مطابق کیا، پس اگر موافقت پائی تو فبہا ورنہ اگر صحابہ وتابعین کی کسی جماعت کو اپنے اصحاب کے مذہب پر عمل کرنے والا پایا تو بھی اسی کو لیا، اور اگر فقہا کے عمل میں ضعیف قیاس یا ضعیف تخریج کو پایا جس کے خلاف صحیح حدیث پائی جاتی ہے۔ یا اکثر علما کا عمل اس کے خلاف ہے تو اس وقت جس مذہب کو مذاہب سلف میں سے ارجح پایا اس کو اختیار کرلیا اور یہ دونوں (امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ) بھی حتی الامکان ابراہیمؒ اور معاصرین ابراہیم کے طریقہ سے کنارہ کش نہیں ہوتے جیسے ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا معمول ہے، البتہ ان تینوں ائمہ کا اختلاف دو باتوں میں سے کسی ایک میں ہوتا تھا، یا تو ابراہیم کے مذہب کے موافق ان کے شیخ ابوحنیفہ نے کسی مسئلہ کی تخریج کی اور اس تخریج میں ان دونوں شاگردوں نے اپنے شیخ کی مخالفت کی یا یہ کہ ابراہیمؒ اور ان کے ہم مرتبہ علما کے کسی مسئلہ میں مختلف اقوال تھے تو یہ دونوں کسی قول کو دوسرے پر ترجیح دینے میں اپنے استاذ کے مخالف ہو جاتے تھے۔ پس امام محمد نے تصنیفات فرمائیں اور ان میں ان تینوں (۱) کی رایوں کو جمع کیا اور کثیر لوگوں کو نفع پہنچایا، پس اصحاب ابوحنیفہؒ نے ان تصنیفات کی طرف نہایت

(۱) ابراہیم نخعی، ابوحنیفہ، اور ابو یوسف۔

توجہ کی، ان کے خلاصہ کیئے ان کے دلائل بیان کیئے، شروح لکھیں، ان سے مسائل کی تخریج کی، ان کے مبانی اور دلائل میں تحقیق کی، پھر ممالک خراسان اور ماوراء النہر میں پھیل گئے پس اس کو امام ابوحنیفہ کا مذہب کہا جاتا ہے، مذہب مالکی اور حنفی کے ابتدا ظہور اور ان کے اصول وفروغ کے مرتب ہونے کے زمانہ میں امام شافعی کا نشو ونما ہوا جب انھوں نے متقدمین کی روش میں غور کیا تو انھوں نے بہت سے ایسے امور کو پایا جن کی وجہ سے وہ متقدمین کے طریق کی پیروی نہ کر سکے، امام شافعی نے ان امور کو اپنی کتاب الام کے اول میں ذکر کیا ہے۔

من جملہ ان کے یہ امر تھا کہ امام شافعیؒ نے دیکھا کہ متقدمین حدیث مرسل اور منقطع پر عمل کرتے تھے اور ایسی حدیثیں خرابی سے محفوظ نہ تھیں پس جب حدیث کے تمام طرق جمع کیئے جاتے تھے تو یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ بہت سی مرسل احادیث بالکل بے اصل ہیں اور بہت سی مرسل احادیث مسند احادیث کے مخالف تھیں اس واسطے امام شافعیؒ نے یہ قرار دیا کہ مرسل حدیث پر عمل جب ہی کیا جائے کہ اس کے شروط بھی موجود ہوں اور وہ تمام شروط کتب اصول میں مذکور ہیں، اور ایک امر یہ تھا کہ متقدمین کے زمانہ میں مختلف احادیث کے درمیان جمع وتوفیق کے قواعد منضبط نہ تھے اس واسطے ان کے اجتہادی مسائل میں خرابیاں رہا کرتی تھیں اس خرابی کو رفع کرنے کے لئے امام شافعیؒ نے اصول مقرر کیئے۔ اور ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا، اصول فقہ میں سب سے پہلی تصنیف یہی کتاب ہے اس کی مثال جو ہمارے علم میں آئی یہ ہے کہ امام شافعی امام محمد بن حسنؒ کے پاس گئے اس وقت وہ علما مدینہ پر اس امر میں اعتراض کر رہے تھے کہ وہ ایک گواہ اور ایک قسم کے ساتھ فیصلہ کر دیتے ہیں اور وہ کہہ رہے تھے کہ ایسا کرنے سے کتاب اللہ پر زیادتی ہوتی ہے، تب امام شافعیؒ نے کہا کیا تمہارے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں ہے؟ امام محمدؒ نے کہا ہاں، جائز نہیں ہے، امام شافعی نے کہا پھر تم کیسے کہتے ہو کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں اور اس کی وجہ آنحضرت کا یہ قول بتلاتے ہو۔

''خبردار ہو جاؤ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے''۔ حالانکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''تم پر مقرر کیا گیا کہ موت آنے کے وقت اگر مال چھوڑا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لئے اس میں وصیت کرنا چاہیے، اسی قسم کے اور چند اعتراضات امام شافعی نے ان پر کیئے اور امام محمد بن حسنؒ

خاموش رہے۔

اور ایک امر یہ تھا کہ بعض احادیث صحیحہ علما تابعین کے مفتیوں کو نہ پہنچیں اس واسطے ان کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑا یا عام الفاظ کا انھوں نے لحاظ کیا یا گزشتہ صحابہ کی انھوں نے پیروی کی اور اسی کے موافق فتویٰ دے دیا لیکن تیسرے طبقہ میں یہ احادیث مشہور ہو گئیں اور انھوں نے ان احادیث پر عمل نہ کیا یہ سمجھ کر کہ یہ احادیث ان کے علما شہر کے عمل کے مخالف ہیں اور اس طریقہ کے خلاف ہیں جس پر وہ سب متفق ہیں اور یہ بات ان احادیث میں طعن کی وجہ بن گئی اور ان احادیث کے غیر معتبر ہونے کی علت ہو گئی، یا وہ احادیث تیسرے طبقہ میں مشہور نہیں ہوئی تھیں بلکہ اس کے بعد ان کی شہرت ہوئی جبکہ محدثین نے احادیث کے تمام طرق روایت میں غور کیا اور اطراف ملک میں سفر کیا اور علمائے حدیث سے ان کی تفتیش کی، پس اکثر احادیث ایسی ظاہر ہوتی گئیں جن کی روایت صحابہ میں سے صرف ایک یا دو اشخاص نے کی تھی اور ان صحابہ سے بھی صرف ایک یا دو راویوں نے ان کی روایت کی تھی وَھَلُمَّ جَرًّا پس بہت سی احادیث فقہا کی نظر میں مخفی رہیں اور ان حفاظ حدیث کے زمانہ میں مشہور ہوئیں جنھوں نے تمام طرق حدیث کو جمع کیا تھا، مثلاً بہت سی احادیث کو اہل بصرہ نے روایت کیا اور باقی حصے ان احادیث سے بے خبر رہے پس امام شافعیؒ نے اس بات کو واضح کر دیا کہ علما صحابہ اور تابعین کی ہمیشہ یہ حالت رہی ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں حدیث کے متلاشی رہتے تھے جب کوئی حدیث ان کو نہ ملتی تھی تو وہ کوئی اور استدلال اختیار کرتے تھے لیکن اس کے بعد جب کوئی حدیث ان پر ظاہر ہو جاتی تھی تو وہ حدیث کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے، پس جب ان کی ایسی حالت تھی تو ان کا کسی حدیث پر عمل نہ کرنا اس کے لئے قادح نہیں ہوسکتا ہاں، اس وقت قادح ہوسکتا ہے جب وہ کوئی علت قادحہ بیان کر دیں اس کی مثال حدیث قلتین ہے یہ حدیث صحیح ہے جو بہت سے طریقوں سے مروی ہے ان سب میں بڑا طریق وہ ہے جو ابوالولید بن کثیر پر ختم ہوتا ہے، انھوں نے اس کو محمد بن جعفر بن زبیرؒ سے روایت کیا ہے اور محمد بن جعفر نے عبداللہ یا محمد بن عباد بن جعفر یہ روایت عبید اللہ بن عبداللہ اور ان دونوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے پھر اس کے بعد طرق روایت متعدد ہو گئے اور یہ دونوں راوی اگرچہ ثقہ ہیں لیکن وہ فتویٰ میں لوگوں کے مرجع نہ تھے اور نہ ہی وہ لوگوں کے نزدیک معتمد علیہ تھے

اس واسطے یہ حدیث نہ سعید بن مسیّب کے عہد میں اور نہ ہی امام زہری کے زمانہ میں مشہور ہوئی اور نہ اس پر مالکیہ نے عمل کیا اور نہ ہی حنفیہ نے عمل کیا۔ پس لوگوں نے اس پر عمل نہ کیا اور امام شافعیؒ نے اس پر عمل کر لیا۔

اور ایسے ہی خیار مجلس کی حدیث ہے یہ حدیث صحیح ہے اور بہ کثرت طریقوں سے روایت کی گئی ہے اور صحابہ میں سے ابن عمر اور ابو ہریرہ نے اس حدیث پر عمل کیا تھا اور فقہائے سبعہ اور ان کے معاصرین میں اس حدیث کی شہرت نہیں ہوئی تھی پس وہ اس حدیث کے قائل نہ تھے اس واسطے امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے اس امر کو حدیث مذکور میں علت قادحہ سمجھ کر اس پر عمل نہ کیا اور امام شافعی نے اس پر عمل کیا۔

اور ایک امر یہ تھا کہ صحابہ کے سب اقوال امام شافعی کے عہد میں جمع کئے گئے، ان اقوال کی کثرت ہوئی اور ان میں اختلافات پائے گئے اور ان میں سے بہت سے اقوال کو امام شافعی نے حدیث صحیح کے مخالف پایا اس وجہ سے کہ وہ حدیث صحابہ کو معلوم نہیں ہوئی تھی اور امام شافعی نے سلف کو دیکھا تھا کہ ایسے امور میں وہ حدیث کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اس واسطے امام شافعی نے صحابہ کے اقوال سے استدلال کرنا ترک کر دیا۔ جب تک کہ وہ اقوال سب کے نزدیک متفق علیہ نہ ہوں اور کہا صحابہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔

اور ایک امر یہ تھا کہ امام شافعیؒ نے فقہا کے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ اس قیاس میں جس کو شرع نے ثابت کیا ہے ایسی رائیں مخلوط کر دیتے ہیں جن کو شریعت کوئی وقعت نہیں دیتی، وہ فقہا اس قیاس اور رائے میں کچھ فرق نہیں کرتے اور کبھی کبھی وہ اس رائے کا نام استحسان رکھتے ہیں اور رائے سے مراد یہ ہے کہ کسی حرج یا مصلحت کے مظنہ کو حکم کی علت قرار دیا جائے، اور قیاس کے معنی یہ ہیں کہ حکم منصوص سے کوئی علت نکالی جائے اور وہ علت حکم کا مدار علیہ قرار دی جائے اس رائے کو امام شافعی نے نہایت اہتمام سے باطل کیا اور فرمایا جو استحسان کرتا ہے وہ شارع بننا چاہتا ہے، ابن حاجب نے مختصر الاصول میں اس کو نقل کیا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ یتیم کا زمانہ رشد تک پہنچنا ایک مخفی امر ہے اس واسطے فقہا نے مظنہ رشد کو جو پچیس برس ہوتے ہیں رشد کے قائم مقام کر دیا اور یہ کہا کہ جب یتیم پچیس برس کا ہو جائے تو اس کو اس کا مال دے دینا چاہئے اور انھوں نے اس کو

استحسان کہا حالانکہ قیاس کا مقتضا یہ ہے کہ اس عمر میں اس کو مال نہیں دینا چاہئے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب امام شافعیؒ نے متقدمین میں سے ایسے امور پائے تو از سر نو فقہ کو مرتب کیا، اصول قائم کئے اور فروع کو ان پر متفرع کیا، عمدہ کتابیں تصنیف کیں اور لوگوں کو فائدہ پہنچایا، فقہا ان کی خدمت میں جمع ہوئے، ان کی کتابوں کا اختصار کیا، ان پر شروح لکھیں، دلائل بیان کئے اور مسائل کی تخریج کی اور پھر تمام شہروں میں یہ لوگ پھیل گئے ہیں پس اس طریقہ کا نام مذہب شافعی ہو گیا، واللہ اعلم۔

تیسرا باب: اہل حدیث اور اصحاب الرائے کے مابین فرق کا بیان

واضح ہو کہ سعید بن مسیب، ابراہیمؒ اور زہریؒ کے زمانہ میں اور امام مالک، سفیان ثوری اور ان کے بعد کے عہد میں بھی ایسے علما تھے جو مسائل دین میں رائے سے خوض کرنے کو برا جانتے تھے اور فتویٰ دیتے ہوئے اور استنباط کرتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن نہایت ہی ضرورت کے موقع پر جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا تھا تو استنباط کرتے تھے، ان کو بڑا اہتمام اس کا ہوتا تھا کہ حدیث رسول کی روایت کر دیں، ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں ناپسند کرتا ہوں کہ تیرے لئے اس شئے کو حلال کر دوں جس کو خدا نے حرام کیا ہو یا وہ چیز حرام کر دوں جس کو اس نے حلال کیا ہو اور معاذ بن جبل نے کہا کہ اے لوگو! بلا کے نازل ہونے سے پہلے جلدی نہ کرو کیونکہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہیں گے کہ جب ان سے کوئی امر دریافت کیا جائے گا تو اس کو مسلسل بیان کرتے چلے جائیں گے۔ اور ایسے ہی حضرت عمر، حضرت علیؓ، ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے اس امر میں کلام کرنا جو نازل نہیں ہوا مکروہ سمجھنا منقول ہے اور عبداللہ بن عمر نے جابر بن زید سے کہا تھا کہ تم فقہا بصرہ میں سے ہو پس قرآن ناطق یا سنت ماضیہ سے ہی فتویٰ دینا، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خود بھی ہلاک ہو گے اور لوگوں کو بھی ہلاک کرو گے، ابونضر کہتے ہیں کہ جب ابوسلمہ بصرہ میں آئے تو میں اور حسن بصریؒ ان کی ملاقات کو گئے، انھوں نے حسن بصری سے فرمایا حسن بصری تم ہی ہو بصرہ میں تم سے زیادہ کسی کی ملاقات کا مجھ کو شوق نہ تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو پس آئندہ بجز قرآن وحدیث کے اپنی رائے سے فتویٰ نہ دینا۔

اور ابن المنکدر کہتے ہیں کہ عالم خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہوا کرتا ہے پس

اس کو اپنے لئے نجات کا کوئی راستہ پیدا کرنا چاہئے، امام شعبیؒ سے دریافت کیا گیا کہ جب تم سے مسائل پوچھے جاتے تھے تو تم کیا کرتے تھے، انھوں نے فرمایا تم نے جاننے والے سے یہ بات دریافت کی جب کسی شخص سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تھا تو وہ اپنے مصاحب سے کہتا تھا کہ تم اس مسئلہ کا جواب دو، پس ایسے ہی یہ بات ایک دوسرے سے کہی جاتی تھی، امام شعبی نے فرمایا یہ علما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بیان کریں اس پر عمل کرو اور جو کچھ اپنی رائے سے کہیں اس کو پاخانہ میں پھینک دو ان آثار کو دارمی نے روایت کیا ہے پس حدیث اور اثر کی تدوین قرآن اور اس کے نسخوں کی کتابت بلاد اسلام میں پھیل گئی حتی کہ اہل روایت میں سے ایسے بہت کم تھے جن کے پاس کوئی صحیفہ یا نسخہ نہ ہو یا وہ تدوین نہ کرتے ہوں اور یہ اس لئے کہ ان کو کسی بڑے موقع پر ضرورت پڑتی تھی پس اس وقت کے بلند پایہ علما نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کا سفر کیا اور کتابیں جمع کیں اور نسخوں میں تتبع کیا، غریب حدیث اور آثار نادرہ میں بہت خوض کیا، پس ان کے اہتمام سے احادیث اور آثار اس قدر مجتمع ہو گئے جو پیشتر کسی سے جمع نہ ہو سکے تھے اور ان کے لئے وہ سامان مہیا ہو گیا جو پہلے کسی کے لئے مہیا نہ ہوا تھا اور بے شمار طرق احادیث خاصۃ انہی کو معلوم ہوئے یہاں تک کہ ان کے پاس ایسی احادیث بہت سی تھیں جو سو اور اس سے بھی زیادہ طرق سے مروی تھیں، پس بعض طرق نے بعض دوسرے نامعلوم طرق کو واضح کر دیا اور علما نے ہر حدیث کا مرتبہ معلوم کر لیا کہ کون سی غریب ہے اور کونسی مستفیض ہے اور حدیث کے متابعات اور اس کے شواہد میں غور کرنے کا ان کو موقع ملا۔ اور بہت سی صحیح احادیث جو پہلے اہل فتویٰ پر ظاہر نہ ہوئی تھیں ان کو معلوم ہو گئیں، امام شافعی نے امام احمد سے کہا تھا کہ تم کو ہم سے زیادہ احادیث صحیحہ کا علم ہے جو حدیث صحیح ہوا کرے وہ مجھ کو بتلا دیا کرو تا کہ میں اس کی طرف رجوع کروں خواہ وہ حدیث کوفی ہو یا بصری ہو یا شامی ہو، اس کو ابن ہمام نے نقل کیا ہے۔

امام شافعی نے امام احمد سے یہ اس واسطے کہا تھا کہ بہت سی احادیث ایسی تھیں جن کو خاص ایک ایک شہر کے لوگ ہی روایت کرتے تھے جیسے وہ احادیث جن کو صرف شامیوں نے روایت کیا یا عراقیوں نے روایت کیا یا صرف ایک ہی خاندان کے لوگوں نے روایت کیا جیسے برید کا نسخہ کہ انھوں نے ابو بردہ سے روایت کیا اور ابو بردہ نے ابو موسیٰ سے روایت کیا اور عمرو بن شعیب کا نسخہ جو

انھوں نے اپنے باپ سے اور ان کے باپ نے اپنے باپ سے روایت کیا، یا بعض صحابی قلیل الروایت اور گوشہ نشین تھے جن سے بہت کم لوگوں نے احادیث روایت کی ہیں پس اس قسم کی احادیث سے اکثر اہل فتویٰ غافل تھے اور ان کے پاس ہر شہر کے فقیہ صحابہ اور تابعین کے آثار کا مجموعہ تھا ان سے پیشتر کے لوگ صرف اپنے شہر اور اپنے اصحاب کی حدیثوں کو جمع کر سکتے تھے اور پیشتر کے علما اسمار جال اور ان کی عدالت کے مراتب پہنچاننے میں اپنے خالص مشاہدہ اور قرائن کے تتبع پر اعتماد کرتے تھے، لیکن اس طبقہ کے علما نے اس فن میں نہایت غور کیا اور اس کو مدون کر کے اور بحث و تفتیش کر کے ایک مستقل فن کر دیا، اور احادیث کے صحیح اور غیر صحیح قرار دینے میں نہایت نظر کی اس طرح اس تدوین اور مناظرہ سے ان حدیثوں کا حال معلوم ہو گیا جن کا متصل یا منقطع ہونا پہلے مخفی تھا، امام سفیان، وکیع اور ان کے امثال کی یہ حالت تھی کہ وہ نہایت اہتمام سے اجتہاد کرتے تھے لیکن حدیث مرفوع متصل ایک ہزار سے کم ہی ان کو حاصل ہوئی تھیں جیسا کہ ابوداؤد بجستانی نے اس کو اپنے خط میں ذکر کیا ہے جس کو انھوں نے اہل مکہ کو بھیجا تھا اور اس طبقہ کے محدثین تقریباً چالیس ہزار تک احادیث کی روایت کرتے تھے۔

امام بخاری کے متعلق یہ صحیح ہے کہ انھوں نے چھ ہزار احادیث سے صحیح بخاری کو مختصر کیا ہے اور ابوداؤد کی نسبت بھی یہ ثابت ہے کہ انھوں نے پانچ ہزار احادیث سے اپنی سنن کو منتخب کیا ہے، اور امام احمد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث معلوم کرنے کے لئے اپنی مسند کو میزان قرار دیا ہے، پس جو حدیث اس مسند میں موجود ہے اگرچہ اس کی روایت ایک ہی طریقہ سے ہو اس کی کوئی اصل ہے اور جو اس میں نہ ہو اس کو بے اصل سمجھنا چاہئے اس طبقہ کے بڑے علما یہ ہیں: عبدالرحمٰن بن مہدی، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، ابوبکر بن ابی شیبہ، مسدد، ہناد، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، فضل بن دکین، علی مدینی اور ان کے ہم مرتبہ محدثین اور یہی طبقہ طبقات محدثین کا پہلا نمونہ ہے۔

پس محققین اہل حدیث فن روایت و معرفت مراتب احادیث کو مکمل کرنے کے بعد فقہ کی طرف مائل ہوئے، پس جبکہ بہت سی احادیث اور آثار کو انھوں نے ان مذاہب میں سے ہر ایک مذہب کے مخالف دیکھا تو متقدمین میں سے کسی خاص امام کی تقلید کرنے پر اتفاق کرنے کو انھوں

نے درست نہ سمجھا، پس وہ خود احادیث نبوی کا صحابہ تابعین اور مجتہدین کے آثار کا ان قواعد کے موافق جو انھوں نے اپنے نزدیک قرار دے رکھے تھے تتبع کرنے لگے اور میں ان قواعد کو تمہارے لئے چند کلمات میں بتلائے دیتا ہوں۔

ان کا مسلک یہ تھا کہ جب کسی مسئلہ میں قرآن ناطق ہو تو کسی دوسری شئے کی طرف توجہ کرنا جائز نہیں ہے اور جب آیت قرآنی میں چند احتمالات ہوں تو اس کا فیصلہ حدیث سے کرنا چاہئے۔

اور جب قرآن میں ان کو کوئی حکم نہ ملتا تھا تو رسول خدا کی حدیث پر عمل کرتے تھے خواہ وہ سنت مستفیض ہو جس پر فقہا کا عمل رہا ہو یا کسی خاص شہر کے علما سے یا کسی خاص خاندان کے علما سے یا کسی خاص طریقہ سے مروی ہے، خواہ صحابہ اور فقہا نے اس پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

اور جب کسی مسئلہ میں ان کو حدیث مل جاتی تھی تو اس کے خلاف کسی اثر یا کسی اجتہاد کا اتباع نہیں کرتے تھے، اور جب تتبع احادیث میں پوری کوشش کر چکتے تھے اور اس مسئلہ میں ان کو حدیث نہیں ملتی تھی تو جماعت صحابہ و تابعین کے اقوال پر عمل کرتے تھے اور اس میں وہ کسی قوم یا کسی شہر کے پابند نہیں تھے جیسا کہ ان سے پہلے لوگ کرتے تھے، پس اگر کسی مسئلہ میں جمہور خلفا اور فقہا کو متفق پاتے تھے تو اس پر قناعت کرتے تھے اور اگر وہ مسئلہ مختلف فیہ ہوتا تھا تو ان میں سے جو بڑا عالم، پرہیزگار یا ضابط یا زیادہ مشہور ہوتا تھا اس کی حدیث کو لیتے تھے اور اگر وہ کوئی ایسا مسئلہ پاتے تھے جس میں مساوی قوت کے دو قول ہوتے تھے تو وہ مسئلہ ذات القولین (۱) رہتا تھا اور اگر اس سے بھی عاجز آجاتے تھے تو کتاب و سنت کی عام تعبیرات ان کے اشارات اور اقتضاءات میں غور کیا کرتے تھے اور نظیر مسئلہ کو ان پر حمل کرتے تھے بشرطیکہ دونوں مسئلے بادی الرائے میں ایک سی حالت رکھتے ہوں، اس امر میں وہ قوانین اصول کی پابندی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طریق پر اعتماد کرتے تھے جو صاف صاف سمجھ میں آئے اور دل کو اس سے اطمینان ہو جیسے تواتر کے لئے راویوں کی تعداد میزان نہیں ہے اور نہ ہی ان کا حال میزان ہے بلکہ اس کے لئے میزان وہ یقین ہے جو خبر کے بعد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، صحابہ کے حالات میں ہم اس کو بیان کر چکے ہیں، اور یہ اصول متقدمین کے برتاؤ اور ان کی تصریحات سے مستخرج تھے، میمون بن مہران سے منقول ہے

---

(۱) یعنی اس میں دونوں وجہیں درست ہیں۔

کہ ابوبکرؓ کے پاس جب کوئی قضیہ پیش ہوتا تھا تو اس کا جواب کتاب اللہ میں تلاش کرتے تھے، پس اگر کتاب اللہ میں ایسا امر معلوم ہو جاتا تھا جس سے لوگوں میں فیصلہ کیا جائے تو اس کے ساتھ فیصلہ کر دیتے تھے اور اگر قرآن میں اسکا جواب نہ ملتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جو اس امر میں آپ کو معلوم ہوتی تھی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور اگر حدیث بھی معلوم نہ ہوتی تو باہر جا کر مسلمانوں سے دریافت کرتے کہ ایسا ایسا مسئلہ میرے سامنے پیش ہوا ہے کیا تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمایا ہے؟ پس کبھی آپ کے پاس بہت سے آدمی جمع ہو جاتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق یہ فیصلہ کیا تھا، تب ابوبکرؓ فرماتے الحمد للہ خدا نے ہم میں ایسے لوگ پیدا کیے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال محفوظ رکھتے ہیں۔

اور اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پانے سے بھی عاجز ہو جاتے تھے تو معتمد اور نیک لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ لیتے پس جس امر پر سب اتفاق رائے کرتے اس کے موافق آپ فیصلہ کر دیتے تھے، قاضی شریح سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو تحریر کیا تھا کہ اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مسئلہ پیش ہو جس کا حکم کتاب اللہ میں مذکور ہے تو اس کے موافق فیصلہ کرنا اور ایسا نہ ہو کہ لوگ تم کو اس سے باز رکھیں، اور ایسا مسئلہ پیش ہو جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنت رسول اللہ کو تلاش کر کے اس کے موافق فیصلہ کرنا اور کوئی ایسا مسئلہ پیش ہو جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ اس کے بارے میں حدیث رسول ہے تو اس قول پر نظر کرنا جس پر لوگوں نے اتفاق کیا ہو اور اس کے موافق فیصلہ کرنا۔

اور اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش ہو جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ اس کے بارے میں حدیث رسول منقول ہے اور نہ تم سے پہلے لوگوں میں سے کسی نے اس میں رائے دی ہے تو دو امروں میں سے جو چاہو اختیار کرنا اگر اپنی رائے سے اجتہاد کرنا چاہو اور پیش قدمی کرنا چاہو تو اجتہاد کرنا اور اگر اجتہاد میں تاخیر کرنا چاہو تو تاخیر کرنا، اور میں تمہارے لئے تاخیر ہی کو بہتر سمجھتا ہوں، عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے وہ کہتے تھے ہم پر ایسا زمانہ گزرا ہے کہ ہم کسی مسئلہ میں فتویٰ نہ دیتے تھے اور نہ ہم فتویٰ دینے کے قابل تھے اور خدا نے مقدر کیا تھا کہ ہم کو اس درجہ تک پہنچا دیا

جس کو تم دیکھتے ہو، پس آج کے بعد جس کے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو تو اس میں کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کرے اور اگر ایسا مقدمہ پیش ہو جس کا حکم کتاب اللہ میں نہیں ہے تو اس میں وہ فیصلہ دے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، اور اگر ایسا مقدمہ پیش ہو جس کا حکم نہ قرآن میں ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کوئی حکم دیا ہے تو جیسا صالحین امت نے فیصلہ کیا ہو اس کے موافق فیصلہ کرے اور اپنی طرف سے یہ نہ کہے کہ میں اس میں خوف کرتا ہوں اور اس کو پسند کرتا ہوں اس واسطے کہ حرام اور حلال صاف اور ظاہر ہیں اور حرام وحلال کے بیچ میں مشتبہ امور ہیں پس شک کی بات کو ترک کرو اور جس پر یقین ہو اس کو لو، اور عبداللہ بن عباس کی یہ حالت تھی کہ جب ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تھا پس اگر اس کا حکم قرآن میں ہوتا تھا تو بتلا دیتے تھے اور اگر قرآن میں اس کا حکم نہ ملتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حکم ثابت ہوتا تو بتلا دیتے اور اگر حضور سے بھی ثابت نہ ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دیا ہوا حکم بیان کر دیتے اور اگر ان سے بھی کوئی حکم محقق نہ ہوتا تو اپنی رائے سے فرماتے، عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے "کیا تم کو اس کا خوف نہیں ہے کہ خدا تم کو عذاب دے یا زمین میں دھنسا دے یہ کہ تم کہتے ہو کہ رسول خدا نے ایسا کہا تھا اور فلاں شخص نے ایسا کہا تھا، قتادہ سے مروی ہے کہ ابن سیرین نے ایک شخص کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی تو اس نے کہا کہ فلاں شخص تو ایسا ایسا کہتا ہے، تب ابن سیرین نے کہا میں تم سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتا ہوں اور تم یہ کہتے ہو فلاں شخص نے ایسا ایسا کہا ہے، اوزاعی سے روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم لکھوایا تھا کہ کسی کو قرآن میں رائے دینے کا حق نہیں ہے اور ائمہ صرف انہی امور میں رائے دے سکتے ہیں جن کے بارے میں قرآن نازل نہ ہوا ہو اور نہ ان کے بارے میں حدیث رسول منقول ہو، اور جس امر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود ہے اس میں بھی کسی کو رائے دینے کا حق نہیں ہے۔

اعمش سے روایت ہے کہ ابراہیمؒ کہا کرتے تھے کہ مقتدی امام کے بائیں جانب کھڑا ہوا کرے، پس میں نے ان سے حدیث بیان کی کہ سمیع الزیات ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس کو اپنے دائیں جانب کھڑا کیا تھا پس ابراہیم نے اس حدیث

کو قبول کرلیا، شعبی سے مروی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس ایک مسئلہ دریافت کرنے آیا تو شعبی نے کہا عبداللہ بن مسعود اس امر میں یہ فرمایا کرتے تھے، اس نے کہا آپ مجھ کو اپنی رائے بتلایئے تب شعبیؒ نے کہا کیا تم اس شخص پر تعجب نہیں کرتے، میں عبداللہ بن مسعود کی طرف سے خبر دے رہا ہوں اور وہ مجھ سے میری رائے دریافت کرتا ہے، اور مجھ کو اس سے زیادہ اپنا دین پسندیدہ ہے، واللہ مجھ کو راگ گانا اچھا معلوم ہوتا ہے اس سے کہ میں اپنی رائے ظاہر کروں، دارمی نے یہ تمام آثار بیان کئے ہیں۔

ترمذی نے ابوالسائب سے روایت کی ہے کہ ہم وکیع کے پاس بیٹھے تھے انھوں نے ایک شخص سے جو رائے کو دخل دیا کرتا تھا کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار(۱) کیا، اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اشعار مثلہ(۲) ہے اس شخص نے کہا کہ ابوحنیفہ نے تو ابراہیم نخعیؒ سے روایت کی ہے کہ 'اشعار' مثلہ ہے، ابوسائب کہتے ہیں کہ میں نے وکیع کو دیکھا کہ اس شخص پر انھوں نے بہت غصہ کیا اور کہا میں تجھ سے کہتا ہوں رسول خدا نے ایسا فرمایا ہے اور تو کہتا ہے ابراہیم یہ کہتے ہیں، تو اسی قابل ہے کہ قید کردیا جائے اور جب تک اپنے قول سے باز نہ آئے رہا نہ کیا جائے، عبداللہ بن عباس، عطاء، مجاہد، مالک بن انس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے قول کو اختیار اور رد نہ کیا جاسکے بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب علما نے فقہ کو ان قواعد پر مرتب کیا تو ان مسائل میں سے جن میں قدما نے کلام کیا تھا اور وہ جو ان کے زمانہ میں واقع ہوئے تھے کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے متعلق کوئی حدیث مرفوع متصل یا مرسل یا موقوف، صحیح یا حسن یا قابل اعتبار انھوں نے نہ پائی ہو، یا اس مسئلہ کے متعلق شیخین یا دیگر خلفا وقضاۃ امصار اور فقہائے بلاد کے آثار میں سے کسی اثر کو انھوں نے نہ پایا ہو یا اس مسئلہ کے متعلق انھوں نے عموم، ائمۃ الفقہا کے ذریعہ کسی استنباط کو نہ حاصل کیا ہو، اس طرح پر علما کے لئے خدا نے سنت پر عمل کرنا آسان کردیا۔

اسی زمانہ کے علما میں سے نہایت عظیم الشان، زیادہ روایت کرنے والے اور مراتب حدیث

---

(۱) اونٹ کے کوہان پر زخم کردینا تاکہ قربانی کا معلوم ہو اور کوئی اس سے تعرض نہ کرے۔ (۲) شکل بگاڑنا، اس کی شریعت میں ممانعت ہے۔

سے زیادہ واقف اور فقہ میں سب سے زیادہ غائر النظر امام احمد بن محمد بن حنبل تھے، ان کے بعد اسحٰق بن راہویہ تھے۔

اور فقہ کا اس طرح سے مرتب کرنا بہت سی احادیث اور آثار پر موقوف تھا یہاں تک کہ امام احمد سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کے لئے ایک لاکھ احادیث کافی ہو سکتی ہیں تا کہ وہ فتویٰ دینے کے قابل ہو سکے، انھوں نے کہا اتنی کافی نہیں ہیں پھر کہا گیا کہ پانچ لاکھ ہوں تو فتویٰ دے سکتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا مجھ کو امید ہے کہ اتنی کفایت کر سکیں، غایت المنتہی میں یہ مذکور ہے، امام احمد کی مراد یہی ہے کہ فتویٰ دینے کے لئے اتنی حدیثیں کافی ہیں۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے زمانہ کی پیدائش کی انھوں نے اپنے اصحاب کو دیکھا کہ انھوں نے احادیث کے جمع کرنے اور فقہ مرتب کرنے کی تکلیف خود برداشت کی اس واسطے انھوں نے اور فنون کی جانب توجہ کی، مثلاً ان صحیح احادیث کو ممیز کر دیا جو کبرائے اہل حدیث کے نزدیک متفق علیہ تھیں، جیسے زید بن ہارون یحییٰ بن سعید قطان، احمد، اسحٰق اور ان کے ہم مرتبہ لوگوں نے ان کو صحیح مانا تھا اور مثلاً فقہ کے متعلق ان احادیث کو جمع کیا جن پر فقہا، امصار اور علما بلاد اسلامی نے اپنے اپنے مذاہب کی بنیاد قائم کی تھی، اور مثلاً جو حدیث جس درجہ کی مستحق تھی اس پر وہی حکم لگایا اور مثلاً ان شاذ و نوادر احادیث کو جمع کیا جن کو سابقین نے روایت نہ کیا تھا یا ان کے وہ طریق بیان کئے جن طرق سے متقدمین نے ان کو بیان نہیں کیا تھا، ان میں وہ احادیث بھی ظاہر ہوئی جن میں اتصال یا علو سند کا وصف تھا یا ان کی روایت فقیہ نے فقیہ سے کی تھی یا حافظ حدیث نے حافظ حدیث سے کی تھی یا اس کے علاوہ اور مطالب علمی ان میں مندرج تھے، اس منصب کے محدثین بخاری، مسلم، ابوداؤد، عبد بن حمید، دارمی، ابن ماجہ، ابویعلی، ترمذی، نسائی، دارقطنی، حاکم، بیہقی، خطیب، دیلمی، ابن عبدالبر اور ان کے ہم مرتبہ لوگ ہیں، اور میرے نزدیک ان سب میں وسیع العلم، سب سے زیادہ نافع مصنف اور مشہور ترین چار شخص ہیں جن کا زمانہ قریب قریب ہے، سب سے اول ابوعبداللہ بخاری ہیں، ان کی غرض یہ تھی کہ جس قدر احادیث صحیح مستفیض اور متصل ہیں، اور احادیث سے جدا کر دی جائیں اور ان احادیث سے فقہ، سیرت اور تفسیر کو مستنبط کیا جائے، اس واسطے انھوں نے اپنا جامع صحیح کو تصنیف کیا اور جو شرط مقرر کی تھی اس کو پورا کیا۔

اورہمیں یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ایک نیک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوخواب میں دیکھا، آپ نے فرمایا تجھ کو کیا ہوگیا ہے کہ تو محمد بن ادریس کی فقہ میں مشغول ہے اور میری کتاب کو تو نے چھوڑ دیا ہے، اس نے عرض کیا یارسول اللہ آپ کی کتاب کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا صحیح بخاری، اور مجھ کو اپنی زندگی کی قسم ہے کہ صحیح بخاری کو ایسی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ اس سے زیادہ کا قصد نہیں ہوسکتا۔

اور دوسرے شخص مسلم نیشاپوری ہیں انھوں نے بھی یہی قصد کیا کہ ان احادیث صحیحہ کو جمع کریں جو محدثین کے نزدیک متفق علیہ متصل اور مرفوع ہوں اور ان سے احکام مستنبط ہوسکیں، اور انھوں نے یہ بھی قصد کیا کہ احادیث کو قریب الفہم کردیں اور ان سے مسائل کا استنباط کرنا سہل ہوجائے اس واسطے انھوں نے نہایت عمدہ ترتیب دی اور ایک ہی موقع پر ہر حدیث کے تمام طرق کو جمع کردیا تاکہ نہایت صراحت کے ساتھ اختلاف متون اور تفرق اسانید واضح ہوجائے اور انھوں نے تمام مختلف احادیث کو یکجا کردیا تاکہ عربی زبان کے واقف کو حدیث سے اعراض کرکے اور طرف متوجہ ہونے کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اور تیسرے شخص ابوداؤد سجستانی ہیں اور ان کا قصد یہی تھا کہ ایسی احادیث یکجا کردیں جن سے فقہا استدلال کرتے ہیں اور جو ان میں مروج ہیں اور جن کو علماء بلاد نے احکام کی بنیاد قرار دیا ہے اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنی سنن کو تصنیف کیا اور اس سے صحیح، حسن اور قابل عمل احادیث کو جمع کیا، ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث بیان نہیں کی جس کے ترک پر سب کا اتفاق ہو، اور ان میں سے جو حدیث ضعیف تھی اس کا ضعف بیان کردیا اور جس حدیث میں کوئی علت تھی اس کو ایسی وجہ کے ساتھ بیان کردیا جس کو علم حدیث میں خوض کرنے والا خوب سمجھ سکتا ہے اور ہر حدیث میں اس مسئلہ کو بیان کردیا جس کو کسی عالم نے اس حدیث سے مستنبط کیا تھا اور جس کو کسی اہل مذہب نے اختیار کیا تھا اسی لئے غزالی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ ابوداؤد کی یہ کتاب مجتہد کے لئے کافی ہے۔

اور چوتھے شخص ابوعیسیٰ ترمذی ہیں انھوں نے شیخین (۱) کے طریقہ کو جہاں انھوں نے صاف بیان کیا تھا اور جس کو انھوں نے مبہم چھوڑا تھا پسندیدہ صورت میں کردیا اور ہر صاحب

(۱) شیخین سے مراد امام بخاری و مسلم ہیں۔

مسلک کے مذہب کو بیان کر کے ابوداؤد کے طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے پس دونوں طریقوں کو جمع کیا اور ان پر صحابہ، تابعین اور فقہا امصار کے مذاہب کے بیان کا اضافہ کیا پس ایک جامع کتاب تصنیف کی اور طرق حدیث کو نہایت بہتر شکل میں مختصر کر دیا ایک طریق کو ذکر کر کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کیا اور ہر حدیث کا حال بیان کر دیا کہ وہ صحیح ہے یا حسن ہے، ضعیف ہے یا منکر ہے، اور ضعف کی وجہ بھی ظاہر کر دی تا کہ طالب حدیث کو پوری بصیرت حاصل ہو جائے اور قابل اعتماد احادیث کو دیگر احادیث سے تمیز کر سکے اور یہ بھی ذکر کر دیا کہ فلاں حدیث شائع یا غریب ہے، مذاہب صحابہ وفقہا بلاد کو بھی نقل کر دیا اور جس شخص کے نام معلوم کرنے کی ضرورت تھی اس کا نام بتا دیا اور جس کی کنیت کی ضرورت تھی اس کی کنیت بتا دی اور اہل علم کے لئے کوئی امر مخفی نہیں رکھا اسی واسطے علما کا قول ہے کہ یہ کتاب مجتہد کو کافی ہے اور مقلد کو بے نیاز کرنے والی ہے، امام مالک اور سفیان ثوری کے زمانہ میں اور ان کے بعد کے زمانہ میں ان محتاط اشخاص کے مقابلہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو مسائل کے بیان کرنے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتے تھے اور فتویٰ دینے سے خوف نہیں کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ دین کی بنیاد فقہ پر ہی ہے اس واسطے اس کی اشاعت ضرور ہونی چاہئے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرنے میں اور آپ تک سلسلہ روایت پہنچانے میں خوف محسوس کرتے تھے حتی کہ امام شعبیؒ نے فرمایا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کسی اور کی طرف نسبت کرنا ہمارے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، اگر حدیث میں کوئی کمی بیشی ہوگی تو اسی شخص پر ہوگی، ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں مجھ کو یہ کہنا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ نے کہا اور علقمہ نے کہا، اور عبداللہ بن مسعودؓ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان کا چہرہ بدل جایا کرتا تھا اور فرماتے تھے کہ آنحضرت نے ایسا ہی یا اس کے مثل فرمایا ہے، اور جس وقت حضرت عمرؓ نے انصار کی ایک جماعت کو کوفہ روانہ کیا تو ان سے فرمایا تم کوفہ کو جاتے ہو وہاں تم ایسے لوگوں سے ملو گے جو قرآن پڑھتے وقت روتے ہیں پس وہ تمہارے پاس آئیں گے اور کہیں گے محمد رسول اللہ کے صحابہ آئے ہیں وہ تم سے احادیث دریافت کریں گے تم رسول خدا سے احادیث کی روایت بہت کم کرنا۔

ابن عون کا قول ہے شعبی کے پاس جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تھا تو وہ بہت احتیاط کرتے تھے

اور ابراہیم خوب بیان کرتے تھے، ان آثار کو دارمی نے روایت کیا ہے، پس حدیث، فقہ اور مسائل کو دوسرے طرز پر مدون کرنے کی ضرورت واقع ہوئی اور یہ اس واسطے کہ ان کے پاس اتنی احادیث اور آثار نہ تھے جن سے ان اصول کے موافق جن کو اہل حدیث نے پسند کیا ہے استنباط فقہ پر قادر ہوتے اور ان کو یہ پسند نہ تھا کہ علما بلاد کے اقوال میں غور کرتے، ان کو جمع کرتے اور ان سے بحث کرتے بلکہ اس امر میں ان کو متہم سمجھا، اور ان کا اپنے اماموں کے متعلق یہ اعتقاد تھا کہ وہ نہایت درجہ کے محقق ہیں اور ان کے دلوں کا میلان سب سے زیادہ اپنے اصحاب کی طرف ہی تھا، جیسے علقمہ کا قول ہے کہ کوئی صحابی عبداللہ بن مسعود سے زیادہ راسخ العلم نہیں ہے اور ابوحنیفہ نے کہا تھا کہ ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحابی ہونے کی فضیلت نہ ہوتی تو میں یہ بھی کہہ دیتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ فقیہ ہیں لیکن ان لوگوں میں فطانت اور سمجھ اور ایک شئے سے دوسری شئے کی طرف ذہن کا سرعت انتقال اس درجہ تھا کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے اصحاب کے اقوال کے مطابق جواب مسائل کی تخریج بخوبی کر سکتے تھے، اور جس شخص کی پیدائش میں جو چیز ہوتی ہے وہ اس کے لئے سہل ہو جایا کرتی ہے (ہر گروہ اپنے اس طریقہ پر نازاں ہے جو ان کے پاس ہے) اس طرح پر انھوں نے تخریج کے قاعدہ پر فقہ کی ترتیب دی اور وہ یہ کہ ہر ایک اس شخص کی کتاب کو محفوظ رکھتا تھا جو ان کے اصحاب کی زبان اور علما کے اقوال کا زیادہ واقف اور ترجیح میں جس کی نظر سب سے زیادہ صحیح ہوتی تھی، اس واسطے وہ ہر مسئلہ میں حکم کی وجہ میں غور کر سکتا تھا پس جب کسی عالم سے مسئلہ دریافت کیا جاتا یا اس کو کسی امر کی ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے اصحاب کی تصریحات میں غور کرتا جو اس کو محفوظ ہوتی تھیں اگر ان میں جواب مل جاتا تو فبہا ورنہ ان کے عموم کلام کو دیکھتا اور اس مسئلہ کو اس عموم پر جاری کرتا یا کلام کے ضمنی اشارہ کو دیکھتا اور اس سے جواب مسئلہ مستنبط کر لیتا، کبھی بعض کلام میں کوئی اشارہ یا اقتضا ہوا کرتا تھا جس سے امر مقصود و مفہوم ہو جایا کرتا تھا، اور کبھی مسئلہ مصرح کی کوئی نظیر ہوتی تھی جس پر اصل مسئلہ کو حمل کر لیا کرتے تھے اور کبھی وہ حکم مصرح کی علت میں بتخریج یا بایسر وحذف غور کرتے تھے، اور کبھی کسی عالم کے دو قول ہوتے تھے کہ اگر ان کو قیاس اقترانی یا شرطی کی ہیئت پر جمع کر لیتے تو جواب مسئلہ کا اس سے حاصل ہو جاتا، اور کبھی ان کے کلام میں بعض امور مثال اور تقسیم سے معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی تعریف جامع اور مانع معلوم نہ

تھی اس واسطے وہ فقہا اہل زبان کی طرف رجوع کرتے تھے اور اس شئے کے ذاتیات حاصل کرنے میں، اس کی جامع مانع تعریف مرتب کرنے میں، اس کے مبہم کو ضبط کرنے میں، اور اس کے مشکل کو ممیز کر دینے میں کوشش کرتے تھے، اور کبھی ان کے کلام میں دو وجوہ کا احتمال ہوتا تھا، پس وہ دونوں میں سے ایک کو ترجیح دینے میں غور کرتے تھے، اور کبھی دلائل کی ادائیگی میں خفا ہوتا ہے پس یہ فقہا اس کو صاف صاف بیان کر دیتے ہیں، اور کبھی کبھی بعض اصحاب تخریج نے اپنے ائمہ کے فعل اور ان کے سکوت وغیرہ سے استدلال کیا ہے، پس ان طرق مذکورہ کو تخریج کہا جاتا ہے اور اسی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے قول کی اس طرح تخریج کی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں مذہب کے موافق یا فلاں شخص کے قاعدہ کے موافق یا فلاں شخص کے قول کے موافق مسئلہ کا جواب اس اس طرح ہے اور ان تخریج کرنے والوں کو مجتہدین فی المذہب کہا جاتا ہے، اور جس نے یہ کہا کہ جس نے مبسوط کو یاد کر لیا وہ مجتہد ہے تو اس سے وہی اجتہاد مراد ہے، جو تخریج سے متعلق ہے اگر چہ ایسے شخص کو روایت کا علم بالکل نہ ہو اور اس کو ایک حدیث بھی معلوم نہ ہو اس طرح ہر ایک مذہب میں تخریج واقع ہوئی اور اس کی کثرت ہو گئی، پس جس مذہب کے لوگ زمانہ میں مشہور ہو گئے اور ان کو عہدہ قضا و استفتا ملا اور ان کی تصانیف لوگوں میں مشہور ہوئیں اور انھوں نے عام طور پر درس دینا شروع کیا تو وہ مذہب اطراف عالم میں پھیل گیا اور ہمیشہ اس کی شہرت ہوتی رہی اور جس مذہب کے لوگ گمنام رہے اور ان کو منصب قضا و افتا نہ ملا اور لوگوں نے ان میں رغبت نہ کی تو وہ چند روز کے بعد نابود ہو گیا۔

چوتھا باب: اس بیان میں کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے اور بعد میں لوگوں کا کیا حال تھا

واضح ہو کہ چوتھی صدی سے پہلے لوگ کسی ایک خاص مذہب کی تقلید پر متفق نہ تھے، ابو طالب مکی نے قوت القلوب میں لکھا ہے کہ کتابیں اور مجموعات، لوگوں کے اقوال بیان کرنا، کسی شخص کے مذہب پر فتویٰ دینا اور اس کا قول اختیار کرنا اور ہر امر میں اس کا قول نقل کرنا اور اس کے مذہب پر فقہ کی بنیاد قائم کرنا یہ سب نئی باتیں ہیں، قرن اول اور دوم میں پہلے لوگ ان باتوں کے قائل نہیں تھے، انتہی۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں قرنوں کے بعد کسی قدر تخریج کا طریقہ پیدا ہو گیا لیکن

چوتھی صدی کے لوگ کسی خاص شخص کی تقلید خالص پر متفق نہیں تھے اور نہ کسی خاص شخص کے فقہ کے پابند تھے اور نہ ہر امر میں اسی کے قول کو نقل کرتے تھے جیسا کہ تتبع سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ ان میں علما اور عام لوگ تھے، عام لوگوں کی یہ حالت تھی کہ وہ ان متفقہ مسائل میں جن میں اہل اسلام یا جمہور مجتہدین کا اختلاف نہ تھا صاحب شریعت کے سوا کسی اور کی تقلید نہیں کرتے تھے، وضو، غسل، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا طریقہ وہ اپنے باپ داداؤں یا شہر کے علما سے سیکھ لیا کرتے تھے اور اسی کے موافق عمل کرتے تھے اور جب کوئی نیا واقعہ پیش آتا تھا تو بلا تعین مذہب جو مفتی مل جاتا تھا اس سے مسئلہ دریافت کرلیا کرتے تھے، اور خاص لوگوں کی یہ حالت تھی کہ ان میں سے محدثین حدیث میں مصروف رہتے تھے اس واسطے ان کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار اس قدر موجود تھے کہ ان کو کسی مسئلہ میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں رہتی تھی اور ان کے پاس بہت سی احادیث مستفیض یا صحیحہ تھیں جن پر بعض فقہا عمل کر چکے تھے اور جن کی وجہ سے تارک عمل کو کوئی عذر باقی نہ رہا، یا ان کے پاس جمہور صحابہ اور تابعین سے ایسے اقوال منقولہ موجود تھے جن کی مخالفت مستحسن معلوم نہیں ہوتی تھی، پس اگر تعارض نقل اور وجہ ترجیح ظاہر نہ ہونے وغیرہ سے کسی مسئلہ میں ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا تو گزشتہ فقہا میں سے کسی کے کلام کی طرف رجوع کرلیا کرتے تھے اور اگر اس مسئلہ میں فقہا کے دو قول ان کو ملتے تھے تو ان میں سے جو زیادہ قابل اعتماد ہوتا تھا اس کو اختیار کرتے تھے خواہ وہ قول اہل مدینہ کا ہو یا اہل کوفہ کا ہو۔

اور ان خواص میں سے اہل تخریج کی یہ حالت تھی کہ جس مسئلہ کو وہ مصرح نہیں پاتے تھے اس میں وہ تخریج کرتے تھے اور مذہب میں اجتہاد کرتے تھے اور یہ لوگ اپنے اصحاب کے مذہب کی طرف منسوب ہوا کرتے تھے پس کہا جاتا تھا کہ فلاں شخص شافعی ہے اور فلاں شخص حنفی ہے، اور اہل حدیث بھی کثرت موافقت کی وجہ سے کبھی کبھی کسی خاص مذہب کی طرف منسوب ہوتے تھے جیسے نسائی اور بیہقی امام شافعی کی طرف منسوب ہوتے تھے۔

اور سوائے مجتہد کے کسی کو قضا اور فتوے کی خدمت نہیں ملتی تھی اور صرف مجتہد ہی کو فقیہ کہتے تھے، ان قرنوں کے بعد اور لوگ ہوئے جو دائیں بائیں چلنے لگے اور چند امور ان میں بالکل نئے پیدا ہوگئے۔

ازآنجملہ علم فقہ کے متعلق ان میں نزاع اور خلاف پیدا ہو گیا، اس کی تفصیل جیسے کہ امام غزالیؒ نے بیان کی ہے یہ ہے کہ جب خلفائے راشدین مہدیین کا زمانہ گزر گیا تو خلافت ان لوگوں کو مل گئی جو اس کے قابل اور مستحق نہیں تھے اور نہ ہی ان کو فتاوی اور احکام دین کا مستقل علم تھا۔ اس واسطے ان کو فقہا سے مدد حاصل کرنے کی اور ہر حال میں ان کو اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت ہوئی۔ اور علما میں سے کچھ ایسے لوگ باقی رہ گئے تھے جو طرز اوّل پر قائم تھے اور صاف دین کے پابند تھے پس جب وہ امرا ان کو طلب کرتے تھے تو وہ گریز کرتے تھے اور خلفا کی صحبت سے اعراض کرتے تھے تب اس زمانہ کے لوگوں نے دیکھا کہ علما کی بڑی عزت ہے اور باوجود ان کے اعراض کے سلاطین ان پر ٹوٹے پڑتے ہیں تو ان لوگوں نے اعزاز اور مرتبہ حاصل کرنے کی آرزو میں نہایت شوق سے علم کی طلب میں توجہ کی پھر تو فقہا مطلوب ہونے کے بجائے طالب ہو گئے اور سلاطین کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے جس قدر معزز تھے بعد میں ان کی طرف التفات کرنے سے اسی قدر ذلیل ہو گئے مگر جس کو خدا نے توفیق دی وہ اس ذلت سے بچا رہا اور ان لوگوں سے پہلے لوگ علم کلام میں کتابیں تصنیف کر چکے تھے اور اس فن میں بہت قیل وقال کر چکے تھے اور اعتراضات وجوابات اور مقابلہ وجدل کا طریقہ بیان کر چکے تھے پس اس علم نے ان کے دلوں میں اس وقت تک قرار پایا جب تک وزرا اور سلاطین کی طبیعتیں فقہ میں مناظرہ کی جانب اور مذہب شافعی وابوحنیفہ میں اولویت ظاہر ہونے کی طرف مائل نہ ہوئیں، بعد میں لوگوں نے علم کلام اور علمی فنون کو ترک کر دیا اور بالخصوص امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے اختلافی مسائل کی طرف متوجہ ہو گئے اور جو اختلافات امام مالک، سفیان اور احمد بن حنبل وغیرہم کے ساتھ تھے ان میں تساہل کیا اور یہ لوگ سمجھے کہ اس چھان بین سے ان کی غرض شریعت کے دقیق مسائل کا مستنبط کرنا اور مذہب کی علتوں کا بیان کرنا اور اصول فتاوی کی تمہید ہے انھوں نے ان اختلافات میں تصانیف اور استنباطات بکثرت کیں اور کئی قسم کے مجادلوں اور تصانیف کو انھوں نے مرتب کیا اور وہ اب تک اسی میں برابر مصروف ہیں ہم نہیں جانتے کہ آئندہ زمانوں میں خدا تعالیٰ نے کیا مقدر کر رکھا ہے، انتہی حاصلہ۔

ازآن جملہ یہ کہ ان تقلید پر پورا اطمینان ہو گیا اور آہستہ آہستہ تقلید ان کے سینوں میں سرایت کرتی گئی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی، اس تقلید کا سبب فقہا کا باہم مجادلہ اور مزاحمت ہے، کیونکہ جب

ان میں فتویٰ دینے میں مزاحمت واقع ہوئی تو جو شخص فتویٰ دیتا تھا فوراً اس کے فتویٰ پر اعتراض کئے جاتے تھے اور اس کا رد کیا جاتا تھا، پس سخن کا سلسلہ اس مسئلہ کے بارے میں متقدمین سے کسی شخص کے مصرح قول پر ختم ہوتا تھا۔

اور نیز تقلید کا ایک سبب قاضیوں کا ظلم تھا کیونکہ جب اکثر قاضیوں کی طبیعت میں ظلم آ گیا اور ان میں امانت نہ رہی تو ان کے فیصلے جب ہی مقبول سمجھے جاتے تھے کہ عام لوگوں کو ان میں اشتباہ باقی نہ رہے اور ان کا پہلے سے کوئی قائل بھی ہو۔

اور نیز ایک سبب یہ تھا کہ حکام جاہل تھے اور لوگ ایسے لوگوں سے فتویٰ لیتے تھے جن کو نہ علم حدیث حاصل تھا اور نہ وہ تخریج کے طریقہ سے واقف تھے جیسا کہ اکثر متاخرین کی ظاہری حالت تم دیکھتے ہو ابن ہمامؒ وغیرہ نے اس پر تنبیہ کی ہے، اس زمانہ میں غیر مجتہد کو بھی فقیہ کہنے لگے تھے۔

از آں جملہ یہ ہے کہ اکثر لوگ ہر فن کی باریک بینی کی طرف متوجہ ہو گئے پس ان میں سے بعض نے خیال کیا کہ وہ علم اسماء الرجال کی بنیاد مستحکم کر رہے ہیں اور جرح و تعدیل کے مرتبوں کو معلوم کرتے ہیں، اس کے بعد انھوں نے قدیم اور جدید تاریخ کی طرف توجہ کی اور بعض نے نادر اور غریب خبروں میں تفتیش شروع کی خواہ وہ خبریں موضوع کے درجہ کی ہوں اور بعض نے اصول فقہ کے متعلق زیادہ گفتگو کی اور ہر ایک نے اپنے اپنے اصحاب کے لئے مناظرہ کے اصول مستنبط کئے پس ان کو مقابل پر پیش کیا اور نہایت درجہ اعتراضات کئے اور ان کے جوابات دیئے اور نہایت درجہ چھان بین کی، ہر امر کی تعریف و تقسیم کی، پس کبھی طول کلام کیا اور کبھی اختصار کیا، بعض نے اس میں یہ روش اختیار کی کہ مسائل کی ایسی مستبعد صورتیں فرض کیں جو اس قابل تھیں کہ کوئی عاقل ان کے درپے نہ ہو اور مخرجین اور ان سے بھی کمتر لوگوں کے کلام سے ایسے عمومات اور ایجادات کی تفتیش شروع کی جن کا سننا نہ عالم پسند کرتا ہے اور نہ جاہل۔

اس جدل و مخالفت اور تعمق کا ضرر اس فتنۂ اولیٰ کے قریب قریب تھا جب لوگوں نے ملک میں فساد برپا کئے تھے اور ہر شخص نے اپنے اپنے ساتھی کی امداد کی تھی، پس جس طرح اس فتنہ و فساد سے انجام کار ظالم حکومت قائم ہوگئی اور نہایت سخت اور تاریک واقعات پیش آئے اسی طرح اس جدل و اختلاف سے جہالت، اختلاط، شکوک اور اوہام پیدا ہو گئے جن سے نجات کی امید نہیں ان

کے بعد صرف تقلید کے زمانے پیدا ہوتے گئے لوگوں کو حق و باطل میں مخاصمت اور استنباط میں کچھ تمیز نہ رہی فقیہ اس زمانہ میں اس شخص کا نام ہو گیا جو بڑا بکواسی اور زبان دراز ہو، جو فقہا کے قوی وضعیف اقوال بغیر امتیاز کے حفظ کرے اور منہ زوری سے ان کو بیان کرتا جائے اور محدث اس شخص کا نام ہو گیا جو صحیح، سقیم حدیثیں شمار کرے اور قصہ گویوں کی طرح زبان زوری سے بیان کرتا جائے، میں یہ بات کلیتًا سب کی نسبت نہیں کہتا ہوں کیونکہ بندگان الٰہی میں سے ایک جماعت ہمیشہ ایسی ہوا کرتی ہے جن کو کوئی رسوا کرنے والا مضرت نہیں پہنچا سکتا اور وہ خدا کی زمین میں اس کی طرف سے حجت ہوتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، اس کے بعد جو زمانہ آتا گیا اس میں فتنہ اور تقلید کی زیادتی ہی ہوتی گئی اور لوگوں کے دلوں سے امانت دور ہوتی گئی حتی کہ امور دین میں خوض کرنا انھوں نے ترک کر دیا اور یہ کہہ کر مطمئن ہو گئے ''ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک جماعت پر متفق پایا ہے ہم انہیں کے نشانوں کے پیرو ہیں، اور خدا تعالیٰ ہی سے شکایت ہے اور اسی سے طلب اعانت ہے، اسی کا سہارا ہے، اور اسی پر اعتماد ہے۔

فصل

اس مقام کے مناسب یہ ہے کہ ان مسائل پر لوگوں کو آگاہ کردیا جائے کہ جن کے صحراؤں میں افہام بہک گئے ،قدم لغزش کھا گئے اور قلموں نے کج روی کی۔

ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ مذاہب اربعہ جو مدون ہو چکے ہیں اور تحریر میں آ چکے ہیں تمام امت یا وہ لوگ جو اس امت میں قابل اعتبار ہیں سب اس زمانہ میں ان کی تقلید کے جائز اور درست ہونے پر متفق ہیں اور اس تقلید میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں خاص کر اس زمانہ میں جس میں لوگ نہایت ہی پست ہمت ہو گئے ہیں اور ان کے قلوب خواہش نفسانی سے پر ہو گئے اور ہر شخص اپنی ہی رائے پر ناز کرنے لگا ، پس ابن حزمؒ نے جو کہا ہے کہ تقلید حرام ہے اور کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا دلیل کسی کے قول کو اختیار کرے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''انہیں امور کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کئے گئے ہیں اور خدا کے علاوہ اور مقربین کا اتباع نہ کرو''۔ نیز خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''جب مشرکین سے کہا جاتا ہے ان احکام کی پیروی کرو جو خدا تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں تو وہ کہتے ہیں 'نہیں' بلکہ ہم تو انہیں چیزوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے''۔ اور جو لوگ تقلید نہیں کرتے ان کی مدح میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ''میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دو جو بات کو سنتے ہیں اور جو سب سے اچھی ہوتی ہے اس کا اتباع کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کو خدا نے ہدایت کی ہے اور وہی عقل والے ہیں''۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''اگر تم کسی بات میں نزاع کرو تو اس کو خدا اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو''۔ پس خدا تعالیٰ نے نزاع کے وقت بجز قرآن وحدیث کے کسی کی طرف متوجہ ہونے کو جائز نہیں کیا ہے اور اس آیت کے ذریعہ تنازع

کے وقت کسی شخص کے قول کی طرف رجوع کرنا حرام کر دیا اس لئے کہ وہ قول قرآن وسنت کے غیر ہے اور تمام صحابہ، تمام تابعین اور تمام تبع تابعین کا اتفاق ہو چکا ہے کہ کسی انسان کے قول کی طرف قصد کرنا خواہ وہ اس کے زمانہ کا ہو یا سابق لوگوں میں سے ہو، اور جن کی ہر بات کو تسلیم کرنا ممنوع ہے پس جو شخص امام ابوحنیفہ یا امام مالک یا امام شافعی یا امام احمد رضی اللہ عنہم کے تمام اقوال کی پیروی کرے اور ان میں سے یا ان کے علاوہ میں سے اپنے مقتدا کے قول کے سوا کسی دوسرے کی بات کی پیروی نہ کرے اور قرآن وسنت کے احکام پر اعتماد نہ کرے جب تک کہ وہ ان کو کسی خاص شخص کے قول کی جانب نہ پھیرے تو ایسا شخص خوب سمجھ لے کہ اس نے یقیناً بلا شبہ اول سے آخر تک تمام امت کی مخالفت کی ہے اور وہ کسی سلف کو اور تینوں مبارک زمانوں میں سے کسی شخص کو اپنے ہمراہ نہ پائے گا، پس تحقیق ایسے شخص نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جو مومنین کا نہیں ہے، ہم ایسی حالت سے خدا کی پناہ لیتے ہیں۔

اور نیز ان تمام فقہا نے غیر سلف کی تقلید سے منع کیا ہے پس ایسا شخص جو ان کی تقلید کرتا ہے وہ ان کے بھی خلاف ہے، اور نیز وہ کون شخص ہے جس نے ان لوگوں میں سے کسی کی تقلید کو یا ان کے علاوہ کسی اور کی تقلید کو حضرت عمر بن الخطاب یا حضرت علی بن ابی طالب یا حضرت عبداللہ بن مسعود یا حضرت عبداللہ بن عمر یا حضرت عبداللہ بن عباس یا حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہم کی تقلید سے اولیٰ قرار دیا ہو، پس اگر تقلید جائز ہوتی تو ان صحابہ میں سے ہر شخص بہ نسبت دوسروں کے مقتدا ہونے کے زیادہ قابل ہے، انتہی۔

ابن حزمؒ کی یہ تقریر اس شخص کے حق میں پوری ہو سکتی ہے جس کو اجتہاد کی کسی قدر قوت حاصل ہو، اگر چہ ایک ہی مسئلہ میں کیوں نہ ہو، اور اس شخص کے حق میں ہو سکتی ہے جو صاف طور پر جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں امر کا حکم فرمایا ہے اور فلاں امر سے منع فرمایا ہے اور یہ بھی جانتا ہے یہ حدیث منسوخ نہیں ہے یا تو اس وجہ سے کہ وہ اس مسئلہ میں احادیث کا اور مخالف وموافق اقوال کا تتبع کرتا ہے اور وہ کوئی ناسخ نہیں پاتا اور یا اس وجہ سے کہ وہ متبحر علما کی ایک کثیر جماعت کو اس پر عمل کرتے ہوئے پاتا ہے اور اس کے مخالف کو دیکھتا ہے کہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس یا استنباط وغیرہ سے استدلال کرتا ہے پس ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث

کی مخالفت کا سبب بجز نفاق خفی اور حماقت جلی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا اور اسی شئے کی طرف شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اشارہ فرمایا ہے، وہ کہتے ہیں نہایت تعجب کی بات ہے کہ فقہا مقلدین میں سے بعض اپنے امام کے ضعف ماخذ سے واقف ہوتا ہے کیونکہ اس کے ضعف کو دفع کرنے والی کوئی شئے نہیں ملتی اس کے باوجود وہ اپنے امام کی تقلید ہی کرتا ہے اور اپنے امام کی تقلید سے وابستگی ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے مذہب کو ترک کر دیتا ہے جس پر قرآن وحدیث اور صحیح قیاسات کی شہادت ملتی ہے بلکہ ظاہر قرآن وحدیث کو رد کرنے کے لئے مختلف حیلے کرتا ہے اور اپنے مقتدا کی حمایت میں ان میں بعید و باطل تاویلیں کرتا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ لوگ ہمیشہ سے بغیر کسی قید مذہب کے اور سائلین پر بغیر کسی ملامت کے جس عالم سے بھی ملاقات ہوگئی اس سے مسئلے دریافت کرتے رہے یہاں تک کہ ان مذاہب اور متعصب مقلدین کا ظہور ہوا، پس تحقیق ان میں سے ہر شخص اپنے امام کا مقلد بن کر اس کے قول کی ایسی پیروی کرتا ہے گویا وہ نبی مرسل ہے، باوجود یہ کہ اس کا مذہب دلائل سے بہت بعید ہے، ایسا کرنا حق اور صواب سے دور ہٹنا ہے جس کو کوئی عقلمند پسند نہیں کرتا، امام ابوشامہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا فقہ میں شغل ہو اس کو یہی مناسب ہے کہ کسی ایک امام کے مذہب کا پابند نہ ہو اور ہر مسئلہ میں اسی امر کی صحت پر اعتقاد رکھے جو دلالت کتاب اور سنت محکمہ سے زیادہ قریب ہو، اور اس کے لئے یہ امر سہل ہے جبکہ اس نے سابقہ اہم علوم کو منضبط کر لیا ہو، اور اس کو چاہئے کہ تعصب سے اور متاخرین کے طرق اختلافات میں غور کرنے سے اجتناب کرے کیونکہ یہ امور وقت کو ضائع کرتے ہیں اور صاف طبیعتوں کو مکدر کرتے ہیں، امام شافعیؒ سے یہ روایت صحیح منقول ہے کہ انھوں نے اپنی اور دوسروں کی تقلید سے منع فرمایا ہے امام شافعی کے صاحب امام مزنی اپنے مختصر کے شروع میں فرماتے ہیں: اس کتاب میں میں نے امام شافعیؒ کے علم اور ان کے اقوال کے معانی کو مختصراً بیان کیا ہے تاکہ ان کو اس شخص کے ذہن کے قریب کردوں جو ان کے معلوم کرنے کا قصد کرتا ہو، اور میں اس کو یہ بھی بتادوں کہ امام شافعی نے اپنی تقلید اور دوسروں کی تقلید سے منع فرمایا ہے تاکہ آدمی اپنے دین کے لئے ان کے قول میں غور کرے اور اپنے نفس کیلئے احتیاط کرے، یعنی میں اس شخص کو جو امام شافعی کے علم کو حاصل کرنے کا قصد کرے یہ بتاتا ہوں کہ امام شافعی نے اپنی تقلید اور دوسروں کی تقلید سے منع فرمادیا ہے، انتہی۔

اور نیز ابن حزمؒ کا قول اس شخص کے حق میں درست ہوسکتا ہے جو عامی ہے اور کسی خاص فقیہ کی تقلید یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ ایسے شخص سے خطا کا ہونا ناممکن ہے اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور اپنے دل میں یہ خیال رکھتا ہے کہ اس کے خلاف دلیل ظاہر ہونے پر بھی میں اس کی تقلید کو ترک نہیں کروں گا، اسی کے متعلق امام ترمذی نے عدی بن حاتمؓ سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ''یہود و نصاریٰ نے اپنے علما اور راہبوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اپنا رب قرار دے لیا تھا''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''وہ اپنے علما کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ جب وہ کسی چیز کو ان کے لئے حلال کہہ دیا کرتے تھے تو وہ اس کو حلال سمجھ لیتے تھے اور جب وہ کسی چیز کو ان کے لئے حرام قرار دے دیا کرتے تو وہ بھی اس کو حرام سمجھ لیتے تھے''۔

اور نیز اس شخص کے حق میں یہ قول درست ہوسکتا ہے جو یہ جائز نہیں سمجھتا کہ کوئی حنفی مثلاً کسی شافعی فقیہ سے فتویٰ دریافت کرے یا اس کے برعکس ہو اور یہ بھی جائز نہیں سمجھتا کہ حنفی مثلاً کسی شافعی امام کی اقتدا کرے کیونکہ ایسا خیال قرون اولیٰ کے اجماع اور صحابہ وتابعین کے بالکل خلاف ہے اور ابن حزم کا قول اس شخص کے متعلق نہیں ہوسکتا ہے جو محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا مطیع ہے اور اسی چیز کو وہ حلال یا حرام سمجھتا ہے جس کو اللہ اور رسولؐ نے حلال یا حرام کیا ہے، لیکن جبکہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول معلوم نہیں تھا اور نہ مختلف حدیثوں کے جمع کرنے کا طریق اس کو معلوم تھا اور نہ ہی آپ کے کلام سے وہ کوئی امر مستنبط کرسکتا تھا تو اس نے کسی رہنما عالم کی پیروی کی، یہ سمجھ کر کہ وہ اپنے قول میں درست ہے اور یہ ظاہر سنت رسول کا متبع ہوکر فتویٰ دیتا ہے، پس اگر وہ عالم اس کے اس گمان کے خلاف معلوم ہوا تو اس نے فوراً بغیر اصرار و جدال کے اس کے قول کو ترک کردیا پس ایسے شخص کو کوئی کیسے برا کہہ سکتا ہے باوجودیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے فتویٰ دینے اور فتویٰ لینے کا سلسلہ مسلمانوں میں برابر رہا ہے اور اس کے بعد کہ اس کا مقصود وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے اس میں کچھ فرق نہیں ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ ایک ہی سے مسئلے پوچھا کرے یا کبھی اس سے دریافت کرلیا کرے اور کبھی کسی دوسرے سے۔

اور کس طرح کوئی برا کہہ سکتا ہے حالانکہ ہم کسی فقیہ پر یہ ایمان نہیں لائے کہ خدا تعالیٰ نے

فقہ کو بطور وحی اس پر نازل کیا ہے، اور خدا نے اس کی اطاعت ہم پر فرض کر دی ہے اور وہ بالکل معصوم ہے، پس اگر ہم کسی فقیہ کی تقلید کرتے ہیں تو یہی سمجھ کر کرتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے اور اس کا قول یا تو قرآن وحدیث کا صریح حکم ہے یا اس نے کسی طریق استنباط سے قرآن وحدیث سے اپنے قول کو مستنبط کیا ہے یا اس نے قرائن سے یہ معلوم کیا ہے کہ شارع نے فلاں صورت میں جو حکم دیا ہے وہ حکم فلاں علت کی وجہ سے ہے اور علت حکم کی معرفت کا اس کو خوب یقین ہو گیا تھا اس واسطے اس نے منصوص پر غیر منصوص کو قیاس کر لیا گویا وہ فقیہ یہ کہتا ہے کہ میرا ظن غالب یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ جہاں یہ علت پائی جائے گی وہاں یہ حکم پایا جائے گا۔ اور مقیس بھی اس عموم میں داخل ہے اس واسطے یہ قول بھی گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی منسوب ہے، لیکن اس کے طرق میں امور ظنی شامل ہیں، اور اگر یہ اعتقاد نہ ہوتا تو مومن کسی مجتہد کی پیروی نہ کرتا۔

پس اگر ہم کو رسول معصوم کی حدیث بہ سند صحیح معلوم ہو جائے جن کی اطاعت خدا نے ہم پر فرض کی ہے اور وہ حدیث اس مجتہد کے مذہب کے خلاف ہے اور اس حدیث کو ترک کر کے اس تخمینی بات کا ہم اتباع کریں تو ہم سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے اور جس روز رب العالمین کے سامنے لوگ حاضر ہوں گے تو ہمارا کیا عذر ہو سکتا ہے۔

ان مسائل مشکلہ میں سے ایک امر یہ ہے کہ کلام فقہا پر تخریج کرنا اور لفظ حدیث کا تتبع کرنا ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے دین میں مضبوط اصل ہے، ہر زمانہ میں علما محققین ان دونوں پر عمل کرتے رہے ہیں پس ان میں سے بعض تخریج کی جانب زیادہ اور لفظ حدیث کے تتبع کی طرف کم التفات کرتے ہیں، اور بعض تخریج کی طرف کم اور تتبع کی جانب زیادہ اہتمام کرتے ہیں اس واسطے یہ مناسب نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی بالکل ترک کر دیا جائے جیسا کہ فریقین کے عام لوگ کرتے ہیں بلکہ خالص حق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ مطابق کرنا چاہئے اور ایک کی خرابی دوسرے سے دور کرنا چاہئے، اور امام حسن بصریؒ کے اس قول سے یہی مراد ہے "قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں تمہارا طریقہ افراط، تفریط کے درمیان ہے، پس جو شخص اہل حدیث سے ہو اس کو مناسب ہے کہ اپنے اختیار کردہ قول اور مذہب کو تابعین میں سے مجتہدین کی

رائے پر پیش کرے اور جو اہل تخریج سے ہو اس کو مناسب ہے کہ وہ ایسا طریقہ اختیار کرے جس سے صریح اور صحیح احادیث کی مخالفت سے بچ سکے، اور جس امر میں حدیث یا کوئی اثر وارد ہو وہاں حتی المقدور اپنی رائے سے نہ کہے، اور محدث کو مناسب نہیں ہے کہ ان قواعد میں زیادہ تعمق کرے جو ارباب حدیث نے مستحکم کئے ہیں اور شارع نے ان کی تصریح نہیں کی ہے تاکہ اس وجہ سے وہ محدث کسی حدیث یا صحیح قیاس کو رد کر دے جیسے ان حدیثوں کو رد کر دے جن میں ارسال یا انقطاع کا ادنیٰ شائبہ ہے جیسے ابن حزم نے کیا ہے، انھوں نے تحریم معازف کی حدیث کو اس وجہ سے رد کر دیا کہ بخاری کی روایت میں انقطاع کا شائبہ تھا حالانکہ وہ حدیث فی نفسہ متصل اور صحیح ہے کیونکہ ایسے امور کی طرف تعارض کے وقت رجوع کیا جاتا ہے اور جیسے محدثین کا قول ہے کہ فلاں شخص فلاں شخص کی حدیث کا زیادہ حافظ ہے اس وجہ سے محدثین اس شخص کی حدیث کو دوسرے کی حدیث پر ترجیح دیتے ہیں گو کہ دوسرے کی حدیث میں ترجیح کی ہزار وجہیں ہوں اور روایت بالمعنی کے وقت اکثر روایت کرنے والے اس کا اہتمام کرتے تھے کہ اصلی معنی ادا ہو جائیں، وہ ان اعتبارات کا کچھ لحاظ نہیں کرتے تھے جن کو عربیت میں غور کرنے والے جانتے ہیں اس واسطے ان کا مثلاً 'فا' یا 'واو' سے یا کسی کلمہ کی تقدیم وتاخیر وغیرہ سے استدلال کرنا زیادتی ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسرا راوی اس قصہ کو (جو پہلے راوی نے بیان کیا تھا) دوسری عبارت سے بیان کر دیا کرتا ہے اور ایک حرف کے بجائے دوسرا حرف لے آتا ہے اور حق یہی ہے کہ راوی جو حدیث بیان کرتا ہے بظاہر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے اس کے بعد اگر کوئی دوسری حدیث یا کوئی دوسری دلیل ظاہر ہوتی ہے تو اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو جائے گا، اور اہل تخریج کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسے قول کی تخریج کرے جو اس کے اصحاب کے نفس کلام سے حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی اہل عرف اور علمائے لغت اس کلام سے اس قول کو سمجھتے ہیں، اور وہ قول یا تو تخریج مناط پر مبنی ہے اور یا مسئلہ کی نظیر کو مسئلہ پر حمل کرتا ہے جس میں اہل وجوہ کا اختلاف ہے اور ان کی رائیں متعارض ہیں اور اگر اس کے اصحاب سے اس مسئلہ کے متعلق پوچھا جائے تو کبھی تو وہ کسی مانع کی وجہ سے نظیر پر حمل کرتے ہوں اور کبھی وہ ایسی علت بیان کرتے ہوں جو اس کے خلاف ہو جس کی اس نے تخریج کی ہے، اور تخریج اس لئے جائز ہے کہ وہ بھی فی الحقیقت مجتہد کی تقلید ہے اور یہ تخریج جب ہی مکمل

ہوتی ہے کہ مجتہد کے کلام سے مفہوم بھی ہوتی ہو، اور صاحب تخریج کو یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ کسی قاعدہ سے جس کا اس نے یا اس کے اصحاب نے استخراج کیا ہے کسی حدیث یا اثر کو جس پر قوم متفق ہے رد کر دے جیسے کہ حدیث مصراۃ (۱) کو رد کر دیا ہے اور جیسے کہ ذوی القربیٰ کے حصہ کو ساقط کر دیا ہے اس واسطے کہ اس مستخرج قاعدہ کی رعایت کرنے سے اس حدیث کی رعایت کرنا زیادہ ضروری ہے اور اسی معنی کی طرف امام شافعیؒ نے اشارہ کیا ہے اس لئے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں جب کوئی بات کہوں یا کوئی قاعدہ مقرر کروں اور اس کے بعد میرے قول کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث معلوم ہو تو صحیح قول وہی ہے جو آنحضرتؐ نے فرمایا۔

اور ان مسائل مشکلہ میں سے یہ بھی ہے کہ احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لئے قرآن وحدیث میں تتبع کرنے کے چند مراتب ہیں، سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اس کو بالفعل یا بقوۃ قریبہ من الفعل اس قدر احکام کی معرفت حاصل ہو جس سے اکثر واقعات میں مستفتین کا جواب دے سکے اس طرح سے کہ اس کے جوابات اکثر ہوں ان مسائل سے جن میں کہ وہ توقف کرتا ہے اور اس معرفت کو اجتہاد کہتے ہیں، اور یہ استعداد کبھی تو روایات کے جمع کرنے میں غور وفکر کرنے سے اور روایات شاذہ ونادرہ کا پورا تتبع کرنے سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ احمد بن حنبلؒ نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے ساتھ اس کو مواقع کلام کی معرفت بھی حاصل ہو جو عاقل زبان داں کو ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ مختلفات کے جمع کرنے کا طریق اور استدلالات کی ترتیب وغیرہا بھی جانتا ہو جو آثار سلف کے واقف کو ہوا کرتی ہے۔

اور یہ استعداد کبھی اس طرح سے حاصل ہوتی ہے کہ مشائخ فقہ میں سے کسی شیخ کے مذہب کے موافق طرق تخریج کو خوب مستحکم کرلے اور اس کے ساتھ احادیث وآثار کے کافی مجموعہ سے بھی واقف ہو جس سے وہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کا قول اجماع کے مخالف نہیں ہے اور یہ طریقہ اصحاب تخریج کا ہے اور اس تتبع کا اوسط درجہ جو انہی دو طریقوں سے حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ قرآن

(۱) حدیث مصراۃ وہ حدیث ہے جس کو ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ جو شخص اپنے جانوروں کا دودھ روک کر فروخت کرے تو خریدار کو اس فریب کی اطلاع ہونے پر اختیار ہے چاہے اس کو رکھ لے اور چاہے ایک صاع چھوہارہ دیکر رد کر دے۔

واحادیث کا اس قدر علم حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے مسائل فقہ جو متفق علیہا ہیں مع ان کے تفصیلی دلائل کے معلوم کر سکے اور بعض مسائل اجتہادیہ کا ان کے دلائل کے ذریعہ نہایت درجہ علم حاصل ہو جائے اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دے سکے تخریجات کو پڑھ سکے اور صحیح وغلط کو سمجھ سکے گو اس کو وہ اسباب حاصل نہ ہوں جو مجتہد مطلق کو حاصل ہوتے ہیں، پس ایسے شخص کو دو مذہبوں میں خلط کر دینا جائز ہو جاتا ہے جبکہ ان دونوں کے دلائل کو خوب سمجھ لے اور یہ معلوم کر لے کہ اس کا قول ایسے امر میں نہیں ہے، جس میں مجتہد کا اجتہاد نافذ نہیں ہوتا اور نہ اس میں قاضی کا فیصلہ مقبول ہوتا ہے اور نہ اس میں مفتیوں کا فتویٰ جاری ہوتا ہے، اور ایسے شخص کو یہ بھی مجاز ہوتا ہے کہ بعض ان تخریجات کو ترک کر دے جن کو سابقین نے خارج کیا تھا جب ان کے صحیح نہ ہونے کا علم ہو جائے، اسی وجہ سے وہ علما جو اجتہاد مطلق کے مدعی نہیں تھے ہمیشہ سے تصانیف کرتے رہے، ترتیب دیتے رہے، تخریج کرتے رہے اور ترجیح دیتے رہے اور جبکہ جمہور کے نزدیک اجتہاد متجزی ہوتا ہے اور تخریج متجزی ہوتی ہے اور مسائل میں مقصود گمان غالب کا حاصل کرنا ہے اور اسی گمان غالب پر تکلیف کا مدار ہے تو امور بالا میں سے کسی چیز کو بھی بعید نہیں سمجھا جا سکتا اور جو لوگ اس سے کم تر درجہ کے ہیں ان کا مذہب ان مسائل میں جو کثیر الوقوع ہیں وہ ہے جو انھوں نے اپنے اصحاب، اپنے آبا اور اپنے اہل شہر سے اخذ کیا ہے ان مذاہب میں سے جن کا انھوں نے اتباع کیا ہے اور نادر مسائل میں ان کا مذہب اپنے مفتیوں کے فتوے اور معاملات میں قاضی کے فیصلے ہیں، اور ہم نے متقدمین و متاخرین میں سے ہر مذہب کے علما محققین کو اسی طریق پر پایا ہے اور ائمہ مذاہب نے اسی کی اپنے اصحاب کو وصیت کی ہے، یواقیت و جواہر میں ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص میری دلیل کو نہ جانے اس کو مناسب نہیں ہے کہ میرے کلام سے فتویٰ دے اور جب ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتویٰ دیتے تھے تو وہ یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ نعمان بن ثابت کی یعنی میری رائے ہے۔

اور جہاں تک ہم کو قدرت ہوئی اس میں یہ قول بہت اچھا ہے اور جو شخص اس سے عمدہ کوئی اور قول پیش کرے تو وہی زیادہ درست ہے، امام مالک رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر ایک کا کلام اختیار کرنے اور رد کرنے کے قابل ہے۔ حاکم اور بیہقی

نے امام شافعی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جب تم میرا کلام حدیث کے مخالف دیکھو تو حدیث پر عمل کرنا اور میرے کلام کو دیوار پر مارنا، اور امام شافعیؒ نے ایک روز امام مزنی سے فرمایا'' اے ابراہیم! میری ہر بات میں تقلید نہ کرنا اور اپنے لئے اس میں غور کرنا کیونکہ یہ دین ہے۔

اور امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کا قول حجت نہیں ہوسکتا خواہ لوگ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اور نہ قیاس حجت ہے اور نہ کوئی شئے اور اس مقام پر اللہ اور اس کے رسول کی طاعت ہی واجب التسلیم ہے۔ اور امام احمد رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی کو خدا اور رسول کے مقابلہ میں گفتگو کی اجازت نہیں، اور نیز امام احمد نے ایک شخص سے کہا کہ ہرگز میری تقلید نہ کرنا اور نہ ہرگز امام مالک کی اور نہ اوزاعی کی اور نہ نخعی کی اور نہ کسی اور کی تقلید کرنا، جہاں کتاب وسنت سے انھوں نے احکام اخذ کئے ہیں وہیں سے اخذ کرنا، اور کسی شخص کو فتویٰ نہیں دینا چاہئے جب تک کہ شرعی فتووں میں وہ علما کے اقوال سے واقف نہ ہو اور ان کے مذاہب کو نہ جانتا ہو، پس اگر اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے اور اس کو یہ معلوم ہو کہ اس پر ان علما کا اتفاق ہے جن کا مذہب قبول کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ کہہ دے کہ یہ امر جائز ہے اور یہ ناجائز ہے اور اس کا بیان نقل کے طور پر ہوگا، اور اگر مسئلہ ایسا ہو جس میں علما نے اختلاف کیا ہے تو اس کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ یہ فلاں شخص کے قول کے موافق جائز ہے اور فلاں شخص کے قول کے موافق ناجائز ہے اور اس کو یہ مناسب نہیں ہے کہ خود ایک قول پسند کر کے کسی کے قول کے موافق فتویٰ دے دے جب تک کہ اس کی دلیل کو بہ خوبی نہ سمجھ لے۔

اور امام ابو یوسف وزفر وغیرہ فرماتے ہیں کہ کسی کو جائز نہیں ہے کہ ہمارے قول سے فتویٰ دے جب تک کہ اس کو نہ معلوم ہو جائے کہ ہم نے کہاں سے کہا ہے، عصام بن یوسفؒ سے کہا گیا کہ آپ اکثر امور میں ابوحنیفہؒ کا خلاف کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: اس واسطے کہ ابوحنیفہ کو وہ فہم عطا ہوا تھا جو ہم کو نہیں عطا ہوا، پس وہ اپنے فہم سے وہ بات معلوم کرتے تھے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہم کو یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر سمجھے ان کے قول کے موافق فتوی دے دیں۔ محمد بن حسنؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ آدمی کو فتویٰ دینا کب جائز ہوتا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ جب خطا سے اس

کا صواب زیادہ ہو، ابوبکر اسکاف بلخیؒ سے مروی ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ ایک شہر میں ایک عالم ہے کہ اس سے زیادہ علم والا وہاں اور کوئی نہیں ہے کیا اس کو جائز ہے کہ فتوی نہ دے؟ انھوں نے کہا کہ اگر وہ اہل اجتہاد میں سے ہے تو فتوی نہ دینا اس کے لئے درست نہیں ہے، پھر دریافت کیا گیا کہ صاحب اجتہاد کیونکر ہوتا ہے؟ فرمایا کہ جب مسائل کے دلائل سے واقف ہو اور اپنے ہم عصروں سے مخالفت کے وقت مناظرہ کر سکے، کہا گیا ہے کہ اجتہاد کی شرطوں میں سے ادنی شرط مبسوط کا حفظ کرنا ہے، انتہی۔

بحر الرائق میں ابولیثؒ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابونصر سے ایک مسئلہ کے متعلق دریافت کیا گیا جو ان کے سامنے پیش ہوا تھا تم کیا کہتے ہو خدا تم پر رحمت کرے تمہارے پاس چار کتابیں ہیں، کتاب ابراہیم بن رستمؒ، خصافؒ کی روایت سے کتاب ادب القاضی اور کتاب المجرد اور ہشام کی روایت سے کتاب النوادر، کیا ہم کو ان کتب سے فتویٰ دینا درست ہے یا نہیں، اور یہ سب کتابیں تمہاری نظر میں پسندیدہ ہیں، انھوں نے جواب دیا ہمارے اصحاب سے جو صحیح صحیح منقول ہے پس وہ ایسا علم ہے جو محبوب، پسندیدہ، قابل تسلیم ہے لیکن فتویٰ دینا، سو کسی کا بے سمجھے فتویٰ دینا میری رائے میں جائز نہیں اور وہ لوگوں کا بار نہ اٹھائے لیکن اگر وہ مسائل ایسے ہیں جو ہمارے اصحاب سے مشہور، ظاہر اور واضح ہیں تو ان میں مجھ کو امید ہے کہ ان پر میں اعتماد کروں، نیز بحرالرائق میں ہے کہ اگر کسی نے پچھنے لگائے یا غیبت کی پھر یہ سمجھ کر کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا ہے اس نے کچھ کھالیا تو اگر اس شخص نے کسی فقیہ سے مسئلہ دریافت نہیں کیا تھا اور نہ اس کو حدیث معلوم ہوئی تھی تب تو اس پر کفارہ واجب ہوگا اس لئے کہ یہ محض جہالت ہے اور وہ دارالاسلام میں کوئی عذر نہیں ہے، اور اگر اس نے کسی فقیہ سے دریافت کیا تھا اور اس نے روزہ توڑنے کا فتویٰ دیا تھا تو اس پر کفارہ واجب نہ ہوگا کیونکہ عامی پر عالم کی تقلید واجب ہے جب اس کے فتوے پر اس کا اعتماد ہو اس واسطے وہ اپنے فعل میں معذور ہوگا اگرچہ مفتی نے اپنے فتویٰ دینے میں خطا ہی کی ہو، اور اگر اس نے کسی مفتی سے تو دریافت نہیں کیا لیکن اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوگئی تھی (پچھنے لگانے والا اور جس کے پچھنے لگائے گئے ہیں دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا) اور آپ کا یہ فرمان معلوم ہوگیا تھا (غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اور اس شخص کو حدیث کے منسوخ ہونے کا یا اس

کی تاویل کا کچھ علم نہ تھا تو طرفین کے نزدیک اس پر بھی کفارہ نہیں ہے اس واسطے کہ ظاہر حدیث واجب العمل ہے، لیکن امام ابویوسف اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ عامی کو ظاہر حدیث پر عمل نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کو ناسخ و منسوخ کا علم نہیں ہے اور اگر کسی شخص نے عورت کو چھولیا یا شہوت سے اس کا بوسہ لیا یا سرمہ لگایا پھر یہ سمجھ کر کہ یہ چیزیں روزہ کو توڑ دیتی ہیں کچھ کھا، پی لیا تو اس پر کفارہ ہے لیکن اگر اس نے کسی فقیہ سے مسئلہ دریافت کیا تھا اور اس نے روزہ ٹوٹ جانے کا فتویٰ دیا تھا یا اس امر میں اس کو کوئی حدیث معلوم ہوگئی تھی تو کفارہ نہ ہوگا، اگر کسی شخص نے زوال سے پہلے روزہ کی نیت کی تھی پھر اس نے روزہ توڑ دیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر کفارہ واجب نہیں ہے اور صاحبین کا قول اس کے خلاف ہے، کذا فی المحیط۔

اور اس سے معلوم ہوگیا کہ عامی کا مذہب اس کے مفتی کا فتویٰ ہے، اور نیز محیط کا باب قضا الفوائت میں ہے کہ اگر کسی عام کا کوئی مذہب معین نہیں ہے تو جو مفتی اس کو فتویٰ دے گا وہی اس کا مذہب ہوگا جیسا کہ علما نے اس کی تصریح کردی ہے، پس اگر کسی حنفی نے فتویٰ دیا تو عصر و مغرب کا وہ اعادہ کرے گا اور اگر کسی شافعی نے فتویٰ دیا تو وہ عصر و مغرب کا اعادہ نہ کرے گا اور اس کی رائے کا کچھ اعتبار نہ ہوگا، اور اگر وہ کسی سے فتویٰ نہ لے یا وہ کسی مجتہد کے مذہب پر صحت کو پالے تو یہی اس کو کافی ہوگا اور اعادہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ ابن صلاحؒ نے کہا ہے کہ جو کوئی شافعی المذہب کسی حدیث کو اپنے مذہب کے مخالف پائے تو اس کو دیکھنا چاہئے اگر اس شخص کو آلات اجتہاد مطلقاً یا خاص اسی باب یا مسئلہ میں پورے حاصل ہیں تو اس حدیث پر وہ مستقل طور پر عمل کرسکتا ہے اور اگر آلات اجتہاد پورے حاصل نہیں ہیں اور بحث کرنے کے بعد اس کو حدیث کی مخالفت شاق معلوم ہوتی ہے اور مخالفت کے لئے وہ جواب شافی نہیں پاتا تو اس کو اس حدیث پر عمل کرنا درست ہے بشرطیکہ امام شافعی کے علاوہ کسی اور مستقل امام نے اس پر عمل کیا ہو اور اپنے امام کے مذہب ترک کرنے میں یہ بات اس کے لئے عذر معقول شمار ہوگی، امام نووی نے اس کو پسند کیا ہے اور اس کا اثبات کیا ہے۔

اور مسائل مشکلہ میں سے یہ بھی ہے کہ فقہا میں اکثر مختلف فیہ صورتیں بالخصوص وہ مسائل جن میں صحابہ کے اقوال دونوں جانب ظاہر ہوئے ہیں جیسے تکبیرات تشریق و تکبیرات عیدین،

احرام باندھنے والے کا نکاح، عبداللہ بن عباس وعبداللہ بن مسعود کا تشہد، بسم اللہ اور آمین کو اخفا سے پڑھنا اقامت میں دو دو بار اور ایک ایک بار کلموں کا ادا کرنا وغیر ذالک، سو وہ اختلاف دو قولوں میں سے ایک کی ترجیح میں ہے اور ان مسائل کے جواز میں سلف کو کچھ اختلاف نہ تھا ان کا اختلاف محض اولویت میں تھا، اور اس کی نظیر قرا کا طرق قرأت میں مختلف ہونا ہے، اور ان امور میں اکثر یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ صحابہ ان میں مختلف تھے اور وہ سب راہ راست پر تھے اسی واسطے مسائل اجتہادیہ میں علما ہمیشہ مفتیوں کے فتوے کو جائز رکھتے آئے ہیں اور قاضیوں کے فیصلوں کو مانتے آئے ہیں، اور کبھی کبھی اپنے مذہب کے خلاف قول پر بھی انھوں نے عمل کیا ہے، اور ایسے موقعوں میں تم ائمہ مذاہب کو دیکھو گے کہ وہ صاف صاف مخالف قول کو بیان کردیتے ہیں پس کوئی کہتا ہے اس قول میں زیادہ احتیاط ہے یا یہی قول مختار ہے یا یہ قول مجھ کو زیادہ پسند ہے اور بعض کہتے ہیں ہم کو تو یہی قول معلوم ہوا ہے، کتاب مبسوط، آثار محمد رحمۃ اللہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ کے کلام میں ایسا بہت ہے۔

ان لوگوں کے بعد نا خلف پیدا ہو گئے انھوں نے فقہا کے قول کا اختصار کیا اور خلاف پر زیادہ زور دیا اور اپنے اپنے اماموں کے پسندیدہ اقوال پر جم گئے، اور سلف سے جو یہ مروی ہے کہ وہ اپنے اصحاب کے مذہب کی پابندی پر تاکید کرتے ہیں اور کسی حال میں ان سے نکلنا نہیں چاہتے، تو یہ یا تو فطری امر کی وجہ سے ہے اس واسطے کہ ہر شخص اسی بات کو پسند کرتا ہے جس کو اس کے اصحاب پسند کرتے ہیں حتی کہ لباس اور کھانوں میں بھی اس پسندیدگی کا لحاظ ہوتا ہے، یا یہ بات کسی قوت کی وجہ سے ہے جو کسی دلیل کے ملاحظہ کرنے سے یا کسی اور سبب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے بعض لوگوں نے اس کو تعصب دینی سمجھا وہ اس سے بالکل بری ہیں۔

صحابہ و تابعین میں اور ان کے بعد کے زمانہ میں بعض ایسے تھے جو نماز میں بسم اللہ پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے تھے، بعض اس کا جہر کرتے تھے اور بعض جہر نہیں کرتے تھے، اور بعض نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے تھے، بعض پچھنے لگانے، نکسیر اور قے کی وجہ سے وضو کرتے تھے اور بعض وضو نہیں کرتے تھے بعض مس ذکر اور عورتوں کو خواہش نفسانی کے ساتھ ہاتھ لگانے سے وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے، بعض لوگ آگ سے پکی ہوئی اشیا کے

تناول سے وضو کرتے تھے اور بعض وضو نہیں کرتے تھے بعض لوگ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ باوجود ان سب امور کے ہر ایک شخص دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتا تھا، مثلاً امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد اور امام شافعی وغیرہم رضی اللہ عنہم مدینہ شریف کے مالکی المذہب وغیرہ اماموں کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے اگرچہ وہ بسم اللہ کو نہ آہستہ پڑھتے تھے اور نہ آواز سے، ہارون رشید نے ایک بار پچھنے لگا کر نماز پڑھائی اور امام ابویوسف نے ان کے پیچھے نماز پڑھی اور نماز کا اعادہ نہیں کیا، اور امام مالک نے ان کو فتویٰ دیا تھا کہ پچھنے لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک نکسیر اور پچھنے لگانے سے وضو کرنا چاہئے، پس کسی نے ان سے پوچھا اگر امام کے جسم سے خون نکلے اور وہ وضو نہ کرے تو آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے؟ انھوں نے کہا کہ میں امام مالک اور سعید بن المسیب کے پیچھے کیسے نماز نہیں پڑھوں گا۔

اور روایت ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد عیدین میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تکبیریں پڑھا کرتے تھے اس لئے کہ خلیفہ ہارون رشید کو اپنے دادا عبداللہ بن عباس کی تکبیر پسند تھی۔

اور ایک مرتبہ امام شافعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے مقبرہ کے قریب صبح کی نماز پڑھی تو ان کے ادب کی وجہ سے دعائے قنوت کو نہ پڑھا، اور نیز امام شافعیؒ کا قول ہے کہ ہم کبھی کبھی اہل عراق کے مذہب کی طرف جھک جاتے ہیں اور امام مالک نے منصور اور ہارون رشید سے وہ بات کہی تھی جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اور فتاویٰ بزازیہ میں امام ثانی یعنی امام ابو یوسف سے منقول ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حمام میں غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھی اور لوگوں کی امامت کی، لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے پھر کسی نے خبر دی کہ حمام کے کنویں میں مرا ہوا چوہا پایا گیا ہے، تب امام صاحب نے فرمایا کہ اب ہم اپنے بھائیوں اہل مدینہ کے قول پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی قلتین کی مقدار کو پہنچ جائے تو ناپاک نہیں ہوتا۔ انتہی۔

امام خجندی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ ایک شخص شافعی المذہب نے ایک سال یا دو سال کی نماز ترک کر دی، پھر اس نے ابوحنیفہ کا مذہب اختیار کر لیا تو اس پر کس طرح سے قضا واجب ہے آیا امام شافعی کے مذہب کے موافق قضا نماز ادا کرے یا امام ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق؟ انھوں نے جواب دیا جس مذہب کے موافق قضا نماز ادا کرے گا نماز جائز ہو جائے گی بشرطیکہ اس

کے جواز کا اعتقاد بھی ہو، انتہی۔

جامع الفتاویٰ میں ہے کہ اگر کسی حنفی نے کہا اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر تین مرتبہ طلاق ہے اس کے بعد اس نے کسی شافعی سے مسئلہ پوچھا اور اس نے جواب دیا کہ اس عورت پر طلاق نہ ہوگی اور اس کی یہ قسم باطل ہے، تو اس مسئلہ میں اس کا امام شافعی کی اقتدا کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ بہت سے صحابہ ان کی طرف ہیں، امام محمد نے اپنی امالی میں بیان کیا ہے کہ اگر کسی فقیہ نے اپنی بیوی سے کہا کہ تجھ پر قطعی طلاق ہے اور وہ اس کو تین طلاق سمجھتا ہے اس کے بعد کسی قاضی نے حکم کر دیا کہ یہ طلاق رجعی ہے تو اس کو اس عورت کا پاس رکھنا جائز ہے، اسی طرح ہر ایک مسئلہ میں جس کی تحریم یا تحلیل یا اعتاق یا اخذ مال وغیرہ کے بارے میں فقہا کا اختلاف ہے، اس فقیہ کو جس کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہے یہی مناسب ہے کہ قاضی کے فیصلہ کو اختیار کرے اور اپنی رائے کو ترک کر دے اور اپنے نفس کو اسی کا پابند کر لے جو قاضی نے اس پر لازم کر دیا ہے اور اسی کی تعمیل کرے جو اس نے دیا ہے، امام محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی طرح وہ شخص جو ناواقف ہے کسی حادثہ میں گرفتار ہو جائے اور اس کے متعلق فقہا سے دریافت کرے اور فقہا اس میں حلال یا حرام ہونے کا فتویٰ دیں اور مسلمانوں کا قاضی اس کے خلاف فیصلہ کر دے اور وہ مسئلہ بھی ایسا ہے جس میں فقہا کا اختلاف ہے تو اس شخص کو یہی مناسب ہے کہ قاضی کے فیصلہ کو اختیار کرے اور فقہا کے فتوے کو ترک کر دے، انتہی

اور مسائل مشکلہ میں سے یہ بھی ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو یہ گمان کرتے پایا ہے کہ جتنے مسائل ان بڑی بڑی شروح اور فتاوے کی ضخیم کتابوں میں مندرج ہیں وہ تمام امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے اقوال ہیں، اور ایسے لوگ ان قولوں میں جو تخریج کئے گئے ہیں اور ان قولوں میں جو حقیقی اور اصلی ہیں کچھ فرق نہیں کرتے اور نہ فقہا کے اس قول کے معنی سمجھتے ہیں کہ کرخی کی تخریج کے موافق مسئلہ کا یہ حکم ہے کہ طحاوی کی تخریج کے موافق یہ حکم ہے اور نہ وہ فقہا کے اس قول میں کہ ابوحنیفہ نے ایسا کہا ہے اور ان کے اس قول میں کہ مسئلہ کا جواب ابوحنیفہ کے مذہب پر یا ابوحنیفہ کے قاعدہ کی بنا پر یہ ہے کہ کوئی فرق کرتے ہیں اور نہ وہ ان اقوال کی طرف نظر کرتے ہیں جو محققین حنفیہ جیسے ابن الہمامؒ اور ابن النجیمؒ نے دہ دردہ مسئلہ میں اور ایسے ہی تیمّم کے بارے میں پانی سے

ایک میل کی دوری شرط کرنے وغیرہا مسائل میں فرمایا ہے کہ یہ سب امور اصحاب حنفیہ کی تخریجات ہیں اور حقیقت میں یہ مذہب نہیں ہے اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد ان محاورات جدلیہ پر ہے جو مبسوط سرخسی، ہدایہ اور تبیین وغیرہ کتب میں مذکور ہیں۔

اور ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اوّل اوّل ان باتوں کو فقہا میں معتزلہ نے ظاہر کیا تھا اور ان پر ان کے مذہب کی بنیاد نہ تھی، بعد میں متاخرین نے بھی ذہنوں کو روشن کرنے اور تیز کرنے کے لئے اچھا سمجھ لیا اور خواہ کسی اور وجہ سے ان کو پسند کر لیا ہو، واللہ اعلم۔ اور ایسے ایسے شبہات اور شکوک اکثر اس بیان سے حل ہو جاتے ہیں جو ہم نے اس باب میں ذکر کیا ہے۔

اور مسائل مشکلہ میں سے ایک یہ امر ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو یہ گمان کرتے پایا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے درمیان مخالفت کی بنیاد ان اصول پر ہے جو بزدوی وغیرہ میں مذکور ہیں حالانکہ حق بات یہ ہے کہ یہ اصول اکثر ان کے اقوال سے خارج کر لئے گئے ہیں، اور میرے نزدیک یہ مسئلہ کہ خاص طور پر ظاہر ہوتا ہے اور اس کو بیان کی حاجت نہیں ہے اور یہ کہ زیادتی نسخ ہوتی ہے اور یہ کہ عام بھی خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے اور یہ کہ کثرت رواۃ سے ترجیح نہیں ہوسکتی اور یہ کہ جب حدیث خلاف قیاس ہو تو ایسے شخص کی روایت واجب العمل نہیں ہے جو فقیہ نہ ہو، اور یہ کہ شرط اور وصف کے مفہوم کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا، اور یہ کہ امر کا مقتضی قطعاً وجوب ہے اور ایسے ہی دیگر مسائل ایسے اصول ہیں جو ائمہ کے کلام سے مستخرج اور مستنبط ہیں، اور امام ابوحنیفہ وصاحبین سے وہ منقول نہیں ہیں اور ان اصولوں کی محافظت کرنا اور متقدمین کے امور مستنبط پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جواب دینے میں تکلف کرنا جیسا کہ بزدوی وغیرہ نے کیا ہے، ان اصول کے مخالف اصول کی محافظت اور ان پر اعتراضات واردہ کے جواب دینے سے زیادہ مستحق نہیں ہیں، مثلاً انھوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ خاص ظاہر ہوتا ہے اور اس کو بیان کی حاجت نہیں ہے اور انھوں نے اس قاعدہ کی تخریج متقدمین کی اس تقریر سے کی ہے جو انھوں نے آیت واسجدوا وارکعوا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں کی ہے کہ کسی شخص کی نماز پوری نہیں ہوگی جب تک کہ وہ اپنی پشت کو رکوع وسجدہ میں درست نہ کرے گا''۔ اس واسطے کہ متقدمین نماز میں فرضیت اطمینان کے قائل نہیں ہوئے ہیں اور انھوں نے حدیث کو آیت کا بیان

قرار نہیں دیا ہے۔ پس ان پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ انھوں نے خدا تعالیٰ کے قول ''و امسحوا برؤسکم '' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشانی پر مسح کرنے کو بیان قرار دیا اور خدا تعالیٰ کے قول ''الزانیۃ و الزانی فاجلدوا '' اور خدا تعالیٰ کے قول ''حتی تنکم زوجا غیرہ '' میں اور جو بیانات بعد میں واقع ہوئے ہیں، پس ان کے جوابات دینے میں انھوں نے تکلف کیا جیسا کہ وہ ان کی کتابوں میں مذکور ہے، اور اسی طرح انھوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ عام خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے اور انھوں نے متقدمین کے اس عمل سے جو خدا تعالیٰ کے اس قول ''فاقروا ما تیسر من القرآن '' اور اس حدیث ''لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب '' کے بارے میں رہا ہے، قاعدہ کی تخریج کی ہے کیونکہ انھوں نے اس حدیث کو مذکورہ آیت کے لئے مخصص قرار نہیں دیا ہے اور اس عمل سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''جو غلہ چشمہ کے پانی سے پیدا ہو اس میں عشر ہے'' اور آپ کے اس قول میں کہ ''پانچ اوقیہ سے کم غلہ میں صدقہ نہیں ہے'' کیونکہ انھوں نے حدیث ثانی کو حدیث اول سے مخصوص قرار نہیں دیا اور اسی طرح کے دیگر مواقع ہیں۔

اس کے بعد ان پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ خدا تعالیٰ کا قول ''فما استیسر من الھدی'' عام ہے اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے خاص کیا اور بکری مراد لی ہے، سو اس اعتراض کے جواب دینے میں ان کو تکلف کرنا پڑا، اور اسی طرح انھوں نے یہ قاعدہ مقرر کرلیا کہ مفہوم شرط اور مفہوم وصف کا کچھ اعتبار نہیں، اور انھوں نے اس قاعدہ کی تخریج متقدمین کے اس عمل سے کی ہے جو ان کا اس آیت کے بارے میں ہے ''فمن لم یستطع منکم طولا '' پھر ان پر متقدمین کے عمل کی وجہ سے بہت سے اعتراضات وارد ہوئے مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے ''چرنے والے اونٹ میں زکوۃ ہے'' پس اس کے جواب میں انھوں نے تکلف کیا ہے اور اسی طرح انھوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ سوائے راوی مجتہد کے کسی اور کی حدیث واجب العمل نہ ہوگی جب قیاس اس حدیث کے خلاف ہو اور اس قاعدہ کی تخریج انھوں نے متقدمین کے حدیث مصراۃ کو متروک العمل قرار دینے سے کی ہے، اس کے بعد قہقہہ والی حدیث اور بھول میں کھالینے سے روزہ کے عدم فساد والی حدیث ان کے اس قاعدہ کے خلاف وارد ہوتی تھی سو ان کے جواب میں انھوں نے تکلف کیا، اسی قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جو غور و خوض کرنے والے پر مخفی نہیں ہیں، اور جو شخص غور

وخوض نہ کرے اس کے لئے طول کلام بھی کافی نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ اشارہ ہوا اور اس امر میں آپ کے لئے بطور دلیل کے محققین کا یہ قول کافی ہے جو اس مسئلہ میں ہے کہ اس شخص کی حدیث واجب العمل نہیں ہے جو ضبط وعدالت میں مشہور ہو اور فقیہ نہ ہو جبکہ وہ حدیث خلاف قیاس ہو جیسے مصراۃ کی حدیث ہے کہ یہ مذہب عیسیٰ بن ابانؒ کا ہے اور متاخرین میں سے کثیر نے اس کو اختیار کیا ہے، امام کرخیؒ اور ان کی اقتدا میں بہت سے علما کا مذہب یہ ہے کہ قیاس پر حدیث کے مقدم ہونے راوی کا مجتہد ہونا شرط نہیں ہے کیونکہ حدیث کا مرتبہ قیاس سے زیادہ ہے، احناف کہتے ہیں کہ یہ شرط ہمارے اصحاب سے منقول نہیں ہے بلکہ ان سے یہ منقول ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ انھوں نے ابو ہریرہؓ کی اس حدیث پر عمل کرلیا جو روزہ دار کے بارے میں ہے جب اس نے بھول کر کچھ کھا، پی لیا ہو، اگرچہ یہ حدیث قیاس کے خلاف ہے حتی کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر روایت نہ ہوتی تو میں قیاس سے کہتا اور تم کو ان کی بہت سی تخریجات میں اختلاف کرنے سے بھی یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ وہ متقدمین کے اقوال سے ان کو حاصل کرتے ہیں اور بعض بعض پر رد کرتا ہے۔

ان مسائل مشکلہ میں سے یہ بھی ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو پایا ہے کہ ان کا یہ خیال ہے کہ یہاں دو فریق ہیں، کوئی تیسرا فریق نہیں ہے، ایک اہل الظاہر ہیں اور ایک اہل الرائے ہیں، اور ہر وہ شخص جو قیاس واستنباط کرتا ہے وہ اہل الرائے میں سے ہے۔ واللہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ رائے سے مراد نہ تو نفس فہم وعقل ہے اس واسطے کہ یہ ہر عالم میں موجود ہے، اور نہ وہ رائے مراد ہے جس کی سنت پر بالکل بنیاد نہ ہو اس واسطے کہ اس کو تو کوئی مسلمان بھی اپنی طرف منسوب نہ کرے گا اور نہ استنباط وقیاس پر قادر ہونا مراد ہے اس واسطے کہ امام احمد واسحٰق بلکہ امام شافعی بھی بالاتفاق اہل الرائے میں سے نہ تھے حالانکہ وہ استنباط اور قیاس کرتے تھے، بلکہ اہل الرائے سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان مسائل کے بعد جن پر جمہور مسلمین متفق ہیں متقدمین میں سے کسی کے قول پر تخریج کرنے کی طرف توجہ کی۔

پس ان کا اکثر کام یہ ہے کہ وہ بجائے احادیث وآثار میں تتبع کرنے کے ایک نظیر کو دوسری نظیر پر حمل کرتے ہیں اور اصول میں سے کسی اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اور ظاہری وہ شخص ہوتا ہے جو نہ قیاس کا قائل ہے اور نہ صحابہ وتابعین کے آثار کا، جیسے داؤد اور ابن حزمؒ ہیں اور ان دونوں فریق کے درمیان محققین اہل سنت ہیں جیسے امام احمد واسحٰق۔

ہم نے اس مقام میں کلام کو خوب طول دیا ہے حتی کہ جس فن میں ہم نے یہ کتاب لکھنا شروع کی تھی اس سے نکل گئے حالانکہ میری یہ عادت نہیں ہے لیکن دو وجھوں سے ایسا ہوا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک وقت میں میرے قلب میں میزان پیدا کر دی جس کی وجہ سے میں ہر اس اختلاف کا سبب پہچان لیتا ہوں جو امت محمدیہ میں واقع ہوا اور اس کو بھی پہچان لیتا ہوں جو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک حق ہے، اور خدا نے مجھ کو یہ بھی قدرت دی ہے کہ امر حق کو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے اس طرح ثابت کر دوں کہ اس میں شبہ اور اشکال باقی نہ رہے پس میں نے ایک کتاب کی تالیف کا ارادہ کیا جس کو میں غایۃ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف کے نام سے موسوم کروں اور اس میں یہ مطالب بیان شافی کے ساتھ ظاہر کروں اور بہت سے شواہد وامثال وتفریعات ذکر کروں اور اس کے ساتھ ساتھ ہر مقام میں افراط وتفریط کے درمیان میانہ روی اختیار کروں اور جوانب کلام اور اصول مقصود ومرام کا احاطہ کروں، اس کے بعد اب تک اس کی تصنیف کی مجھ کو فرصت نہ ملی لیکن جب کلام ماخذ اختلاف تک پہنچا تو مجھ کو میرے دلی منصوبہ نے اس میں سے جتنا بھی میسر ہوا اس کے بیان کرنے پر آمادہ کیا۔

اور اس اطناب کی دوسری وجہ اس زمانہ کے لوگوں کی شورش ہے اور ان کا اختلاف اور بعض ان امور میں جن کو ہم نے ذکر کیا اندھا ہو جانا ہے یہاں تک کہ قریب ہے کہ ان لوگوں سے لڑ پڑیں جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں، وربنا الرحمن **المستعان علی ما تصفون**۔

اور حجۃ اللہ البالغہ کی قسم اول میں جس کلام کے بیان کرنے کا ہم نے قصد کیا تھا یہ اس کا آخر ہے اور سب تعریف اوّل وآخر، ظاہر وباطن اللہ ہی کے لئے ہے اس کے بعد انشاء اللہ قسم ثانی آئے گی جس میں ان چیزوں کے معانی کا بیان ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تفصیلا صادر ہوئی ہیں۔

حصۂ دوم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ تفصیلاً صادر ہوا ہے اس کے اسرار کا بیان

اس مقام پر ان احادیث کا ایک معتد بہ مجموعہ ذکر کرنا مقصود ہے جو احادیث محدثین کے نزدیک معروف ہیں اور اہل علم کے درمیان مشہور ہیں اور جو صحیح بخاری و صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد و ترمذی میں مروی ہیں، ان کے سوا اور کتابوں سے جو حدیث میں بھی لایا ہوں اس کا ذکر بالتبع ہے، اور اسی واسطے میں نے ہر حدیث کی نسبت اس کے راوی کی طرف نہیں کی ہے اور کبھی میں نے حاصل معنی یا حدیث کا ٹکڑہ ہی ذکر کر دیا ہے اس واسطے کہ طالب کے لئے ان کتابوں کا تتبع کرنا اور ان کی طرف رجوع کرنا آسان ہے۔

ایمان کی قسموں کا بیان

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جب کہ تمام مخلوق کے لئے عام تھی تا کہ تمام ادیان پر آپ کے دین کو غلبہ ہو خواہ اس غلبہ سے کسی معزز کی عزت یا ذلیل کی ذلت ہو اس لئے آپ کے دین میں کئی قسم کے لوگ داخل ہوئے، پس ان میں باہم تمیز کی ضرورت ہوئی کہ کون مسلمان ہیں اور کون نہیں ہیں، پھر ان مسلمانوں میں سے بھی کن لوگوں نے اس ہدایت کو حاصل کیا جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے اور کون لوگ ایسے ہیں جن کے دلوں میں ایمان کی تازگی نے سرایت نہیں کیا اس واسطے شارع نے ایمان کی دو قسمیں کیں ایک تو وہ جس پر احکام دنیا کا مدار ہے جیسے جان و مال کا محفوظ ہونا اور اس کا انضباط ایسے امور سے کرنا جن میں فرمانبرداری ظاہر ہوتی ہے، اور وہ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں سے جہاد کرنے کا مجھ کو حکم ہوا ہے یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں ہے اور محمد

اللہ کے رسول ہیں، اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں، پس جب وہ یہ کام کریں گے تو بجز حقوق اسلام کے وہ اپنی جان و مال مجھ سے محفوظ کر لیں گے اور (جو کفر و معاصی پوشیدہ کریں گے) خدا ان سے حساب لے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو ہماری سی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کو قبلہ سمجھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبیحہ کھائے تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا معاہدہ ہے پس تم لوگ اللہ تعالیٰ کے معاہدہ میں خیانت نہ کرنا''۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تین چیزیں ایمان کی بنیاد ہیں، جس شخص نے اپنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہا ہے نہ تو اس کو کسی گناہ کے سبب کافر قرار دے اور نہ تو اس کو کسی عمل کی وجہ سے اسلام سے خارج کر''۔ الحدیث

اور ایمان کی دوسری قسم وہ ہے جس پر آخرت کا مدار ہے جیسے نجات اور حصول درجات ہے اور وہ تمام عقائد حقہ، اعمال صالحہ اور عمدہ ملکہ پر مشتمل ہے اور اس ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اور شارع کا یہ دستور ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایمان سے تعبیر کرتا ہے تاکہ ان کے جز ایمان ہونے پر اچھی طرح سے تنبیہ ہو جائے اسی واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس کو عہد کا پاس نہیں اس کا دین نہیں''۔ اور آپ نے فرمایا ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں'' الحدیث۔ اس ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں، اور اس کی حالت درخت کی سی ہے کہ تنہ، شاخیں، پتے پھل اور پھول سب کو درخت کہتے ہیں، پس جب اس کی شاخیں کٹ جائیں، پتے جھڑ جائیں اور اس کے پھل توڑ لئے جائیں تو اس کو ناقص درخت کہا جاتا ہے اور جب اس کا تنہ جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو درخت کا نام ہی اس سے جاتا رہتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مطلب ہے ''ایمان والے وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی اللہ کا ذکر کرے تو ان کے دلوں میں خوف طاری ہو جائے''۔ اور جبکہ یہ سب امور ایک قسم کے نہ تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دو حصے کر دیے، ان میں سے ایک تو ارکان ہیں جو ان کے سب اجزا میں عمدہ ہیں ان کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے''۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے عبادت کے قابل کوئی نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں، اور نماز کی پابندی کرنا، اور زکوۃ دینا، اور حج کرنا اور رمضان

کے روزے رکھنا اور ان میں سے دوسرے باقی سب شعبے ہیں ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے ہیں ان میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دینے والی چیز ہٹا دینا ہے اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے"۔

ایمان کی پہلی قسم کے مقابل کا نام کفر ہے لیکن ایمان کی دوسری قسم کے مقابل کی دو صورتیں ہیں، پس اگر اس میں تصدیق قلبی نہیں ہے بلکہ تلوار کے زور سے اطاعت کرتا ہے تو وہ خالص نفاق ہے اور اس قسم کے منافق اور کافر کے درمیان آخرت میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے اور اگر تصدیق قلبی ہے لیکن اس کے ساتھ اعمال جوارح نہیں ہیں تو اس کو فاسق کہتے ہیں، یا اگر دل میں خلوص نہیں ہے تو یہ اور طرح کا منافق ہے بعض سلف نے اس نفاق کا نام نفاق عمل رکھا ہے اور یہ اس طرح سے پیدا ہوتا ہے کہ طبیعت یا رسم یا بدعقیدگی کا حجاب اس پر غالب آجاتا ہے پس وہ دنیا، کنبہ اور اولاد کی محبت میں مصروف رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں جزا و سزا کے بعید سمجھنے اور معاصی پر جرأت کرنے کی ایک نامعلوم حرکت پیدا ہو جاتی ہے اگرچہ باعتبار نظر برہانی کے قابل اعتراف امور کا اقرار کرتا ہو، یا وہ اسلام میں سختیاں دیکھتا ہے پس وہ اس کو ناگوار گزرتی ہیں، یا کفار سے محبت کرتا ہے اور وہ اعلاء کلمۃ اللہ سے مانع ہو جاتی ہے۔

ان دو معنی کے علاوہ ایمان کے دو معنی اور ہیں ایک تو ضروری التصدیق امر کی دل سے تصدیق کرنا اور وہ جبرئیل کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "ایمان اس کا نام ہے کہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ پر ایمان لائے"۔ الحدیث

اور معنی ثانی وہ اطمینان اور دلی کیفیت ہے جو مقربین کو حاصل ہوتی ہے، اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "پاکی ایمان کا جزو ہے"۔ اور آپ کا قول ہے "جب کوئی بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے اور وہ اس کے سر پر مثل سائبان کے ہو جاتا ہے، پس جب وہ اس فعل سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایمان پھر اس میں واپس آجاتا ہے" اور حضرت معاذؓ کا قول ہے "آؤ ایک ساعت ہم مومن بن جائیں"۔

پس شرع میں ایمان کے چار معنی مستعمل ہیں، اب اگر تم ان احادیث میں سے جو ایمان کے باب میں متعارض ہیں، ہر ایک حدیث کو اس کے محل پر محمول کرو گے تو تم سے تمام شکوک وشبہات دفع ہو جائیں گے اور معنی اول میں لفظ اسلام ایمان سے زیادہ واضح ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد سے کہا تھا (جبکہ انھوں نے کسی شخص کی نسبت کہا تھا کہ میں ان کو ایمان دار جانتا ہوں) بلکہ مسلمان کہو، اور معنی رابع میں احسان کا لفظ ایمان کے لفظ سے زیادہ واضح ہے، اور جبکہ نفاق فی العمل اور اس کا مقابل یعنی اخلاص ایک پوشیدہ امر تھا اس واسطے ہر ایک کی علامات بیان کرنا ضروری ہوا، اور اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''چار خصلتیں ہیں جس میں وہ سب پائی جائیں وہ پکا منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے ایک خصلت پائی جائے اس میں نفاق کی ایک خصلت رہے گی جب تک کہ اس کو ترک نہ کردے، جب اس کے پاس کوئی امانت رکھے تو خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب کسی سے عہد کرے تو پورا نہ کرے اور جب کسی سے لڑے تو گالیاں بکے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''تین باتیں ہیں جس میں وہ باتیں ہوں گی ان کے سبب سے وہ حلاوت ایمان پائے گا۔ وہ شخص جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت سب سے زیادہ ہو، اور وہ جو خاص اللہ کے لئے کسی سے محبت کرتا ہو، اور وہ جو کفر کی طرف اعادہ کرنا اس قدر ناگوار سمجھے جس قدر آگ میں گرنا ناگوار سمجھتا ہے''۔ اور آپ کا فرمان ہے ''جب تم کسی بندہ کو ہر وقت مسجد میں دیکھو تو اس کے لئے ایمان کی شہادت دو''۔ اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے علیؓ سے محبت کرنا ایمان کی علامت ہے اور علیؓ سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے''۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امر الٰہی میں نہایت سخت تھے پس ان کی سختی وہی برداشت کرسکتا ہے جس کی طبیعت قائم ہو اور اس کی عقل خواہش نفسانی پر غالب ہو، اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے''۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب معدیہ اور یمنیہ میں ہمیشہ سے عداوت چلی آتی تھی حتی کہ ایمان نے ان کو یکجا کردیا پس جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کا عزم کرلیا تو اس کے دل سے نزاع دور ہوگیا اور جس نے ایسا پختہ عزم نہیں کیا تو اس کے دل میں وہی نزاع باقی رہا، اور بلاشک نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے''۔ اور اسی طرح حدیث ضمام بن ثعلبہ اور حدیث اعرابی ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ مجھ کو ایسا عمل بتلا دیجئے کہ جب میں اس پر عمل کروں تو جنت میں چلا جاؤں آپ نے فرمایا کہ یہ پانچ چیزیں ارکان اسلام ہیں اور جس نے ان کو کر لیا اور ان کے سوا کوئی اور عبادت نہیں کی تو اس نے اپنی گردن کو عذاب سے رہا کر لیا اور جنت کا مستحق ہو گیا، ایسے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا کہ ادنی درجہ نماز کا کیا ہے اور ادنیٰ درجہ وضو کا کیا ہے، اور ان پانچ چیزوں کو اس لئے رکن قرار دیا کہ تمام عبادات بشر میں یہی سب سے زیادہ مشہور ہیں اور تمام ملتوں میں کوئی ایسی ملت نہیں جس میں ان پانچ کا التزام نہ ہو، جیسے یہود و نصاریٰ، مجوس اور بقیہ عرب، باوجویکہ ہر ایک کا ادا کرنے کا طریقہ جداگانہ ہے، اور اس لئے رکن قرار دیا کہ ان پانچ میں یہ بات ہے کہ یہ اور عبادتوں کے بدلہ میں کافی ہوسکتی ہیں اور ان کے سوا کسی اور عبادت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ ان کے بدلہ کافی ہوسکے، اور یہ ان وجوہ کی بنا پر ہے کہ تمام نیکیوں کی اصل توحید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور شرائع الٰہیہ کو تسلیم کرنا ہے اور جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سب کے لئے عام تھی اور لوگوں کے گروہ کے گروہ دین الٰہی میں داخل ہوتے تھے تو ایک علامت ظاہرہ کا ہونا ضروری تھا جس سے موافق و مخالف میں امتیاز ہو جائے اور اس پر حکم اسلام کا مدار ہو اور لوگوں سے اس پر مواخذہ کیا جائے اور اگر یہ نہ ہوتا تو مدتوں کی ممارست کے بعد بھی بجز ظنی تفریق کے جس کی بنا قرائن پر ہوتی دونوں میں کچھ تمیز نہ ہوتی، اور یہ کہ حکم اسلام میں لوگ مختلف ہو جاتے، اور جیسا کہ ظاہر ہے ایسی حالت میں اسلام کے احکام میں بڑی دقت واقع ہو جاتی ہے دلی اعتقاد و تصدیق کی حقیقت ظاہر کرنے میں اقرار سے زیادہ اور کوئی شئے نہیں ہوسکتی جو اختیار اور خوشی کے ساتھ کیا گیا ہو، اور اس سبب سے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انسانی سعادت کا مدار اور اخروی نجات کی اصل چار خصلتوں پر ہے، پس وہ نماز جو طہارت کے ساتھ ہو دو اوصاف تواضع اور پاکیزگی کا مظنہ اور جائے گمان قرار دی گئی اور وہ زکوٰۃ جس کی شرائط پائی جائیں اور وہ اپنے مصارف پر خرچ کی جائے، سخاوت اور عدل کا مظنہ قرار دی گئی۔

اور اس سبب سے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ طبعی حجاب دور کرنے کے لئے ایک ایسی عبادت

کی ضرورت ہے جس کا نفس پر دباؤ رہے اور اس باب میں روزہ سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اس سبب سے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ اصول شرائع کی اصل شعائر اللہ کی تعظیم ہے اور شعائر چار ہیں ان میں سے ایک کعبہ بھی ہے اور اس کی تعظیم حج کرنا ہے اور پیشتر ان عبادات کے فوائد جو ذکر کرتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت خمسہ اور عبادتوں کے بدلہ کافی ہوسکتی"۔ ان کے سوا کوئی اور عبادت ان کے بدلہ کافی نہیں ہوسکتی۔

اور شریعت کے اعتبار سے گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں صغائر اور کبائر، کبائر گناہ وہ ہیں جو قوائے بہیمیہ یا سبعیہ یا شیطانیہ کا پورے طور پر غلبہ ہو جانے کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں اور ان میں حق کے راستہ کا انسداد، شعائر الٰہی کی حرمت کا نقض یا تدابیر ضروریہ کی مخالفت اور لوگوں کا ضرر عظیم پایا جاتا ہے اور ان امور کے ساتھ ساتھ کبائر کا مرتکب شرع کو پس پشت ڈال دیتا ہے کیونکہ شریعت نے ان سے سخت ممانعت کی ہے اور کبائر کے کرنے والے پر بہت شدت سے تہدید کی ہے اور ان کے ارتکاب کو ایسا قرار دیا ہے جیسے دین سے خارج ہونا، اور صغائر وہ گناہ ہیں جو کبائر سے کم درجہ کے ہوں اور دواعی شر اور اس کے اسباب میں سے ہوں، اور شریعت کی قطعی ممانعت بھی ان کی نسبت ظاہر ہو لیکن ان میں کبائر جیسی سختی نہ کی گئی ہو اور حق بات یہ ہے کہ کبائر کا شمار متعین نہیں ہے اور ان کی پہچان یہ ہے کہ یا تو اس کے کرنے والے پر قرآن وحدیث صحیح میں جہنم کی وعید ہو یا اس گناہ پر شرعی حد مقرر ہو اور شارع نے اس کا نام کبیرہ بیان فرمایا ہو اور اس کے ارتکاب کو خروج عن الدین بیان کیا ہو اور جس چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبیرہ بیان فرمایا ہو کوئی شئے فساد اور خرابی میں اس سے زیادہ یا اس کے برابر ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ "زنا کرتے وقت زانی مومن نہیں رہتا"۔ الحدیث۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ افعال اسی وقت صادر ہوتے ہیں کہ جب قوائے بہیمیہ یا سبعیہ کا پورے طور پر غلبہ ہوتا ہے پس اس وقت قوت ملکیہ کالمعدوم اور ایمان بمنزلہ زائل کے ہو جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے معلوم ہو گیا کہ یہ کبیرہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اس امت کا کوئی یہودی یا نصرانی جس کو میری خبر پہنچی ہو پھر وہ مر جائے اور جن احکام کو میں لیکر آیا ہوں اس پر وہ ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں جائے گا"۔

میں کہتا ہوں یعنی جس شخص کو دعوت پہنچ چکی اور وہ کفر پر جما رہا حتی کہ اسی پر مر گیا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ کیونکہ اس نے اس تدبیر الٰہی کی مخالفت کی جو اس نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کر رکھی تھی اور اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ اور ملائکہ مقربین کی لعنت کا مورد بنایا اور نجات کے راستہ کو چھوڑ دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور بیٹے اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں''۔ اور یہ بھی فرمایا ''جب تک کہ اس کی خواہش ان احکام کے تابع نہ ہو جائے جن کو میں لیکر آیا ہوں''۔

میں کہتا ہوں کہ کمال ایمان یہ ہے کہ عقل طبیعت پر غالب آ جائے اس طرح سے کہ اس کے نزدیک بادی الامر میں مقتضی عقل مقتضی طبعی سے بہتر معلوم ہو، اور محبت رسول صلعم کے بارے میں یہی حال ہے اور میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ حالت کاملین میں دیکھی جاتی ہے، کسی نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات ارشاد فرمائیے کہ پھر آپ کے بعد کسی سے دریافت نہ کروں، اور ایک روایت میں ہے کہ پھر آپ کے سوا کسی اور سے دریافت نہ کروں، آپ نے اس کے جواب میں فرمایا ''یہ کہہ کہ میں خدا پر ایمان لایا اور پھر اس پر قائم رہا''۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے سامنے فرمانبرداری اور اسلام کے حالات رکھے پھر جو کام اس کے مناسب ہو اس کو کیا کرے اور جو اس کے خلاف ہو اس کو ترک کر دے، اور یہ ایک ایسا قول کلی ہے جس کی وجہ سے انسان کو علم بالشرائع کی نسبت بصیرت ہو جاتی ہے گو وہ علم بالتفصیل نہ ہوتا ہو لیکن علم اجمالی ضرور حاصل ہو جاتا ہے جو انسان کے لئے سبقت کا باعث ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص صدق دل سے لا الٰہ الا اللہ و انّ محمداً رسول اللہ کہے گا تو خدا تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دے گا''۔ اور فرمایا ''اگر چہ وہ چوری اور زنا کرتا ہو''۔ اور ایک حدیث میں فرمایا ''خواہ اس کے کیسے ہی عمل ہوں''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس سخت آگ پر حرام کر دے گا جو دائمی ہے اور کفار کے لئے مقرر کی گئی ہے اگر چہ وہ کبائر کا مرتکب ہوا ہو، اور اس طور سے کلام بیان کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ گناہوں کے درجوں میں بہت بڑا فرق ہے اگر چہ گناہ کا نام سب پر بولا جاتا ہے پس کبائر کو جب کفر کے اعتبار سے دیکھا جائے گا تو اس کے سامنے ان کی کچھ ہستی معلوم نہیں ہوتی

اور نہ ان کا کچھ معتد بہ اثر معلوم ہوتا ہے اور نہ دخول نار کے واسطے وہ کوئی ایسے سبب ہو سکتے ہیں جن کو سبب کہا جائے اور اسی طرح کبائر کے مقابلہ میں صغائر ہیں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اچھی طرح سے فرق بیان کر دیا کہ جو بمنزلہ صحت اور مرض کے ہے، پس امراض ظاہرہ کو جیسے زکام اور تکان ہے جب سو مزاج متمکن کے ساتھ قیاس کریں جیسے جذام، سل اور استسقا ہے تو ان پر صحت کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان امراض کا مریض، مریض ہی نہیں اور نہ اس میں کوئی بیماری ہے، اور بعض مصائب ایسے ہوتے ہیں جو دوسری مصیبتوں کو بھلا دیتے ہیں مثلاً کسی کو کانٹا لگ جائے اور پھر اس کے بعد اس کا گھر اور مال لٹ جائے تو ایسا شخص بیان کرتے وقت کہے گا کہ پہلے مجھ پر بالکل کوئی مصیبت نہ تھی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور اپنے لشکر کو لوگوں کو بہکانے کے لئے روانہ کرتا ہے''۔ الحدیث

واضح ہو کہ خدا نے شیاطین کو پیدا کیا اور ان کی جبلت میں یہ بات رکھی کہ لوگوں کو بہکائیں جس طرح کیڑے ہوتے ہیں جو اپنے مزاج کے مقتضی کے موافق کام کرتے رہتے ہیں، جیسے نجاست کا کیڑہ نجاست میں لوٹتا رہتا ہے، اور ان سب شیاطین کا ایک سردار ہے جو اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور جس کام کے وہ درپے ہیں اس کی تکمیل کے لئے ان کو بلاتا ہے تاکہ پوری بدبختی اور کامل گمراہی کا مستحق ہو جائے اور ہر نوع اور ہر صنف میں خدا تعالیٰ کا یہی قاعدہ ہے اور اس میں کچھ مجاز نہیں ہے اور میرے نزدیک یہ بات ایسی محقق ہو گئی ہے جیسے کوئی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جس نے اس کا کام وسوسہ تک ہی رہنے دیا''۔ اور آپ نے فرمایا ''شیطان اس بات سے ناامید ہو گیا کہ جزیرۃ العرب میں کوئی مسلمان اس کی عبادت کرے، لیکن اس کو باہمی عداوت سے ناامیدی نہیں ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جبکہ صحابہ نے عرض کیا تھا کہ ہمارے دل میں ایسی ایسی باتیں آتی ہیں جن کا بیان کرنا ہم کو گراں معلوم ہوتا ہے) ''یہ صریح ایمان ہے''۔

واضح ہو کہ باعتبار اس استعداد کے جو کسی شخص میں وسوسہ کے قبول کرنے کی ہوتی ہے شیطانی وسوسہ کی تاثیر مختلف ہوتی ہے، پس شیطانی وسوسہ کی بڑی سے بڑی تاثیر یہ ہے کہ انسان کافر ہو جائے اور دین سے نکل جائے، پس جب قوت یقینی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کسی کو اس بلا سے

محفوظ کرتا ہے تو اس کے وسوسہ کی تاثیر دوسری صورت میں بدل جاتی ہے اور وہ باہمی لڑائی، امور خانہ داری میں بگاڑ ڈالنا اس گھر و شہر والوں میں فساد برپا کرنا ہے، پھر جب خدا تعالیٰ اس سے بھی کسی کو بچالیتا ہے تو اس کے دل میں وسوسہ آتا ہے اور نکل جاتا ہے اور چونکہ اس کی تاثیر کمزور ہوتی ہے اس لئے نفس کو کسی عمل پر برانگیختہ نہیں کرسکتا اور اس وسوسہ سے اس شخص کو کچھ مضرت نہیں پہنچتی بلکہ جب اس وسوسہ کو برا سمجھتا ہے تو یہ اس کے خلوص ایمان کی دلیل ہو جاتی ہے البتہ اصحاب نفوس قدسیہ میں ان باتوں کا ذرا بھی وجود نہیں ہوتا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''خدا تعالیٰ نے جن پر میری اعانت کی پس وہ مسلمان ہوگیا ہے اور سوائے بھلائی کے وہ مجھے کچھ نہیں کہتا، اور ان تاثیرات کا حال آفتاب کی شعاع کا سا ہے کہ لو ہے اور قلعی دار چیزوں میں جس قدر اثر کرتی ہے، دوسری چیزوں میں نہیں کرتی، علی حسب مراتب، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان کا بھی ایک اثر ہوتا ہے اور فرشتہ کا بھی ایک اثر ہوتا ہے''۔ الحدیث۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ قلوب کے اندر ملائکہ کی تاثیر کی صورت انس الٰہی اور نیک کاموں میں رغبت پیدا کرنا ہے، اور شیاطین کی تاثیر کی صورت دلوں میں وحشت، اضطراب اور افعال قبیحہ کی رغبت پیدا کرنا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کے دل میں اس قسم کا وسوسہ پیدا ہو تو اس کو اس وقت یہ کہہ دینا چاہئے کہ مجھ کو خدا اور رسول کا یقین ہے؟ اور آپؐ نے فرمایا ''اس کو چاہئے کہ خدا کی پناہ مانگے اور اپنی بائیں جانب تھوک دے''۔ اس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف التجا اور اس کی یاد کرنے سے اور شیاطین کو قبیح و ذلیل سمجھنے سے نفس کی توجہ شیاطین کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور ان کا اثر قبول کرنے سے دل رک جاتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''تحقیق جو لوگ ہم سے ڈرتے ہیں جب ان کو شیطانی خیال چھوتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں پس وہ فوراً خبردار ہو جاتے ہیں''۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب کے سامنے بحث کی''۔

میں کہتا ہوں رب کے سامنے بحث کرنے کے یہ معنی ہیں کہ حضرت موسیٰ کی روح حظیرۃ القدس کی طرف کھینچ آئی اور اس نے وہاں حضرت آدمؑ سے ملاقات کی، اور اس واقعہ کا اصل راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ کو آدمؑ کی زبانی ایک علم عطا فرمایا، جس طرح کوئی شخص حالت خواب میں

کسی فرشتہ یا کسی نیک آدمی کو دیکھتا ہے اور اس سے کچھ بات دریافت کرتا ہے اور وہ اس کا جواب دیتا ہے حتیٰ کہ ایک بات جو پہلے سے اس کو معلوم نہ تھی اس شخص سے حاصل ہو جاتی ہے، اور یہاں ایک باریک علم تھا جو موسیٰ پر مخفی تھا حتیٰ کہ خدا تعالیٰ نے اس واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام پر اس علم کا انکشاف کر دیا اور وہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے قصہ میں دو وجہیں مجتمع ہیں ان میں سے ایک جو خاص آدم علیہ السلام کی ذات سے متعلق ہے یہ ہے کہ جب تک انھوں نے وہ درخت نہیں کھایا تھا نہ ان کو پیاس لگتی تھی نہ دھوپ اور نہ بھوکے رہتے تھے اور نہ ننگے اور فرشتوں کی طرح رہتے تھے پس جب انھوں نے اس درخت کو کھایا تو بہیمیت کا غلبہ ہوا اور ملکیت پست ہو گئی، پس لامحالہ درخت کا کھانا گناہ شمار ہوا جس سے استغفار کرنا ضروری ہوا۔

اور دوسری وجہ جو تدبیر کلی سے متعلق ہے جس کو خدا تعالیٰ نے مخلوق کے پیدا کرنے میں ملحوظ رکھا اور آدمؑ کو پیدا کرنے سے پیشتر فرشتوں کی طرف اس کی وحی کر دی تھی اور وہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ کو آدم کے پیدا کرنے سے یہ منظور تھا کہ نوع انسان زمین میں خلیفہ ہو، اس سے گناہ صادر ہوں وہ مغفرت چاہے، پھر اس کے گناہ معاف کئے جائیں اور لوگوں کو مکلّف بنایا جائے، ان میں رسولوں کی بعثت ہو، اور ثواب وعذاب اور مراتب کمال وگمراہی ان میں پائی جائیں اور یہ بذات خود ایک بڑی مخلوق ہو، اور اس درخت کا کھانا ارادہ الٰہی اور اس کی حکمت کے موافق تھا جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا تعالیٰ تم کو فنا کر کے اور لوگ پیدا کرتا جو گناہ کرتے اور اس سے مغفرت مانگتے پھر خدا تعالیٰ ان کو معاف کرتا۔'' اور بہیمیت کا اولاً غلبہ آدم علیہ السلام پر ہوا تھا کہ ان پر دوسری بات کا علم پوشیدہ تھا اور وجہ اول نے ان کا احاطہ کر لیا تھا اور ان پر سخت عتاب کیا گیا پھر اس سے ان کو خلاصی ہوئی اور علم ثانی کی ایک جھلک ان پر پڑی، پھر جب آدمؑ حظیرۃ القدس کی طرف آئے تو خوب اچھی طرح سے حال معلوم ہو گیا جو گمان حضرت آدم کو تھا حضرت موسیٰ بھی اسی گمان میں تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر علم ثانی کا انکشاف فرمایا۔

اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح خواب کی تعبیر ہوتی ہے وقائع خارجہ کی بھی تعبیر ہوتی ہے اور امر ونہی میں ظن وتخمین کو دخل نہیں ہوتا بلکہ ان کے لئے استعداد ہوتی ہے جو اس امر ونہی کو واجب کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر بچہ فطرت کے موافق پیدا ہوتا ہے پھر

اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں جس طرح حیوان کا بچہ ہاتھ پاؤں سے درست پیدا ہوتا ہے، بھلا تم اس کا ناک، کان کٹا ہوا دیکھتے ہو۔

میں کہتا ہوں، واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے اپنا ایک طریقہ جاری کر رکھا ہے کہ حیوانات، نباتات اور ان کے سوا ہر نوع کو خاص خاص شکل پر پیدا کیا ہے مثلاً انسان کو اس خاص شکل میں بنایا کہ اس کی جلد صاف ہے، قد سیدھا ہے، ناخن پھیلے ہوئے ہیں، بولنے والا، ہنسنے والا ہے اور انہی خواص سے پہچانا جاتا ہے، کہ وہ انسان ہے کہیں شاذ و نادر جگہ، خلاف عادت ہو جاتا ہے جیسے بعض بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے سونڈ یا کھر ہوتے ہیں۔

اسی طرح اس کی یہ عادت بھی جاری ہے کہ اس نے ہر نوع کو تھوڑا سا علم اور محدود ادراک عطا کیا ہے جو اسی کے واسطے خاص اور اس کے تمام افراد میں برابر پایا جاتا ہے، پس شہد کی مکھیوں کو اس علم کے ساتھ خاص کیا، کہ اپنے مطلب کے درخت معلوم کریں، چھتے بنائیں اور ان میں شہد جمع کیا کریں، پس تم کو ایسی کوئی مکھی نہ دکھائی دے گی جس میں یہ علم نہ ہو، اور کبوتر کو اس علم سے خاص کیا کہ وہ کس طرح آواز کرتا ہے، آشیانہ بناتا ہے اور اپنے بچہ کو جگاتا ہے اور اسی طرح خدا نے انسان کو ادراک زائد اور عقل کامل کے ساتھ خاص کیا اور اس میں اپنے پیدا کرنے والے کی پہچان اور اس کی عبادت کا علم رکھا اور ہر وہ چیز عطا فرمائی جو انسان کی امر معاش میں کام آئے اور اس کا ہی نام فطرت ہے۔ پس اگر کوئی رکاوٹ مانع نہ ہو تو اسی حالت پر انسان بڑی عمر تک رہ سکتے ہیں لیکن عوارض پیش آجاتے ہیں جیسے ماں، باپ کا گمراہ کر دینا، اس واسطے اس کا علم جہل ہو جاتا ہے، جس طرح راہب لوگ طرح طرح کی تدابیر کر کے عورتوں کی خواہش اور کھانے کی خواہش بالکل زائل کر دیتے ہیں باوجودیکہ فطرت انسانی میں یہ دونوں داخل ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خدا تعالیٰ نے لوگوں کو اس کے لئے پیدا کیا حالانکہ وہ اس وقت وہ اپنے آبا کی پشتوں میں تھے"۔ اور فرمایا "وہ اپنے آبا سے ہیں"۔ اور فرمایا "جو کچھ وہ کرنے والے تھے خدا کو اس کا پورا علم ہے"۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طویل خواب میں ذکر فرمایا "ذریت بنی آدم کی تمام ارواح حضرت ابراہیمؑ کے پاس ہوتی ہیں"۔

واضح ہو کہ اکثر بچہ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا لیکن کبھی بچہ ایسا بھی پیدا

ہوتا ہے کہ بغیر کسی عمل کے لعنت کے قابل ہوتا ہے جیسے وہ لڑکا جس کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا اس کے دل پر کفر کی مہر لگا دی گئی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے آبا سے ہیں تو یہ احکام دنیا کے متعلق ہے۔

اور شرائع کا کسی امر میں توقف کرنا اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اس کا علم نہیں ہوتا بلکہ کبھی اس لئے توقف کیا جاتا ہے کہ مظنہ ظاہرہ کی وجہ سے احکام منضبط نہیں ہوتے یا اس لئے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی یا اس لئے کہ اس میں کوئی ایسی باریک بات ہوتی ہے جس کو مخاطب نہیں سمجھ سکتے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''خدا کے ہاتھ میں میزان ہے جس کو چاہتا ہے پست کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بلند کرتا ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تدبیر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ تدبیر کی بنیاد اس بات پر ہے کہ جو مصلحت کے زیادہ موافق اور مناسب ہے اس کو اختیار فرماتا ہے، پس جس حادثہ میں اسباب متنازعہ جمع ہو جاتے ہیں اس میں خدا تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کا قول ہے ''کل یوم ھو فی شأن''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بنی آدم کے دل خدا تعالیٰ کے دو انگشت میں ہیں''۔ اور فرمایا ''قلب کا حال ایک پر کا سا ہے جو چٹیل میدان میں پڑا ہے جس کو ہوا الٹ پلٹ کرتی ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ بندوں کے افعال اختیاری ہیں لیکن اس اختیار میں ان کا کچھ اختیار نہیں ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص پتھر پھینکنے کا ارادہ کرتا ہے پس اگر یہ قادر، حکیم ہوتا تو اس پتھر میں اس کی اختیاری حرکت کو بھی پیدا کرتا اور اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ جب بندوں کے افعال بھی خدا تعالیٰ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اسی طرح یہ اختیار بھی اس نے ہی پیدا کیا تو پھر جزا کس بات پر دی جاتی ہے، کیونکہ جزا کے معنی بعض افعال خداوندی کا بعض پر مرتب ہونا ہے بایں معنی کہ خدا تعالیٰ نے یہ حالت بندے میں پیدا کی پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں اس بات کا اقتضا کیا کہ اللہ تعالیٰ بندے میں عذاب ونعمت کی دوسری حالت پیدا کرے جیسا کہ خدا تعالیٰ پانی میں حرارت پیدا کرتا ہے پس یہ اس بات کا اقتضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہوا کی صورت دے، اور جزا کے لئے بندے کے کسب اور اختیار کا ہونا بالعرض شرط ہے نہ بالذات۔ اور یہ اس لئے کہ نفس ناطقہ ان اعمال کا رنگ قبول نہیں کرتا جو کسب کی وجہ سے اس کی طرف منسوب نہیں

ہوتے بلکہ اس کے غیر کی طرف مستند ہوتے ہیں، اور نہ ان اعمال کا رنگ قبول کرتا ہے جو اس کے اختیار اور قصد کی طرف منسوب نہیں ہوتے، اور خدا تعالیٰ کی حکمت میں یہ نہیں ہے کہ بندے کو اس عمل کی وجہ سے سزا دے جس کا اثر نفس ناطقہ نے قبول نہیں کیا، پس جب یہ بات ہے تو یہ اختیار غیر مستقل جزا کے لئے شرط ہونے میں کافی ہے جبکہ اس اختیار سے عمل کے رنگ کی قبولیت درست ہو اور یہ کسب غیر مستقل کافی ہے جبکہ اس کسب غیر مستقل سے یہ بات ثابت ہو رہی ہو کہ حالت متاخرہ خاص اسی کا سبب بندہ میں پیدا ہونی چاہئے نہ کہ دوسرے میں پس یہ تحقیق نہایت عمدہ ہے، صحابہ وتابعین کے کلام سے سمجھی جاتی ہے اس کو تم یاد رکھو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدا تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی کی حالت میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور ڈالا پس جس کو وہ نور پہنچ گیا اس کو ہدایت ہوگئی اور جس پر وہ نور نہیں پڑا وہ گمراہ ہوا"۔ پس اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ علم الٰہی پر قلم خشک ہوگیا، اس سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے لوگوں کے پیدا ہونے سے پہلے اندازہ کرلیا تھا، وہ بذات خود کمالات سے خالی تھے، پس انھوں نے یہ چاہا کہ ان کی طرف رسول بھیجے جائیں اور ان پر کتابیں نازل کی جائیں پس بعض نے ہدایت پائی اور بعض گمراہ رہے، خدا تعالیٰ نے ایک ہی مرتبہ یہ سب اندازہ کرلیا تھا لیکن جو بات کہ ان کو از خود حاصل تھی وہ اس پر مقدم ہے کہ جو رسولوں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور روایت اللہ تعالیٰ سے نقل فرمایا ہے "تم سب بھوکے ہو مگر جس کو میں کھانا کھلا دوں اور تم سب گمراہ ہو لیکن جس کو میں ہدایت کردوں"۔ یا ہم کہتے ہیں یہ بھی ایک ایسے ہی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت نکالنے کا واقعہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب خدا تعالیٰ کسی خاص زمین میں کسی بندے کے مرنے کا حکم دیتا ہے تو اس کی وہاں کوئی ضرورت پیدا کردیتا ہے"۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض حوادث اس لئے پائے جاتے ہیں تا کہ اسباب کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے پس اگر کوئی حاجت پیدا نہیں ہوتی تو وہ الہام کے ذریعہ سے معلوم کرلیتا ہے یا کوئی ایسی صورت پیدا کردی جاتی ہے جس سے اس قضا الٰہی کا ظاہر ہونا ضروری ہو جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پچاس

ہزار سال قبل تمام خلائق کے مقادیر کو لکھا تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔

میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے عرش اور پانی کو سب مخلوق سے پہلے پیدا کیا پھر جتنی چیزوں کا موجود ہونا اس نے چاہا عرش کے قویٰ میں سے ایک قوت میں جو ہمارے قویٰ میں سے خیال کے مشابہ ہے اور جس کو ذکر سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کو پیدا کیا جیسا کہ امام غزالیؒ نے بیان کیا ہے اور اس بیان کو تم سنت کے مخالف نہیں سمجھنا کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک جو حدیث سے واقفیت رکھتے ہیں قلم اور لوح کی صورت کے بیان میں جیسا کہ عام لوگ اس کو بیان کرتے ہیں کوئی معتد بہ حدیث وارد نہیں ہوئی اور وہ روایتیں جو لوگ بیان کرتے ہیں وہ بنی اسرائیل کے تراشے ہوئے قصے ہیں احادیث محمدی نہیں ہیں اور متاخرین اہل حدیث کا ایسی چیزوں کا قائل ہونا تکلف ہے اور متقدمین کا اس بارے میں کوئی کلام نہیں ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کائنات کے اس تمام سلسلہ کی صورت متحقق ہوگئی تھی اور اس کو کتابت سے ایسا ہی تعبیر کیا ہے جیسا کہ سیاست مدنیہ میں کتابت کا اطلاق تعیین اور ایجاب پر ہوتا ہے، اسی معنی میں خدا تعالیٰ کا یہ قول ہے ''تم پر روزے لکھے گئے''۔ اور خدا تعالیٰ کا قول ہے ''جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے تو تم پر یہ بات لکھی گئی'' الآیہ۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ نے اپنے بندہ پر زنا کا ایک حصہ لکھ دیا ہے'' الحدیث۔ اور ایک صحابی کا قول ہے کہ میں فلاں غزوہ میں لکھا گیا تھا حالانکہ وہاں کوئی دفتر نہ تھا جیسا کہ کعب بن مالک نے بیان کیا ہے اور اس کی مثال اشعار عرب میں بکثرت ہے اور پچاس ہزار سال کا ذکر کرنا، اس میں احتمال ہے کہ اتنی ہی مدت کی تعیین ہو اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے طول مدت بیان کی ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا پھر اپنا دایاں ہاتھ ان کی پشت پر پھیرا'' الحدیث (۱)۔

میں کہتا ہوں جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تاکہ وہ ابوالبشر ہوں تو ان کے وجود میں ان کی اولاد کے حقائق کو لپیٹ دیا پھر خدا تعالیٰ نے ان کو کسی وقت میں اس شئے کا علم جس کو ان کا وجود قصد الٰہی کے موافق مشتمل تھا عطا فرمایا اور ان سب کا ایک صورت مثالیہ میں مشاہدہ کرا دیا اور ان

(۱) پھر ان کی ذریت نکل آئی خدا تعالیٰ نے فرمایا ان کو میں نے جنت کیلئے پیدا کیا ہے اور یہ جنت کے کام کریں گے، پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ذریت نکل آئی پس فرمایا یہ جہنم کے لئے ہیں اور یہ جہنم کے کام کریں گے۔

کی سعادت اور شقاوت کو نور اور ظلمت کی صورت میں ظاہر کر دیا اور ان کی جبلت میں تکلیف کی جو استعداد تھی اس کو سوال و جواب اور اپنی جانوں پر لازم کر لینے کی صورت میں ظاہر کیا پس ان سے ان کی اصل استعداد کی وجہ سے مواخذہ کیا جاتا ہے اور ظاہر میں یہ مواخذہ شیخ استعداد کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے ہر شخص کی خلقت چالیس روز تک ماں کے پیٹ میں جمع ہوتی رہتی ہے''۔ الحدیث۔

میں کہتا ہوں یہ تغیر آہستہ آہستہ ہوتا رہتا ہے دفعتاً نہیں ہوتا اور ہر حالت اپنی سابق اور لاحق حالت کے مغائر ہوتی ہے اور وہ شئے جو صورت دموی سے پورے طور پر متغیر نہیں ہوتی اس کو نطفہ ہی کہتے ہیں اور جس میں کسی قدر انجماد ہو جاتا ہے تو اس کو علقہ کہتے ہیں اور جس میں اس سے زیادہ انجماد ہو جاتا ہے تو اس کو مضغہ کہتے ہیں، اگرچہ اس میں نرم نرم ہڈیاں بھی بن جائیں۔

اور جس طرح کھجور کی گٹھلی ایک خاص وقت میں زمین میں ڈالی جائے اور ایک خاص تدبیر اس میں صرف کی جائے تو جو شخص اس کھجور کی نوع، اس زمین، اس پانی اور اس وقت کی خاصیت کو جانتا ہے وہ یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ یہ درخت خوب اُگے گا اور اس کے متعلق اس کو بعض بعض باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

پس اسی طرح سے خدا تعالیٰ بچہ کا حال جس پر اس کی پیدائش ہوئی ہے بعض فرشتوں پر کھول دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے ایسا کوئی نہیں جس کی جگہ دوزخ اور جنت میں معین نہ ہو''۔

میں کہتا ہوں کہ لوگوں کی ہر صف کے لئے کمال اور نقصان ہے، عذاب اور ثواب ہے اور اس معنی کا بھی احتمال ہے کہ یا جنت میں اور یا دوزخ میں جگہ مقرر ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول ''اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا'' الا یہ۔ اس حدیث کے مخالف نہیں۔ ''پھر خدا تعالیٰ نے اپنا دایاں ہاتھ آدم کی پشت پر پھیرا اور ان کی اولاد کو نکالا''۔ اس واسطے کہ آدم علیہ السلام سے ان کو اولاد کو نکالا اور ان کی اولاد کی پشت سے اولاد کی اولاد نکالی گئی، روز قیامت تک اس ترتیب پر کہ جس پر وہ موجود ہوتے ہیں، پس قرآن میں اس قصہ کا ایک حصہ مذکور

ہے، حدیث نے اس کا تتمہ بیان کر دیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، ''پس جس نے دیا اور ڈرتا رہا اور اچھی بات کی تصدیق کی (یعنی جو شخص ہمارے علم اور تقدیر میں ان صفات سے متصف ہے تو خارج میں ان اعمال کی بجا آوری) ہم اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں''۔

پس اس توجیہ پر حدیث بھی منطبق ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''قسم ہے جان کی جو اس کو درست کیا پھر اس کی نافرمانی اور پرہیزگاری کا اس کو الہام کیا''۔

میں کہتا ہوں یہاں الہام سے مراد نفس کے اندر فجور کی صورت کا پیدا کرنا ہے جیسا کہ عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں گزر چکا ہے، پس الہام اصل میں اس صورت علمیہ کو پیدا کرنا ہے کہ جس سے وہ عالم ہو جاتا ہے، پھر مجازاً اس صورت اجمالیہ کو کہنے لگے جو مبدا آثار ہوتی ہے اگرچہ اس سے علم حاصل نہ ہو، واللہ اعلم۔

کتاب وسنت کے اتباع کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تحریف کے سب راستوں سے ڈرایا اور سخت منع فرمایا اور اس بارے میں اپنی امت سے عہد و پیمان لئے، پس سستی کا سب سے بڑا سبب سنت کو چھوڑ دینا ہے اور اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''مجھ سے پہلے خدا تعالیٰ نے کوئی نبی اس کی امت میں ایسا نہیں بھیجا جس کی امت میں سے اس کے حواری اور ایسے اصحاب نہ ہوں جو اس کی سنت پر عمل کرتے اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہیں، پھر ان کے بعد نااہل لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو کچھ وہ کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں اور جن باتوں کا حکم ان کو نہیں ہوتا وہ کرتے ہیں، پس جو ان سے ہاتھ کے ساتھ جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے دل سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے، اور اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور اس کے پاس میرا کوئی حکم آئے جس کا میں نے امر کیا ہو یا نہی کی ہو تب وہ کہنے لگے میں کچھ نہیں جانتا جو کچھ ہم نے کتاب اللہ میں پایا اس کا ہم نے اتباع کیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت پر عمل کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے خاص کر جبکہ لوگ مختلف ہوں، اور تشدد کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے'' اپنی جانوں پر سختی نہ کرو۔ پھر خدا تعالیٰ بھی

تمہارے اوپر سختی کرے گا''۔ اور اسی طرح عبداللہ بن عمرو اور کچھ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو کم سمجھ کر عبادات شاقہ کا قصد کیا تھا تو آپ نے ان کو منع فرمایا اور تعمق و تکلف کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لوگوں کا کیا حال ہوگیا ہے کہ ایک چیز کو میں تو کر لیتا ہوں اور وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں، بخدا میں ان سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہدایت پر ہونے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی بجز اس صورت کے کہ وہ باہمی جھگڑے میں پڑ گئے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم اپنی دنیا کی باتوں سے خوب واقف ہو، اور خلط (۱) کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے جو آپ نے ایک صحابی سے فرمایا تھا جو علم یہود سیکھنا چاہتے تھے۔ ''کیا تم بھٹکتے پھرتے ہو جس طرح یہود ونصاریٰ بھٹکتے پھرتے ہیں، میں تمہارے پاس روشن اور صاف دین لیکر آیا ہوں اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے سوا چارہ نہ ہوتا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کو سب سے زیادہ مبغوض قرار دینا ہے جو اسلام میں جاہلیت کی باتوں کا طالب ہے'' اور استحسان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی بات پیدا کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ رد ہے''۔ اور ملائکہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جس نے ایک مکان بنایا اور اس نے کھانا تیار کیا اور ایک شخص کو لوگوں کے بلانے کے لئے بھیجا (۲)۔

میں کہتا ہوں اس میں لوگوں کو مامور بنانے کی طرف اشارہ ہے اور پورے طور پر سمجھانے کے لئے اس کو بہ منزلہ امر محسوس کے کر دینا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی'' الحدیث، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تیری مثال اور اس چیز کی مثال جس کو خدا نے مجھے دیکر بھیجا ہے، اس شخص جیسی ہے جو ایک قوم کے پاس آئے اور کہے اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے لشکر کو دیکھا ہے''۔ الحدیث۔ یہ حدیث اس امر پر صریح دلیل ہے کہ بعض اعمال بذات خود بعثت سے قبل عذاب آنے کے مستوجب ہوتے ہیں، اور نبی

(۱) یعنی اسلام میں اور مذہب کو ملانا۔ (۲) اس کا اخیر یہ ہے پس جس نے اس داعی کا کہنا مانا وہ گھر میں آیا اور اس نے کھانا بھی کھایا اور جس نے کہنا نہ مانا وہ گھر میں نہ آیا اور نہ اس نے کھانا کھایا۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس ہدایت اور علم کے ساتھ خدا تعالیٰ نے مجھ کو بھیجا ہے اس کی مثال اس کثیر بارش کی سی ہے جو زمین پر برسا''۔الحدیث۔اس حدیث میں اس امر کا بیان ہے کہ اہل علم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کو دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے قبول کرلیا، یا صریح روایت کے ذریعہ سے یا دلالت روایت کے ذریعہ سے، بایں طور کہ انھوں نے شریعت پر عمل کیا، پس لوگوں نے ان کی رہبری سے ہدایت پائی، اور اہل جہل نے اس ہدایت کو بالکل قبول نہیں کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نصیحت میں جو نہایت تاکید سے لوگوں کو فرمائی تھی اس میں کہا تھا میرے طریقہ کو اور میرے خلفا راشدین مہدیین کے طریقہ کو اپنے اوپر لازم کر لینا''۔

میں کہتا ہوں دین کا انتظام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع پر موقوف ہے اور سیاست کبریٰ کا انتظام اس پر موقوف ہے کہ خلفا تدابیر ملکی اور جہاد سے متعلق جن امور کا اپنے اجتہاد سے حکم دیں ان کے حکم اطاعت کی جائے بشرطیکہ ان کا یہ حکم شریعت کے حق میں بدعت نہ ہو اور نہ ہی خلاف نص ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا یہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے پھر اس خط کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے اور فرمایا یہ بھی راستے ہیں ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے، اور آپ نے یہ آیت پڑھی ''تحقیق یہ میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر تم چلو دوسرے راستوں پر مت چلو ورنہ خدا تعالیٰ کے راستہ سے بچھڑ جاؤ گے''۔

میں کہتا ہوں کہ فرقہ ناجیہ وہ ہے جو تمام عقائد اور اعمال کے اندر اس پر عمل کرتے ہیں جو کتاب وسنت سے ظاہر ہے اور جس پر جمہور صحابہ وتابعین نے عمل کیا ہے اگر چہ وہ ان باتوں کے اندر مختلف ہوں جن میں کوئی نص مشہور نہیں ہے نہ ان پر صحابہ کا اتفاق ظاہر ہوا ہے اور ان کے بعض اقوال سے استدلال کرتے ہوں اور مجمل کی تفسیر کرتے ہوں۔

اور غیر ناجیہ ہر وہ فرقہ ہے جو سلف کے عقیدہ کے خلاف کوئی عقیدہ رکھے یا ان کے عمل کے خلاف کوئی عمل نکالے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ امت گمراہی پر اتفاق نہ کرے گی، اور فرمایا'' ہر صدی کے بعد خدا تعالیٰ اس امت میں ایسے شخص کو پیدا کرتا رہے گا جو اس امت کے لئے اس کے دین کو نیا کرتا رہے گا'' اور اس حدیث کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے ''ہر خلف کے عادل لوگ اس علم کا بار

اٹھائیں گے جو اس سے آمیزش کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی کج روی اور جاہلوں کی تاویل کو دور کریں گے۔

واضح ہو کہ لوگوں نے جب دین میں اختلاف اور زمین میں فساد پھیلایا تو اس شئے نے جود الٰہی کے دروازہ کو کھٹکھٹایا پس خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ سے دین کی کجی کی درستی کا ارادہ فرمایا، پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عالم سے وفات پائی تو بعینہٖ یہ عنایت الٰہی اس طرف متوجہ ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم ورشد کو امت میں محفوظ رکھے، پس اس نے ان میں الہامات اور تقریبات پیدا کر دیں۔ پس قیامت تک ان میں ہدایت برقرار رکھنے کا حظیرۃ القدس میں ایک داعیہ رہتا ہے پس اس وجہ سے ضرور ہوا کہ ان میں ہمیشہ ایک ایسا گروہ رہے جو امر الٰہی پر قائم ہو وہ سب کے سب گمراہی پر اتفاق نہ کریں اور قرآن ان میں محفوظ رہے، اور ان کے اختلاف استعداد کی وجہ سے یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ ہدایت پانے کے باوجود لوگوں میں کچھ ردوبدل ہو پس عنایت الٰہی ایسے لوگوں کی منتظر ہوئی جو مستعد ہوں اور ان کو عظمت دی گئی ہو، پس اس عنایت الٰہی نے ان کے دلوں میں ان امور کو پیدا کیا کہ علم میں رغبت کریں اور غالی لوگوں کی تحریف کو دور کریں، اور یہ سختی اور تکلف کی طرف اشارہ ہے، اور جھوٹوں کی کج روی کو دور کریں، اور یہ استحسان کی طرف اور مذہب کے ساتھ دوسرے مذہب کو خلط ملط کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور جاہلوں کی تاویل دور کریں، اور یہ سستی کی طرف اور ضعیف تاویل کر کے مامور بہ کے ترک کی طرف اشارہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ جس شخص کی بہتری چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے''۔ اور آپ نے فرمایا علما انبیا کے وارث ہیں'' اور آپ نے فرمایا ''عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسی مجھ کو تم میں سے کسی ادنیٰ شخص پر فضیلت ہے'' اور اسی قسم کی اور حدیثیں فرمائی ہیں۔

واضح ہو کہ جب کسی شخص پر عنایت الٰہی کا ورود ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کو تدبیر الٰہی کا اہل بناتا ہے تو ضرور اس پر خدا تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور فرشتوں کو اس کی محبت اور تعظیم کا حکم ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے جس میں جبرئیل کو محبت رکھنے کا اور زمین میں مقبولیت پھیلانے کا حکم ہونا بیان ہے اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو وہی عنایت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ خاص تھی آپ کی ملت کی حفاظت کے لحاظ سے علماء رواۃ اور اس کی اشاعت کرنے والوں کی طرف متوجہ ہوئی اور ان میں بے شمار فوائد پیدا کر دیئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خوش رکھے اللہ تعالیٰ اس بندے کو جو میری بات کو سنے اور یاد کرے اور محفوظ رکھے اور پھر جیسا سنا تھا ویسا ہی بیان کر دے۔

میں کہتا ہوں کہ اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ یہ شخص اس قابل معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت نبوی کو مخلوق کی طرف پہنچا دے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص قصداً مجھ سے جھوٹ بولے وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اخیر زمانہ میں دجال اور کذاب پیدا ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ جب کہ اخیر زمانوں تک دین کے پہنچنے کا ذریعہ روایت ہی ہے اور جب روایت میں فساد داخل ہو جائے تو پھر اس کا کچھ علاج نہیں اس واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہوا اور روایت کرنے میں احتیاط واجب ہوئی تا کہ روایت کرنے میں کذب نہ ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بنی اسرائیل سے روایت کرو اور کچھ مضائقہ نہیں''۔ اور فرمایا ''بنی سرائیل کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب''۔

میں کہتا ہوں کہ قابل عبرت امور میں بنی اسرائیل سے روایت کرنا جائز ہے اور جہاں احکام دین اختلاف ہونے سے امن ہو اور اس کے ماسوا میں جائز نہیں۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سے بنی اسرائیل کے قصے جو کتب تفسیر میں بھرے پڑے ہیں، اور اخبار جو علما اہل کتاب سے منقول ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کسی حکم شرعی یا اعتقاد کو قائم کیا جائے، فتدبر۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس علم سے خدا تعالیٰ کی رضا مندی مطلوب ہوتی ہو اس علم کو کوئی شخص متاع دنیا حاصل کرنے کی غرض سے پڑھے تو قیامت کے روز وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا''۔ میں کہتا ہوں کہ دنیوی غرض کے لئے علم دین حاصل کرنا حرام ہے اور جس میں غرض فاسد معلوم ہوتی ہو اس کو سکھلانا بھی چند وجوہ سے حرام ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسا شخص اکثر غرض دنیوی کے واسطے ضعیف تاویل کر کے دین

کے اندر تحریف کر سکتا ہے اس واسطے اس راستہ کو بند کر دینا ضروری ہوا، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص قرآن وسنت کی حرمت نہ کرے گا اور نہ ان پر عمل کرے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص سے کوئی علمی بات جس کو وہ جانتا ہو دریافت کی جائے پھر وہ چھپائے تو قیامت کے روز اس کو آگ کی لگام دی جائے گی''۔

میں کہتا ہوں کہ علم کا چھپانا جس وقت کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہو حرام ہے اس واسطے کہ یہی سستی کی اصل ہے اور احکام دینی کے نسیان کا سبب ہے اور آخرت کی جزائیں اعمال کی مناسبت سے ہوتی ہیں، پس جبکہ گناہ بیان مسئلہ سے زبان کا روکنا تھا۔ تو زبان کے بند کرنے کے ہم شکل سزا دی گئی اور وہ ہم شکل شئے آگ کی لگام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''علم تین ہیں آیت محکمہ، یا سنت قائمہ یا فریضہ عادلہ، اور جو اس کے سوا ہے وہ زیادہ ہے۔

میں کہتا ہوں یہ اس انضباط اور حد کو بیان کرنا ہے جس کا سیکھنا لوگوں پر واجب بالکفایہ ہے، پس قرآن کا لفظاً سیکھنا اور بذریعہ بحث الفاظ غریبہ کی شرح سے اس کے محکم کی معرفت اسباب نزول اور وقت طلب امر کی توجیہ اور ناسخ ومنسوخ کی معرفت ضروری ہے، لیکن متشابہ سو اس کا حکم یا توقف ہے یا محکم کی طرف رجوع کر لینا ہے، اور سنت قائمہ وہ ہے جو عبادات اور معاملات میں ان شرائع اور سنن سے ثابت ہو جن پر علم فقہ مشتمل ہے، اور سنت قائمہ وہ ہے جو نہ منسوخ ہو، نہ متروک ہو اور نہ اس کا کوئی راوی چھوٹا ہو اور جمہور صحابہ وتابعین کا اس پر عمل رہا ہو، ان سب میں اعلیٰ وہ ہے جس پر فقہا مدینہ وکوفہ متفق ہوں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس پر مذاہب اربعہ متفق ہوں، اس کے بعد وہ ہے جس میں جمہور صحابہ کے دو قول یا تین قول ہوں اور ہر قول پر اہل علم کے ایک گروہ نے عمل کیا ہو، اور اس کی شناخت یہ ہے کہ موطا اور جامع عبدالرزاق جیسی کتابوں میں ان کی روایات پائی جاتی ہوں اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بعض فقہا کا استنباط ہے اور بعض کا نہیں ہے جو تفسیر، تخریج، استدلال اور استنباط کی وجہ سے حاصل ہوا ہے اور وہ سنت قائمہ نہیں ہے۔

اور فریضہ عادلہ، ورثہ کے حصے معلوم کرنا ہے اور اس کے ساتھ وہ ابواب قضا بھی ملحق ہیں جن کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان انصاف کے ساتھ قطع منازعت ہو جائے، پس یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے واقف سے شہر کا خالی رہنا حرام ہے کیونکہ ان پر دین موقوف ہے اور جو ان کے سوا

ہیں وہ فضل اورزیادتی کے قبیل سے ہیں۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مغالطات سے منع فرمایا ہےاور یہ وہ مسائل ہیں جن سے مسئول عنہ غلطی میں پڑتا ہےاوران سے لوگوں کے اذہان کا امتحان لیا جاتا ہےاوران سے منع کرنے کی کئی وجوہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ ایسی باتوں میں مسئول عنہ کوایذااورذلت اور پوچھنے والے کوتکبراورعجب حاصل ہوتا ہےاوردوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے تعمق کا دروازہ کھلتا ہےاورصحیح وہ ہے جس پرصحابہ اور تابعین تھے کہ ظاہر سنت پر مطلع ہونا چاہئے،اور جوایماواقتضااورفحوائے کلام سے بہ منزلہ ظاہر کے ہے اس پر مطلع ہونا چاہئے اور بہت امعان مناسب نہیں ہے اور نہ ہی اجتہاد میں مشغول ہونا مناسب ہے جب تک کہ اس کی ضرورت نہ پڑےاور حادثہ پیش نہ آئے کیونکہ اس وقت خدا تعالیٰ اپنی عنایت سے جولوگوں پرصحیح علم عطا کردیتا ہےاور پہلے سے اس کے لئے جلدی کرنے میں غلطی کا امکان ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''جوشخص اپنی رائے سے قرآن میں کوئی بات کہےاس کواپنی جگہ دوزخ میں بنانا چاہئے''۔

میں کہتا ہوں جوشخص اس زبان سے جس میں قرآن نازل ہوا ہےواقف نہ ہواور نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ اور تابعین سے الفاظ غریبہ کی شرح سبب نزول اور ناسخ ومنسوخ کے بارے میں جومنقول ہےاس سے واقف نہ ہوتو اس کے لئے تفسیر میں خوض کرنا حرام ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ مجادلہ حرام ہےاوروہ مجادلہ یہ ہے کہ کوئی شخص حکم منصوص کوکسی شبہ سے جواس کے دل میں واقع ہوا ہے رد کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''تم سے پہلے لوگ اسی سبب سے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بعض کوبعض سے لڑایا''۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن کے ساتھ تدافع کرنا حرام ہے اوروہ تدافع یہ ہے کہ ایک شخص کسی آیت سے کوئی مسئلہ ثابت کرےاوردوسرا شخص اپنا مذہب ثابت کرنے کے لئے اور دوسرے کی بات باطل کرنے کے لئے یا بعض ائمہ کے مذہب کوبعض پر غالب کرنے کے لئے دوسری آیت کو پیش کرےاوراس کا پوراپورا قصد اظہار حق نہ ہو،اوراسی طرح سنت کے ساتھ تدافع کرنا حرام

ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر آیت کے لئے ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور ظاہر و باطن کو سمجھنے کے ہر درجہ کے لئے ایک خاص استعداد ہوتی ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ زیادہ تر قرآن میں صفات الٰہی کا بیان، اس کی عجائب قدرت، احکام اور قصص، کفار پر احتجاج اور جنت و دوزخ کے ساتھ موعظت کرنا ہے پس قرآن کا ظاہر یہ ہے کہ جس کے لئے کلام لایا گیا ہے اس کا پورا پورا علم حاصل ہو جائے، اور اس کا باطن آیات صفات میں، نعمائے الٰہی میں فکر اور غور کرنا ہے، اور آیات احکام میں ایما اور اشارہ اور فحوی اور اقتضا سے مسائل کا استنباط کرنا ہے، جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت "وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا" سے اس بات کا استنباط کیا ہے کہ مدت حمل کی کبھی چھ ماہ بھی ہوتی ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے "حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ"۔

اور قصص میں اس کا باطن کا ثواب اور مدح، یا عذاب اور ذم کے مدار کی معرفت ہو، اور موعظت میں اس کا باطن رقت قلب اور خوف و رجا کا ظاہر ہونا، اور اسی قسم کی اور باتیں ہیں اور ہر حد کے مطلع سے مراد وہ استعداد ہے جس سے وہ حد حاصل ہوتی ہے جیسے زبان اور آثار سے واقف ہونا اور جیسے ذہن کی صفائی اور سمجھ کی پختگی کا ہونا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اس کتاب میں سے کچھ آیتیں محکم ہیں اور وہ کتاب کی اصل ہیں اور کچھ آیات متشابہات ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بظاہر محکم وہ ہے جس میں ایک وجہ کے سوا دوسری وجہ کا احتمال نہ ہو جیسے یہ آیت ہے "تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں حرام ہیں"۔ اور متشابہ وہ ہیں جس میں چند احتمالات ہوں اور ان میں سے بعض مراد ہو، جیسے خدا تعالیٰ کا قول ہے "ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اس شئے کے بارے میں کوئی گناہ نہیں جو انھوں نے کھایا"۔ کج فہموں نے اس آیت کو اس پر محمول کیا کہ جب تک کسی پر ظلم یا زمین میں فساد نہ ہو شراب کا پینا درست ہے، اور صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں ہے جو تحریم سے پیشتر شراب پیتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اعمال کا مدار نیت پر ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ نیت، قصد اور ارادہ کو کہتے ہیں، اور یہاں نیت سے مراد علت غائیہ ہے جو انسان کو خیال میں آنے کے بعد کسی کام پر آمادہ کرتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ سے ثواب اور رہنما کا

طلب کرنا، اور حدیث کے معنی یہ ہیں کہ نفس کی تہذیب اور اس کی کجی کے دور کرنے میں اعمال کا کچھ اثر نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کسی ایسے مقصد کے تصور کرنے سے صادر نہ ہوں جس کو تہذیب نفس سے تعلق ہوتا ہے، اور عادت یا لوگوں کی موافقت یا ریا، اور سمعہ یا اقتضا جبلی کی وجہ سے صادر نہ ہوں جیسے اس بہادر آدمی سے قتال کا سرزد ہونا جو جنگ کے بغیر نہیں رہ سکتا اور اگر کفار سے مقابلہ پیش نہ آتا تو اس شجاعت کو مسلمانوں کے قتال میں صرف کرتا اور ایسے ہی شخص کی نسبت کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ ایک شخص دکھاوے کی غرض سے قتال کرتا ہے اور ایک شخص اپنی شجاعت کی وجہ سے پس ان دونوں میں سے کون سا خدا کی راہ میں قتال کرتا ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو تو اس کا لڑنا خدا کے لئے ہے''۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کا ارادہ روح ہے اور اعمال اس کی صورت اور جسم ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا '' حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہات ہیں، پس جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور اپنی عزت کو بچا لیا''۔

میں کہتا ہوں کہ کبھی ایک مسئلہ میں چند وجوہ متعارض ہوتی ہیں تو اس وقت میں احتیاط اور اس سے بچنا سنت ہے پس تعارض کی ایک صورت تو یہ ہے کہ صراحتاً روایات مختلف ہوں جیسے مس ذکر سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں، بعض نے اس کو ثابت کیا ہے اور بعض نے اس کی نفی کی ہے اور ہر ایک کے پاس حدیث ہے جس سے وہ شہادت پیش کرتا ہے، اور جیسے محرم کا نکاح ہے اس کو ایک گروہ نے جائز رکھا ہے اور دوسروں نے اس کی نفی کی ہے اور روایتیں مختلف ہیں اور تعارض کی ایک صورت یہ ہے کہ اس باب میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی منضبط نہیں ہیں، یعنی اس کے معنی تقسیم اور مثال سے معلوم ہوتے ہیں اور ایک جامع مانع تعریف سے اس کے معنی معلوم نہیں ہوتے تو وہاں تین مادے پیدا ہوتے ہیں ایک تو وہ مادہ (۱) ہے جہاں اس لفظ کا یقیناً اطلاق ہوتا ہے اور ایک وہ مادہ ہے جہاں یقیناً اطلاق نہیں ہوتا اور ایک وہ مادہ ہے جہاں اس لفظ کے اطلاق کا صحیح ہونا یا نہ ہونا کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تعارض کی ایک صورت یہ ہے کہ حکم کا مدار یقیناً کسی علت پر ہوتا ہے جس میں ایک مقصد کا یقینی گمان ہوتا ہے، اور ایک نوع اس کی ایسی ہوتی ہے کہ وہاں مقصد

---

(۱) مادہ سے مراد موقع ہے۔

نہیں پایا جاتا اور علت پائی جاتی ہے۔ جیسے وہ لونڈی جس کو ایسے شخص سے خریدا جس میں جماع کی قابلیت نہیں ہے تو وہ وہاں استبرا(۱) واجب ہے یا نہیں، پس ایسے ایسے مواقع میں احتیاط کی بڑی تاکید ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قرآن پانچ وجوہ پر نازل ہوا حلال اور حرام اور محکم اور متشابہ اور مثال''۔

میں کہتا ہوں یہ وجوہ کتاب اللہ کے اقسام ہیں اگرچہ مختلف تقسیمات سے ہوں، پس ان میں حقیقی تضاد نہیں ہے اسی واسطے حکم کبھی حلال ہوتا ہے اور کبھی حرام ہوتا ہے اور دین کے اصول میں سے یہ بات ہے کہ جو آیات قرآنی یا احادیث نبوی متشابہات کے قبیل سے ہیں ان میں عقل سے خوض نہ کرنا چاہئے اور اسی قسم کے بہت سے امور ہیں جہاں معلوم نہیں ہوتا کہ کلام کے حقیقی معنی مراد ہیں یا کوئی معنی مجازی مراد ہیں جو حقیقت کے قریب ہیں اور یہ وہاں ہے جہاں امت کا اجماع نہیں ہے اور اس سے شبہ مرتفع نہیں ہوا ہے، واللہ اعلم۔

طہارت کا بیان

واضح ہو کہ طہارت کی تین قسمیں ہیں ایک تو حدث سے طہارت دوسرے اس نجاست سے طہارت جو بدن یا کپڑے یا جگہ سے متعلق ہے، تیسرے بدن سے پیدا ہونے والے میل کچیل سے طہارت ہے جیسے موئے زیرناف، ناخن اور میل وغیرہ، لیکن احداث سے طہارت حاصل کرنا، سو وہ ''اصول بر'' سے اخذ کی گئی ہے، ناپاکی اور طہارت کی روح کے پہچاننے میں عمدہ ان لوگوں کا وجدان ہے جن کے دلوں میں انوار ملکیہ کا ظہور ہوتا ہے، پس ان کے نفوس اس حالت سے جس کو حدث کہتے ہیں نفرت محسوس کرتے ہیں، اور اس حالت میں جس کا نام طہارت ہے سرور اور انشراح محسوس کرتے ہیں، اور طہارت کی صورتوں کی تعیین میں اور اس کے موجبات کے بارے میں اس امر کا اعتبار ہے جو ملل سابقہ یعنی یہود، نصاریٰ اور مجوس اور بقایا ملت اسماعیلیہ میں مشہور تھا، پس وہ لوگ ناپاکی کی دو قسمیں اور طہارت کی دو قسمیں کرتے تھے جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں اور جنابت سے غسل کرنا تمام عرب میں مروج تھا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طہارت کی دونوں قسموں کو حدث کی دونوں قسموں پر تقسیم فرمایا، پس طہارت کبری یعنی غسل کو حدث اکبر یعنی

(۱) وہ مولد سے رحم کے بری ہونے کو معلوم کرنا۔

جناب کے مقابلہ میں رکھا، اس واسطے کہ حدث اکبر قلیل الوقوع اور کثیر التلوث ہے اور وہ ایسے عمل شاق یعنی غسل سے جس کا آدمی کو بہت کم اتفاق ہوتا ہے نفس کو متنبہ کرنے کا زیادہ ضرورت مند ہے اور طہارت صغریٰ وضو کو حدث اصغر کے مقابلہ میں رکھا اور واسطے کہ وہ کثیر الوقوع اور قلیل التلوث ہے اور اس میں نفس کو کسی قدر متنبہ ہو جانا کافی ہے، وہ امور جن میں حدث کے معنی پائے جاتے ہیں فی الحقیقت بے شمار ہیں جن کو اصحاب ذوق سلیم جانتے ہیں لیکن وہ حدث جس سے تمام لوگوں کو مخاطب کیا جا سکے ان محسوس امور میں منضبط ہے جن کا ظاہر میں نفس کے اندر اثر ہوتا ہے تاکہ ظاہر طور پر لوگوں سے اس کی باز پرس ہو سکے اسی واسطے یہ بات مقرر ہوئی کہ مدار حکم اس اشتغال نفس پر نہ رکھا جائے جو معدہ میں معلوم ہوتا ہے بلکہ حدث کے حکم کا دار سبیلین یعنی پیشاب یا پاخانہ کے راستہ سے کسی چیز کے نکلنے پر رکھا جائے کیونکہ پہلی صورت کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا اور جب معدہ کے اندر کچھ حرکت پائی بھی جائے تو باہر سے وضو کر لینا اس کو رفع نہیں کر سکتا، اور دوسری بات یعنی سبیلین سے کسی شئے کا خارج ہونا حسا معلوم ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہے کہ اس میں انقباض نفس کے معنی کی ایک ظاہری صورت ہے اور اس کا قائم مقام یعنی نجاست سے بدن کا آلودہ ہونا پایا جاتا ہے اور نیز نفس کے اندر وضو کا اثر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ نفس کو فراغت ہو جائے اور یہ فراغت کسی چیز کے خارج ہونے سے ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس کلام میں (تم میں ... شخص ایسی حالت میں نماز نہ پڑھے جبکہ اس کو پیشاب پاخانہ کی حاجت معلوم ہوتی ہو) متنبہ فرما دی کہ اس میں صرف مشغول ہو جانا بھی حدث کے ایک معنی ہیں، اور وہ امور جن میں طہارت کے معنی پائے جاتے ہیں بہت سے ہیں ... خوشبو لگانا اور وہ اذکار جس اس خصلت یعنی پاکی کو یاد دلاتے ہیں جیسے آپ کا یہ پڑھنا "اے اللہ مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے کر اور مجھ کو پاکیزہ لوگوں میں سے کر"۔ اور آپ کا یہ فرمانا "اے اللہ مجھ کو گناہوں سے ایسا پاک صاف کر جیسے سفید کپڑہ میل سے صاف ہو جاتا ہے"۔ اور پاکیزہ جگہوں ... جانے سے بھی طہارت حاصل ہوتی ہے وغیر ذالک، لیکن وہ طہارت جس سے سب لوگوں کو مخاطب کر سکیں ایسی ہونا چاہئے جو منضبط و معین چیز ہو اور ہر وقت اور ہر جگہ لوگوں کو حاصل ہو سکے اور بظاہر اس کا اثر معلوم ہوتا ہو اور لوگوں میں اس کا دستور رہا ہو، وضو کے اندر اصل اعضا کا دھونا ہے اس واسطے شارع نے منہ اور دونوں

ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا مقرر کیا کیونکہ اس سے کم کا اثر محسوس نہیں ہوتا، اور پیروں کا ٹخنوں تک دھونا مقرر کیا کیونکہ اس سے عضو نا تمام ہے اور سر کے واسطے مسح مقرر کیا کیونکہ اس کے دھونے میں ایک طرح کی دقت ہے اور غسل کے اندر اصل تمام بدن کا دھونا ہے، اور سبب وضو میں اصل وہ شئے ہے جو پیشاب پاخانہ کے راستہ سے نکلے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ اسی پر محمول ہے، اور سبب غسل میں اصل جماع اور حیض ہے، اور گویا یہ دونوں امر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر عرب میں مسلم تھے، اور طہارت کی دوسری دونوں قسمیں تمدنی زندگی سے ماخوذ ہیں کیونکہ یہ دونوں (۱) اصل طبیعت انسانی کی مقتضی ہیں، ان سے کوئی قوم اور کوئی ملت خالی نہیں ہے اور اس بارے میں شارع نے عرب خالص کا اعتبار کیا جن کو اوسط درجہ کی خوش حالی حاصل تھی جس طرح اور باقی تمدنی زندگی درست کرنے میں انہیں کا اعتبار کیا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے اس کے کوئی بات زیادہ نہیں کی کہ آداب معین کر دیے، جہاں اشکال تھا اس کو صاف کر دیا اور جہاں ابہام تھا اس کا اندازہ کر دیا۔

وضو کا بیان: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''طہارت نصف ایمان ہے''۔

میں کہتا ہوں یہاں ایمان سے ایک ایسی ہیئت نفسانیہ مراد ہے جو نور طہارت اور خشوع سے مرکب ہے، اور لفظ احسان اس معنی میں ایمان سے زیادہ واضح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ طہارت اس کا نصف ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے وضو کیا اور اچھی طرح سے کیا تو اس کے گناہ اس کے جسم سے نکل جاتے ہیں حتی کہ اس کے ناخونوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں وہ پاکیزگی جو اصل نفس میں اثر کرتی ہے نفس کو مقدس کر کے ملائکہ کے ساتھ ملحق کر دیتی ہے اور بہت سے ناپاک حالات کو محو کر دیتی ہے پس اس پاکیزگی کی خاصیت ہی وضو کی خاصیت کر دی گئی جو طہارت کی صورت اور اس کا مظنہ اور اس کا عنوان ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز میری امت کو پکارا جائے گا اور وضو کے آثار سے ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے، پس تم میں سے جو کوئی اپنا نور بڑھا سکے وہ بڑھالے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) تطیب اور حلول۔

نے فرمایا ''جہاں تک وضو کا پانی پہنچے گا وہیں تک مومن کو جنت کا زیور پہنایا جائے گا''۔

میں کہتا ہوں کہ جبکہ طہارت کی صورت پانچ اعضا کے ساتھ متعلق تھی تو نفس کا طہارت کے ساتھ تنعم حاصل کرنا ان اعضا کے لئے زیور اور روشن ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا جس طرح بزدلی خرگوش کی صورت میں اور شجاعت شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مومن کے سوا وضو پر کوئی مداومت نہیں کر سکتا''۔

میں کہتا ہوں کہ جب وضو پر مداومت ایک دشوار امر تھا جس کو وہی شخص کر سکتا ہے جس کو طہارت کے بارے میں بصیرت حاصل ہو اور اس کے نفع عظیم کا اس کو یقین ہو اس لئے اس کی مداومت کو ایمان کی علامت بنا دیا گیا۔

کیفیت وضو کا بیان

وضو کی کیفیت جس طرح حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن زید وغیرہم رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے بلکہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بالتواتر ثابت ہے اور امت نے اس پر اتفاق کیا یہ ہے کہ پانی کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پیشتر اپنے دونوں ہاتھ دھوئے اور کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے اور اس کو صاف کرے اس کے بعد اپنا منہ دھوئے پھر اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے پھر سر کا مسح کرے پھر اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے۔

اور ان لوگوں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں جن میں گمراہی سرایت کر گئی اور انھوں نے ظاہر آیت سے استدلال کر کے پاؤں کے دھونے سے انکار کر دیا کیونکہ میرے نزدیک جو شخص ایسی بات کہے اور وہ شخص جو جنگ بدر جنگ احد سے جو آفتاب فی رابعۃ النہار کی طرح ثابت ہے منکر ہو دونوں برابر ہیں، ہاں، جو شخص یہ بات کہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ پاؤں کے دھونے کے ساتھ ان کا مسح بھی کرے یا یہ کہ ادنیٰ فرض مسح کرنا ہے اگر چہ دھونا بھی ایسا ہے جس کا ترک کرنا سخت قابل ملامت ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ علما اس کے اندر جب تک کہ اصل حال منکشف نہ ہو توقف کر سکتے ہیں، اور مجھ کو کوئی ایسی صحیح روایت نہیں ملی جس میں یہ تصریح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کلی کئے اور بغیر ناک میں پانی ڈالے اور بغیر ترتیب کے وضو کیا، پس یہ وضو میں نہایت موکد امور ہیں، اور یہ دونوں یعنی کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا خصال فطرت میں سے دو مستقل

طہارتیں ہیں جو وضو کے ساتھ اس لئے ملا دی گئی ہیں کہ وضو کے ساتھ ان کا ایک وقت معین رہے اور اس لئے کہ یہ دونوں جسم کے ان پوشیدہ حصوں میں سے ہیں جو خیال رکھنے کے قابل ہیں اور ان دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا بہ نسبت جدا جدا ہونے کے زیادہ مناسبت ہے، اور آداب وضو چند امور میں منحصر ہیں ان میں سے ایک جسم کے ان پوشیدہ حصوں کا خیال رکھنا ہے جن میں بغیر تکلف کے پانی نہیں پہنچتا جیسے کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں اور داڑھی میں خلال کرنا اور انگوٹھی کو حرکت دینا اور ان میں سے ایک پاکیزگی کو پورا کرنا ہے جیسے تین تین مرتبہ دھونا اور جیسے خوب اوپر تک ہر عضو کا دھونا جو روشنی اور نور کا زیادہ کرنا ہے اور صاف کرنا اور وہ بدن کا ملنا ہے اور سر کے ساتھ دونوں کانوں کا مسح کرنا ہے اور وضو پر وضو کرنا ہے اور ان میں سے ایک امور مہمہ کے اندر ان کی عادت کی موافقت کرنا ہے جیسے دائیں عضو سے شروع کرنا اس لئے کہ دائیں کو بائیں سے قوت اور اولویت ہے پس ان امور میں جو دونوں سے تعلق رکھتے ہیں ابتداء کا حق بھی اسی کو حاصل ہے اور ان امور میں جو استعمال میں کسی ایک کے ساتھ تعلق رکھ سکتے ہیں ان میں سے صرف محاسن اور طیبات کو دائیں کے ساتھ ہی خاص کرنا مناسب ہے، اور ان میں سے ایک دل کی کیفیت کا ان الفاظ کے ساتھ انضباط کرنا ہے جو صراحتاً مقصود پر دلالت کرتے ہیں، اور ذکر قلبی کے ساتھ ذکر لسانی کا ملانا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے خدا کا ذکر نہیں کیا اس کا وضو نہیں ہوا''۔

میں کہتا ہوں کہ واقفین حدیث کا اس کی صحت پر اتفاق نہیں ہے اور اگر صحیح بھی سمجھی جائے تو یہ ان مواضع میں سے ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنے کے طریقوں میں اختلاف واقع ہوا ہے، پس اہل اسلام ہمیشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کو بیان کرتے رہے اور لوگوں کو سکھلاتے رہے اور بسم اللہ کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے حتی کہ اہل حدیث کا زمانہ ظاہر ہوا، اور اس حدیث میں اس بات کی نص ہے کہ بسم اللہ یا تو وضو کا رکن ہے یا اس کی شرط ہے، اور دونوں وجہوں میں اس طرح مطابقت ہوسکتی ہے کہ حدیث میں ذکر سے مراد ذکر قلبی ہے کیونکہ بغیر نیت کے اعمال مقبول نہیں ہوتے، اور اس وقت وضو سے نفس کا رنگین ہونا مراد ہے اور وضو اپنے ظاہر معنی میں مراد نہیں ہے ہاں تسمیہ ایک امر مستحب ہے جیسے اور مستحبات ہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو مہتم

بالشان کام خدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے تو وہ خراب ہوتا ہے'' اور بہت سے مواضع پر قیاس کرنے سے اس کا آداب میں داخل ہونا ثابت ہوسکتا ہے اور لا وضو کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس کا وضو کامل نہیں ہوتا، لیکن میں ایسی تاویل کو پسند نہیں کرتا کیونکہ یہ ایک ایسی بعید تاویل ہے جو اصل لفظ کے مخالف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کیونکہ اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ رات بھر کہاں پڑا رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھوں کو دھوئے ہوئے بہت دیر ہو جانے اور بہت دیر تک ان سے بے خبر رہنے میں ظن غالب ہے کہ نجاست اور میل کچیل ان تک پہنچا ہو جس کی وجہ سے اس کے ساتھ ہاتھوں کا پانی میں ڈالدینا پانی کو ناپاک کردینا یا مکدر کردینا یا اس میں کراہت پیدا کردینا ہے اور پانی میں پھونک مارنے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منع فرمایا ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جو صبح تک سوتا ہے تو شیطان اس کی ناک پر رات کو رہتا ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نتھنوں میں بلغم اور مواد غلیظہ کا جمع ہو جانا کند ذہنی اور فکر میں نقصان کا سبب ہوتا ہے پس وہ شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا اور اس شخص کو تدبر از کار سے روکنے کا موقع دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' تم میں سے جو شخص وضو کرے اور پورا پورا کرے اور پھر **اشھد ان لا الہ الا اللہ**، اخیر تک پڑھے اور ایک روایت میں ہے کہ یہ دعا پڑھے **اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین**، تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں جس میں سے چاہے داخل ہو جائے''۔

میں کہتا ہوں کہ طہارت کی روح بغیر اس کے حاصل نہیں ہوتی کہ عالم غیب کی طرف نفس کی توجہ ہو اور اس کی طلب میں پوری پوری کوشش ہو اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ذکر مقرر فرمایا اور اس پر اس طہارت کے فائدہ کو مرتب فرمایا جو نفس کے اندر حاصل تھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جس نے پورے طور پر وضو نہیں کیا تھا فرمایا'' خرابی ہے ایڑیوں کو آگ سے''۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں راز یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان اعضا کا دھونا واجب کیا تو اس

ایجاب نے اقتضا کیا کہ دھونے کے معنی پائے جائیں پس اس نے بعض عضو کو دھویا اور پورے اس عضو کو نہیں دھویا تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس نے عضو کو دھویا اور نیز آپ کے اس فرمانے میں سستی کا دروازہ بند کر دینا ہے اور ایڑیوں میں آگ اس واسطے لگی کہ پے در پے ناپاکی کا ہونا اور اس کے دور نہ کرنے پر اصرار کا پایا جانا ایسی خصلت ہے جس سے دوزخ کی آگ واجب ہوتی ہے اور ناپاکی سے طہارت حاصل کرنا اس آگ سے نجات کا اور گناہوں کے دور کرنے کا سبب ہے، پس جب ایک عضو میں طہارت کے معنی نہ پائے گئے اور اس میں حکم الہٰی کی تعمیل نہ ہوئی تو یہ اس بات کا سبب بن گیا کہ اس خصلت کی وجہ سے جو نفس کے اندر خرابی کا سبب بنی ہے اس عضو کی طرف سے نفس کے لئے تکلیف ظاہر ہو، واللہ اعلم۔

موجبات وضو کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس شخص کی نماز قبول نہیں ہوتی جس کا وضو جاتا رہا یہاں تک کہ وہ وضو کرے'' اور آپ نے فرمایا ''بغیر طہارت کے نماز مقبول نہیں ہوتی'' اور آپ نے فرمایا ''نماز کی کنجی طہارت ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ ان سب احادیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ نماز کے لئے طہارت شرط ہے اور طہارت ایک مستقل عبادت ہے جو نماز کے ساتھ مقرر کر دی گئی ہے کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا فائدہ دوسرے پر موقوف ہے اور اس میں نماز کی جو من جملہ شعائر الہٰی کے ہے تعظیم پائی جاتی ہے، ہماری شریعت میں وضو کو واجب کرنے والے امور تین قسم کے ہیں، ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس پر جمہور صحابہ نے اتفاق کیا ہے اور اس میں روایتیں متفق ہیں اور اس پر برابر عمل جاری ہے اور وہ بول و براز ہے اور ریح اور مذی ہے اور غفلت کی نیند ہے، اور جو ان کے ہم معنی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سرین کا بندھن دونوں آنکھیں ہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس جب آدمی لیٹ جاتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ گہری نیند میں جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور ریح کے خارج ہونے کا گمان غالب ہوتا ہے اور اس کے ساتھ میں ایک سبب اور بھی پاتا ہوں وہ یہ ہے کہ نیند نفس کو سست کرتی ہے اور حدث جیسا کام کرتی ہے، مذی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا" اپنے آلہ تناسل کو دھو لے اور وضو کر لے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں شک نہیں کہ ملاعبت کرنے سے جو مذی باہر آتی ہے اس میں شہوت کا پورا کرنا ہے جس کا درجہ شہوت جماع سے کم ہے اس واسطے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ ایسی طہارت واجب کی جائے جو طہارت کبریٰ سے کم درجہ کی ہو، جس شخص کو ریح کے خروج کا شک ہو اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جب تک آواز نہ سنے یا بو نہ محسوس کرے مسجد سے باہر نہ جائے"۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس کو یقین نہ ہو جائے جبکہ وضو کے حکم کا مدار سبیلین سے کوئی چیز خارج ہونے پر ہے تو اس کا مقتضی یہ ہے کہ اس شئے میں جو حقیقت میں ہے اور اس شئے میں جو مشتبہ ہے اور واقع میں نہیں ہے تمیز کی جائے اور اس سے مقصود تکلف اور شک کا دور کرنا ہے اور موجبات وضو کی دوسری قسم وہ ہے جس میں فقہا صحابہ اور تابعین سلف کا اختلاف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات مختلف مروی ہیں جیسے مس ذکر سے وضو کا واجب ہونا اس واسطے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جس شخص نے آلہ تناسل کو ہاتھ لگایا اس کو وضو کرنا چاہئے"۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور سالم اور عروہ وغیرہم کا یہی قول ہے، اور حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود اور فقہا کوفہ نے اس کو رد کر دیا اور ان کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول دلیل ہے" وہ بھی بدن کا ایک ٹکڑا ہے" اور دونوں حدیثوں میں سے کسی ایک کا منسوخ ہونا یقینی نہیں ہے اور جیسے عورت کو ہاتھ لگانا، حضرت عمر اور ابن مسعود اور ابراہیم عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو کے وجوب کے قائل ہیں اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے" یا عورتوں کو تم نے چھوا ہو" اور کوئی حدیث اس کی شاہد نہیں ہے بلکہ حضرت عائشہ کی حدیث اس کے خلاف شہادت دیتی ہے لیکن اس حدیث میں کلام ہے کیونکہ اس کی سند منقطع ہے اور میرے نزدیک اس قسم کی علت یعنی حدیث کی اسناد کا منقطع ہونا اس وقت معتبر ہے جب ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح دی جائے اور جبکہ دوسری حدیث نہ ہونے سے تعارض نہ ہو تو اس ایک حدیث کو ترک کرنے کے لئے اس علت کا کچھ اعتبار نہ کیا جائے گا، واللہ اعلم۔

حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے نزدیک جنابت میں تیمم کرنا درست نہیں ہے

اس واسطے ان کے نزدیک یہ آیت لمس پر محمول ہے لیکن حضرت عمران اور عمار اور عمرو بن العاص کے نزدیک جنابت میں تیمم کرنا درست ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمر احتیاط پر عمل کرتے تھے اور ابراہیم عبداللہ بن مسعودؓ کی پیروی کرتے تھے حتی کہ امام ابوحنیفہ پر اس دلیل کا حال ظاہر ہو گیا جس سے عبداللہ بن مسعودؓ نے تمسک کیا تھا تب ابوحنیفہ نے ان کے قول کو ترک کر دیا باوجودیکہ وہ ابراہیمؒ کے مذہب کا بہت اتباع کرتے تھے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں یعنی مس ذکر اور مس میں صحابہ اور تابعین کے بعد فقہا کے تین طبقے ہو گئے ایک طبقہ نے ان کے ظاہر کو لیا اور ایک نے بالکل ہی ترک کر دیا اور ایک نے شہوت اور عدم شہوت سے ہاتھ لگانے کا فرق کیا، اور ابراہیم کے نزدیک بہتے ہوئے خون کے نکلنے اور قئے کثیر سے وضو لازم آتا ہے اور حسن کے نزدیک نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو لازم آتا ہے اور دوسرے لوگ اس کے قائل نہیں ہیں اور ان سب کے بارے میں احادیث ہیں جن کی صحت پر علما حدیث نے اتفاق نہیں کیا ہے۔

اور اصح یہ ہے کہ جس نے احتیاط کی اس نے اپنے دین کو اور عزت کو محفوظ رکھا اور جس نے احتیاط نہ کی تو شریعت میں اس پر کوئی جرم نہیں، اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے ہیجان شہوت ہوتا ہے جو اس شہوت کے پورا کرنے کا مظنہ ہے جو شہوت جماع سے کمتر ہے، اور آلہ تناسل کا چھونا بھی ایک بیہودہ فعل ہے اسی وجہ سے استنجا کے وقت دائیں ہاتھ سے اس کا چھونا منع ہے اور جبکہ وہ آلہ تناسل کو پکڑ لے تو وہ ضرور ایک شیطانی کام ہے اور بہتا ہوا خون اور قئے کثیر بدن کو آلودہ کرنے والی اور نفس کو پلید کرنے والی چیزیں ہیں اور نماز میں قہقہہ لگانا ایک گناہ ہے جس کا کفارہ ہونا چاہئے پس کوئی تعجب کی بات نہیں کہ شارع نے ان چیزوں میں وضو کا حکم دیا ہو اور نہ اس میں تعجب ہے کہ اس نے حکم نہ دیا ہو، اور اس میں بھی تعجب نہیں کہ وضو کی ترغیب دی ہو اور اس کو واجب نہ کیا ہو۔

اور موجبات وضو کی تیسری قسم وہ ہے جس میں حدیث کے لفظ سے شبہۃً وجوب پایا جاتا ہے اور فقہا صحابہ اور تابعین نے اس کے ترک پر اتفاق کیا ہے جیسے آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفا اور ابن عباس اور ابوطلحہ وغیرہم کا عمل اس کے خلاف

ثابت ہوگیا ہے اور حضرت جابرؓ نے بیان کیا کہ یہ حدیث منسوخ ہے، اور آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنے کا سبب یہ تھا کہ یہ وہ ارتفاق کامل ہے جو ملائکہ سے عمل میں نہیں آتا پس یہ ملائکہ کے ساتھ مشابہت کے منقطع ہو جانے کا سبب ہوتا ہے، علاوہ بریں آگ سے پکی ہوئی چیز دوزخ کی آگ کو یاد دلاتی ہے اور اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا ضرورت داغ دینے سے منع فرمایا، پس اس واسطے انسان کو اپنا دل اس قسم ثالث کے ساتھ مشغول نہ کرنا چاہئے، لیکن اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کا حکم دینا، پس اس میں دقت ہے، فقہا صحابہ اور تابعین میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہوا اور نہ اس کو منسوخ کہہ سکتے ہیں پس اس لئے جس پر تخریج غالب ہے وہ اس کا قائل نہیں ہوا اور احمد و اسحاق اس کے قائل ہیں اور میرے نزدیک اس میں انسان کو احتیاط کرنا چاہئے، واللہ اعلم۔

اور جو شخص کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کا قائل ہے اس کے مذہب کے بموجب اس میں راز یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت توراۃ میں حرام کیا گیا تھا اور تمام انبیا بنی اسرائیل اس کی حرمت پر متفق رہے پس جب خدا تعالیٰ نے اس کو ہمارے لئے حلال کر دیا تو دو وجہ سے وضو کرنا مشروع کیا یک تو یہ ہے کہ وضو کرنے میں اس نعمت کا شکر ادا کرنا ہے جو اللہ نے اس کو مباح کر کے ہم پر کی ہے بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے پیشتر کے لوگوں پر اس کو حرام کر چکا تھا، دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیا بنی اسرائیل پر حرام ہونے کے بعد اس کی اباحت سے شاید کسی کے دل میں کچھ خطرہ سا پیدا ہو تو وضو اس کا علاج ہو جائے کیونکہ حرمت سے ایسی اباحت کی طرف جس سے وضوء واجب ہو جائے انتقال کرنا لوگوں کے اطمینان نفوس کے لئے کسی قدر سہل ہے اور میرے نزدیک یہ بات ہے کہ یہ حکم ابتدا اسلام میں تھا بعد میں منسوخ ہوگیا۔

موزوں پر مسح کرنے کا بیان

جبکہ وضو کا مبنی ان اعضا ظاہرہ کے دھونے پر تھا جو جلدی غبار آلود ہو جاتے ہیں اور پاؤں موزے پہننے کے وقت اعضا باطنہ میں داخل تھے اور موزوں کا پہننا عرب کے نزدیک ایک عادت متعارف تھی اور ہر نماز کے وقت ان کے اتارنے میں دقت تھی اس واسطے ان کے پہننے کے وقت پاؤں کا دھونا فی الجملہ ساقط ہوگیا اور چونکہ ایسی تدبیر اختیار کرنا جس کے ہوتے ہوئے نفس مطلوب

کو آسانی سے نہ چھوڑ دیا کرے تیسیر ہی کی ایک قسم ہے اسی لئے شارع نے یہاں تدبیر کو تین طرح استعمال کیا ان میں سے ایک مسح کی مدت مقیم کے لئے ایک دن رات مقرر کرنا اور مسافر کے لئے تین دن اور تین رات مقرر کرنا ہے کیونکہ ایک دن رات خبرگیری کے لئے ایسی مناسب مقدار ہے جس کو لوگ بہت سے ایسے امور میں جن کی خبرگیری مقصود ہوتی ہے استعمال میں لاتے ہیں، اور تین دن رات کی مدت بھی ایسی ہی ہے پس یہ دونوں مقداریں مقیم اور مسافر پر وقت کے موافق تقسیم کردی گئیں اور ان میں سے دوسری شرط یہ ہے کہ ان کو طہارت کی حالت میں پہنے تاکہ پہننے والے کے سامنے یہ تصور رہے کہ وہ دونوں پاؤں گویا اپنی پہلی طہارت پر باقی ہیں یہ سمجھ کر کہ پوشیدہ اعضا کی طرف گردوغبار کم پہنچتا ہے اور اس قسم کے خیالات نفس کے تنبیہ کرنے میں موثر ہوتے ہیں۔

اور ان میں سے تیسری چیز یہ ہے کہ پاؤں کے دھونے کے عوض میں موزوں کے اوپر مسح کیا جائے تاکہ یادگار اور نمونہ باقی رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے "اگر دین میں رائے کو دخل ہوتا تو موزوں کے نیچے کی طرف مسح کرنا اوپر کی جانب مسح کرنے سے بہتر تھا، میں کہتا ہوں کہ جبکہ مسح کرنا پاؤں کے دھونے کا نمونہ تھا اور اس کے سوا اس سے کچھ اور مقصود نہیں ہے اور زمین میں چلتے وقت موزوں کے نیچے کا حصہ ان کے ملوث ہونے کا مظنہ تھا تو اوپر کی جانب مسح کرنا اور نیچے کی جانب نہ کرنا معقول اور رائے کے موافق ہوا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اسرار شرعی کو سب لوگوں سے زیادہ جانتے تھے جیسا کہ ان کے کلام اور خطبوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن انھوں نے رائے کے دخل کو روکنا چاہا تاکہ عام لوگ رائے سے اپنا دین نہ خراب کریں۔

کیفیت غسل کا بیان

غسل کرنے کا طریقہ جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت میمونہؓ نے روایت کیا ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو برتن میں ڈالنے سے قبل دھولے پھر اپنے بدن اور شرمگاہ سے نجاست کو دھوڈالے بعد ازاں وضو کرے جس طرح نماز کے لئے وضو کرتے ہیں پھر اپنے سر میں انگلیوں سے خوب پانی پہنچائے پھر اپنے بدن پر پانی بہائے، صرف ایک بات میں اختلاف ہے کہ پاؤں بعد میں دھوئے یا پہلے دھوئے، اور بعض نے یہ فرق کیا ہے کہ جہاں غسل کا پانی جمع ہوتا ہے وہاں اس جگہ سے الگ ہوکر بعد میں دھوئے ورنہ پہلے دھولے۔

ہاتھوں کو پہلے دھونے کی وجہ تو وضو میں پہلے بیان ہو چکی اور شرمگاہ کو دھونا اس واسطے ہے کہ پانی کے بہانے سے نجاست زیادہ نہ پھیل جائے اور اس کے دھونے میں دقت ہو جائے اور زیادہ پانی کی بھی ضرورت پڑے، اور نیز غسل خالص طہارت حدث کے لئے نہ ہوگا، اور وضو کرنا اس لئے ہے کہ طہارت کبریٰ کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ طہارت صغریٰ اور کچھ زیادہ طہارت پر مشتمل ہوتا کہ طہارت کی خصلت کے لئے نفس زیادہ بیدار رہے، اور نیز غسل کے اندر وضو کو وہ نسبت ہے جو وضو کے اندر جوڑوں کی رعایت رکھنے کو ہے کیونکہ جب سر پر پانی ڈالے گا تو تمام اعضا کو تکلف اور مشقت سے پورا پورا پہنچے گا اور دونوں پاؤں کا بعد میں دھونا اس وجہ سے ہے کہ بلا فائدہ ان کو دوبارہ نہ دھونا پڑے، ہاں اوّل دھو لینا بھی اس وجہ سے مناسب ہے کہ اس میں صورت وضو کی محافظت ہوتی ہے، پھر غسل مستحبات سے کامل ہوتا ہے کہ بدن کو تین مرتبہ دھوئے اور بدن کو ملے اور جہاں پانی بہ تکلف پہنچتا ہے ان کا خیال رکھے اور پردہ کا اہتمام کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ بہت حیا اور پردہ والا ہے''۔ اس کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ہوتی ہے ''وہ حیا اور پردہ کو پسند کرتا ہے'' اور لوگوں سے پردہ کرنا تو واجب ہی ہے اور تنہائی میں بھی اس کو اس طرح سے ہونا کہ اگر کوئی شخص عادۃً اس کے پاس سے گزر جائے تو اس کا ستر نہ دیکھے مستحب ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت سے فرمایا ''مشک میں بسا ہوا کپڑا لے اور اس سے پاکی حاصل کر'' یعنی خون کے نشان کو اس کے ذریعہ تلاش کر۔

میں کہتا ہوں: حائضہ کو مشک و خوشبو لگانے کا حکم آپ نے کئی وجوہ سے فرمایا، ان میں سے ایک طہارت کا زیادہ پایا جانا ہے اس لئے کہ خوشبو بھی طہارت کا کام دیتی ہے، اور ہمیشہ خوشبو کا حکم اس واسطے نہیں دیا کہ اس میں لوگوں پر دقت ہے، اور ان میں سے ایک اس بدبو سے بچنا ہے جو حیض کے خون میں ہوتی ہے، اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ حیض کا گزرنا اور طہر کا شروع ہونا اولاد کی خواہش کا وقت ہے اور خوشبو اس قوت کو ابھارتی ہے۔

غسل کے لئے پانی کی مقدار ایک صاع سے پانچ مد تک اور وضو کے لئے ایک مد مناسب ہے اس واسطے کہ متوسط جسموں میں یہ مقدار کافی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر ہر بال کے نیچے جنابت ہے پس بالوں کو دھوؤ اور جلد کو صاف کرو''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس

نے جنابت سے ایک بال کی جگہ کو بھی چھوڑ دیا اور اس کو نہ دھویا تو اس جگہ کے ساتھ ایسا ایسا کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں اس میں راز وہی ہے جو ہم نے استیعاب وضو میں بیان کیا کہ ایک ایک بال کی جگہ کو دھونے میں غسل کے معنی کو ثابت کرنا ہے اور جنابت پر باقی رہنا اور اس پر اصرار کرنا دخول نار کا سبب ہے اور جس عضو سے غسل میں خلل واقع ہوا ہے اسی عضو کی طرف سے نفس کو تکلیف ظاہر ہوگی۔

موجبات غسل کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب عورت کے چاروں ہاتھ پاؤں کے درمیان بیٹھ گیا اور پھر اس سے جماع کیا تو غسل واجب ہو گیا اگر چہ اس کو انزال نہ ہو''۔

میں کہتا ہوں اس بات میں روایتیں مختلف ہیں کہ آیا اکسال یعنی جماع بدون انزال کو اس جماع پر محمول کر سکتے ہیں جو قضا شہوت کے معنی میں کامل ہوتا ہے یعنی اس جماع پر جو انزال کے ساتھ ہوتا ہے، پس جو صحیح روایت سے ثابت ہے اور جس پر جمہور فقہا متفق ہیں یہ ہے کہ جس نے عورت سے جماع کیا تو دونوں پر غسل واجب ہو گیا اگر چہ انزال نہ ہو اور لوگوں نے اس حدیث میں اور اس حدیث میں کہ غسل انزال سے لازم آتا ہے، تطبیق دینے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ حدیث انما الماء من الماء احتلام کے متعلق ہے مگر اس میں کچھ کلام ہے، اور حضرت ابی بن کعب نے فرمایا انزال سے ہی غسل کا لازم آنا یہ رخصت ابتدا اسلام میں تھی پھر یہ رخصت نہیں رہی، اور حضرت عثمان، علی، طلحہ، زبیر، ابی بن کعب اور ابوایوب رضی اللہ عنہم سے اس شخص کے بارے میں جو اپنی عورت سے جماع کرے اور اس کو انزال نہ ہو، مروی ہے کہ ان سب نے کہا ہے کہ وہ اپنے ذکر کو دھو ڈالے اور جس طرح نماز کے لئے وضو کرتے ہیں اسی طرح وضو کر لے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ مرفوع ہے اور میرے نزدیک یہ بعید نہیں ہے کہ اس حدیث سے مباشرت فاحشہ مراد لی جائے کیونکہ اس پر بھی جماع کا اطلاق ہوتا ہے، کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص کو اپنے کپڑے پر تری معلوم ہوا اور اس کو احتلام کا ہونا یاد نہ ہو تو آپ نے جواب میں فرمایا ''وہ غسل کرے'' اور اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا کہ اس کو احتلام کا ہونا یاد ہو مگر تری نہ معلوم ہو تو آپ نے فرمایا ''اس پر غسل نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں حکم کا مدار تری پر رکھا ہے خواب پر نہیں رکھا اس واسطے کہ خواب کبھی خیالی ہوتا ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور کبھی خواب قضا شہوت ہوتی ہے اور وہ بغیر تری کے نہیں ہوتی، پس غسل کے حکم کا مدار تری پر ہی ہوسکتا ہے، نیز تری ایک ظاہر شئے ہے جس میں تعیین وانضباط کی صلاحیت ہے، اور خوابوں کو آدمی اکثر بھول جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ طہر اور حیض کی مدت کی زیادتی اور کمی مزاج اور غذا وغیرہما کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے اور اس کمی، بیشی کا ایسی شئے کے ساتھ انضباط نہیں ہوسکتا کہ کسی میں اس کے خلاف ہی نہ ہو، پس ضرور اصح یہی ہے کہ عورتوں کی عادت کو دیکھی جائے، پس جب وہ یہ سمجھیں کہ وہ حیض ہے تو وہ حیض ہے اور جب وہ یہ سمجھیں کہ وہ استحاضہ ہے تو وہ استحاضہ ہے، اور اس بارے میں صحابہ اور تابعین کا جو اختلاف ہے تو اس کا باعث ہر ایک کا اندازہ اور تخمین ہے حمنہ بن جحش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استحاضہ کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روئی کا ٹکڑا رکھنے اور پٹی باندھنے کا حکم دیا اور دو باتوں میں سے ایک بات کا ان کو اختیار دیا الخ۔

میں کہتا ہوں کہ اصل اس باب میں یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ استحاضہ امور صحت میں سے نہیں ہے اور ان ایام میں نماز ترک کرنا ایک مدت دراز تک اس کو چھوڑ دینے کا باعث ہے تو آپ نے اس کو اسی پر محمول کرنے کا ارادہ فرمایا جو ان کے نزدیک معروف تھا، پس دو وجہیں ظاہر ہوئیں ایک تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ یہ کوئی روگ ہے یعنی کوئی مرض ہے جس کا مقام پوشیدہ ہے اور وہ حیض نہیں ہے وہ نکسیر کے مانند ہے، پس تندرستی کی حالت میں ہر ماہ اس کے حیض وطہر کی جو مقدار ہوتی تھی آپ نے وہی مقرر فرمائی، اور اس وقت حیض کی استحاضہ سے تمیز ضروری ہے، تو ان میں یا تو رنگ سے تمیز ہوسکتی ہے پس گہرا رنگ مثلاً سیاہ، حیض کا ہے یا عورت کے ایام سے جو اس کے نزدیک معروف تھے تمیز ہوسکتی ہے اور دوسری بات یہ ظاہر ہوئی کہ یہ حیض فاسد ہے پس اس کے حیض ہونے کی وجہ سے تو یہ مناسب ہے کہ عورت کو ہر نماز کے وقت غسل کا حکم دیا جائے اور اگر ہر نماز کے لئے غسل کرنے میں دشواری ہو تو دو نمازوں کے لئے ایک غسل تو ضرور کرے اور چونکہ وہ فاسد حیض ہے اس واسطے نماز سے مانع نہیں ہے اور روئی کا ٹکڑا رکھنے اور اس پر پٹی باندھ لینے میں یہ حکمت ہے کہ خون رکھے ہوئے روئی کے ٹکڑے سے لگے اور اس سے تجاوز نہ

کرے، اور تاکہ خون اس کے بدن اور کپڑوں کو آلودہ نہ کرے، جمہور فقہا نے پہلی بات (۱) پر فتویٰ دیا ہے بجز اس حالت کے جبکہ وہ ناممکن ہو۔

ان امور کا بیان جو جنبی اور محدث کے لئے مباح ہیں اور ان امور کا بیان جو ان کیلئے مباح نہیں ہیں

جبکہ شعائر الٰہی کی تعظیم واجب ہے اور من جملہ شعائر کے نماز اور کعبہ اور قرآن ہیں اور بڑی تعظیم یہ ہے کہ بدون طہارت کاملہ کے اور کسی نئے فعل سے نفس کو تنبیہ کئے بغیر آدمی ان چیزوں کے قریب نہ ہو اس لئے یہ امر ضروری ہو گیا کہ سوائے پاک آدمی کوئی ان کے قریب نہ ہو، اور قرآن کی تلاوت کے لئے وضو شرط نہیں کیا گیا کیونکہ ہر وقت قرآن کے پڑھنے کے ساتھ وضو کا لازم کرنا قرآن کے یاد کرنے اور اس کے سیکھنے میں مخل تھا اور اس دروازہ کا کھول دینا اور اس میں رغبت دلانا اور جو شخص قرآن یاد کرنا چاہے اس کے لئے آسانی کا کرنا بہت ضروری تھا اور جنابت کے بارے میں زیادہ تاکید واجب ہوئی پس جنابت کی حالت میں قرآن کا پڑھنا بھی جائز نہیں قرار دیا اور نہ جنبی اور حائض کو مسجد کے اندر جانا جائز ہوا کیونکہ مسجد نماز اور یاد الٰہی کے لئے مقرر کی گئی ہے اور وہ شعائر اسلام سے ہے اور وہ کعبہ کا ایک نمونہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھنے میں طہارت شرط نہیں کی گئی کیونکہ ہر شئے کی تعظیم اس کے مناسب ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر تھے اور لوگوں کی طرح حدث اور جنابت آپ کو بھی عارض ہوتے تھے پس آپ کے پاس بیٹھنے میں طہارت کا شرط کرنا قلب موضوع ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس گھر میں تصویر یا کتا یا جنبی ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے'' میں کہتا ہوں مراد اس سے یہ ہے کہ فرشتے ان چیزوں سے نفرت کرتے ہیں اور صفات تقدس اور بت پرستوں سے نفرت جن سے فرشتے متصف ہیں یہ چیزیں ان کی ضد ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جس کو رات میں جنابت پیش آئے فرمایا ''وضو کر اور اپنے آلہ تناسل کو دھو پھر سو جا''۔

(۱) ایک یہ کہ وہ ہر ماہ میں چھ یا سات دن حیض کے شمار کرے اور باقی ایام میں نماز پڑھے اور دوسرے یہ کہ ظہر میں تاخیر اور عصر میں تعجیل کر کے غسل کرے ....

میں کہتا ہوں کہ چونکہ جنابت فرشتوں کے حالات کے منافی ہے تو مومن کے حق میں پسندیدہ یہ ہے کہ جنابت کے ساتھ اپنی ضروریات مثلاً سونے اور کھانے میں مشغول نہ رہے، اور جبکہ غسل کرنا مشکل تھا تو مناسب نہیں ہے کہ وضو کو بھی ترک کردے کیونکہ دونوں کی حالت طہارت میں ایک برابر ہے صرف فرق یہ ہے کہ شارع نے ان دونوں طہارتوں کو دونوں حدثوں پر تقسیم کر دیا ہے۔

تیمّم کا بیان

جبکہ احکام الٰہی میں خدا تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ بندوں پر جو کام مشکل ہوتا ہے وہ اس کو ان کے لئے آسان کر دیتا ہے اور آسانی کی سب سے مناسب صورت یہ ہے کہ جس چیز کے کرنے میں دقت ہو اس کو ساقط کر کے اس کا بدل قائم کر دیا جائے تاکہ لوگوں کے دل مطمئن ہو جائیں اور جس چیز کا وہ غایت درجہ التزام کر رہے تھے اس کو یک بارگی ترک کرنے سے ان کے دل پریشان نہ ہوں اور نہ ترک طہارت کے عادی ہوں تو اس واسطے خدا تعالیٰ نے مرض اور سفر میں وضوء اور غسل کو ساقط کر کے تیمّم مقرر فرمایا اور جبکہ یہ بات اس طرح تھی تو ملا اعلیٰ میں وضو اور غسل کی جگہ تیمّم کو مقرر کرنے کا حکم نازل ہوا، اور تیمّم کے لئے ایک وجود تشبیہی حاصل ہوا کہ وہ بھی جملہ طہارات میں سے ایک طہارت ہے اور یہ حکم بھی ان امور عظام میں سے ہے جن کی وجہ سے ملت مصطفوی تمام ملل سابقہ سے ممتاز ہے اور وہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''جب ہم کو پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لئے پاک کرنے والی بنادی گئی''۔

میں کہتا ہوں کہ تیمّم کے لئے زمین کو اس لئے خاص کیا کہ وہ کہیں ناپید نہیں ہے پس وہ وقت کے رفع کرنے میں زیادہ مناسب ہے اور زمین کو خاص کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض اشیا میں زمین پاک کرنے والی ہے جیسے موزہ اور تلوار کو پانی کے ساتھ دھونے کی بجائے مٹی میں ملنا بھی کافی ہوتا ہے اور ایک یہ بھی وجہ ہے کہ اس میں عاجزی پائی جاتی ہے جیسے چہرہ کو مٹی میں آلودہ کر لیا اور یہ ذلت کی حالت طلب عفو کے مناسب ہے اور غسل اور وضو کے تیمّم میں کوئی فرق نہیں کیا گیا اور نہ ہی تمام بدن پر خاک کا ملنا مقرر کیا گیا کیونکہ جس شئے کا مقصد بظاہر سمجھ میں نہ آئے اس کو موثر بالخاصیت بنانا ہی مناسب ہے نہ کہ موثر بالمقدار، اس واسطے کہ اسی سے ایسے محل میں اطمینان

قلب حاصل ہوتا ہے، اور کیونکہ تمام بدن کو مٹی میں لوٹ پوٹ کرنے میں بھی کچھ دقت تھی اس واسطے اس کے مقرر کرنے سے پوری دقت رفع نہیں ہوسکتی تھی، اور سخت سردی جس میں وضو کرنے سے مضرت ہو مرض کے حکم میں ہے۔ عمرو بن العاص کی روایت کی ہوئی حدیث اس پر دلیل ہے اور سفر آیت میں قید نہیں ہے بلکہ سفر کو اس لئے ذکر کیا کہ وہ پانی کے نہ ملنے کی ایسی صورت ہے جو جلد ذہن میں آتی ہے، اور تیمّم کے اندر مٹی کے ساتھ پاؤں پر مسح کرنے کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ پاؤں تو گرد و غبار سے آلودہ ہی رہتے ہیں، اور حکم ایسی چیز کا دیا جاتا ہے جو پہلے سے حاصل نہ ہوتا کہ اس کے کرنے سے نفس کو تنبیہ حاصل ہو، اور تیمّم کرنے کی ترکیب بھی منجملہ ان چیزوں کے ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرنے کے طریق میں اختلاف ہوا، پس پیشتر اس سے کہ محدثین کا طریقہ مقرر ہوا اکثر فقہا تابعین وغیرہم اس پر متفق تھے کہ تیمّم میں دو ضرب ہیں ایک ضرب منہ کے لئے اور دوسری کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے۔

بہرحال احادیث جو اس باب میں آئی ہیں ان سب میں اصح حدیث وہ ہے جو عمار نے روایت کی ہے کہ ''تجھ کو اس قدر کافی تھا کہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارتا پھر ان میں پھونک مارتا پھر دونوں ہاتھ منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیتا''۔

اور عبداللہ بن عمر سے حدیث مروی ہے ''تیمّم میں دو ضربیں ہیں ایک ضرب منہ کے لئے اور ایک ضرب کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا عمل دونوں طرح منقول ہے اور دونوں حدیثوں میں تطبیق کی وجہ ظاہر ہے جس کی طرف لفظ ''انما یکفیک'' اشارہ کرتا ہے، پس اول یعنی ایک ضرب پر اکتفا کرنا تیمّم کا ادنیٰ درجہ ہے، اور ثانی یعنی تیمّم میں دو ضربیں ہیں ہونا سنت کا درجہ ہے، اور تیمّم کے بارے میں ان کے اختلاف کو اسی معنی پر حمل کرنا ممکن ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی یہ بھی تاویل ہوسکتی ہے کہ آپ نے حضرت عمار کو یہ بات تعلیم فرمائی ہو کہ تیمّم کے اندر ضرب کی وجہ سے ہاتھوں کو لگی ہوئی چیز کا بدن پر ملنا مشروع ہے نہ کہ خاک میں بدن کو آلودہ کرنا اور اعضا تیمّم میں سے ممسوح کی مقدار بیان کرنا مقصود نہ ہو اور عدد ضربی کا بیان کرنا بھی مقصود نہ ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ قول جو آپ نے حضرت عمار سے فرمایا تھا اس معنی پر محمول ہو، اور اس کے معنی خاک میں لوٹنے کی بہ نسبت حصر کرنا ہے اور ایسے مسئلہ میں انسان

کو اس قول پر عمل کرنا مناسب ہے جس کی وجہ سے وہ یقیناً بری الذمہ ہو جائے اور حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما جنابت سے تیمّم کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے اور آیت، او لا مستم النساء کو لمس پر محمول کرتے تھے اور لمس کو ناقص وضو جانتے تھے لیکن عمران اور عمار کی حدیث اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے اور میں نے کسی حدیث صحیح میں اس بات کی تصریح نہیں پائی کہ ہر فرض نماز کے لئے جدا تیمّم کرنا فرض ہے اور نہ یہ کہ غلام آبق وغیرہ کے لئے تیمّم جائز نہیں ہے یہ سب محض تخریجات کے قبیل سے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمی آدمی کے بارے میں فرمایا ''اس کو کافی تھا کہ تیمّم کرتا اور اپنے زخم پر پٹی باندھتا اور اس پر مسح کر لیتا اور باقی جسم کو دھوتا''۔

میں کہتا ہوں، اس میں اشارہ ہے کہ تیمّم جس طرح تمام بدن کا بدل ہے اسی طرح ایک عضو کا بھی بدل ہے کیونکہ وہ ایک موثر بالخصوصیت شئے کی طرح ہے۔ اور اس میں مسح کرنے کا حکم ہے جس کی وجہ ہم مسح علی الخفین میں بیان کر چکے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پاک مٹی مسلمان کے لئے وضو ہے اگرچہ اس کو دس برس تک پانی نہ ملے''۔

میں کہتا ہوں کہ اس فرمانے سے وہم و تردد کا دروازہ بند کرنا ہے کیونکہ ایسی باتوں میں وہمی لوگ تردد کرتے ہیں اور رخصت کے بارے میں حکم الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں۔

آداب خلا کا بیان

یہ آداب چند امور پر مشتمل ہیں، منجملہ ان کے ایک تعظیم قبلہ ہے اس کی نسبت آنحضرت کا فرمان ہے ''جب تم بیت الخلا میں جاؤ تو قبلہ کی طرف نہ منہ کرو اور نہ پشت'' اور اس میں ایک حکمت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ دل کا تعظیم الٰہی کی طرف متوجہ ہونا چونکہ ایک باطنی امر تھا اس واسطے تعظیم قلبی کے قائم مقام ایک مظنہ ظاہرہ کا پایا جانا ضروری تھا پہلی شریعتوں میں یہ مظنہ ان عبادت خانوں میں داخل ہونا قرار دیا گیا تھا جو خدا تعالٰی کی عبادت کے لئے بنائے گئے تھے اور جو شعائر الٰہی اور دین الٰہی میں سے ہوتے تھے، ہماری شریعت نے قبلہ کی طرف منہ کرنا اور تکبیر کہنا اس کا مظنہ قرار دیا پس جبکہ خدا تعالٰی نے کعبہ کی طرف منہ کرنا تعظیم الٰہی کی طرف دل کی توجہ کا اور یاد الٰہی میں دل لگانے کا قائم مقام قرار دیا، اور قائم مقام ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ ہیئت اللہ تعالٰی کی یاد دلاتی ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم سے یہ استنباط کر لیا کہ استقبال قبلہ کی ہیئت کو تعظیم

الٰہی کے ساتھ مخصوص رہنا ضروری ہے اور وہ اس طرح کہ جو ہیئت نماز کی ہیئت کے بالکل مباین اور منافی ہے اس میں استقبال قبلہ نہ کیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض دفعہ قبلہ کی طرف چہرہ مبارک کئے اور بعض دفعہ پشت مبارک کئے دیکھا گیا پس اس کی تطبیق اس طرح کی گئی کہ پیشاب پاخانہ کی حالت میں قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنا جنگل ومیدان میں منع ہے اور آبادی میں منع نہیں ہے اور اس طرح بھی تطبیق کی گئی کہ ممانعت سے مراد کراہت ہے اور یہی تطبیق زیادہ ظاہر ہے، منجملہ آداب کے پوری پاکیزگی کا کرنا ہے اس واسطے تین پتھروں سے کم یعنی تین دفعہ سے کم استنجا کرنے سے آپ نے منع فرمایا کیونکہ غالباً تین دفعہ سے کم میں نجاست دور نہیں ہوتی، اور پتھر کے ساتھ پانی سے استنجا کرنا مستحب ہے۔

اور منجملہ آداب کے ان امور سے احتراز کرنا ہے جن سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے جیسے لوگوں کے سایہ کی جگہ میں یا ان کے راستہ میں یا ان کے بیٹھنے کی جگہ میں یا رُکے ہوئے پانی میں پاخانہ کرنا، اور جیسے ہڈی سے استنجا کرنا کیونکہ وہ جنات کی غذا ہے اور اسی طرح ان تمام چیزوں سے استنجا کرنا ممنوع ہے، جو کارآمد ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول نے کہ ''لاعنین سے بچو'' یہ بات سمجھا دی کہ اس میں حکمت لوگوں کی لعنت اور ان کی ایذا سے پرہیز کرنا ہے یا ان امور سے احتراز کرنا ہے جن سے اپنی ذات کو تکلیف ہوتی ہے جیسے سوراخ میں پیشاب کرنا کیونکہ اکثر وہ سوراخ سانپ یا اس جیسے زہریلے جانوروں کی جگہ ہوتی ہے پس وہ اس میں سے نکل کر کاٹ لیتا ہے اور منجملہ آداب کے اچھی عادات کا اختیار کرنا ہے پس دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کرے اور پیشاب کے مقام کو دائیں مقام سے نہ پکڑے اور گوبر سے استنجا نہ کرے اور پتھر لینے میں طاق عدد ملحوظ رکھے، اور منجملہ آداب کے پردہ کا اہتمام کرنا ہے پس مناسب ہے کہ لوگوں سے دور جا کر استنجا کرے تاکہ آواز نہ سنائی دے اور نہ بدبو محسوس ہو اور نہ اس کا ستر دکھائی دے اور جب تک زمین کے قریب نہ ہو جائے اپنا کپڑا نہ ہٹائے اور مجتمع درختوں سے پردہ کر دے جو اس کے بدن کے نیچے کے حصہ کو چھپا لیں پس جس کو ایسی آڑ نہ ملے تو ریت کی ایک ڈھیری لگا لے اور اس کی طرف پشت کر کے بیٹھ جائے کیونکہ شیطان انسانوں کے پاخانہ کی جگہ سے مذاق کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کی جبلت میں افکار فاسدہ اور اعمال شنیعہ داخل ہیں، اور منجملہ آداب کے بدن اور

کپڑے کونجاست سے بچانا ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی شخص پیشاب کرنا چاہے تو پیشاب کے لئے نرم جگہ تلاش کرے''۔

اور منجملہ آداب کے وسواس کا دور کرنا ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس تم میں سے کوئی شخص اپنے نہانے کی جگہ پیشاب نہ کرے کیونکہ اکثر وسوسے اس سے پیدا ہوتے ہیں''۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے) فرمایا ''کھڑے ہوکر پیشاب نہ کر''۔

میں کہتا ہوں کہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنا اس لئے مکروہ ہے کہ اس سے بدن اور کپڑے پر چھینٹ پڑتی ہے اور یہ سنجیدگی اور عادات حسنہ کے منافی ہے اور اس میں ستر کھل جانے کا احتمال ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پاخانے شیاطین کے موجود رہنے کی جگہ ہیں پس جب کوئی پاخانہ میں آیا کرے تو یہ کہہ لیا کرے 'اعوذ باللہ من الخبث و الخبائث، اور جب پاخانہ سے باہر آئے تو کہے غفرانک۔

میں کہتا ہوں پاخانہ میں جاتے وقت اللھم انی اعوذبک من الخبث و الخبائث پڑھنا مستحب ہے اس لئے کہ پاخانے شیاطین کے حاضر ہونے کی جگہ ہیں جہاں وہ آتے ہیں کیونکہ ان کونجاست پسند ہے اور پاخانہ سے نکلتے وقت غفرانک کہنا مستحب ہے کیونکہ وہ ذکر الٰہی کے ترک کا اور شیاطین سے مخالطت کا وقت تھا، نبی نے فرمایا ''ان میں سے ایک پیشاب سے نہیں بچتا تھا'' الحدیث

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب سے پاکی حاصل کرنا واجب ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ پیشاب کر کے کچھ دیر رکا رہے اور پیشاب کے قطرے خارج کردے یہاں تک کہ اس کو یقین ہو جائے کہ پیشاب کا کوئی قطرہ آلہ تناسل کی نالی میں باقی نہیں رہا اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نجاست سے آلودہ رہنا اور ایسا کام کرنا جس سے آپس میں بگاڑ پیدا ہو، عذاب قبر کا باعث ہوتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تر شاخ کو چیر کر دونوں قبروں میں سے ہر ایک قبر پر گاڑ دینا، سو اس میں سے راز یہ ہے کہ ایسا کرنا ان کے حق میں شفاعت مقیدہ تھا کیونکہ ان کے کفر کی وجہ سے شفاعت مطلقہ ان کے لئے ناممکن تھی۔

خصال فطرت اور ان سے متعلق امور کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دس باتیں فطرت میں سے ہیں، مونچھوں کا ترشوانا اور داڑھی کا بڑھانا اور مسواک کرنا اور ناک میں پانی دینا اور ناخن کتروانا اور انگلیوں کے جوڑوں کا دھونا اور بغل کے بال اکھاڑنا اور موئے زیر ناف کا مونڈنا اور پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ اور دسویں بات مجھ کو یاد نہیں رہی غالباً وہ کلی کرنا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ طہارتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں اور تمام امم حنفیہ میں برابر جاری ہیں اور ان کے دلوں میں پیوست ہیں اور ان کے خالص عقائد میں داخل ہیں اور ہر زمانہ میں انہیں پر ان کی زندگی اور انہیں پر ان کی موت ہے اور اسی وجہ سے ان کا نام فطرت رکھا گیا ہے اور ملت حنیفیہ کے یہ شعائر ہیں اور ہر ملت کے لئے شعائر کا ہونا ضروری ہے جن سے ان کی پہچان ہوتی ہے اور جن پر ان سے مواخذہ ہوتا ہے تاکہ ان کی فرمانبرداری اور نافرمانی بظاہر معلوم ہو جائے، اور شعائر میں اس شئے کا داخل کرنا مناسب ہے جو کثرت سے پائی جائے اور بار بار واقع ہوتی رہے اور ظاہر ہو اور اس میں بہت سے فوائد ہیں جن کو لوگوں کے اذہان خوب طرح سے قبول کرتے ہوں اور ان فوائد کے بارے میں مختصراً یہ ہے کہ انسان کے جسم سے بعض جگہ میں جو بال نکلتے ہیں وہ انقباض قلب میں وہی کام کرتے ہیں جو احداث سے پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح سر اور داڑھی کے بالوں کے پراگندہ ہونے سے بھی دل منقبض ہوتا ہے اس باب میں انسان کو اطبا کے اس کلام کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے مرض شری (۱) اور خارش اور ان کے علاوہ امراض جلدیہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ ایسے امراض سے دل مغموم رہتا ہے اور خوشی جاتی رہتی ہے اور داڑھی ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑے چھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اور وہ مردوں کے لئے خوبصورتی اور اس کی ہیئت کو مکمل کرنے والی ہے اس واسطے اس کا بڑھانا ضروری ہے اور اس کا کتروانا مجوسی کا طریقہ ہے اور اس میں خلق الٰہی کا بدل دینا اور سردار و اہل عزت لوگوں کو کمتر لوگوں میں شامل کر دینا ہے اور جس کی مونچھیں بڑی ہو جاتی ہیں تو ان میں کھانا پینا، اٹکتا ہے اور ان میں میل جمع ہو جاتا ہے اور یہ مجوس کا طریقہ ہے اور اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

(۱) ایک مرض ہے جس میں بدن پر سرخ دانے نکل آتے ہیں یعنی پِتی۔

''مشرکین کی مخالفت کرو، مونچھیں کترواؤ اور داڑھی بڑھاؤ اور کلی کرنے اور ناک میں پانی پہنچانے اور مسواک کرنے سے ناک کی کثافت اور منہ کی بدبو دور ہوتی ہے اور ختنہ کی کھال ایک زاید عضو ہوتا ہے جس میں میل اکٹھا ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے پیشاب کے قطروں سے پوری طہارت نہیں ہو سکتی اور لذت جماع کو بھی کم کرتا ہے توریت میں مذکور ہے کہ ختنہ کرنا حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر خدا تعالیٰ کی نشانی ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ بادشاہوں کی عادت اس طرح جاری ہے کہ اپنے خاص خاص جانوروں پر کچھ علامت کر دیتے ہیں تاکہ تمیز رہے اور ان غلاموں پر جن کو آزاد کرنا منظور نہیں ہوتا کوئی نشانی کر دیتے ہیں پس اسی طرح سے ختنہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر علامت ہے اور دیگر شعائر ایسے ہیں جن میں تبدیلی اور حیلہ کی گنجائش ہے اور ختنہ ایسا شعار ہے جس میں تبدیلی بہت مشکل ہے اور انتقاص الماجو حدیث میں مذکور ہے اس سے مراد استنجا کرنا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''چار چیزیں رسولوں کی سنت میں سے ہیں: حیا کرنا اور ایک روایت میں ختنہ کرنا آیا ہے اور خوشبو لگانا اور مسواک کرنا اور نکاح کرنا''۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک یہ سب باتیں طہارت کے قبیل سے ہیں پس حیا کے معنی بے شرمی، بیہودگی اور برے افعال کا ترک کرنا ہے اور یہ امور نفس کو ملوث اور مکدر کرتے ہیں، اور خوشبو لگانا نفس میں سرور اور فرحت پیدا کرتا ہے اور اس سے طہارت پر بہت بڑی تنبیہ ہوتی ہے اور نکاح کرنا عورتوں سے ملنے کی خواہش سے اور ان خیالات سے جو اس خواہش کے پورا کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں باطن کو پاک رکھتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر میں اپنی امت پر دشوار نہ جانتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا''۔

میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہے کہ اگر حرج کا ڈر نہ ہوتا تو مسواک کرنے کو وضو کی طرح نماز کے لئے شرط کر دیتا، اور اسی طرح کی بہت سی احادیث وارد ہیں جو اس امر پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کو حدود شرعیہ میں دخل ہے اور حدود شرعیہ مقاصد پر مبنی ہیں اور امت سے حرج کا رفع کرنا منجملہ ان اصول کے ہے جن پر احکام مبنی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مسواک کرنے کی کیفیت بیان کرنے میں راوی کہتا ہے کہ آپ

مسواک کرتے وقت اُع اُع کی آواز کرتے تھے جیسے کوئی قئے کرتے وقت کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں انسان کو مناسب ہے کہ اچھی طرح منہ کے اندر مسواک کرے اور حلق اور سینہ کا بلغم نکالے اور منہ میں خوب اندر تک مسواک کرنے سے مرض قلاع دور ہو جاتا ہے اور آواز صاف ہو جاتی ہے اور منہ خوشبودار ہو جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن نہالیا کرے اور اس میں اپنا جسم اور سر دھولیا کرے''۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن غسل کرنا سنت مستقلہ ہے جو جسم سے میل کچیل دور کرنے کے لئے اور صفت طہارت پر نفس کی تنبیہ کے لئے مقرر کی گئی ہے اور جمعہ کی نماز کے لئے اس کی پابندی اس وجہ سے کی گئی کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مکمل ہو جاتا ہے اور اس میں نماز جمعہ کی تعظیم بھی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم چار چیزوں سے غسل فرمایا کرتے تھے ایک تو جنابت سے اور ایک جمعہ کے روز اور ایک پچھنے لگوانے کے بعد اور مردے کو نہلانے کے بعد۔

میں کہتا ہوں پچھنے لگوانے کے بعد تو اس لئے کہ خون اکثر جسم پر لگ جاتا ہے اور ہر ہر چھینٹ کا دھونا مشکل ہے اور اس لئے بھی کہ سینگی کے چوسنے سے ہر طرف سے خون کھنچ کر آتا ہے پس اس خاص عضو سے خون کے کم ہونے کا نفع نہیں ہوتا اور غسل خون کے بہنے کو بند کرتا ہے اور اطراف سے اس کے انجذاب کو موقوف کرتا ہے اور غسل میت کے بعد نہانے کی وجہ یہ ہے کہ نہلانے میں جسم پر چھینٹیں پڑ جاتی ہیں اور میں ایک شخص کے پاس جان کنی کے وقت بیٹھا تو میں نے ان ملائکہ کی طرف سے جو ارواح کے قبض کرنے پر متعین ہیں حاضرین کی روحوں میں ایک عجیب قسم کی تکلیف کو دیکھا پس میں سمجھ گیا کہ حالت کا بدلنا ضروری ہے تاکہ نفس کو اس حالت کے مخالف حالت کے لئے تنبیہ حاصل ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جو اسلام لایا تھا پانی اور بیری کے پتوں سے نہانے کا حکم فرمایا اور دوسرے شخص سے فرمایا ''تو اپنے کفر کے بال دور کر''۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں راز یہ ہے کہ اک شئے سے یعنی کفر سے باہر ہونا اس کے لئے خوب اچھی طرح متمثل ہو جائے، واللہ اعلم۔

پانی کے احکام کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص اس رکے ہوئے پانی میں جو بہتا نہیں ہے۔ ہرگز پیشاب نہ کرے پھر اس میں غسل بھی کرلے۔

میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ممانعت ہر ایک سے ہے یعنی پانی میں پیشاب کرنے سے بھی اور اس میں غسل کرنے سے بھی جیسے اس حدیث میں ہے ''دو شخص پاخانہ کرنے کے لئے نہ جائیں کہ برہنہ ہو کر آپس میں باتیں کریں کیونکہ خدا تعالیٰ اس سے ناخوش ہوتا ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو فقط پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت مروی ہے اور دوسری حدیث جو اس پانی میں فقط غسل کی ممانعت میں مروی ہے اسی معنی کو ظاہر کرتی ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دو باتوں میں سے ایک بات سے خالی نہیں یا تو اسی وقت پانی میں تغیر آجاتا ہے یا وہ پانی کے تغیر کی طرف مفضی ہوتا ہے کہ لوگ اس کو پیشاب کرتا ہوا یا نہاتا ہوا دیکھیں گے اور وہ بھی ایسا ہی کریں گے اور ان دونوں باتوں میں سے ہر ایک منجملہ انہی صورتوں کے ہے جن کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لعنت کرنے والے سے بچو، لیکن جبکہ پانی بہت زیادہ ہو یا بہتا ہوا ہو، اور ہر حال میں ان باتوں سے پرہیز کرنا افضل ہے لیکن مستعمل پانی سو اس کو کوئی جماعت طہارت میں استعمال نہیں کرتی تھی اور وہ مہجور اور متروک سا سمجھا جاتا تھا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسی حال پر رکھا جیسا ان کے نزدیک تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پاک ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب پانی قلتین کو پہنچ جائے تو اپنے اوپر ناپاکی کو نہیں آنے دیتا۔

میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ معنوی ناپاکی کو قبول نہیں کرتا یہ حکم شرع کے اعتبار سے ہے عرف وعادت کے اعتبار سے نہیں ہے اور جب نجاست کی وجہ سے پانی کا کوئی وصف بدل جائے اور کمیت یا کیفیت کے اعتبار سے نجاست کا اس پر غلبہ ہو جائے تو وہ اس حکم سے خارج ہے، اور قلتین کو کثیر اور قلیل پانی میں حد فاصل ایک ضروری امر کی وجہ سے قرار دیا ہے کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے اور وہ حد تحکما یا انکل سے مقرر نہیں کی گئی ہے اور ایسا ہی حال تمام مقادیر شرعیہ کا ہے کہ کسی میں انکل کو دخل نہیں ہے اور وہ ضروری امر یہ ہے کہ پانی کے رہنے کی دو جگہ ہیں ایک معدن دوسرے برتن، معدن تو کنوئیں اور چشمے ہیں اور جھیل بھی انہیں میں شامل ہے اور برتن مشک اور

مٹکے اور لگن اور ناند اور مشکیزے ہیں۔

اور معدن ایسی چیز ہے کہ اس کے ناپاک ہونے سے لوگوں کو ضرر ہوتا ہے اور اس کے پانی کو نکالنے میں لوگوں کو بڑی دقت ہوتی ہے اور برتن تو ہر روز پانی سے بھرے جاتے ہیں اور ان کا پانی بہانے میں کچھ دقت نہیں ہوتی اور معادن کے لئے نہ کوئی سرپوش ہے اور نہ ہی ان کو جانوروں کے گوبر اور درندوں کے منہ ڈالنے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں البتہ برتنوں کے ڈھانکنے اور ان کی حفاظت رکھنے میں زیادہ دقت نہیں ہے ہاں ان جانوروں سے جو گھروں میں پھرتے رہتے ہیں حفاظت مشکل ہے اور معدن میں پانی کثرت سے ہوتا ہے بہت سی نجاستیں اس میں اثر نہیں کرسکتیں بخلاف برتنوں کے، اس واسطے ضروری ہوا کہ معدن کا حکم اور ہو اور برتنوں کا حکم اور ہو۔ اور معدن میں ان چیزوں کی معافی دی جائے جن کی معافی برتنوں میں نہیں دی جاتی اور سوائے قلتین کے اور کوئی چیز حد فاصل نہیں ہوسکتی اس واسطے کہ کنوئیں اور چشمہ کا پانی کسی طرح بھی قلتین سے کم نہیں ہوتا اور جس جگہ پانی قلتین سے کم ہو اس کو نہ حوض کہتے ہیں اور نہ تالاب کہتے ہیں بلکہ اس کو گڑھا کہتے ہیں اور جب قلتین کی مقدار پانی ہموار زمین میں ہو تو غالباً سات بالشت طویل اور پانچ بالشت عریض جگہ میں آتا ہے اور یہ حوض کا ادنی درجہ ہے اور عرب میں سب برتنوں میں بڑا برتن قلہ تھا اس سے بڑا برتن ان کے ہاں اور کوئی معلوم نہیں ہوتا اور سب قلے بھی ان کے ہاں برابر نہ تھے بعض قلہ ڈیڑھ قلہ کے برابر اور بعض سوا قلہ کے برابر اور بعض پونے دو قلہ کے برابر ہوتا تھا اور ایسا کوئی قلہ نہ تھا جو دو قلہ کے برابر ہو پس دو قلہ کی مقدار کو کوئی برتن نہیں پہنچتا اور کوئی معدن اس سے کم نہیں ہے اس واسطے قلتین کی مقدار پانی کثیر اور پانی قلیل کے درمیان حد فاصل قرار پائی اور جو قلتین کا قائل نہیں ہے جیسے مالکیہ تو وہ بھی پانی کثیر کی حد مقرر کرنے میں قلتین کے قریب قریب مقدار کی طرف مجبور ہوئے ہیں، اور جنگل کے کنوئیں میں اونٹ کی مینگنی وغیرہ گر جانے کو معافی کے حکم میں رکھا ہے پس یہاں سے انسان کو حدود شرعیہ کے امر کو معلوم کرنا چاہئے کہ وہ ایسی ضروری صورتوں میں قائم کی گئی ہیں جن کے بغیر لوگوں کو چارہ نہیں اور جن کے ماسوا کو عقل درست نہیں سمجھتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' اور فرمایا ''پانی ناپاک نہیں ہوتا'' اور فرمایا ''مومن ناپاک نہیں ہوتا'' اور اسی طرح کی دیگر احادیث ہیں جن

میں ہے کہ بدن ناپاک نہیں ہوتا اور زمین ناپاک نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں کہ ان سب سے مراد نجاست خاصہ کی نفی کرنا ہے جس پر قرائن حالیہ اور مقالیہ دلالت کرتے ہیں پس آپ کا فرمان کہ ''پانی ناپاک نہیں ہوتا'' اس کے معنی یہ ہیں کہ معاون نجاست کے پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتے جب نجاست نکال کر پھینک دی جائے اور پانی کا کوئی وصف بھی نہ بدلے اور پانی خراب نہ ہوا ہو اور بدن غسل کرنے سے پاک ہو جاتا ہے اور زمین بارش سے اور دھوپ سے اور لوگوں کے چلنے پھرنے سے پاک ہو جاتی ہے اور بیر بضاعہ کے متعلق کیا کوئی یہ گمان کرسکتا ہے کہ اس میں نجاستیں پڑی رہا کرتی تھیں؟ کیونکہ یہ گمان ہوسکتا ہے حالانکہ بنی آدم کو ایسی چیز سے عادۃً اجتناب ہوتا ہے پس کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا پانی پی سکتے تھے بلکہ نجاستیں بغیر اس کے کہ کوئی ان کو ڈالنے کا ارادہ کرے اس میں گر جایا کرتی تھیں جس طرح ہم اپنے زمانہ کے کنوؤں کو دیکھتے ہیں، اور پھر یہ نجاستیں نکال دی جاتی تھیں، پس جب اسلام کا زمانہ آیا تو انھوں نے طہارت شرعیہ کا جو ان کے ہاں کی طہارت سے زاید ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا ''پانی پاک ہوتا ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی''، یعنی اس نجاست کے علاوہ جس کو تم سمجھتے ہو کوئی اور نجاست نہیں ہے اور حضورؐ کے کلام میں نہ یہ کوئی تاویل ہے اور نہ کلام کو ظاہر سے پھیرنا ہے بلکہ وہ محاورہ عرب ہے پس خدا تعالیٰ کا قول ''کہ میرے پاس جو وحی کیا گیا ہے اس میں کھانے والے کے لئے کوئی کھانے کی چیز میں حرام نہیں پاتا'' الا یہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں میں تم کو اختلاف ہے ان میں کوئی حرام چیز نہیں پاتا، اور جب طبیب سے کسی شئے کے متعلق دریافت کیا جائے اور وہ کہے کہ اس کا استعمال جائز نہیں ہے تو اس سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اس کی مراد صحت بدن کے اعتبار سے ناجائز ہونا ہے اور جب فقیہ سے کسی شئے کے متعلق دریافت کیا جائے اور وہ اس کا ناجائز ہونا بیان کرے تو عدم جواز سے اس کی مراد عدم جواز شرعی کا ہونا سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تم پر مردار حرام کیا گیا'' پس اول سے مراد حرمت نکاح ہے اور ثانی سے مراد حرمت اکل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بدون ولی کے نکاح نہیں ہوتا'' اس سے مراد ہے کہ شرع میں وہ نکاح جائز نہیں ہوتا، یہ مراد نہیں ہے کہ خارج میں وہ پایا ہی نہیں جاتا اور اس

قسم کی بہت سی احادیث ہیں اوران میں تاویل نہیں ہے لیکن اس پانی مقید سے وضو کرنا جس پر بغیر قید کے پانی کا اطلاق نہیں ہوتا ایک ایسی بات ہے جس کو بادی الرائے میں شرع رد کر دیتی ہے، ہاں ایسی چیز سے ناپاکی کے دور کرنے کا احتمال ہے بلکہ راجح یہی ہے کہ نجاست اس سے دور ہوسکتی ہے اور لوگوں نے کنوئیں میں جانور کے مرجانے کے مسئلہ میں اور دہ دردہ میں اور آب جاری میں بہت سی فروعات نکالی ہیں اوران سب مسائل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مروی نہیں ہیں لیکن وہ آثار جو صحابہ اور تابعین سے منقول ہیں جیسے ابن زبیر کا اثر زنگی کے بارے میں اور حضرت علیؓ کا چوہے کے بارے میں اور نخعی اور شعبی کا بلی کے قریب قریب جانوروں میں سوان میں سے کوئی بھی ایسا اثر نہیں ہے جس کی صحت پر محدثین نے گواہی دی ہو اور نہ ہی قرون اولی کے جمہور کا ان پر اتفاق ہے، اور اگر ان آثار کو صحیح بھی مان لیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ دلوں کو مطمئن کرنے کے لئے اور پانی کی پاکیزگی کے لئے ہوں اور وجوب شرعی کے اعتبار سے نہ ہوں جیسا کہ کتب مالکیہ میں مذکور ہے اور اس احتمال کی نفی کرنا بہت مشکل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس باب میں کوئی معتبر حدیث نہیں ہے جو واجب العمل ہو، اور بلا شبہ قلتین کی حدیث ان سب سے زیادہ ثابت ہے اور یہ امر محال ہے کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کے لئے ان مسائل میں ایسی شئے مقرر فرمائے جو ان تدابیر پر زاید ہو جو ان کے واسطے لازم ہیں اور وہ مسائل کثیر الوقوع ہوں اور ان میں عموم بلوی ہو پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شئے کی صاف صاف تصریح نہ فرمائی ہو اور نہ وہ صحابہ اور ان کے بعد کے لوگوں میں مشہور ہو اور کوئی ایک حدیث بھی اس بارے میں وارد نہ ہو، واللہ اعلم۔

نجاستوں کے پاک کرنے کا بیان

نجاست وہ شئے ہے جس کو سلیم الطبع لوگ ناپاک سمجھیں اور اس سے پرہیز کریں اور جب کپڑوں کو لگ جائے تو ان کو دھوئیں جیسے پاخانہ پیشاب اور خون، لیکن نجاسات سے پاکی حاصل کرنا سو وہ بھی سلیم الطبع لوگوں سے ماخوذ اور ان کے مروجہ طریقہ سے مستنبط ہے اور گوبر ناپاک ہے عبداللہ بن مسعود کی حدیث اس پر دلیل ہے اور جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کے پیشاب کے ناپاک ہونے میں بھی شبہ نہیں، طبائع سلیمہ اس کو ناپاک سمجھتی ہیں، اور اس کے پینے کی

جو اجازت ہے تو وہ طلب شفا کی ضرورت کی وجہ سے ہے اور اس کے پاک ہونے کا یا نجاست خفیفہ ہونے کا جو حکم ہے تو وہ دفع حرج کی وجہ سے ہے، اور شراب کو شارع نے نجاست میں داخل کیا ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ناپاکی شیطان کا فعل ہے'' اس واسطے کہ خدا تعالیٰ نے شراب کو حرام کیا اور اس کی حرمت کی نہایت تاکید کی۔ پس حکمت کا تقاضہ یہی تھا کہ اس کو پیشاب اور پاخانہ کے مانند کر دیا جائے تاکہ لوگوں کے سامنے اس کی برائی متمثل ہو جائے اور اس وجہ سے ان کے دل اس سے ہٹ جائیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا پانی پی جائے تو وہ اس کو سات بار دھوئے'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''اول بار مٹی سے دھوئے''۔

میں کہتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کے جھوٹے کو بھی نجاسات میں شامل کر دیا اور نجاستوں میں سے سخت ناپاک قرار دیا کیونکہ کتا ایک ملعون حیوان ہے جس سے ملائکہ نفرت کرتے ہیں اور اس کو بلا ضرورت پالنا اور اس کے ساتھ مخالطت کرنا ہر روز ایک قیراط کی مقدار اجر کم کرتا ہے، اور اس میں راز یہ ہے کہ کتا اپنی جبلت میں شیطان سے مشابہ ہے کیونکہ اس کی عادت میں شیطنت کرنا، غصہ کرنا اور نجاسات میں منہ ڈالنا اور لوگوں کو تکلیف پہنچانا ہے اور شیاطین کی طرف سے الہام کو قبول کرتا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دیکھا کہ کتوں سے خلط ملط رکھتے ہیں اور ان کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی اور کھیتی اور مویشی اور گھر کی حفاظت اور شکار کے واسطے اس کی ضرورت کی وجہ سے بالکل نہیں کر دینا بھی مناسب نہ تھا اس واسطے آپ نے پوری پوری طہارت شرط کر کے اور اس کے موکد کر کے اور ایسی طہارت کا حکم دیکر جس میں کسی قدر دقت بھی ہے اس سے بچانے کا علاج کر دیا تاکہ اس قدر پاک کرنا روک ٹوک میں کفارہ کے برابر ہو جائے، اور بعض حاملین مذہب نے سات مرتبہ دھونے کو امر تشریعی نہیں سمجھا بلکہ ایک طرح کی تاکید پر محمول کیا ہے اور بعض نے ظاہر حدیث کا لحاظ کیا ہے اور احتیاط ہی افضل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس اعرابی کے پیشاب پر ایک ڈول پانی کا بہادو''۔

میں کہتا ہوں بہت سا پانی بہانا زمین پر سے پیشاب کی ناپاکی کو دور کر دیتا ہے اور یہ اس دستور سے ماخوذ ہے جو تمام لوگوں کے نزدیک طے شدہ ہے کہ بہت سی بارش سے زمین پاک

ہوجاتی ہے اور بہت سے پانی سے بدبو بھی دور ہوجاتی ہے اور پیشاب منتشر ہوکر کالعدم ہوجاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم عورتوں میں سے کسی عورت کے کپڑے کو جب حیض کا خون لگ جائے تو وہ اس خون کو کھرچ دے پھر اس کو رگڑ کر پانی سے دھوڈالے پھر اس کپڑے سے نماز پڑھ لے''۔

میں کہتا ہوں عین نجاست اور اس کا اثر زائل ہونے سے طہارت حاصل ہوجاتی ہے اور تمام خصوصیات اس صورت کا بیان ہیں جو نجاست اور اس کے اثر کو زائل کرسکتی ہے اور وہ خصوصیات طہارت پر تنبیہ کیلئے ہیں طہارت کے لئے شرط نہیں ہیں لیکن ''منی'' سو ظاہر یہی ہے کہ وہ نجس شئے ہے کیونکہ نجاست کی تعریف میں جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ اس میں پایا جاتا ہے اور کھرچ دینا خشک منی سے کپڑے کو پاک کردیتا ہے جبکہ وہ جرم والی ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لڑکی کے پیشاب سے کپڑے کو دھونا چاہئے اور لڑکے کے پیشاب سے کپڑے پر پانی بہانا چاہئے''۔

میں کہتا ہوں زمانۂ جاہلیت میں یہی طریقہ مقرر تھا پس اسی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھا اور یہ فرق چند امور کی وجہ سے ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ لڑکے کا پیشاب پھیل جاتا اور اس کا ازالہ دقت سے ہوتا ہے اس واسطے اس کے لئے تخفیف مناسب ہے اور لڑکی کا پیشاب ایک جگہ مجتمع رہتا ہے اور بآسانی زائل ہوسکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ لڑکی کا پیشاب لڑکے کے پیشاب سے زیادہ غلیظ اور بدبودار ہوتا ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ لڑکوں سے لوگوں کو رغبت ہوتی ہے اور لڑکیوں کو کم پسند کرتے ہیں اس حدیث پر اہل مدینہ اور ابراہیم نخعیؒ نے عمل کیا ہے اور امام محمد نے اس بارے میں تفصیل کی ہے پس لوگوں میں جو مشہور ہے اس سے دھوکہ میں نہیں پڑنا چاہئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''چمڑا جب پکا لیا جاتا ہے تو پاک ہوجاتا ہے''۔

میں کہتا ہوں حیوانات کے پکے ہوئے چمڑوں کا استعمال کرنا تمام فرقوں کے نزدیک جاری اور مسلم ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ پکا لینے سے بدبو اور کراہت دور ہوجاتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کسی کے جوتے کو نجاست لگ جائے تو مٹی اس کے لئے پاک کرنے والی ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ جوتا اور موزہ اس نجاست سے جو جسم والی ہو رگڑنے سے پاک ہوجاتا ہے

کیونکہ وہ سخت جسم ہے اس میں نجاست سرایت نہیں کرتی اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم تر اور خشک دونوں نجاستوں میں عام ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے بارے میں فرمایا "یہ گھر میں پھرنے والی چیزوں میں سے ہے"۔

میں کہتا ہوں اس کے معنی ایک قول کے موافق یہ ہے کہ اگر چہ وہ نجاستوں میں منہ ڈالتی ہے اور چوہے کا شکار کرتی ہے مگر اس جگہ ضرورت ہے کہ اس کے جھوٹے کی پاکی کا حکم دیا جائے اور حرج کا دفع کرنا اصول شرع میں سے ایک اصل ہے اور دوسرے قول کے موافق اس حدیث میں ترغیب ہے کہ ہر جاندار کے ساتھ احسان کیا جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کو سائلین اور سائلات کے ساتھ تشبیہ دی ہے، واللہ اعلم۔

نماز کے ابواب کا بیان

واضح ہو کہ نماز تمام عبادتوں میں سب زیادہ عظیم الشان، سب سے زیادہ یقینی اور لوگوں میں سب عبادتوں سے زیادہ مشہور اور نفس میں سب سے زیادہ نفع بخش عبادت ہے اور اسی وجہ سے شارع علیہ السلام نے اس کی فضیلت، تعیین اوقات اور اس کے شروط وارکان بیان کرنے میں اور اس کے آداب، اس کی رخصتیں اور اس کے نوافل بیان کرنے میں اس قدر زیادہ اہتمام کیا ہے جو کسی اور عبادت میں نہیں کیا اور اس کو دین کے بڑے بڑے شعائر میں سے شمار کیا ہے اور نماز تمام یہود، نصاریٰ مجوسی اور بقایہ ملت اسماعیلیہ میں قابل تسلیم رہی ہے پس ضروری ہوا کہ اس کے اوقات اور اس کے جمیع متعلقات میں انہی امور کو اختیار کرنا چاہئے جن پر انھوں نے اور ان کے جمہور نے اتفاق کیا ہے اور جن جن باتوں کو انھوں نے اپنی طرف سے بنا رکھا ہے جیسے یہود موزے اور جوتے پہن کر نماز پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے اور اسی طرح کی دیگر باتیں تھیں تو یہ امر ضروری ہوا کہ ان کے ترک کی تاکید کی جائے اور مسلمانوں کا طریقہ ان کے طریقہ کے خلاف ہو، اور اسی طرح مجوس نے اپنے دین کو بگاڑا اور آفتاب کی پرستش کرنے لگے اس واسطے ملت اسلام کو ان کی ملت سے بالکل جدا کرنے کی ضرورت ہوئی، اور مسلمانوں کو ان کی نمازوں کے اوقات میں نماز پڑھنے سے بھی منع کر دیا گیا، اور چونکہ نماز کے احکام وسیع ہیں اور جن اصول پر نماز کی بنا ہے بہت ہیں اس واسطے کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں ہم نے ان اصول کو ذکر نہیں کیا جیسا کہ تمام کتب کے

اوّل میں ہم ذکر کرتے تھے، بلکہ ہر فصل کے اصول کو اس فصل کے اندر بیان کر دیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنی اولاد کو نماز کا حکم کرو جب وہ سات برس کی عمر کے ہو جائیں اور ان کو نماز کے اوپر مارو، جب وہ دس برس کی عمر کے ہو جائیں اور ان کے سونے کی جگہ الگ کر دو''۔

میں کہتا ہوں لڑکے کے بالغ ہونے کے دو طریق ہیں ایک تو اس حد کو پہنچنا جس میں صحیح اور غیر صحیح ادراک کی صلاحیت ہو جائے اور یہ صرف عقل سے ہوتا ہے اور عقل ظاہر ہونے کی علامت سات برس ہیں۔ پس سات برس کا لڑکا ان امور میں یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور عقل کے پورے ہونے کی علامت دس برس ہیں پس دس برس کا لڑکا بشرطیکہ صحیح المزاج ہو پورا عاقل ہوتا ہے، اپنے نفع اور نقصان کو خوب پہچاننے لگتا ہے اور تجارت و دیگر معاملات میں پورا ہوشیار ہو جاتا ہے، اور بلوغ کا دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ جہاد، حدود اور سزاؤں کے قابل ہو جائے اور اس کا ان لوگوں میں شمار ہونے لگے جو تکالیف برداشت کرتے ہیں اور مدنی اور مذہبی سیاست میں ان کا اعتبار کیا جاتا ہے اور جو راہ راست پر جب چلائے جاتے ہیں اور اس مرتبہ کا مدار عقل کامل اور جسم تام پر ہے اور یہ حالت اکثر میں پندرہ برس کی عمر میں متحقق ہو جاتی ہے اس بلوغ کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ احتلام ہونے لگے اور زیر ناف کے بال نکل آئیں۔

نماز میں دو امر کا لحاظ کیا گیا ہے پس اس لحاظ سے کہ نماز بندے اور اس کے مالک کے درمیان ایک واسطہ ہے اور بندے کو جہنم کے طبقہ اسفل السافلین میں گرنے سے باز رکھنے والی ہے، بلوغ اول کے وقت نماز کے حکم کر دیا گیا اور اس لحاظ سے کہ نماز اسلام کے شعائر میں سے ہے، اور اس پر مواخذہ کیا جاتا ہے اور اس پر لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں نماز کا حکم دیگر امور کے حکم کی طرح ہے۔

اور چونکہ دس برس کی عمر بلوغ کے دونوں حدوں کے بیچ میں ایک برزخ کی حالت تھی، بلوغ کی دونوں جہتوں میں مشترک تھی اس واسطے دونوں جہتوں سے حصہ دیا گیا اور دونوں کا حکم دیا گیا اور اس عمر میں الگ سلانے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ یہ زمانہ آغاز جوانی کا ہوتا ہے پس کچھ بعید نہیں ہے کہ یکجا سونے سے جماع کی خواہش پیدا ہو جائے اس واسطے ضروری ہوا کہ برائی کا راستہ اس کے واقع ہونے سے پہلے ہی بند کر دیا جائے۔

نماز کی فضیلت کا بیان

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے فرمایا جس نے گناہ کرنے کے بعد جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھ لی تھی ''خدا تعالیٰ نے تیرے گناہ کو بخش دیا'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر نہر بہتی ہو جس میں وہ دن بھر میں پانچ مرتبہ نہاتا ہے تو کیا اس کے بدن پر میل باقی رہ سکتا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا نہیں، آپ نے فرمایا، پس یہی حال پنج وقتہ نمازوں کا ہے کہ ان سے خدا تعالیٰ گناہوں کو دور کر دیتا ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانچوں نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان کو دوسرے رمضان تک اپنے درمیان کے گناہوں کو دور کرنے والے ہیں بشرطیکہ کبائر سے پرہیز کیا جائے۔

میں کہتا ہوں نماز میں پاکیزگی بھی ہے اور عبادت بھی اور وہ نفس کو پاک کر کے عالم ملکوت تک پہنچاتی ہے اور نفس کی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ کسی صفت کے ساتھ متصف ہوتا ہے تو اس صفت کی ضد کو ترک کر دیتا ہے اور اس سے الگ ہو جاتا ہے اور وہ صفت اس سے ایسی معدوم ہو جاتی ہے کہ کبھی اس کا نام بھی اس میں نہ تھا، پس جو شخص ان نمازوں کو پورے طور پر ادا کرے اور اچھی طرح پر وضو کرے اور ان کے وقت پر ان کو پڑھے اور ان کے رکوع اور خشوع اور اذکار اور اشکال کو پورے طور پر کرے اور اشباح سے ان کی ارواح اور صورتوں سے ان کے معانی مقصود رکھے تو ضرور وہ رحمت الٰہی کے عظیم الشان دریا میں غوطہ لگاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کے گناہ مٹا دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بندے میں اور اس کے کافر ہونے میں نماز کو ترک کرنے کا فرق ہے''۔

میں کہتا ہوں نماز اسلام کے شعائر اور اس کی علامات میں سب سے زیادہ عظیم الشان ہے جس کے جاتے رہنے سے اسلام کے فقدان کا حکم دیا جا سکتا ہے کیونکہ نماز میں اور اسلام میں بہت زیادہ لگاؤ اور اتحاد ہے نیز نماز ہی اس کے معنی کو یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکا دینے کو خوب ثابت کرتی ہے اور جس کو نماز سے حصہ نہیں ملا تو اس کا اسلام اس قدر باقی رہ گیا جس کا خدا تعالیٰ

کے نزدیک کچھ اعتبار نہیں۔

نماز کے اوقات کا بیان

جبکہ نماز کا فائدہ یعنی دریائے شہود میں غوطہ لگانا اور فرشتوں کی جماعت میں مل جانا بدون نماز پر مداومت کے اور اس کا التزام اور اس کی کثرت کے حاصل نہیں ہوتا حتی کہ لوگوں کے اثقال ان کے اوپر سے ہٹ جائیں اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ان کو ایسا حکم دیا جائے جس سے ضروری خارج ہونا لازم آئے، اس واسطے حکمت الٰہی کا مقتضی ہوا کہ لوگوں کو نماز کی محافظت اور اس کی مداومت کا حکم زمانہ کے ہر ایک حصہ کے بعد دیا جائے تا کہ نماز پڑھنے سے قبل اس کا انتظار کرنا اور اس کے لئے تیار رہنا اور نماز پڑھ لینے کے بعد اسکے رنگ کا بقیہ اور اس کے نور کا اثر نماز کے حکم میں شمار ہو اور غفلت کے اوقات میں بھی نظر ذکر الٰہی کی طرف رہے اور دل اللہ تعالیٰ کی طاعت میں لگا رہے، پس مسلمان کا حال اس گھوڑے کا سا ہوتا ہے جو لمبی رسی سے بندھا ہوتا ہے ایک دو قدم ادھر ادھر چل کر پھر اپنے تھان پر آ رہتا ہے اور نماز کی پابندی سے غفلت اور گناہوں کی تاریکی دلوں کے اندر نہیں بیٹھتی، مداومت حقیقی ممکن نہ ہونے کی صورت میں ایسی مداومت ہو سکتی ہے۔

پس جب نماز کے اوقات کی تعیین کی ضرورت ہوئی تو کوئی وقت ان چاروں وقتوں سے بہتر نہ تھا جن میں روحانیت کا عالم ظہور میں ہوتا ہے اور ملائکہ کا نزول ہوتا ہے اور بندوں کے اعمال خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور بندوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور یہ چاروں اوقات ان سب لوگوں کے نزدیک جو عالم بالا سے فیض حاصل کرتے ہیں ایک مسلم امر کے مانند ہیں، لیکن آدھی رات کے وقت سب لوگوں کو نماز پڑھنے کے ساتھ مکلف کرنا ممکن نہیں ہے، جیسا کہ ظاہر ہے اس واسطے فی الحقیقت نماز کے اوقات تین ہوئے، صبح اور شام اور رات کی تاریکی۔

چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''قائم کر نماز کو سورج کے ڈھلنے سے رات کی تاریکی تک اور صبح کو قرآن پڑھا کر کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے'' اور ''الی غسق اللیل'' اس واسطے فرمایا کہ فصل نہ پائے جانے کی وجہ سے شام کی نماز حکما شب کی تاریکی سے مل جاتی ہے اور اسی وجہ سے ضرورت کے وقت ظہر و عصر کو اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ پڑھنا درست ہے، پس یہ ایک اصل ہے، اور دو نمازوں میں بہت زیادہ فصل کرنا بھی درست نہیں ہے کہ

محافظت کے معنی ہی فوت ہو جائیں اور جو کچھ اس نے اوّل بار نماز سے حاصل کیا تھا جاتا رہے، اور نہ ہی بہت تھوڑا سا فصل رکھنا درست ہے کہ ان کو معاش کے حاصل کرنے کی فرصت ہی نہ ملے، اور اس امر میں ایک ایسی ظاہر و محسوس حد مقرر کرنا ضروری ہے جس کو سب خاص و عام معلوم کر لیا کریں اور وہ کسی قدر زیادہ کر دینا ہے اس جز کا جو اوقات کے اندازہ کرنے میں عرب و عجم کے نزدیک مستعمل ہو اور وہ بہت زیادہ بڑھائی ہوئی نہ ہو، اور اس امر کے لئے چوتھائی دن کی مقدار ہی ہو سکتی ہے کیونکہ چوتھائی دن میں تین ساعتیں ہوتی ہیں اور دن کا اور رات کا بارہ حصوں میں تقسیم کرنا ایک ایسا اہم ہے جس پر تمام اقالیم صالحہ نے اتفاق کیا ہے۔

اور اہل زراعت اور تجارت اور اہل صنعت وغیرہم کی اکثر یہ عادت ہے کہ صبح سے دوپہر تک اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں کیونکہ کسب معاش کا یہی وقت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور ہم نے دن کو روزگار بنایا'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تاکہ تم اس کے فضل سے طلب کرو'' اور بہت سے اشغال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے اور ایسے کاروبار کے وقت میں سب لوگوں کا نماز کے لئے آمادہ ہونا اور اس کے لئے وقت نکالنا حرج عظیم ہے اور اسی واسطے شارع نے نماز چاشت کو ساقط کر دیا اور بغیر فرض کئے اس کی طرف پوری رغبت دلائی اس وجہ سے یہ بات ضروری ہوئی کہ دن کے نصف اخیر کی نماز کے دو حصے کئے جائیں جن کے درمیان قریباً چوتھائی دن کا فصل ہو اور وہ ظہر اور عصر کی نمازیں ہیں اور رات کی نماز کے بھی دو حصے کر دیئے جائیں جن کے درمیان اسی قدر فصل رہے اور وہ مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں اور یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ بغیر ایسی ضرورت کے جس سے مفر ہی نہیں ایک وقت کی دونوں نمازوں کو جمع نہ کیا جائے ورنہ وہ مصلحت جس کا تعین اوقات میں لحاظ رکھا گیا ہے ضائع ہو جائے گی اور یہ دوسری اصل ہے۔

اور صالح ملکوں کے تمام باشندے اور معتدل مزاج لوگ جو احکام میں مقصود بالذات ہیں ہمیشہ علی الصبح بیدار ہو کر صبح کی روشنی سے رات کی تاریکی تک اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں اور نماز کے ادا کرنے کے لئے ایک تو وہ وقت مناسب ہے جس میں انسان کا نفس معاشی مصروفیات کے ان اثرات سے بری ہو جو یادالٰہی کو بھلا دیتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک فارغ

قلب کو پالے پس اس میں جگہ کرلے اور نفس کے اندر پوری پوری تاثیر کرلے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور صبح کو قرآن پڑھا کر کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔

اور ایک وہ وقت مناسب ہے جس میں آدمی سونے کے قریب ہوتا ہے تاکہ اس وقت کی نماز سارے دن کی کدورتوں کا کفارہ اور دل کے زنگ کو دور کرنے والی ہو جائے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''جس نے عشا کی نماز جماعت سے پڑھی تو وہ شب کے نصف اول میں قیام کے برابر ہے اور جس شخص نے عشا اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھی تو وہ پوری رات کے قیام کے برابر ہے''۔

اور ایک وہ وقت مناسب ہے جو لوگوں کے کاروبار کا ہوتا ہے جیسے دن چڑھے کا وقت ہے تاکہ اس وقت کی نماز دنیا کے اندر پورے انہماک کو ہلکا کردے اور اس کے واسطے تریاق کا کام دے، مگر اس وقت کی نماز کا تمام لوگوں کو حکم نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس وقت لوگوں کی دو حالتیں ہوں گی یا تو وہ اپنے کاروبار کو چھوڑیں گے اور یا ان کو نماز ترک کرنا پڑے گی اور یہ ایک اور اصل ہے، نیز تعیین اوقات کے باب میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ اس طریق کو اختیار کیا جائے جو گزشتہ انبیا مقربین سے منقول ہے کیونکہ اس طریق کا اختیار کرنا ادائے طاعت پر نفس کے لئے بہت بڑی تنبیہ کرنے والا ہے اور نفس کے لئے اس امر پر ابھارنے والا ہے کہ لوگ عبادت میں ایک دوسرے پر سبقت کریں اور لوگوں میں صالحین کے ذکر جمیل کا باعث ہے، اس کی نسبت حضرت جبرئیل نے فرمایا تھا ''یہ آپ سے قبل گزرے ہوئے انبیا کا وقت صلوٰۃ ہے''۔

یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ نماز عشا کے بارے میں حضرت معاذ کی روایت کردہ حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس عشا کو تم سے پہلے کسی نے نہیں پڑھا'' کیونکہ اس حدیث کو لوگوں نے مختلف طور سے روایت کیا ہے پس بعض نے اس طرح سے کہا کہ لوگوں نے نماز پڑھی اور سو گئے اور بعض نے اس طرح کہا کہ اس نماز کو کوئی نہیں پڑھتا تھا مگر مدینہ میں اور اسی طرح اور اقوال ہیں پس ظاہر یہ ہے کہ یہ روایت بالمعنی کی قسم سے ہے اور یہ ایک اور اصل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اوقات کے مقرر کرنے میں بہت سے اعتبار سے بڑے بڑے راز

ہیں، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام بشکل انسان تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھائی اور آپ کو نماز کے اوقات کی تعلیم فرمائی، اور ہمارے بیان سے جمع بین الصلوتین کے جواز کی وجہ فی الجملہ اور نماز تہجد اور نماز چاشت کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر انبیا پر واجب ہونے کا سبب جیسا کہ علما نے بیان کیا ہے اور دیگر لوگوں کے لئے ان کا نفل ہونا اور نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کی تاکید کا سبب ظاہر ہو گیا، واللہ اعلم۔

اور چونکہ تمام لوگوں کو ایک ہی وقت میں نماز پڑھنے کا حکم کرنے میں نہ اس وقت سے پہلے پڑھیں اور نہ اس کے بعد پڑھیں حرج عظیم تھا اس واسطے اوقات کے اندر کسی قدر توسیع کر دی گئی، اور جبکہ وہی قرائن جو عرب کے نزدیک ظاہر تھے اور کسی ادنی و اعلیٰ پر مخفی نہیں تھے تشریع کی صلاحیت رکھتے تھے تو اوقات کے اوائل اور ان کے اواخر کے لئے منضبط اور محسوس حدیں مقرر کی گئیں اور ان اسباب کے مجتمع ہونے کی وجہ سے نمازوں کے لئے چار قسم کے اوقات حاصل ہوئے ان میں سے ایک وقت اختیار کا ہے اور یہ وہ وقت ہے جس میں نماز بلا کراہت کے ادا ہو جاتی ہے اور اس میں زیادہ معتبر دو حدیثیں ہیں ایک تو حدیث جبرئیل ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دو روز تک نماز پڑھائی اور دوسری حدیث بریدہ ہے جس میں یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جو نماز کے اوقات دریافت کرتا تھا جواب دیا کہ وہ دو روز تک ساتھ نماز پڑھے اور ان دونوں حدیثوں میں سے مفسر کا حکم مبہم پر ناطق ہے اور جس امر میں اختلاف ہوگا اس میں بریدہ کی حدیث پر عمل کیا جائے گا کیونکہ وہ مدنی ہے، متاخر ہے اور پہلی حدیث مکی ہے، متقدم ہے اور اتباع متاخر ہی کا ہوا کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا آخر وقت شفق غائب ہونے سے پیشتر تک ہے اور کچھ بعید نہیں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے دوسرے دن مغرب کی نماز تھوڑی ہی سی دیر کر کے پڑھی ہو کیونکہ اس کا وقت کم ہوتا ہے پس راوی نے خطا اجتہادی کی وجہ سے یا غایت قلت کو بیان کرنے کی غرض سے یہ کہہ دیا ہو کہ دونوں روز مغرب کی نماز ایک ہی وقت میں پڑھی، واللہ اعلم۔

اور بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نماز عصر کا اخیر وقت تغیر آفتاب تک ہے اور اسی پر فقہا کا اتفاق ہے، پھر شاید مثلین اخیر وقت مختار یا وقت مستحب کا بیان ہو، یا ہم یہ کہتے ہیں کہ شاید شرع نے اولاً اس بات کی طرف نظر کی کہ وقت عصر کے دو حصے کرنے سے مقصود یہ ہے

کہ ہر دو نمازوں میں بقدر چوتھائی دن کے فصل ہو اس واسطے اس کا انتہائی اخیر وقت یہ مقرر فرمایا ہو کہ ہر شئے کا سایہ مثلین تک پہنچ جائے، پھر لوگوں کے حوائج اور اشغال سے ظاہر ہوا کہ انتہا وقت کو بڑھانا ضروری ہے، اور نیز اس حد کے معلوم کرنے میں ایک قسم کا غور کرنے اور سایہ اصلی کو یاد رکھنے اور آلات رصد کی ضرورت ہے۔

اور مناسب یہ ہے کہ ایسے امور میں ان چیزوں سے لوگوں کو خطاب کیا جائے جو محسوس اور ظاہر ہوں اس واسطے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس بات کا القا فرمایا کہ انتہائے وقت عصر سورج کے جسم یا اس کی روشنی کے تغیر کو گردانا جائے، واللہ اعلم۔

اور ان چار وقتوں میں سے ایک وقت استحباب کا ہے جس میں نماز کا پڑھنا اولیٰ ہوتا ہے اور وہ وقت سب نمازوں کے لئے اول وقت ہے بجز عشا کی نماز کے کہ اس کا اصل مستحب وقت اس کو دیر سے پڑھنا ہے اس وضع طبعی کی وجہ سے جس کو ہم بیان کر چکے ہیں اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "اگر میں اپنی امت پر دشوار نہ سمجھتا تو میں ان کو عشا کی نماز کو دیر کر کے پڑھنے کا حکم دے دیتا۔ اس کے علاوہ عشا کی نماز کو دیر سے پڑھنا خدا کی یاد سے غافل کرنے والے اشغال سے باطن کو خوب صاف کرتا ہے اور عشا کے بعد قصے کہانیوں میں پڑنے کو ختم کرتا ہے، لیکن تاخیر کبھی کبھی جماعت میں کمی کا اور نماز سے لوگوں کی بے رغبتی کا سبب بن جاتی ہے اور ایسی تاخیر میں قلب موضوع ہے، پس اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے کہ جب لوگ کثرت سے آ جاتے تو جلدی کر کے نماز پڑھاتے اور جب کم ہوتے تو دیر کر کے نماز پڑھاتے اور موسم گرما میں ظہر کی نماز میں تاخیر مستحب ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب گرمی کی شدت ہو تو ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا کرو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ ہے"۔ میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ اس عالم میں جو کچھ کیفیات مناسبہ اور منافرہ کا فیضان ہوتا ہے ان کا خزانہ جنت اور دوزخ ہیں اور کاسنی وغیرہ کے متعلق جو حدیث آئی ہے اس کی بھی یہی تاویل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فجر کی نماز اجالے میں پڑھو کیونکہ اس سے اجر زیادہ ہوتا ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ان لوگوں سے خطاب ہے جن کو جماعت کے بہت کم ہونے کا خوف تھا کہ وہ روشنی ہونے تک انتظار کریں، یا بڑی بڑی مساجد والوں سے خطاب ہے جن میں ضعیف

لوگ اور لڑکے وغیرہ اکٹھے ہوتے ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''تم میں سے جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ تخفیف کرے کیونکہ جماعت میں ضعیف بھی ہوتے ہیں'' الحدیث۔ یا اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ صبح کی نماز کو اتنا طویل کرو کہ اسفار کے وقت ختم ہوا کرے اور ابو برزہؓ کی حدیث اس پر دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں اس وقت فارغ ہوتے تھے کہ آدمی اپنے پاس کے آدمی کو پہچان لیتا تھا، اور ساٹھ آیت سے سو آیت تک پڑھتے تھے پس اب اسفار کی حدیث میں اور غلس (۱) کی حدیث میں کوئی منافات نہیں رہی۔ اور ان چار وقتوں میں سے ایک وقت ضرورت کا ہے اور یہ وہ وقت ہے کہ بغیر عذر کے اس وقت تک نماز کو موخر کرنا ممنوع ہے اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے طلوع آفتاب سے پہلے صبح کی ایک رکعت پالی تو اس نے صبح کی نماز کو پالیا اور جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالی تو اس نے عصر کی نماز کو پالیا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایسے تنگ وقت میں نماز پڑھنا منافق کی نماز ہے جو بیٹھا دیکھا کرتا ہے یہاں تک کہ جب آفتاب زرد ہو جاتا ہے'' الحدیث، اور عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث بھی اسی قبیل سے ہے جس سے ظہر و عصر کا جمع کرنا اور مغرب و عشا کا جمع کرنا ثابت ہے اور وہ عذر کی وجہ سے تاخیر جائز ہے سفر، مرض اور بارش وغیرہ ہیں اور عشا کی نماز میں طلوع فجر تک تاخیر کرنا جائز ہے، واللہ اعلم۔

اور ان چار وقتوں میں سے ایک وقت قضا کا ہے جب اس کو نماز یاد آجائے اور اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کسی وقت کی نماز کو بھول جائے یا سو جائے تو جب اس کو وہ نماز یاد آئے پڑھ لے''۔

میں کہتا ہوں کہ ساری بات اس میں یہ ہے کہ نفس کو ترک کرنے کا عادی نہ ہو جائے، اور جو نماز کا فائدہ اس سے فوت ہو گیا ہے وہ اس کو مل جائے، اور علما نے دانستہ نماز فوت کرنے کو بھی خود فوت ہونے کے ساتھ ملحق کر دیا ہے یہ دیکھ کر کہ اس میں کفارہ ادا کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ کو وصیت فرمائی تھی جب ان پر ایسے سردار مقرر ہوں جو نماز کو بے جان کر کے پڑھتے ہوں ''تو نماز کے وقت پر نماز پڑھا کرنا پھر اگر ان کے ساتھ کبھی تو نماز کو پالے

(۱) غلس تاریکی کو کہتے ہیں، بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ آنحضرت اندھیرے میں نماز پڑھتے تھے۔

تو ان کے ساتھ پڑھ لینا پس وہ تیرے لئے نفل ہو جائے گی''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں دو باتوں کا لحاظ کیا، ایک تو اس کا کہ نماز بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان وسیلہ ہے اور دوسرے اس کا کہ نماز اسلام کے شعائر میں سے ہے جس کا تارک قابل ملامت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت ہمیشہ بخیر رہے گی جب تک کہ وہ مغرب کی نماز کو ستاروں کے گنجان ہونے تک دیر تک نہ پڑھیں گے''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حدود شرعیہ کے اندر سستی کرنا دین کے اندر تحریف اور بگاڑ کا سبب ہوتا ہے، خدا تعالیٰ کا فرمان ہے ''سب نمازوں کی محافظت کرو خاص کر درمیانی نماز کی''۔ درمیانی نماز سے عصر کی نماز مراد ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے دو ٹھنڈک کے وقت کی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوا''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے عصر کی نماز ترک کردی اس کا عمل ضائع ہو گیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص کی عصر کی نماز جاتی رہی تو گویا اس کی اولاد اور مال غارت ہو گیا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''منافقین پر فجر اور عشا سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہوتی اور جو کچھ ان نمازوں کے اندر ہے اگر ان کو معلوم ہوتا تو ان نمازوں کے لئے آتے خواہ ان کو گھسٹنا ہی پڑتا''۔

میں کہتا ہوں ترغیب اور ترہیب کے لحاظ سے انہی تین نمازوں کا زیادہ تر اہتمام اس لئے کیا گیا ہے کہ ان نمازوں میں سستی اور غفلت کا مظنہ ہے کیونکہ فجر اور عشا کا وقت لوگوں کے سونے کا وقت ہوتا ہے خدا تعالیٰ کا یقین اور اس کا خوف رکھنے والا ہی اپنی آرام کی نیند اور غنودگی کے وقت اپنے بستر اور گدے سے اللہ تعالیٰ کے واسطے اٹھ سکتا ہے اور عصر کا وقت پس وہ بازاروں کے قیام کا اور خرید و فروخت میں لوگوں کی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے اور وہ وقت کسان لوگوں کے لئے نہایت ہی تھک جانے کا وقت ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''گنوار لوگ تمہاری مغرب کی نماز کا نام بدلنے میں تم پر غالب نہ آجائیں'' اور ایک دوسری حدیث میں آیا ہے ''عشا کی نماز کا نام بدلنے میں تم پر غالب نہ آجائیں''۔

میں کہتا ہوں کسی شئے کا نام جو کتاب وسنت میں آیا ہے بدل کر کوئی اور نام رکھنا جو پہلے نام کے متروک ہونے کا سبب بنتا ہو مکروہ ہے کیونکہ ایسا کرنا لوگوں پر ان کے دین کو خلط ملط کرتا ہے

اور کتاب آسمانی کو ان پر دشوار کر دیتا ہے۔

اذان کا بیان

جب صحابہ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جماعت ایک مقصود اور موکد چیز ہے اور ایک وقت اور ایک جگہ میں بغیر اعلام اور آگاہ کرنے کے اجتماع نہیں ہو سکتا تو انھوں نے اس شئے کے بارے میں باہم گفتگو کی جس سے اعلام حاصل ہو جائے، پس کسی نے آگ روشن کرنے کا ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے نامنظور فرمایا اور کسی نے نرسنگہ بجانے کو کہا تو آپ نے مشابہت یہود کی وجہ سے اس کو رد کر دیا، اور کسی نے ناقوس کے لئے کہا تو اس کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشابہت نصاریٰ کی وجہ سے منظور نہیں کیا پس بغیر کسی بات کو معین کیے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے، اس اثنا میں عبداللہ بن زید نے اذان اور اقامت کو خواب میں دیکھا اور اس خواب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا آپ نے سن کر فرمایا، خواب سچا ہے، اور یہ قصہ ان امور پر واضح دلیل ہے کہ احکام شرعیہ مصلحتوں کی بنا پر مقرر کیے جاتے ہیں اور اجتہاد کو بھی احکام میں دخل ہے اور آسانی ایک اصل اصیل ہے اور دینی امور میں ان لوگوں کی مخالفت کرنا جو گمراہی میں بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں شارع کو مطلوب ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور بھی خواب کے ذریعہ یا القافی القلب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مراد پر کبھی مطلع ہو جاتا ہے لیکن لوگ اس کے مکلّف نہیں ہو سکتے اور نہ اس میں سے شبہ دور ہو سکتا ہے یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برقرار رکھا ہو، اور حکمت الٰہی کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ اذان میں صرف اعلام اور تنبیہ ہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ اس کا شعائر دین میں سے ہونا بھی شمار کیا جائے اس طور پر کہ بے خبر لوگوں کے سروں پر اس کے الفاظ کا پکارنا اور تنبیہ کرنا تعظیم دین ہو اور لوگوں کا اس کو قبول کر لینا ان کے دین الٰہی کے تابع ہونے کی نشانی ہو اس واسطے یہ بات ضروری ہوئی کہ اذان ذکر الٰہی سے اور شہادتین سے اور نماز کی طرف بلانے سے مرکب ہو، تاکہ جو چیز اس سے مقصود ہے اس کی وہ تصریح کرنے والی ہو۔

اور اذان کے کئی طریقے مروی ہیں، ان میں سے سب سے صحیح طریقہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا طریقہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اذان، ہر کلمہ کو دو دو مرتبہ کہنے سے اور

اقامت ایک ایک مرتبہ کہنے سے ہوتی تھی مگر قد قامت الصلوٰۃ کو دوبارہ کہتے تھے، اس کے بعد ابومخذورہ کا طریقہ ہے کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان میں انیس کلمات اور اقامت میں سترہ کلمات سکھلائے، اور میرے اذان کے کلمات ایسے ہیں جیسے قرآن کی قرأتیں کہ سب شافی، کافی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس اگر صبح کی نماز ہے تو تجھے کہنا چاہئے۔ الصلوٰۃ خیر من النوم، الصلوٰۃ خیر من النوم۔

میں کہتا ہوں صبح کا وقت چونکہ سونے اور غفلت کا وقت ہوتا ہے اور اس میں نہایت قوی تنبیہ کی حاجت ہے اس واسطے ان کلموں کا زیادہ کرنا مستحب ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اذان کہے وہی اقامت بھی کہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں وجہ یہ ہے کہ جب ایک شخص نے اذان کی ابتدا کی تو اس کے مسلمان بھائیوں پر ضروری ہوا کہ اس نے مباح منافع سے جو حاصل کرنا چاہے ہے اس میں اس سے مزاحمت نہ کریں، جس طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے ''کوئی شخص اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کا پیغام نہ بھیجے''۔ اور فضائل اذان میں سے یہ امور ہیں کہ وہ شعائر اسلام میں سے ہے اور اس کی وجہ سے ملک دارالاسلام ہو جاتا ہے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی جگہ سے اذان کی آواز سن لیتے تھے تو حملہ کرنے سے رک جاتے تھے ورنہ اس کو غارت کر دیا کرتے تھے، اور وہ نبوت کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے کیونکہ اس سے اسلام کے بڑے عظیم الشان رکن پر اور اس عبادت پر جو سب عبادتوں کی اصل ہے ترغیب ہوتی ہے، اور خدا تعالیٰ کی رضامندی اور شیطان کی ناراضی جس قدر اس نیکی میں ہوتی ہے جو دوسروں کی طرف متعدی ہو اور کلمہ حق کے بلند ہونے میں ہوتی ہے کسی اور چیز میں نہیں ہوتی، اسی کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''ایک فقیہ ہزار عابد سے زیادہ شیطان پر سخت ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب نماز کے لئے اذان ہوتی ہے تو شیطان پشت پھیر کر بھاگتا ہے اور اس کا گوز (ا) نکل جاتا ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''موذن سب لوگوں سے زیادہ بلند گردن والے ہوں گے'' اور آپ نے فرمایا جہاں تک موذن کی آواز جاتی ہے اس کی مغفرت کی جاتی ہے اور جن وانس اس

(ا) ہوا خارج ہو جاتی ہے۔

کی گواہی دیں گے''۔

میں کہتا ہوں جزا اور سزا کا معاملہ معانی کی صورتوں کے ساتھ مناسبت اور ارواح کے اشباح کے ساتھ تعلق پر مبنی ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ موذن کی عظمت وشان اس کی گردن اور آواز کے اعتبار سے ظاہر ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس پر اس قدر پھیلے جس قدر اس کا خدا تعالیٰ کی طرف بلانا لوگوں میں پھیلتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے طلب ثواب کی غرض سے سات سال تک اذان دی تو اس کے لئے آگ سے رہائی لکھ دی گئی''۔ اور یہ اس واسطے کہ اس نے اپنی صحت تصدیق کو ظاہر کیا، خدا تعالیٰ کے لئے سات سال تک اذان دینے کی وہی شخص پابندی کر سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہو، اور اس واسطے کہ اس نے اپنے نفس کو اس قابل بنا لیا کہ رحمت الٰہی اس پر پورے طور سے چھا جائے، خدا تعالیٰ نے اس چرواہے کے حق میں جو پہاڑ کے ٹیلہ پر بکریاں چراتا تھا فرمایا ''میرے اس بندے کی طرف دیکھو! اذان کہتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، وہ مجھ سے ڈرتا ہے میں نے اس کو بخش دیا اور اس کو جنت میں داخل کیا''۔ خدا کا یہ فرمانا ''وہ مجھ سے ڈرتا ہے'' اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال کا اعتبار ان کے دواعی پر ہوتا ہے جو ان اعمال پر ابھارتے ہیں اور یہ کہ اعمال اشباح ہیں، اور دواعی ان اعمال کی ارواح ہیں پس خدا تعالیٰ سے اس کا خوف کرنا اور اس کا اخلاص اس کی مغفرت کا سبب ہو گیا، اور چونکہ اذان جو شعائر دین میں سے ہے اس لئے مقرر کی گئی کہ اس کے ذریعہ لوگوں کا ہدایت الٰہیہ کا قبول کر لینا پہچان لیا جائے اس واسطے اذان کے جواب دینے کا لوگوں کو حکم دیا گیا تاکہ جواب دینے سے اس کی تصریح ہو جائے جس کا حصول لوگوں کی جانب سے مقصود ہے پس سننے والا ذکر اور شہادتین کا جواب انہی الفاظ کے ساتھ دے اور دعوت کا جواب ان الفاظ کے ساتھ دے جن میں گناہ سے باز رہنے کی اور نیکی کے کرنے کی طاقت کی طلب خاص خدا سے ہوتا کہ اس عبادت کے کرتے وقت فخر پیدا نہ ہو جو شخص دلی خلوص سے ایسا کرے گا جنت میں داخل ہوگا کیونکہ ایسا کرنا قلبی فرمانبرداری کی صورت ہے اور اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا ہے، پھر اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے دعا (۱) کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ آپ کے دین کو قبول کرنے کی اور آپ کی محبت اختیار کرنے کی

حقیقت کو کامل کر دے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اذان اور اقامت کے درمیان میں دعا رد نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں اس وقت میں دعا کا رد نہ ہونا رحمت الٰہیہ کے شمول اور دعا کرنے والے کی طرف سے تابعداری پائے جانے کا سبب ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بلال رات میں اذان دیا کرتا ہے پس جب تک ابن ام مکتومؓ اذان نہ دے تم کھاؤ پیو''۔

میں کہتا ہوں امام کے لئے مستحب ہے کہ جب اس کو ضرورت معلوم ہو تو دو مؤذن مقرر کر دے جس کی آواز لوگ پہچانتے ہوں اور لوگوں کو یہ بتلا دے کہ ان میں سے فلاں مؤذن رات میں اذان دیتا ہے پس جب تک دوسرا موذن اذان نہ دے تم کھایا پیا کرو تا کہ جو شخص بیدار ہو چکا ہے اور سحری کھا رہا ہے وہ پہلی اذان سے نہ رک جائے اور سونے والا نماز کے لئے اٹھ بیٹھے اور سحری نہ کھائی ہو تو جلدی سے سحری کھالے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب نماز کی اقامت ہو تو نماز کے لئے دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ چلتے ہوئے آؤ''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عبادات میں تکلف نہیں کرنا چاہئے۔

مساجد کا بیان

مسجد بنانے کی اور اس کے التزام کی فضیلت اور مسجد میں نماز کے انتظار کی فضیلت کے اسباب یہ ہیں کہ مسجد شعائر اسلام میں سے ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم کسی مسجد کو دیکھو یا کسی موذن کو اذان کہتے سنو تو پھر کسی کو قتل نہ کرو''۔

اور وہ نماز کی جگہ ہے، عابدوں کے اعتکاف کی جگہ ہے اور رحمت نازل ہونے کی جگہ ہے اور کسی قدر کعبہ کے مشابہ ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنے گھر سے پاک ہو کر فرض نماز کے لئے نکلا تو اس کا اجر ایسا ہے جیسے حج کرنے والے کا جو حالت احرام میں ہو، اور جو شخص چاشت کی نماز کے لئے گھر سے نکلا اور اس کا مقصود نماز پڑھنا ہی ہو تو اس کا اجر عمرہ کرنے والے کے اجر کے برابر ہے، اور آپ نے فرمایا ''جب تمہارا جنت کے باغوں میں گزر ہوا کرے تو اس میں چرا کرو، کسی نے پوچھا جنت کے باغ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا ''مساجد'' اور تمام کاروبار

(۱) یعنی اللھم رب ھذہ الدعوۃ اخیر تک پڑھے۔

اور اہل وعیال سے یکسو ہو کر اوقات نماز میں محض نماز کی خاطر مسجد کی طرف متوجہ ہونا اس شخص کے اخلاص دین اور دل سے اپنے رب کی اطاعت کی دلیل ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب ایک شخص نے وضو کیا اور اچھے طور پر کیا پھر مسجد کی طرف خاص نماز ہی کے لئے چلا تو اس کی وجہ سے ہر ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بلند اور ایک گناہ کم ہوتا چلا جاتا ہے پھر جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے تو جب تک وہ اپنی نماز میں رہتا ہے اس کے لئے ملائکہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے خدا اس پر فضل کر، اے خدا اس پر رحم کر، اور تم میں سے جب تک کوئی نماز کا انتظار کرتا ہے نماز ہی میں رہتا ہے''۔ اور مسجد کا بنانا اعلا کلمۃ اللہ کی اعانت کرنا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص صبح کو یا شام کو مسجد میں جاتا ہے اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی مہمانی کا سامان کرتا ہے خواہ وہ صبح کو جائے یا شام کو''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر صبح و شام کو جانا بہیمیت کو ملکیت کے تابع کرنا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے خدا کے لئے مسجد بنائی خدا اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنائے گا''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ جزا بصورت عمل ہوتی ہے اور وضو جاتے رہنے سے انتظار کا ثواب اس لئے منقطع ہو جاتا ہے کہ اس وقت میں اس کی نماز کے لئے تیاری باقی نہیں رہتی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کو اور مسجد حرام کو زیادہ ثواب ہونے کی فضیلت چند وجوہ سے ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان مواضع میں خاص خاص فرشتے مقرر ہیں جو وہاں کے باشندوں کو گھیرے رکھتے ہیں اور جو وہاں آتا ہے اس کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اور ان وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ ان مواضع کا آباد کرنا اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم ہے اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنا ہے۔

اور ان وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ ان مواضع میں آنا ائمہ دین کے حال کو یاد دلاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سوائے تین مساجد کے کہیں کے لئے کجاوے نہ کسو، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد''۔

میں کہتا ہوں اہل جاہلیت ان مقامات کو اپنے زعم میں معظم سمجھتے تھے ان کی زیارت کرنے کے لئے اور برکت حاصل کرنے کے لئے سفر کرتے تھے اور اس میں دین کی تحریف اور فساد ہے جو

پوشیدہ نہیں ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فساد کا دروازہ بند کر دیا تا کہ جو چیزیں شعائر الٰہی نہیں ہیں وہ شعائر میں نہ مل جائیں اور تا کہ یہ غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ نہ ہو جائے، اور میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ قبر اور اولیا اللہ میں سے کسی کی عبادت گاہ اور کوہِ طور سب کے سب ممنوع ہونے میں برابر ہیں، واللہ اعلم۔

مسجد کے آداب کے کئی طریقے ہیں، ان میں سے ایک مسجد کی تعظیم کا لحاظ رکھنا اور اپنے نفس کو اس بات کا پابند کرنا کہ دل میں متفرق خیالات نہ آئیں اور مسجد میں داخل ہونے کے بعد وہ مطلق العنان نہ رہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پیشتر دو رکعت پڑھ لے'' اور ان آداب میں سے ایک مسجد کو ان چیزوں سے جو ناپاک اور مکروہ ہیں پاک صاف رکھنا ہے اس کے متعلق راوی کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے بنانے کا اور اس کو پاک صاف رکھنے کا اور معطر کرنے کا حکم دیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت کے اجر میرے سامنے پیش کئے گئے یہاں تک کہ کوڑے کا اجر بھی جس کو کوئی شخص مسجد سے نکال دیتا ہے دکھایا گیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مسجد میں تھوکنا ایک خطا ہے اور اس کا کفارہ اس کو مٹی سے دبا دینا ہے''۔

اور ان میں سے ایک عبادت کرنے والوں کے دل پراگندہ کرنے سے اور بازار کا سا شور وغل کرنے سے باز رہنا ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا تھا ''اس تیر کا پھل اپنے ہاتھ میں رکھ'' اور آپ نے فرمایا ''جو کوئی کسی شخص کو مسجد کے اندر اپنی گم شدہ چیز کے لئے آواز دیتا ہوا سنے تو اس کو یہ کہنا چاہئے۔ خدا تیری طرف اس کو واپس نہ کرے، کیونکہ مسجدیں اس واسطے نہیں بنائی گئی ہیں اور آپ نے فرمایا ہے جب تم مسجد کے اندر کسی شخص کو خرید یا فروخت کرتا دیکھو تو کہہ دو کہ خدا تعالیٰ تیری تجارت میں نفع نہ دے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر اشعار پڑھنے سے، شکار کرنے سے اور حدود قائم کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ گم شدہ چیز کا تلاش کرنا یعنی اس کی طلب میں آواز بلند کرنا اس لئے ممنوع ہوا کہ وہ شور وغل ہے جس سے نماز پڑھنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں کے دل اچاٹ ہوتے ہیں اور اس کے مطلوب کے خلاف بددعا کرے کہ جس میں کہ اس کی ذلت بھی ہوتی ہے اس کو منع کرنا

مستحب ہے، اور اس کی علت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ مسجدیں اس لئے نہیں بنائی گئی ہیں، یعنی وہ ذکر الٰہی اور نماز کے لئے بنائی گئی ہیں اور مسجد کے اندر خرید و فروخت کرنا اس لئے ممنوع ہوا کہ مسجد بازار نہ بن جائے کہ لوگ اس میں معاملات کرنے لگیں پس اس کی حرمت جاتی رہے اور نمازیوں اور معتکفوں کو تشویش پیدا ہونے لگے، اور اشعار پڑھنے سے منع کرنے کی وجہ بھی یہی ہے جو ہم نے بیان کی اور یہ وجہ بھی ہے کہ اشعار پڑھنے میں ذکر الٰہی سے اعراض اور دوسروں کو اعراض کی ترغیب دینا پایا جاتا ہے اور مسجد کے اندر شکار اور حدود کی اس لئے ممانعت ہوئی کہ اس میں گندگی رونے اور پیٹنے اور شور وغل کے پیدا ہونے اور عبادت سے نمازیوں کے دل ہٹنے کا احتمال ہے البتہ وہ اشعار مستثنیٰ ہیں جن میں ذکر الٰہی ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہو اور کفار کو غم وغصہ میں مبتلا کرنا ہو کیونکہ یہ غرض شرعی ہے، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسانؓ کے لئے دعا کی تھی کہ ''اے اللہ تو روح القدس سے اس کی تائید کر''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی حائض اور جنبی کے لئے میں مسجد کو حلال نہیں رکھتا''۔

میں کہتا ہوں اس ممانعت کا سبب تعظیم مسجد ہے کیونکہ مسجد کی سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ کوئی انسان بغیر طہارت کے اس میں داخل نہ ہو، اور بے وضو کو مسجد میں داخل ہونے سے منع کرنے میں بڑی دقت تھی اور جنبی اور حائض کو منع کرنے میں کوئی دقت نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کو بہ نسبت دوسرے لوگوں کے نماز سے زیادہ بعد ہے اور مسجد نماز ہی کے لئے بنائی گئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس بدبودار درخت کو کھا کر کوئی شخص ہماری مسجد میں ہرگز نہ آئے کیونکہ جس چیز سے لوگوں کو ایذا ہوتی ہے اس چیز سے فرشتوں کو بھی ہوتی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس بدبودار درخت سے مراد پیاز یا لہسن ہے اور ہر بدبودار چیز اسی حکم میں ہے اور فرشتوں کو ایذا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس سے کراہت کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں کیونکہ فرشتے پاکیزہ اخلاق اور خوشبودار چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کی اضداد چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اس کو یہ کہنا چاہئے اللھم افتح لی ابواب رحمتک، پھر جس مسجد سے نکلے تو یہ کہنا چاہئے: اللھم انی اسألک من فضلک.

میں کہتا ہوں داخل ہونے والے کے لئے طلب رحمت کی تخصیص اور نکلنے والے کے لئے طلب فضل کی تخصیص میں حکمت یہ ہے کہ کتاب اللہ میں رحمت سے نفسانی اور اخروی نعمتیں مراد ہیں، جیسے ولایت اور نبوت، خدا تعالیٰ نے فرمایا ''اور تیرے رب کی رحمت اس خیر سے جس کو وہ جمع کرتے ہیں بہتر ہے اور فضل سے دنیاوی نعمتیں مراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے رب کے فضل کو طلب کرو''۔ اور خدا تعالیٰ نے فرمایا ''پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کے فضل کو طلب کرو''۔ اور جو شخص مسجد میں جاتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کا قرب تلاش کرتا ہے اور مسجد سے نکلنے کے بعد روزی تلاش کرنے کا وقت ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں جائے تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھ لے''۔

میں کہتا ہوں یہ اس وجہ سے مقرر کیا گیا کہ جو مکان نماز کے لئے بنایا گیا ہے اس میں داخل ہونے کے وقت نماز نہ پڑھنا بڑے خسارہ اور حسرت کی بات ہے اور اس میں ایک امر محسوس سے نماز کی طرف رغبت کا بھی انضباط ہو جاتا ہے اور اس میں مسجد کی تعظیم بھی ہوتی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تمام زمین نماز کی جگہ ہے بجز مقبرہ اور حمام کے'' اور سات جگہ میں نماز پڑھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے: کوڑی خانہ میں اور مقبرہ میں اور مذبح میں اور عام راستہ میں اور حمام میں اور اونٹوں کے بندھنے کی جگہ میں اور خانہ کعبہ کی چھت پر اور بل کی زمین میں نماز پڑھنے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ اس زمین پر خدا کی لعنت ہو چکی ہے۔

میں کہتا ہوں کوڑی جگہ اور مذبح میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ وہ دونوں نجاست کے مقام ہیں اور نماز کے لئے طہارت اور پاکیزگی مناسب ہے اور مقبرہ میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ بتوں کی طرح سے علما اور اولیا کی قبور کی لوگ پرستش شروع نہ کر دیں کیونکہ یہ شرک خفی ہے یا ان مقابر میں نماز پڑھنے کو زیادہ تقرب الی اللہ نہ سمجھنے لگیں اور یہ شرک خفی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا یہی مفہوم ہے: یہود و نصاری پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد بنا لیا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سورج کے طلوع استوا اور غروب کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمانا اسی کی نظیر ہے کیونکہ ان اوقات میں کفار آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں، اور حمام میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ستر

برہنہ ہونے کی اور لوگوں کے آتے جاتے رہنے کی جگہ ہے پس یہ باتیں نماز کو حضور قلب کے ساتھ مناجات کرنے سے روک دیں گی۔ اور اونٹوں کے باندھنے کے مواضع میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اونٹ عظیم الجثہ ہونے کی وجہ سے اور سختی کے ساتھ پکڑنے کی وجہ سے اور اس کی زیادہ جرأت کی وجہ سے انسان کو ایذا پہنچا سکتا ہے پس اس خیال سے اس جگہ نمازی کو حضور قلب حاصل نہ ہوگا بخلاف ان مواضع کے جہاں بکریاں باندھی جاتی ہیں اور عام راستہ پر نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ راہ چلنے والوں کی وجہ سے ان کا دل نماز میں نہ لگے گا اور چلنے والوں پر راستہ بھی تنگ ہو جائے گا اس کے علاوہ وہ درندوں کے گزرنے کا راستہ ہوتا ہے جیسا کہ وہاں اترنے سے صریح نہی وارد ہے، اور بیت اللہ کی چھت پر نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ بلاضرورت بیت اللہ کی چھت پر چڑھنا مکروہ ہے اور اس میں خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہے اور اس حالت میں استقبال الی القبلہ ہونے میں بھی شک ہے اور اس زمین میں جہاں خسف واقع ہونے یا پتھر برسنے سے لعنت ہو چکی ہے نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس زمین کو حقیر سمجھنا مقصود ہے، اس کے علاوہ خدا تعالیٰ کا خوف کر کے اس کے مقام غضب سے دور رہنا چاہئے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس جگہ روتے ہوئے جاؤ''۔

نماز کے کپڑوں کا بیان

واضح ہو کہ لباس کا پہننا ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے انسان کو تمام بہائم سے امتیاز حاصل ہے اور کپڑوں کا پہننا انسان کے عمدہ حالات میں سے ہے اور اس میں ایک طرح کی طہارت پائی جاتی ہے اور اس میں نماز کی تعظیم ہوتی ہے اور اس سے اس مناجات کا جو خدا تعالیٰ کے روبرو ہوتی ہے ادب ثابت ہوتا ہے اور لباس کا پہننا بذات خود ایک واجب چیز ہے اس کو نماز میں اس لئے شرط کر دیا گیا ہے تاکہ اس سے نماز کے معنی کی تکمیل ہو جائے، شارع نے لباس کی دو حدیں مقرر کی ہیں ایک تو وہ حد ہے جو ضروری ہے اور وہ نماز کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے، اور ایک وہ حد ہے جو مستحب ہے، پس پہلی حد مرد کے لئے پیشاب اور پاخانہ کے مقام کا ستر کرنا ہے اور ان دونوں میں پیشاب کے مقام کا ستر زیادہ ضروری ہے اور دونوں رانیں انہی کے ساتھ ملحق ہیں اور عورت کے لئے تمام بدن کا ستر کرنا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حائض کی نماز بغیر

اوڑھنی کے قبول نہیں ہوتی''۔ حائض سے بالغ عورت مراد ہے اور دونوں رانوں کو شرمگاہ کے ساتھ اس لئے ملحق کیا کہ ران محل شہوت ہے اور اسی طرح عورت کا تمام بدن محل شہوت ہے اور اس واسطے اس کا حکم وہی ہے جو دونوں شرمگاہوں کا حکم ہے اور دوسری حد یعنی لباس مستحب کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''تم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں کہ اس میں سے اس کے کاندھے پر کچھ نہ ہو نماز نہ پڑھے'' اور فرمایا ''جب کپڑا بڑا ہو تو اس کے دونوں طرف اِدھر اُدھر ڈال لے'' اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ عرب اور عجم اور تمام وہ لوگ جن کے مزاج درست اور انسانیت پر ہیں باوجودیکہ وہ اپنی وضع میں مختلف ہیں کہ کوئی قبا پہنتا ہے، کوئی قمیص پہنتا ہے، کوئی حلہ پہنتا ہے اور کوئی ان کے علاوہ کچھ اور پہنتا ہے ان سب کی پوری ہیئت اور ان سب کا پورا لباس وہی ہوتا ہے جس میں دونوں کاندھے اور پشت کپڑے سے ڈھک جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: کیا ہر ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں؟ پھر حضرت عمرؓ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: جب خدا تعالیٰ وسعت دے تو وسعت کرو، جمع کیا ایک شخص نے الخ۔

میں کہتا ہوں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حد اول کی بابت دریافت کیا گیا تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول حد ثانی کا بیان ہے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ آنحضرتؐ سے اس حد ثانی کے بارے میں ہی سوال کیا گیا ہے جو مستحب ہے پس آپ نے دو کپڑوں کا حکم نہیں دیا کیونکہ دو کپڑوں کی شرط کے ساتھ حکم کرنے میں خواہ وہ استحباب کے لئے ہی شرط ہوں ایک طرح کا حرج ہے اور شاید اس وجہ سے دو کپڑوں کا حکم نہیں کیا ہو کہ جس شخص کو دو کپڑے میسر نہ ہوں تو وہ اپنے دل میں کچھ کوتاہی پائے پس اس کوتاہی کی وجہ سے جو وہ اپنے خیال میں محسوس کرتا ہے، اس کی نماز ہی نامکمل رہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ جانتے تھے کہ احکام کے مقرر کرنے کا وقت تو گزر گیا اور ان کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ نماز میں پورا لباس پہننا مستحب ہے اس واسطے انھوں نے اس کے موافق حکم کر دیا، واللہ اعلم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جو اس حالت میں نماز پڑھتا تھا کہ اس کے سر کے بال پیچھے کی جانب بندھے ہوئے تھے فرمایا اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص

شانے بندھے ہوئے حال میں نماز پڑھتا ہو"۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے یہ بات بتلادی کہ خوبصورتی اور پورا لباس اور طرز ادب میں کمی کرنا کراہت کا موجب ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چادر کے متعلق جس پر نقش ونگار تھے فرمایا "اس نے اب مجھ کو میری نماز سے ہٹادیا"۔ اور آپ نے حضرت عائشہ سے فرمایا "اس تصویر والے پردے کو اتار ڈال اس واسطے کہ اس کی تصویریں میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں اور فروج حریر کی نسبت فرمایا: یہ لباس متقین کے لئے مناسب نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں نمازی کے لئے ضروری ہے کہ جو چیز اس کو نماز سے غافل کرے خواہ وہ اس چیز کی خوبصورتی کی وجہ سے غافل ہو یا نفس کے اترانے کی وجہ سے غافل ہو تو اس کو اپنے سے علیحدہ کردے تاکہ جو نماز سے مقصود ہے وہ پورا پورا حاصل ہوجائے، اور یہودی لوگ اپنے جوتے اور موزوں میں نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے اس واسطے کہ اس میں ایک طرح کی ترک تعظیم ہے اور کیونکہ لوگ بڑوں کے پاس حاضر ہوتے وقت جوتے اتار دیتے ہیں اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اپنے موتے اتار دے تو مقدس میدان طویٰ میں ہے"۔ اور جوتے اور موزہ کے اندر ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ موزے اور جوتوں سے انسان کے لباس کی تکمیل ہوتی ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی مخالفت کی وجہ سے قیاس اول کو ترک کیا اور قیاس ثانی کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہود کی مخالفت کرو اس لئے کہ وہ جوتے اور موزے پہن کر نماز نہیں پڑھتے"۔ پس صحیح یہ ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا اور ننگے پیروں نماز پڑھنا دونوں برابر ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اندر سدل کرنے سے منع فرمایا ہے پس بعض نے سدل کے معنی یہ بتلائے کہ کپڑا اپنے اوپر لپیٹ لے اور اپنے ہاتھوں کو اس کے اندر داخل کرلے، اور عنقریب اس بات کا بیان آئے گا کہ بدن پر اس طرح کپڑا لپٹنا کہ ہاتھ اندر رہیں لباس کی سب صورتوں سے بدتر ہے کیونکہ ہاتھوں کا کھلا رکھنا انسان کی اصل طبیعت اور اس کی عادت ہے اور یہ ہیئت اس کے مخالف ہے، نیز اس میں ستر کے کھلنے کا ہر وقت احتمال ہے کیونکہ اکثر اوقات انسان کو کسی چیز کے پکڑنے میں ہاتھ باہر نکالنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سے ضرور ستر کھل جائے گا۔ بعض نے سدل کے معنی یہ بتلائے کہ اپنے اوپر کپڑا ڈال لے اور اس کے دونوں

جانب نہ ملائے اور اس سے بھی خوبصورتی اور تمام ہیئت میں خلل پیدا ہوتا ہے اور تمام ہیئت سے ہماری مراد وہ لباس ہے جس کے متعلق عرف عادت میں یہ کہا جاسکے کہ اس میں ضروری کپڑوں میں سے کوئی کپڑا کم نہیں ہے، اور لوگوں کے لباس کی وضع جداگانہ ہے لیکن ہر طرح کے لباس میں تمام ہیئت ہوتی ہے جو تلاش کرنے سے معلوم ہوسکتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عرب کے دستور کے موافق جو اس وقت میں لباس کے متعلق تھا حکم دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی اہم مطبوعات

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	325.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد دوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد سوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد چہارم)	//	زیر طبع
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب و ہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی، خدمات و آثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی چہرے)	//	100.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
المساجد التاریخیہ بدهلی	//	500.00
معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
مرد مومن ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
الامام الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
وقف ترمیمی بل ۲۰۱۰ء منظر، پس منظر	//	زیر طبع
ضمائر القرآن (ضمائر قرآن اور انکے مراجع) ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی	مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اور متماثل و نظائر)	//	350.00
وفیات اعیان الہند (امراء و سلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مضامین خالدی (اسلامیات قرآنیات اور دینیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
قرآنی تشبیہات و استعارات	//	150.00
نشریات (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ)	مولانا جنید احمد بنارسی	100.00
سفر وسیلہ ظفر	خورشید انوار عارفی	100.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Adjacent to Kaka Nagar Masjid, (Near NDMC Primary School),
Kaka Nagar, New Delhi-110003
Ph.: 9811740661, 9811615455, 26953430
Email: shahwaliullah_institute@yahoo.in, swiinstitute26gmail.com